The Drinched Book

text fiy book

text cut book only

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ

مدیر
محمد عبدالقادر سروری
ایم اے، ال ال بی

۱۔ یہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا ماہوار رسالہ ہے۔

۲۔ یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جسمیں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

۳۔ بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹفیکٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالۂ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

۴۔ قیمت سالانہ (للعہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عاہر) فی پرچہ ۶

۵۔ اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (صہ) نصف کے لئے (سے) اور چوتھائی کے لئے عہ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲ ½ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

مجلۂ مکتبہ کی خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے اُنکے نام رسالہ سال بھر کیلئے بلا قیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خریدیں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلۂ مکتبہ بلا قیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے ان کو ایک رسید دیجائے گی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبوں کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحت بالا رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں "منتظم مجلۂ مکتبہ" کے پاس بھیج دیں تا کہ انکے نام جاری کر دیا جائیگا یہ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ترسیل زر، مضامین اور جملہ خط و کتابت بتوسط "منتظم مجلۂ مکتبہ" مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ہونی چاہیئے۔

رجسٹرڈ نشان ٹپہ سرکار آصفیہ (٦٥)

رجسٹرڈ نشان ٹپہ سرکار انگلشیہ

مجلّۂ مکتبہ

جلد (۳) شمارہ (۱)

بابتہ ماہ خورداد ۱۳۳۸ف م اپریل ۱۹۲۹ء

تصاویر

مولانا سید شاہ ابراہیم صاحب عفو مرحوم سید عسکری حسن صاحب بیارسٹر ایٹ لا

خان بہادر ڈاکٹر خواجہ محمد حسین صاحب مرحوم

فہرست

شذرات

مجلۂ مکتبہ کی تیسری جلد کا پہلا نمبر ہم اپنے وعدہ کے مطابق وقت پر شائع کر رہے ہیں۔ توقع ہے کہ آئندہ سے اس قسم کی تاخیر نہ ہوگی۔

یہ نمبر زیادہ تر ادبی مضامین پر مشتمل ہے، جن میں سے اکثر دلچسپی سے پڑھے جائینگے مولوی سید غلام محی الدین قادری زور ایم۔ اے نے بھی جن کی علمی کاوشوں سے مجلۂ مکتبہ کے ناظرین کو واقف رہنے کا خاص طور سے موقع ملتا رہا ہے، کمال ہمدانی دہ ایک معرکتہ الآرا مضمون روانہ فرمایا ہے۔ آپ کی یہ قابلِ قدر تحقیق ضرور ہماری ستائش کی مستحق ہے۔ پچھلے دنوں جب آپ اڈنبرا یونیورسٹی کے کتب خانے میں ریسرچ کر رہے تھے، آپ کو قدیم اردو مرثیہ نگاروں ہی کے متعلق اس قدر کارنامے دستیاب ہوئے ہیں کہ جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ آپ کی تحقیقات کے نتائج جلد عوام کے سامنے آجائیں گے۔

لچھمی نارائن شفیق (اورصاحب) اورنگ آبادی، مصنف تذکرہ چمنستان شعرا کے کلام کا انتخاب جو شاعر کے سارے کلام کی روح ہے، گذشتہ نمبر پر ختم کر دیا گیا۔ اور سال نو سے شفیق ہی کے ایک ہم عصر اور اچھے دکنی شاعر سخن اورنگ آبادی کے کلام کے انتخاب کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ ہمارے شریک کار مولوی عمر یافعی صاحب نے سخن کے کلام اور حالات کا مطالعہ کر کے اُس کے سخن ہائے گفتنی و شنیدنی کا نچوڑ لے لیا ہے۔ اور شاعر اور اُس کے معاصرین کی نسبت ایسی معلومات فراہم کی ہیں، جس سے اُردو میں اچھا اضافہ ہو سکیگا۔

اس نمبر میں مولانا سید شاہ ابراہیم صاحب عفو مرحوم کی تصویر شائع کی جا رہی ہے۔ عفو صاحب مرحوم حیدر آباد کے نہایت پختہ گو اور مشہور شاعر تھے۔ آپ کے پاکیزہ اشعار عرصہ تک اُردو اخباروں اور رسالوں میں شائع ہو کر پسند عام کا تمغہ حاصل کر چکے ہیں۔ آج کل بھی آپ کے ورثا سے لے کر اُردو کے کئی رسائل اور اخبارات آپ کے کلام سے اپنی زینت بڑھاتے ہیں۔ مرحوم نے سال گزشتہ بڑی عمر پا کر بماہ اردی بہشت انتقال کیا۔ شعر شاعری کے علاوہ آپ کو نثر نویسی میں بھی بڑا ملکہ تھا اور متعدد کتابیں آپ کی یادگار ہیں۔ عربی فارسی کے علاوہ انگریزی زبان و ادب سے بھی بقدر ضرورت واقف تھے۔ سرکار عالی میں مہتمیی تعمیرات و آبپاشی کے عہدہ پر فائز رہ کر پیرانہ سالی میں وظیفہ حسن خدمت پر علیحدہ ہوئے۔ باقی عمر تصنیف و تالیف میں گزار دی۔ ہماری فیاض حکومت نے آپ کے علمی مشاغل کی قدردانی کرتے ہوئے آپ کو وظیفہ تصنیف و تالیف بھی عطا کیا تھا۔ آپ کی نثری

تالیفات میں حضرت خالد بن ولید اور نور جہاں بیگم کی سوانح عمریاں بہت مقبول ہیں۔

اس نمبر کی دوسری تصویر مولوی سید عسکری حسن صاحب یم۔ اے بیرسٹر ایٹ لا کی ہے یوصوف حیدرآباد کے طبقہ وکلا میں ایک ممتاز شخصیت رکھتے ہیں۔ اسی ماہ کے اوائل میں بمقام گلبرگہ شریف وکلا کی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں آپ نے ایک مفید خطبہ صدارت دیا۔ اور طبقہ وکلا کی ترقی و تعالی کے لئے مفید تجاویز پیش کیں نہایت مسرت کی بات ہے کہ حیدرآباد کے مختلف ممتاز طبقوں میں ایک طبقہ وکلا ہی ایسا ہے جو اپنی فلاح و ترقی کے لئے سب سے پہلے کوشاں نظر آتا ہے طبقہ وکلا میں جامعہ عثمانیہ کے قانونی طیلسانین سے قوی اُمید ہے کہ ایک نئی روح پیدا ہو جائیگی۔ اس کے آثار و علایم صاف نظر آرہے ہیں۔ وکلائے گلبرگہ کی سعی سے یہ کانفرنس اس مرتبہ نہایت کامیابی کے ساتھ گلبرگہ شریف میں منعقد ہوئی جامعہ عثمانیہ کے قانونی طیلسانین کے مفید رسالہ مقنن کا ذکر بھی اس موقع پر ضروری ہے۔ مقنن کے کارپردازوں نے ایک خاص کانفرنس نمبر بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ جس میں حکام عدالت العالیہ اور کارکنان کانفرنس کی متعدد تصاویر ہیں۔ ہم کارپردازان مقنن کو اس کامیاب نمبر پر مبارکباد دیتے ہیں۔

تیسری تصویر خان بہادر ڈاکٹر خواجہ محمد حسین کی ہے۔ جو کئی نمایاں حیثیتوں کے حامل تھے آپکی تصویر اور حالات ہم اپنے ایک کرمفرما مولوی احمد عبدالحی صاحب کی مساعی کی بدولت شائع کرسکے حالات موصوف ہی کے مضمون کا اقتباس ہیں۔

خان بہادر ڈاکٹر خواجہ محمد حسین مرحوم کی ولادت مدراس کے ضلع چنگل پٹ میں ہوئی۔ آپنے بہت سے مفید کام اپنے ملک کیلئے انجام دیئے تھے تو طبیب لیکن شعر سے بھی لگاؤ تھا علمی کتابیں بھی لکھیں اور حکومت برطانیہ سے "خان بہادر" کا خطاب پایا۔

آپکے والد خواجہ سرور حسین سرور عربی اور فارسی کے زبردست عالم، اور اچھے ادیب شاعر بھی تھے۔ ابتدائی تعلیم السنہ شرقیہ میں پائی۔ لیکن بعد میں انگریزی تعلیم شروع کی اور اپنے مذاق کے مطابق ڈاکٹری کو اپنا مطمع نظر بنایا۔ اور بعد تکمیل تعلیم سرکار انگریزی کی طرف سے رایاپورم کے دواخانہ میں ڈاکٹر مقرر ہوئے۔ جو ہر دلعزیزی اُن کو غریب بیماروں میں حاصل تھی وہ بہت کم طبیبوں کو حاصل ہوسکتی ہے۔ بعض اوقات وہ خود اپنی جیب سے غریب بیماروں کی امداد کیا کرتے۔ اُن کی صداقت کے مدنظر بعد میں ڈاکٹر صاحب مدراس کے علاقہ اسپاہ میں ان زخمی سپاہیوں کے علاج کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔ جو سرکش رعایا میں نظام قائم رکھنے کی غرض سے بھیجے گئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی اس فنی قابلیت کی بنا پر، موجودہ نواب صاحب بنگن پلی کے دادا نواب فتح علی خاں بہادر نے گورنمنٹ کی ملازمت سے سبکدوش کرواکر اپنے دواخانہ میں طبیب مقرر کر لیا اور رفتہ رفتہ محکمۂ صفائی کی کمشنری بھی انہیں کے سپرد کی۔ حیدرآباد کے بعض امرا جنکو بنگن پلی سے کسی قسم کا بھی تعلق تھا اکثر ڈاکٹر صاحب ہی کے زیر علاج رہے۔ انہیں تعلقات کی وجہ سے بلدہ کے اکثر عمائدین سے بھی ڈاکٹر صاحب کی گہری ملاقات ہو گئی تھی۔ جن میں نواب احمد حسین سر امین جنگ بہادر، نواب ذوالقدر جنگ بہادر، نواب سردار یار جنگ بہادر نواب شاد یار جنگ بہادر اور نواب عماد الملک بہادر خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

نواب سر احمد حسین امین جنگ بہادر کے ڈاکٹر صاحب سے تعلقات کا ایک خاص واقعہ قابل ذکر یہ ہے کہ نواب صاحب کے والد انگریزی تعلیم کے سخت مخالف تھے، اس لئے وہ نواب صاحب کو انگریزی مدرسہ میں بھیجنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب انگریزی تعلیم کے بڑے شوقین تھے اور انہیں کی دوستی کے اثر اور مشورے کی بدولت نواب صاحب کو انگریزی تعلیم کا بڑا شوق ہوا۔ گویا ڈاکٹر صاحب اس طرح ایک جوہر فرد کو اس حلقہ میں نصب کرنے کا باعث ہوئے جس میں وہ اپنی اصلی خوشنمائیاں دکھانے والا تھا۔ خود نواب صاحب کو اس کا اعتراف ہے کہ خان بہادر ڈاکٹر خواجہ محمد حسین کی علمی صحبتوں سے آپ نے بہت کچھ اکتساب کیا۔

آخر میں ڈاکٹر صاحب کو حج بیت اللہ اور زیارت مقامات متبرکہ کا شوق ہوا جس کی تکمیل اس طرح ہوئی کہ وہ قافلہ کے طبیب کا کام انجام دیتے ہوئے، حج سے فارغ ہوئے۔

آپ نے ڈاکٹر شیخ محی الدین مصنف "میٹریا میڈیکا" کو اس کی تکمیل میں بڑی مدد دی۔ "گزیٹیر آف انڈیا" کی تدوین میں بھی بنگن پلی سے متعلق آثار قدیمہ کا مواد فراہم کرنے میں آپ نے جو کاوش کی اس کا صلہ سرکار انگریزی نے "خاں بہادر" کے خطاب کی شکل میں عطا کیا۔

ڈاکٹر صاحب شاعر بھی تھے۔ خواجہ تخلص کیا کرتے تھے۔ کچھ نعتیہ غزلیں آپ کے افکارات سے باقی ہیں۔

سعدی ایک مصری مقالہ نگار کی نظر میں

از جناب ابو المحاسن، محمد محسن خاں صاحب متین

ذیل کا مضمون مصر کے ہفتہ وار اخبار "السیاست الاسبوعیہ" (شمارہ ۹۸) سے کے لائق مقالہ نگار مصطفیٰ عبد اللطیف السحرتی کی علمی کوششوں کا نتیجہ ہے جس کو ایران کے گرامی قدر مجلہ "تقدم طہران" کے فاضل مدیر ین احمد عبد الرحمن فرامرزی نے عربی سے دار السلطنت طہران کی سائج الوقت زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ آج دنیا میں ایسا کون ذی علم انسان ہے جو شیخ سعدی کی حکیمانہ نصائح سے بہرہ مند ہو کر ان کی فقید النظیر شخصیت سے متاثر نہ ہوا ہو۔ سعدی کے متعلق اعتقادی مقالوں کے قلمبند کئے جانے کی جس قدر ضرورت ہے اس سے ہر صحیح المذاق انسان واقف ہے اور یہ امر بھی محتاج بیان نہیں کہ ابھی اس میدان میں خامہ فرسائی کے لئے بہت کچھ گنجائش ہے۔ بدقسمتی سے اردو میں اس کے متعلق صرف لے دیکے "حیات سعدی" کے سوا اور کوئی مستقل کتاب موجود نہیں۔ اگر زمانہ اتنی مہلت دے اور تمام چیزیں ہمارے منشا کے مطابق مہیا ہو جائیں تو انشاء اللہ ہم اس موضوع پر آئندہ کوئی مستقل مقالہ پیش کریں گے۔ لیکن سردست ہم مقالۂ مذکور کے ترجمہ پر جو خاص ناظرین "مکتبہ" کے لئے فارسی سے لیا گیا ہے۔ اکتفا کرتے ہیں۔

(ابو المحاسن متین)

تمہید

شاید آپ اس واقعہ سے متعجب ہوں گے کہ ایک پرند، اپنے طلسم زا آشیانے سے نکل کر کس طرح آفتاب کے چہرہ کے روبرو قہقہے لگاتا نسیم صبحگاہی کے دوش بدوش اٹکھیلیاں کرتا اور گل و غنچہ کے حسن و جمال کے مقابل غزل سرائی کرتا ہے۔ بارھویں صدی کے اوائل میں ایک ایسے ہی پرندے نے بھی، بصورت بشر فضا کے وجود میں پھریری لی۔ یہ میٹھے سروں میں گیت گانے والا پرند سعدی تھا جس نے شیراز کی فضا میں، اپنے راگ الاپے اور جس کے سننے کے اشتیاق میں، ایک عالم نے سکوت اختیار کر کے، اپنے کان لگا دیئے۔ اس نے عالم تنہائی میں اپنے سحر طراز قلم کو حرکت دیکر اہل دنیا کے

رد پردِ جمال و تناسب کو پیش کیا، اس نے خواص و عوام، بادشاہ و درویش، امیر و فقیر کے باب میں گفتگو کر کے، حسن ظرافت میں چار چاند لگا دیئے اس نے بلا لحاظ، حکمت کے وہ انمول موتی، جو شاہوں کے شایان شان ہیں، ہر کس و ناکس کے سامنے بکھیر دیئے۔ اس نے بے تکلف دوستوں اور ہم مذاق ساتھیوں کے سامنے، اپنے لب تبسم کھول دیئے۔ اہل ذوق نے شوخی و ظرافت اور شیرینی و حلاوت کو یہیں سے حاصل کیا۔

یہ وہ شاعر ہے جس نے سطح ارض کو اپنی شعاعوں سے جگمگا دیا اور اقطاع عالم کو عطر میں بسے ہوئے پھولوں کی بو سے مہکا دیا تھا، وہ نہ دل آویز چہرہ رکھتا تھا اور نہ خوبصورت جسم نہ بنفشئی رنگ کے بال جس سے لوگوں کے دل دام میں آ جائیں۔ بلکہ وہ ایک سادہ سیدھا شیخ تھا جو سر پر ایک عمامہ رکھے، جسم میں لاجوردی رنگ کا لباس پہنے اور ہاتھ میں ایک عصا، فقیروں کی مانند لئے ہوئے رہتا تھا۔ لیکن اس کی جس چیز نے دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیا اور عقلوں کو مسحور و مفتون بنا لیا، بلاشبہ وہ اس کا صاف دل، پاک وجدان اور متوالی روح ہے۔ سعدی لڑکپن میں اپنے ہمعصروں میں ممتاز رہا ہے، وہ جوانی میں ایک زبردست زبان آور اور بڑھاپے میں ایک عارف ربانی تھا۔ اس دنیا کے نامور ترین شخص نے اپنی تصانیف میں اس طرح زندگی کی تصویر ماہرانہ انداز میں کھینچی ہے کہ اس سے بہتر کھینچنا ناممکن ہے یہ خوشگو پرندہ عہد تاریک میں پر و بال نکالے، سکون و آرام کی حالت میں ایک غزلخوان بلبل اور موسم خزاں و خشک سالی کے زمانے میں ایک ہنستا ہوا پھول بنا رہا۔[1]

۲۔ اس کا وطن اور محل تربیت

اس کا اصلی نام مشرف الدین اور اس کے والد کا نام مصلح الدین عبداللہ ہے۔ سعدی تخلص اختیار کرنے کی وجہ یہ ہوئی کہ اس کے والد سعد زنگی کے ہاں ملازم تھے اسی وجہ سے سعدی کے تخلص کو اسکی طرف منسوب کیا جاتا ہے اس کو بچپن ہی میں باپ کے گزر جانے کی وجہ سے یتیمی اور بے پدری کا مزا چکھنا پڑا[2]۔ اسی باعث سے وہ یتیموں پر ترس کھاتا اور دل جوئی کرنے اور ان پر شفقت رکھنے کے متعلق اپنی مواعظ میں لوگوں کو وصیت کرتا ہے[3]۔

---

[1] اکثروں نے اس کے برعکس لکھا ہے۔

[2] مرا باشد از درد طفلاں خبر۔ کہ در طفلی از سر برفتم پدر (بوستان باب دوم)

[3] پدر مردہ را سایہ بر سر فگن۔ غبارش بیفشان و خارش بکن (بوستان باب دوم)

باپ کے انتقال کے بعد تحصیل علم کے ارادہ سے، وہ بغداد روانہ ہو کر (یہ وہ مقام ہے جو ان ایام میں تربیت و تمدن اور علوم عرفان کا مرکز بنا ہوا تھا) حصول علم میں مشغول ہو گیا مذاہب اربعہ کے علوم سے فارغ ہونے کے بعد اس کا رجحان عرفان کی جانب ہوا اور اس نے شیخ شہاب الدینؒ کا دامن تھام لیا۔ خلاصہ یہ کہ سعدی تیس برس تک تحصیل علم و فضل میں مصروف رہا اور آخر کار وہ ایک بزرگ ترین مفکر ہو گیا۔

۳- اسکی سیر و سیاحت

جب وہ تحصیل علم سے فارغ ہو چکا تو سیاحت و جہاں نوردی کی آتش شوق اس کے سینے میں بھڑک اٹھی اور مدتوں وہ مسافرت میں مشغول رہا۔ اس نے زندگی کا نہایت گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا، اس کو ہر طبقے کے لوگوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس نے مختلف اقوام کی خصوصیات اور نوع انسانی کی عادات و خصائل سے واقفیت پیدا کی تھی۔[۱]

اس کو ہر ایک چمن سے گلہائے یاسمین کے چننے، ہر ایک شخص کی زبان سے گفتگو سننے اور ہر ایک خرمن سے خوشہ چینی کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔[۲]

پہلے پہل وہ ہندوستان کی جانب روانہ ہوا۔[۳] پھر وہاں سے ترکستان کی راہ لی اس کے بعد یمن کے ہرے بھرے چمن زاروں اور اس کی خوشگوار آب و ہوا کی کشش نے اس کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہیں سے وہ حبش کی جانب روانہ ہوا۔ مکہ اور مدینہ کی بھی زیارت کی۔ پہلی مرتبہ جب وہ مکہ کی زیارت سے مشرف ہوا ہے، یہ شرف اس کو اپنے محترم استاد شیخ عبدالقادر گیلانی کی بیعت میں نصیب ہوا۔[۴] بیان کیا جاتا ہے کہ سعدی نے پندرہ دفعہ سے زیادہ کعبۃ اللہ کے جو حج کئے ہیں ان میں سے اکثر پا پیادہ کئے ہیں، اس کے بعد اس نے

---

۱ در اقصائے عالم بگشتم بسے۔ بسر بردم ایام با ہر کسے۔

۲ تمتع زہر گوشۂ یافتم۔ زہر خرمنے خوشۂ یافتم۔ (دیباچہ)

۳ بتے دیدم از عاج در سومنات۔ مرصع چو در جاہلیت منات الخ (بوستان باب ہشتم)

۴ چونکہ گیلانی کی وفات ۵۶۱ھ میں ہوئی ہے اور سعدی کا تولد ۵۸۹ھ میں۔ اس اعتبار سے سعدی ان کے زمانہ میں نہیں ہوا۔ شاید گلستان میں جو اشارہ شیخ سے ملاقات کرنے کے واقعہ کی طرف پایا جاتا ہے وہ تحریف کتاب کی وجہ سے ہے۔

شام کی جانب عنان عزیمت پھیر دی اور عرصۂ دراز تک دمشق میں زندگی بسر کی اور وہیں پر اس نے عام شہرت حاصل کی۔ اس طور پر کہ بعلبک[1] میں، اس کی مجلس وعظ میں حاضر رہنے کے لئے لوگ ایک دوسرے پر سبقت کرتے تھے لیکن آخر کار اس نے دمشق میں رہنے سے بیزار ہو کر صحرا نشینی اختیار کی اور ایک زمانہ تک بیت المقدس کے صحرا میں گھومتا رہا۔ اس اثنا میں ولندیزیوں کے ایک دستہ نے اس کو گرفتار کر کے طرابلس[2] کو بھیج دیا۔ ایک مدت تک وہاں کے قلعہ میں اس سے سخت کام لئے جاتے رہے۔ یہاں تک کہ حلب کے کسی ذی ثروت امیر نے اس کو دس دینار کے عوض خرید کر اپنی بیٹی اسکے حوالے کی۔ لیکن سعدی کا دل اس عقد سے بجائے خوش ہونے کے ہمیشہ ناراض ہی رہا۔ اس واقعہ کی کیفیت کو یہی بہتر ہے کہ ہم اس کے اپنے معجز نما بیان پر چھوڑ دیں۔

"دمشق کے دوستوں کی صحبت سے مجھے رنج پہنچا، میں نے "بیابان قدس" کی جانب روانہ ہو کر جانوروں سے انس پیدا کیا۔ اس کے بعد مجھے فرنگیوں کی قید میں گرفتار ہونا پڑا۔ طرابلس کی خندق میں یہودیوں کے ساتھ مجھے مٹی اٹھانے کے کام پر مقرر کیا گیا، یہاں تک کہ اس طرف سے حلب کے ایک رئیس کا (جو مجھ سے پہلے سے متعارف تھا) گزر ہوا۔ اس نے مجھے پہچان کر کہا۔ یہ کیا حالت ہے اور ایسے کیوں گزار رہا ہے؟ میں نے کہا میں لوگوں سے بیزار ہو کر اس خیال سے پہاڑوں اور جنگلوں کی طرف بھاگا کرتا تھا۔ کہ خدا کے سوا کسی اور کے ساتھ مشغول نہ رہوں تو یہی اندازہ کر کہ اس وقت میری کیا حالت ہوگی، جب کہ مجھے نامردوں کے طویلے میں گزارنا پڑتا ہے!۔

پائے در زنجیر پیش دوستاں — بہ کہ با بیگانگان در بوستاں

اس نے میرے حال پر ترس کھایا اور دس دینار کے عوض مجھے قید سے رہائی دلائی اور اپنے ساتھ حلب لے گیا۔ اس کے ایک بیٹی تھی جس کو اس نے میرے عقد نکاح میں دیا، مدتوں اس کا سو دینار مہر مجھ پر چڑھا رہا۔ لڑکی بدخو، لڑاکا اور نافرمان تھی اس نے

---

[1] گلستان کے دوسرے باب میں اس مجلس وعظ کا خود شیخ نے اس طرح ذکر کیا ہے۔ در جامع بعلبک وقتے کلمۂ چندے ہمی گفتم بطریق وعظ با جماعت افسردہ دل مردہ راہ از عالم صورت بعالم معنی بردہ۔ دیدم کہ نفسم در نمی گیرد و آتشم در ہیزم تر اثر نمیکند، دریغ آمدم تربیت ستوران و آئینہ داری در محلت کوران ولیکن در معنی باز بود و سلسلۂ سخن دراز (متین) [2] اس سے مراد طرابلس الشام ہے۔ (متین)

زبان درازی شروع کر دی اور میرا عیش تلخ کر دیا جیسا کہ عقلاء نے کہا کہ:-

زن بد در سرائے مرد نکو　　هم درین عالم است دوزخ او

ایک دفعہ اس نے طعنہ دیکر کہا:- کیا تو وہ آدمی نہیں ہے جس کو میرے باپ نے "قیدِ فرنگ" سے دس دینار میں خریدا؟ میں نے کہا:- ہاں سو دینار کے عوض اس نے مجھے تیری قید میں گرفتار کرادیا[1]"

اگرچہ سعدی نے اس عورت کی بدولت بہت بڑی ثروت حاصل کی مگر سیر و سیاحت کے پیچھے پڑکر ایشیائے کوچک کا طول و عرض کھونڈ ڈالا۔ بیان کرتے ہیں کہ اس نے یورپ کا بھی سفر کیا تھا، بہرصورت سعدی دوسرے تیس سال بھی اسی طریقہ پر سیر و سیاحت میں مصروف رہا۔

۴- اس کی زندۂ جاوید مؤلفات

سعدی نے پہلے تیس سال تحصیل علم میں اور دوسرے تیس سال سیر و سیاحت میں صرف کئے جس وقت وہ ستر سال کی عمر کو پہنچ کر اپنے اصلی وطن شیراز کی جانب لوٹا تو دیکھا کہ ملک بادشاہ عادل ابوبکر سعد کے زیر سایہ امن و آرام میں ہے۔ سعدی کو یہ حالت پسند آگئی شہر کے قریب ہی ایک چھوٹا سا مکان لیکر رہ پڑا۔

سعدی کی ذہنیت اپنی مانوس خلوت گاہ سے نکل کر عرصۂ ظہور میں آئی وہ پھول جن کی عطر آگین خوشبو کے سونگھنے سے کوئی شخص سیر نہیں ہوتا تھا یہیں دستہ کی صورت میں بندھے ہوئے آپہنچے۔

سعدی نے اپنی سب سے پہلی کتاب یعنی "بوستان" بیاسی[82] سال کی عمر میں نظم کی۔ اس کے ایک سال بعد ایک اور بینظیر کتاب "گلستان" یعنی ہمایون کا باغ کے نام سے بعجلت تمام تالیف کی۔ اس نے اس کتاب کو جس کی تکمیل کے لئے کئی ایک سال کی مدت درکار تھی ایک ہی سال میں تمام کی[2] سعدی کی حقیقت آراء افکار اور اس کی عظمت کے

[1] اصلی مقالہ نگار نے اس عبارت کو السنہ خارجہ سے ترجمہ کیا ہے لیکن ہم نے بجائے اس کے گلستان کی یہ عبارت بجنسہ درج کردی ہے۔ (چونکہ ہماری مادری زبان فارسی نہیں ہے اس لئے ہم کو بھی اصل مقالہ نگار کے تتبع میں بجائے گلستان کے اصلی عبارت نقل کرنے کے اردو میں ترجمہ کرنا پڑا۔ دشتین)

[2] سعدی نے خود گلستان کے دیباچہ میں یہی لکھا ہے اس کتاب کے تمام ہونے میں دو تین ماہ سے زیادہ عرصہ نہیں گذرا۔ اس سے کہ اس نے اردی بہشت کے اوائل میں ابتداء کی اور بہار کا موسم گذرنے تک تکمیل کر دی۔ چنانچہ کہتا ہے:- "ہنوز از گلستان بقیتے مانده بود که کتاب گلستان تمام شد"

نہ ختم ہونے والے چشموں کی بنیاد یہی دو کتابیں ہیں[1]۔ مدت ہائے دراز سے یہ دونوں کتابیں ادب اور حکمت کے الہام کا سرچشمہ اور گمراہوں کے لئے شمع ہدایت بنی رہیں جن کی شعاعوں سے مشرق اور مغرب کے فضلا نے استفادہ کیا اور کئے جا رہے ہیں۔ سعدی ایک اور کتاب بھی رکھتا ہے جو پندنامہ[2] کے نام سے موسوم ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کتاب بھی اس کی پر ذوق کتب سے ہوگی۔ بوستان میں تمام کے تمام شعر ہیں لیکن ان تینوں کتابوں میں سب سے اچھی کتاب وہی پھولوں کا باغ (گلستان) ہے یعنی یہ کتاب ایسا مجموعہ ہے جو اخلاقیات، فلسفہ اور حکایات پر مشتمل ہے۔ اس نے اس میں نظم و نثر کے ذریعہ حزن و ظرافت کو جمع کر دیا ہے۔ یہ کتاب ایک ایسے ساحرانہ اسلوب میں قلمبند کی گئی ہے جس سے قاری کے ذہن کا حرکت پاتا ہے۔ اس میں سب سے زیادہ جو حصہ جاذب توجہ نظر آتا ہے وہ عشق اور عشاق کا باب ہے۔ حقیقت میں سعدی نے موثر ترین جذبات کا انتخاب کرکے انسان کے حساس ترین اعصاب کا پتہ چلایا ہے۔

درحقیقت وہی شخص اس کی قدر و قیمت اور ان کے علمی پایہ کا اندازہ کرسکتا ہے جس نے ان کو اچھی طرح پڑھ کر جمال عبارت اور کمال معنی کا مطالعہ کیا ہو۔

اہل مشرق پر واجب ہے کہ اس مشرقی فلسفہ کی چاشنی سے لذت اندوز ہوں۔ خاص کر اس صورت میں جب کہ اہل مغرب ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کرکے اس کی سرچیوں سوتوں سے سیراب ہوئے ہوں۔

"اڈورڈ براؤن نے" اس کے اکثر حصوں سے استفادہ کیا ہے۔ یورپ کا یگانہ روزگار فسانہ نگار "لافونتن" نے بھی اس کی کتاب کا گہری نظر سے مطالعہ کرکے اس کی حکایات میں سے ایک حکایت کی نقل کی ہے۔

یورپ کے اکثر شعراء نے بھی ہمیشہ گلزار سعدی سے عطر میں بسے ہوئے پھول چنے ہیں اور چنتے رہیں گے۔ چنانچہ ان کا ہمعصر فرانسیسی شاعر "پول ہورڈ" نے جو دلنواز صدا بلند کی ہے

---

[1] چونکہ فاضل مقالہ نگار زبان فارسی سے واقف نہیں ہے اور نہ سعدی کی غزلیات کی حلاوت دوسری زبانوں میں آتی سکتی ہے (؟) وجہ ہے کہ اس نے غزلیات کی حقیقت کا پتہ نہیں لگایا۔

[2] ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ اس سے کونسی کتاب مراد ہے شاید اس سے مراد وہی پند اللہ ہوگی لیکن ہم اپنے قیاس کی بناء پر کہتے ہیں کہ شارح نے اس نام کے پڑھنے میں غلطی کی ہے۔ پندنامہ در اصل پندنامہ کا معرب ہے جس کی صورت تعریب کی وجہ بگڑ کر اس طرح ہو گئی۔ (مترجم)

وہ سعدی ہی کے ساز سے تعلق ہے اور اس حقیقت کو فرانس کے ایک ادیب نے آشکار کیا۔
فی الحقیقت سعدی کی کتب نے قرون وسطی سے لیکر تا حال روئے زمین کو ہلا دیا ہے۔
یہ عشق و جمال، پند و حکمت، اخلاق و فلسفہ اور تمام چیزوں کی ابتدا سے انتہا تک آدمیوں کو تعلیم دیتی ہے۔

جو شخص شمع اور پروانے کی حکایت پڑھتا ہے وہ کچھ دوستی و وفاداری اور دوستوں (مخلصوں) کے ساتھ ایثار نفس کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے[1]۔

"حکایت جوانمرد تنگدست" ہم کو جوانمردی و انسانیت کی تعلیم دیتی ہے[2] اور "حکایت بادشاہ بیمار" سے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ سعدی ظالموں اور ستم پرور حاکموں کے ظلم سے کس قدر متاثر ہوا ہے[3]۔ حکیمانہ مقالوں کو پڑھنے والا سعدی کے تنفر کے عالم کا، اس رسم و رواج کے ذریعہ ــــ کہ نو عمر لڑکیاں بوڑھے کمسٹ آدمیوں کو دی جاتی ہیں ــــ بخوبی اندازہ کر سکتا ہے[4]۔

خلاصہ یہ کہ سعدی کی تمام کی تمام حکایتیں پر لطف، دل کو موہ لینے والی بلند معانی اور بلند پایہ فلسفہ کی حامل ہیں۔ شاید یہ بات نامناسب نہ ہوگی اگر ہم یہاں اس کے بعض اقوال نقل کریں، وہ گلستان کے آخر میں کہتا ہے[5]

"ای کہ پنجاہ رفت در خوابی | مگر این پنج روز دریابی"
"خجل آنکس کہ رفت و کار نساخت | کوس رحلت زدند و بار نساخت"

....

"رفتن و نشستن بہ کہ دویدن و گسستن"
"اسب تازی دو تگ رود بشتاب | شتر آہستہ میرود شب و روز"

---

[1] کسے گفت پروانہ را کے حقیر | برو دوستی در خور خویش گیر (بوستان باب سوم)
[2] یکے را کرم بود و قوت نبود | کفافش بقدر مروت نبود
کسے را کہ ہمت بلند او فتد | مرادش کم اندر کمند او فتد (بوستان باب دوم)
[3] یکے را حکایت کنند از ملوک | کہ بیماری رشتہ کرد ش چو دوک (بوستان باب اول)
[4] زن جوان را تیرے در پہلو نشیند بہ از آنکہ پیرے .... (گلستان باب پنجم)
[5] یہ ابیات گلستان کے شروع میں ہیں، ہم نے بجائے ان کے کتاب کے آخر حصوں کی مانند بجنسہ نقل کر دی ہیں۔

بد اندیش را خوے شیرین مبین　　که ممکن بود زہر در انگبین" (بوستان)

....

وقتیکہ محبوبہ سر بر سینہ ات نہادہ دستت را از روے محبت فشار داد براے اینکہ ترا بوسہ برق تشکر خندہ از میان دندان ہاے مروارید گونش پرید۔ فوراً لب بلبش نزدیک ملکن زیرا نمیدانی در پشت آن خندۂ تشکر چہ پنہان باشد[1]"

مختصر یہ کہ سعدی نے حکمت کو شوخی کے لباس اور شیرین عبارات میں کچھ اس طریقہ کے ساتھ بیان کیا ہے، در آن حالیکہ وہ نادر ہے۔ ہنوز ہماری زبان میں اس شاعر کی کتابون کا جو در اصل حکمت عملی فلسفہ ہیں، ترجمہ نہیں ہوا ہے[2]۔ برخلاف اس کے خیام کے اس فلسفہ کا جو ماوراء الطبیعہ سے متعلق ہے ترجمہ ہو چکا ہے!

۵۔ سعدی کی شاعری

سعدی، تمام مشرقی شعراء میں جو تمغائے امتیاز رکھتا ہے بلا شبہ وہ دوستانہ حقیقت اور جوش و صداقت پر مبنی ہے یعنی گلہائے سعدی، گلہائے حقیقت ہیں نہ کہ گلہائے خیال، لیکن اسی طریقہ پر فطرت کے مطابق یہ پھول کانٹوں میں گھرے ہوئے ہیں۔

جس وقت کوئی شخص اس کے شیرین قصائد اور غزلیات کو پڑھتا ہے تو وہ ان پر وحی الہی اور الہام آسمانی کا گمان کرتا ہے۔ کوئی شخص یہ باور نہیں کر سکتا کہ یہ پھول کسی انسان ہی کے دل سے نکلے ہیں اور ان آسمانی نغموں کو کسی انسان نے ہی الاپا ہے۔

جس چیز نے زیادہ تر سعدی کے شعر میں جان ڈالدی ہے اور اس کو یہ رونق و جمال بخشا ہے۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ وہ اس کے طول و طویل سفر ہیں[3] جن کے باعث اس نے ہر ہر طبقے کے آدمیوں سے ربط و ضبط بڑھا کر اقسام اقسام کی معاشرتوں سے واقفیت بہم پہنچائی اور مختلف اقوام میں قسم قسم کے محاسن اور جمال و تناسب کے مظاہر کے مشاہدے کئے ہیں۔

سب سے آخر یہ بات قابل ذکر ہے کہ سعدی سر تا پا حکمت و تناسب کا نمونہ ہے

---

[1] ہم نے اس معنی کی کوئی چیز سعدی کی کتابون میں نہیں پائی۔

[2] عربی میں گلستان کا دو تین دفعہ ترجمہ ہو چکا ہے شاید مقالہ نویس اس سے ناآشنا ہے۔

[3] سعدی سفر کے فوائد کے متعلق کہتا ہے۔ تا بہ دکان خانہ در گروی۔ ہرگز ای خام آدمی نشوی۔

لوگ جب تک حکمت و تناسب کو دوست رکھیں گے سعدی کے والہ و شیدا بنے رہیں گے۔

۶۔ اس کا عرفانی مسلک

جو شخص گلستان کا سطحی نظر سے مطالعہ کرتا ہے وہ اپنی جگہ یہ تصور کر لیتا ہے کہ سعدی ایک عیاش اور شہوت پرست شخص تھا۔ ایسی صورت میں جب کہ اس کی حقیقت سوائے اس کے نہیں کہ اس نے اقوال کو شوخی و بذلہ سنجی کے ساتھ ملا دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے فلسفہ کو لوگوں کے قلوب میں داخل کر کے مقبولیت حاصل کی ہے۔ اس طور پر کہ کوئی طبیب کڑوی دواؤں کو شیریں اجزا کے ساتھ ترکیب دیتا ہے تاکہ اس کا علاج طبیعتوں کو پسند آجائے۔

سعدی اس ذات ذوالجلال سے عشق رکھنے والا عارف ہے جس نے اس مسلک کے بارہ میں برسوں جامع دمشق میں نہایت پر قیمت درس دئے ہیں۔ اس نے گلستان و بوستان میں اس لئے قرآنی تخم بوئے ہیں کہ اپنی شیریں عبارتوں اور حکایتوں کو کتاب مجید کی آیتوں کے ذریعہ دیدہ زیب بنائے۔ سعدی شخصی تدین میں متعصب اور خشک واقع نہیں ہوا تھا بلکہ اس کا عقیدہ یہ رہا ہے کہ حقیقت دین نیکوکاری اور بنی نوع انسان کی خدمت گذاری و محبت ہے نہ کہ تسبیح و سجادہ و دلق[51]

۷۔ اس کے اخلاق و اوصاف

سعدی بڑا سخی اور فیاض شخص تھا۔ اس طور پر کہ اس کی فیاضی اسراف کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ وہ بڑا خوش مزاج، خوش معاشرت شیریں زبان، بذلہ سنج، خوش طبع، وجیہہ، روشن روان اور پاک وجدان حریت خواہ اور صلح پسند مسلک کا شخص تھا! اس کی آزادی پسند طبیعت اس کے اکثر اشعار میں اپنی جھلکیں دکھاتی ہے۔ وہ اس بات کا معتقد تھا کہ جماعت انسانی کی تنظیم و اصلاح اصل (جڑ) ہے اور بادشاہ و رئیس بمنزلہ پتوں اور ڈالیوں کے ہیں[52] نفس الامر میں یہ لوگ بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے مقرر کئے گئے ہیں[53]

سعدی نہایت ذہین، طباع اور حاضر جواب تھا۔ اس باب میں اس کی جن حکایتوں کر

---

[51] عبادت بجز خدمت خلق نیست — بتسبیح و سجادہ و دلق نیست (بوستان باب اول)

[52] رعیت چو بیخ است سلطان درخت — درخت ای پسر باشد از بیخ سخت (" ")

[53] پادشہ پاسبان درویش است — گرچہ نعمت بفر دولت اوست
گو سفند از برائے چوپان است — بلکہ چوپان برائے خدمت اوست (بوستان باب اول)

نقل کیا گیا ہے ان کے منجملہ ذیل کی حکایت بیان کی جاتی ہے جس وقت وہ تبریز میں وارد ہوا ہے تو وہاں کے ایک شاعر نے پوچھا تو کہاں کا رہنے والا ہے؟ اس نے کہا "شیراز جنت طراز" کا! تبریزی نے کہا کہ تبریز میں شیرازی اس کثرت سے ہیں کہ ان کی تو تعداد کتوں سے بھی "بیشتر" ہے۔ سعدی نے کہا کہ مگر شیراز میں تبریزی کتوں سے بھی کمتر ہیں۔

۸- اس کی عمر کا آخری حصہ

سعدی نے اپنی عمر کے اواخر کو شیراز میں گذار کر اپنی سکونت کے لئے ایک مکان بستی سے دور کسی گوشہ میں تجویز کیا مختلف طبقے کے لوگ عموماً ہر طرف سے اس کی ملاقات کے لیے آتے بالخصوص ذی رتبہ بادشاہ اپنے سر نیاز کو اس کے آستانے پر جھکاتے اور نذرانے اور تحفے اس کے لئے لے آتے لیکن وہ بندۂ خدا سوائے کھانے کی چیز کے اور کچھ قبول نہیں کرتا۔ وہ بقدر سدّ جوع لے کر باقی کو زنبیل میں رکھ چھوڑتا اور اس کو کھڑکی میں لٹکا دیتا کہ فقرا اور مساکین آکر اس کو اٹھالیں۔ سعدی کی گوشہ نشینی و زہد کے خصوص میں ایرانیوں نے ایسی بہت سی حکایتیں نقل کی ہیں جن سے اس کی کرامات و تصرفات پر روشنی پڑتی ہے۔

۹- اس کی وفات

لوگوں کو سعدی کی عمر کے بارہ میں اختلاف رہا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ نوے سال تک جیا بعض بیان کرتے ہیں کہ سو سال تک اور ان کے سوا بعضوں کا یہ اعتقاد ہے کہ وہ اس سے بھی زیادہ۔ بہر صورت سعدیؒ نے دنیا سے رحلت کی اور ایک نہایت حسین و خوش مقام پر یعنی اسی جگہ پر جہاں اس نے اپنی عمر کا آخری حصہ گذارنے کے لئے سکونت اختیار کی تھی، مدفون ہوا۔ اور کثیر ادبی ثروت کو، جو ختم ہونے والی ہے، اپنی یادگار میں چھوڑا۔ اس کی روح نے مدتوں روئے زمین کو مہکا دیا تھا اس نے آسمان کی طرف پرواز کر کے بہشت برین کو بھی معطر کر دیا۔ سعدی وہ مرد کامل تھا جس نے اپنے عطر آگین پھولوں کو دنیا کے روبرو بکھیر دینے کے بعد اہل دنیا کو جمال و تناسب کی تلقین کی۔ اس نے حکمت کے ساگ ان کے گوش وجود تک پہنچا دیئے اور وہ وجود ہمیشہ ان کو دہراتا رہے گا۔ گلہائے سعدی ہمیشہ تر و تازہ رہیں گے اور خوشبو دینے والے ہیں اور اس کے روح پرور نغمے بھی ابد تک گراں بہا خزینہ اور مرغوب طبع رہیں گے!
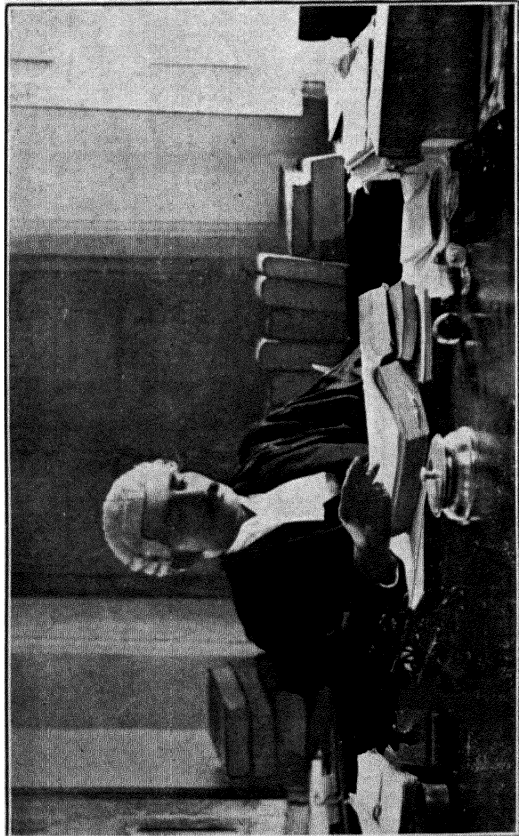
سید عسکری حسن اسکوئر۔ ایم۔ اے۔ بیرسٹر

کوئی ہم سے یہ پوچھے بے خودی میں کیا پایا
زیست کی ملی لذت وصل کا مزا پایا

دل کی آرزو دل میں رہ گئی ہوس بنکر
کھو کے اس کو پہلو سے خوب مدعا پایا

بے پتا نشان اس کا گم ہے آگہی اپنی
عقل کو بھی اس راہ میں کچھ نہ رہنما پایا

ہم نہ کہتے تھے دل سے ہے جفا شعار اس کا
پھر کوئی شکایت کیا جس نے جو کیا پایا

حسن و عشق یہ دونوں مجمع مظاہر ہیں
اس کو جا بجا دیکھا اس کو جا بجا پایا

عقل کا ہے کیا امکان منزل تجسس میں
اس کو جس قدر ڈھونڈا کچھ نہ یکذرا پایا

کیا ہوا کہ واعظ کو آج صحن مسجد میں
ہوش اڑا ہوا دیکھا دل گیا ہوا پایا

دیر میں حرم میں بھی جا کے جا بجا ہم نے
ڈھونڈھکر اوسے زاہد کیا کہیں کہ کیا پایا

ظلم کی گئی شوخی رحم آگیا اوس کو
در پہ اپنے اخگر کو یوں لہو بھر پڑا پایا

گولکنڈہ کا ایک قدیم ترین ادبی شہ کار

از

مولوی سید غلام محی الدین صاحب قادری زور یم اے

مولوی زور صاحب یورپ میں لسانیات کی تحقیقاتی تعلیم کے ساتھ اردو ادب اور بالخصوص دکھنی یا اردوئے قدیم میں جو مہتم بالشان ریسرچ فرما رہے ہیں اس سے ناظرین مکتبہ بخوبی واقف ہیں اور کسی مزید صراحت کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ آپ نے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کی نایاب مخطوطات اردوئے قدیم و جدید کے تحقیقی مطالعہ کے بعد ان کتب خانوں کے کٹلاگوں کی تصحیح بھی کی جس کو مستشرقین یورپ نے بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا۔ نیز آپ نے پیرس اور آکسفورڈ کے کتب خانوں میں دکھنی ادب کی نایاب مخطوطات کا جن سے اردو دنیا بالکل ناواقف ہے محققانہ مطالعہ کرکے اردوئے قدیم میں حیرت انگیز انکشافات فرمائے۔ انشاء اللہ آپ کی یہ معرکتہ الآراء ادبی تحقیقات قریب میں شایع کی جائیگی۔ ذیل کا مضمون مولانا وجہی کی مثنوی "قطب مشتری" پر آپ کی ایسی ہی فاضلانہ تحقیقات کا نتیجہ ہے۔ آج تک اس مثنوی کا اردو دنیا کو کوئی علم نہیں تھا۔ کٹلاگوں کے مطالعے ہی اس کتاب کا کوئی حال کسی کو معلوم نہ ہو سکا تھا۔ مولوی زور صاحب کی سعی مشکور سے نہ صرف نایاب اور نہایت ہی قدیم مثنوی دریافت ہوئی بلکہ قطب شاہی اردو ادب کے ایک گم شدہ شہ کار کا تفصیلی علم بھی عام ہو گیا۔ آپ نے اپنے ایک گرامی نامہ میں تحریر فرمایا ہے کہ یہ مضمون عدم فرصت کی وجہ سے سرسری طور پر لکھا گیا ہے۔ آپ آئندہ مزید تفصیل اور شرح و بسط کے ساتھ اس پر قلم اٹھانا چاہتے ہیں مگر ہمارے خیال میں بصورت موجودہ یہ مضمون مکمل اور کافی معلومات سے پُر ہے۔ یہ اردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ مولوی زور صاحب اپنے ہمہ معانی مطالعہ کے سوا اپنے ذاتی شوق یا درلود کی خدمت گذاری کے مخلصانہ جذبہ سے اپنی فرصت کا وقت ایسی اعلیٰ ادبی

مفید تحقیقات میں مصروف فرار ہے ہیں جامعہ عثمانیہ اپنے اس فرزند پر جس قدر فخر کرے بجا ہے۔

"مکتبہ"

وجہی گولکنڈہ کے نہایت قدیم اور اول درجہ کے ادیبوں اور شاعروں میں سے ہیں۔ دکھنی ادب کے قدردان ان سے ضرور واقف ہوں گے، کیونکہ ان کی نثر "سب رس" کے متعلق دو تین دفعہ مضمون شایع ہو چکے ہیں لیکن شاید ہی کوئی ہوں جنھوں نے ان کی مثنوی "قطب مشتری" کا ذکر سنا ہو۔ اس کو اردو زبان کی خوش قسمتی سمجھنا چاہئے کہ یہ اہم شعری کارنامہ زمانہ کی دست برد سے بچ گیا اور اس طرح اب ہم اس قابل ہیں کہ آج سے تقریباً ساڑھے تین سو برس پہلے کی اردو کی ایک ایسے زیادہ تصنیفوں پر زبان اور ادب دونوں کے لحاظ سے تحقیقی اور تقابلی نظر ڈال سکیں۔

(۲) سب رس اور قطب مشتری کا مصنف

قطب مشتری، جیسا کہ مثنوی کے آخری شعروں سے ظاہر ہے ۱۰۱۸ھ کی تصنیف ہے اور سب رس اس کے تقریباً ۲۷ سال بعد یعنی ۱۰۴۵ھ میں لکھی گئی۔ دو کتابوں کی تصنیف کے زمانوں میں اس قدر زیادہ فرق کا پایا جانا مصنف کے ایک ہی ہونے کے متعلق شبہ پیدا کر دیتا ہے لیکن یہ اس طرح دور ہو جاتا ہے کہ:-

(۱) "سب رس" کا وجہی، غواصی کا ہمعصر تھا کیونکہ "سب رس" کا سنہ تصنیف ۱۰۴۵ھ ہے اور "طوطی نامہ" اور "سیف الملوک" کے سنین تصنیف ۱۰۴۹ھ اور ۱۰۳۵ھ ہیں۔

(۲) "قطب مشتری" کا وجہی بھی اندرونی شہادتوں کے لحاظ سے غواصی کا ہمعصر تھا "قطب مشتری" کے حسب ذیل اشعار اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ کس طرح اس کا مصنف اپنے ایک ہمعصر غواصی کی طرف اشارہ کرتا ہے:-

جو لک برس کوئی سر لیوے رنج کون	بناوے کدھیں اس چھپے گنج کون
ہوا جیو جب شعر یو بولنے	خزینے لگیا غیب کے کھولنے
اگر غوطے لک برس غواص کھائے	تو یک گوہر اس دھات امولک نپائے
یو موتی نہیں وو جو غواص پائیں	یو موتی نہیں وو جو کس ہات آئیں

غواصان کئی غوطے کھا کھا کے کر — موے ہیں سو اس سمد میں آ کے کر
اپنے ہو کے لیا نا سو ہے جھوٹ سب — خدا غیب تھے دیوے تو کیا عجب
کہ ہنس نسنے تج سمد یک جائے تو — مرے ڈوب اِل سیر اُپر پانوں ہو (ورق ۶۹ ا)

(۳) ۱۰۲۱ھ میں ایک شخص وجہی زندہ تھا جو شاعر کی حیثیت سے مشہور تھا اور جو غواصی ہی کے ساتھ کا درباری شاعر تھا۔ اس کا ثبوت نظام الدین احمد کی اس اہم تاریخ سے ملتا ہے جو سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے عہد حکومت پر لکھی گئی ہے اور جس کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ اس میں ۱۰۲۳ھ میں بادشاہ کو لڑکا پیدا ہونے کے ذکر کی ذیل میں لکھا ہے۔

وجہی از شعرا تاریخہائے کہ یافتہ بودند بسامع جاہ و جلال خسرو یوسف جمال رسانیدند (زاں جملہ این سہ تاریخ مرقوم گردید۔ اول تاریخ کہ ملا وجہی شاعر دکنی یافتہ است ع "آفتاب از آفتاب آمد پدید" (۱۰۲۳ھ) و ملا غواصی کہ در شعر دکنی از مثال خود ممتاز است این حکم را مادہ تاریخ ساختہ است "محفوظ باد" (۱۰۲۳ھ) (ورق ۲۵ ب) یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ مورخ وجہی کو شاعر لکھتا ہے نہ کہ صرف انشا پرداز۔ پس سب رس کا وجہی شاعر بھی تھا۔

(۴) "سب رس" کے لکھے جانے کے پینتیس سال بعد یعنی ۱۰۸۱ھ میں گولکنڈہ کا ایک شاعر طبعی اپنی مثنوی "بہرام و گل اندام" کے دیباچہ میں ایک شاعر وجہی کا ذکر کرتا ہے جس کی اندرونی شہادتیں ثابت کرتی ہیں کہ وہ قطب مشتری کا وجہی ہے کیونکہ طبعی نے وجہی کے حسب ذیل اشعار

کہ فیروز آخواب میں رات کوں — دعا دے کے چومے مرے ہوت کوں
کھیا ہے توں یو شعر ایسا سدس — کہ پڑنے کوں عالم کرے سب ہوس
توں یوں کر کہ خصلت یو تج آئے تا (دکھتا) — کہ توں خوش رچے ہور کسے بھائے تا
توں ایسی طرز دل تے نیجا؟ انوی — کہ دسرے کریں سب تری پیروی (ریجے)
وجہی تسا ذہن جوں برق ہے — تجے ہور بعضیاں میں کئی فرق ہے
ترا شعر سن دل لگتا ہے یوں — کہ پانی تھے ابلوج گلتا ہے جیوں
توں وجہی کھیا شعر کئی دعات کا — ہوا زیارت تجہ تے فرابات کا
شعر بونا گرچہ اپر دب سہے (دکھیا) — ولے جانا کہنے کے خوب ہے (ورق ۹۶۹) (دفہمنا)

کی تقلید میں اپنی مثنوی میں اس طرح ہی مطالب کو ادا کیا ہے:۔

لگیا میں جو یو مثنوی بولنے   یو موتیاں کچل ڈھال یو رولنے

یو وجہی مرے خواب میں آ کر   کہ اپنا سورج ناز کھلائے کر

سراسر سپنا جو مری مثنوی   کیا بات طبعی ہے تیرا لسانی

ہو خوش حال سن کر یو باتاں مرے   اپس کے لے باتاں میں باتاں مرے

پڑے پیار سو آپنا یو مثل   سپنا سو پڑیا خواب ہے میں اچھل

پھر اسی سلسلہ میں وجہی کے حسب ذیل اشعار بعینہ اپنے ہاں نقل کرتے ہیں:۔

کہتا ہوں سنو کان دھر لوگ ہو   کہاوت منے بات ہو آئے سو

اگر شعر کوئی خوب کہہ کر جو لائے   تو خوباں کو دو بس اشک البتہ آئے

کیس کوں سو یک دیک سکتے نہیں   کیس کوں سو یک مان رکتے نہیں

اگر کچھ کہیے تو کدھر کا کدھر   کہے تو کتے ہیں اسے ہیچ کر

ارانی (؟) ہیں اسکوں جیوں ڈھیر تھے   فضیحت کریں پا لونگ سیر تھے

اگر خوب جو بولے تو دوں رہے   وگر جو برا بولے تو یوں اہے

اگر وجہی نام کے دو ادبی آدمی گذرے ہوتے تو طبعی اس قدر سادگی اور بے پروائی کے ساتھ اپنے منظور نظر شاعر کا ذکر نہ کرتا۔ وہ سب رس کے وجہی اور قطب مشتری کے وجہی میں امتیاز کرنے کا ضرور خیال رکھتا۔

(۵) یوں بھی اس بات کو عقل نہیں مانتی کہ اس قدر کے قریب کے زمانہ میں ایک ہی دربار کے دو شاعر ایسے گذر سکتے ہیں جن کا تخلص ایک ہی ہو!

ان دلیلوں پر غور کرنے سے یہ نتیجے نکلتے ہیں کہ:۔

(۱) سب رس اور قطب مشتری دونوں کا مصنف ایک ہی شخص تھا جس کا تخلص وجہی تھا۔

(۲) وجہی نے ابراہیم قطب شاہ (۹۵۷ھ تا ۹۸۸ھ) کا زمانہ دیکھا تھا۔ اور ممکن ہے کہ اسی وقت سے شاعری بھی شروع کر دی ہو۔ کیونکہ قطب مشتری بالکل وضاحت کے ساتھ ثابت

---

۱ قطب مشتری میں یہاں "جو" ہے۔ ۲ قطب مشتری میں یہاں "آپس میں اپنے" ہے ۳ قطب مشتری میں یہاں "کوچ"
۴ 〃 〃 〃 "کہہ لوا گر" ہے ۵ 〃 〃 "دو کا" ہے۔ ۶ "کا کچھ کدھر کا کدھر" ہے

کرتی ہے کہ اس کا مصنف ایک مشاق اور مشہور شاعر ہے۔ اگر ابراہیم کی وفات اور محمد قلی کی تخت نشینی کے وقت (یعنی ۹۸۸ھ میں) اس کی عمر ۱۵ سال کی فرض کی جائے تو قطب مشتری کی تصنیف کے وقت (یعنی ۱۰۱۸ھ میں) وہ ۴۵ سال کا اور سب رس کی تصنیف کے وقت (یعنی ۱۰۴۵ھ میں) ۷۲ سال کا تھا۔

(۳) غواصی نے بھی محمد قلی قطب شاہ کے زمانہ ہی سے شاعر کی حیثیت سے چمکنا شروع کر دیا تھا۔ اور اس کا زمانہ پیدائش بھی وجہی کے قریب ہی ہوگا۔ یہ بہت ممکن ہے کہ غواصی، وجہی سے عمر میں بہت چھوٹا ہو کیونکہ اگر اس کی بھی عمر ۱۰۴۵ھ میں ۷۲ سال کی ہوتی تو وہ غالباً اس قدر ضعیف العمری میں قطب شاہی دربار کے ایلچی کی حیثیت سے بیجاپور کا سفر نہ کر سکتا، جس کی نسبت اس مضمون میں آئندہ ذکر کیا جائے گا۔

(۴) وجہی نے اس قدر شہرت حاصل کر لی تھی کہ اس کی وفات کے شاید پچیس برس بعد بھی ایک شاعر اس کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے خواب میں آکر تعریف کرنے کو اپنی شاعری کی خوبی و عمدگی کے لئے سند سمجھتا ہے۔

(۳)

وجہی کی زندگی

وہ غالباً ابراہیم قطب شاہ کے عہد حکومت میں پیدا ہوئے اور کم عمری ہی سے شاعری شروع کر دی ان کی نشو و نما اس زمانہ میں ہوئی جب کہ گولکنڈہ میں اردو ادبیات کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور غالباً چند اچھے شاعر بھی پیدا ہو چکے تھے۔ خصوصاً جب انھوں نے قطب مشتری لکھی عام طور پر اردو شعر و شاعری کا چرچا ہو چکا تھا اور کئی شاعروں سے وجہی کی چشمک بھی تھی جس کے متعلق ان کے ان شعروں سے کچھ اندازہ ہو سکتا ہے جن کو طبعی نے اپنی مثنوی کے دیباچہ میں داخل کر لیا تھا اور جو اوپر پیش کئے جا چکے ہیں۔ لیکن اس زمانہ کی علمی و ادبی فضا کے متعلق وجہی کے کلام سے اور جو روشنی پڑتی ہے اس کے ظاہر کرنے کے لئے ہم قطب مشتری سے چند اور انتخابات یہاں پیش کرتے ہیں۔

اپنے ہمعصر عام شاعروں کی نسبت وجہی کی یہ رائے تھی کہ:۔

یو سب شعر کہتے یو سب شعر نین — کہ یولان کدہر ہور معنی کہیں

شعر گرچہ پیے لوگ جوڑے اہیں (نہیں) — بُرے بھوت ہور خوب تھوڑے اہیں

ایک جگہ اپنے (دیئے) کلام کا دوسرے شاعرون کی شاعری سے مقابلہ کرتے ہیں۔ اور اس میں اپنی خوبیاں بیاں کرتے وقت اس بات پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں کہ خود ان کی شاعری اچھی ہے انہوں نے کسی اور جگہ سے اپنا مضمون اور خیالات اخذ نہیں کئے۔ اس کے برخلاف ان کے ہمعصر دوسرے جو ممنون منت تھے۔ وہ اپنی ذات سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ اس بات سے ان کا اشارہ غالبًا فارسی کے ترجمون کی طرف ہوگا۔ وجہی یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ اگر اب آگے کوئی شاعر اچھی کتاب لکھے بھی تو اس کو کوئی فخر نہیں حاصل ہو سکتا کیونکہ ایسے کام کی ابتداء کا سہرا تو صرف انہی کے سر رہے گا۔ بعض شعر یہ ہیں

دو جگ جس تمہ ہیرے کا مول ہے — (دو) ہیرا سو ہر ایک مرا بول ہے

رتن بے بدل یو مرے جاں (جہاں) لگائیں — وہاں چاند سورج دلائی نہ پائیں

یکن موتی یو دیک پنت لا بجتے — سمد پانی گل کر ہوا لاج (سے) تیے

جکوئی جوہری (دیکھکر) ہے سو پچھان کر — منگلے گا رتن کوں قدر جاں کر

پہ کہ دیک (جو کوئی) توں کانچ ہور پانچ کون — برابر نہ کر دود ہور چھاچ کون

بہا اک نیں کانچ ہور پانچ کون — لذت دیک ٹک دود ہور چھاچ کون

جہان پانچ اچھے گا وہاں کانچ کیا — جہاں دود اچھے گا وہاں چھاچ کیا

نہ یو بات ہر ایک کے سات ہے — جکوئی عارف ہے اس کون یو بات ہے

تو پہل چاک دیک ہور لذت کون نام — نکر بول سب کا سنگٹ تین دام

جو کرتا کیس کا ہنر دیک (ہنر) کر — ہنر وند اسے پن کہتے ہیں مہر

نواول تے لیا نا ہے مشکل (دیکھ) کنا — کہ آسان ہے دیک (نہیں دیکھنے) کر بونا

جو کوئی یوں کرے اس میں کچ (دیکھنا) فام مین — ہنر دیک سکتا بڑا کام مین

ہنر وند اسی کوں (فہم نہیں) کہیا جائے گا — جو کوئی اپنے دل (سے) تے نوا لیائے (لائے) گا

فرق ہے (دکھا) اول ہور آخیر میں — تفاوت اہے نیر ہور شیر میں

ہنر دیک سکتا ہے استاد کا — فہم جو ہے آدمی زاد کا

اسی سلسلہ میں وہ اس کا بھی اظہار کر دیتے ہیں کہ میں اپنے کلام کو ناحق ترجیح نہیں دیرہا ہوں بلکہ میں اپنے ہنر کی باریکیاں اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ لوگ انصاف سے کام لین۔ اور کسی کی تعریف یا طرفداری خواہ مخواہ نہ کریں۔

ہنر کیان ہیں یو باریکیاں لاف نین	وو ادمی نہیں جس میں انصاف نیں
کہ انصاف (کی جیع) دیوے وہی (نہیں) است ہے	کہ انصاف طاعت تے بی زیاست ہے
نکر بات تون نا سمجھ امنا	بہوت مشکل ہے بات کوں (بھی) فاہنا (فہمنا)

اسی سلسلہ میں حسب ذیل شعر بھی آتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعرون کی ذاتی کشمکشیں کہاں تک انہیں پریشان رکھتی تھیں نیز یہ کہ انہیں بعض وقت سرے سے شاعری ہی ترک کر دینے کا خیال پیدا ہوتا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

ہوا شعر کا اس وصنعا کام جب	تو اب شعر لکھنا بھی کیا سبب
دلے جیو رھتا نین (وضع) کہے اج یو	عجب سرکش ہے اپخو وی راج لیو
شعر خوب کہو کر جو لیا (نہیں) تا ہے	اپس پر بلا ایک بسانا ہے
ہنر میں ہنر کوی جو تا نین	ترک کرنے گئے تو بھی ہوتا نیں
یو بلوند بخن اس میں بل بہوت ہے	سبھے تھوڑی لوگاں میں جہل بہوت ہے

وجہی نے غالباً کسی شاعر کی شاگردی نہیں کی۔ کیونکہ انھوں نے اپنے ہمعصرون پر جو چوٹ کی ہے اس سے کچھ اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ وہ شاعری میں کسی کو استاد نہیں مانتے تھے۔ تاہم انہوں نے اپنے دیباچہ میں دو اردو شاعرون کے نام پیش کئے ہیں جو اس وقت زندہ نہیں تھے لیکن ان کی وہ عزت کرتے تھے اور انہیں اس قابل سمجھتے تھے کہ ان کے ذریعہ سے اردو شاعری کو بہت رواج ہوتا نیز یہ کہ صرف وہ دونو ہی ان کی نظرون میں بڑے شاعر تھے اور ان کے علاوہ جتنے شاعرون کو وہ جانتے تھے یا جو اس وقت موجود تھے وہ ان کے ہاں بالکل ہیچ تھے وہ لکھتے ہیں:۔

کہ فیروز محمود اچھتے جو آج	تو اس شعر کون بہوت ہوتا رواج
کہ نادر تھے دونو ہی اس کام میں	رکھیا نیں کنے بول اچھوں فام میں

فیروز اور محمود کی شہرت (بھی) اور ان کے اردو ذوق ادب کی نسبت ہمیں ایک اور دکھنی (دکھنی نے) شاعر کے ذریعہ سے بھی علم حاصل ہوتا ہے۔ ابن نشاطی نے پھول بن کے خاتمہ میں جہاں چند متوفی اردو شاعرون اور

قدردانوں کا ذکر کیا ہے ان دونوں کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ پھول بن کے حسب ذیل شعروں سے فیروز اور محمود کے اوصاف کے متعلق ناظرین کی معلومات میں ضرور کچھ اضافہ ہوگا۔

نہیں دو کیا کروں فیروز استاد ۔۔۔ جو دیتے شاعری کا کچ بڑی داد
(وہ)

رہے صد حیف جو نیں سید محمود ۔۔۔ کتے پانی کوں پانی دود کوں دود
(نہیں) ۔۔۔ (کہتے)

(مخطوطہ انڈیا آفس ورق ۱۴۱)

قطب مشتری میں وجہی نے ابراہیم قطب شاہ کی اس طرح تعریف کی ہے کہ گویا وہ تصنیف کے وقت زندہ تھے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:-

ابراہیم قطب شاہ راجا دہراج ۔۔۔ شہنشاہ ہے شاہ شاہاں مں آج
عدل بخشش ہور داد اس تے اچھے ۔۔۔ سدا خلق سب شاد اس تے اچھے
جتے بادشاہاں ہیں سنسار کے ۔۔۔ بھکاری ہیں سب اس کے دربار کے
(جتنے)
سلیمان تے فاضل ہے اس تخت بل ۔۔۔ پڑے دیو جن سب ہیں اس حکم تل
اسی شاہ عادل کے غصہ تے ڈر ۔۔۔ لیا ہے گگن کوں پون پیٹ پر
یتا بل ہے اس عدل کے فن منے ۔۔۔ کہ بجلیاں کھڑیاں کا نپتیاں کھن منے
(اتنا)

لیکن اس کو دیکھ کر یہ سمجھ لینا فی الحال خلاف تحقیق ہوگا کہ وجہی نے ابراہیم کی زندگی ہی سے یہ مثنوی لکھنی شروع کر دی تھی۔ (دوغیر نقطی) تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ محمد قلی قطب شاہ کی تخت نشینی کے ساتھ ہی چمکنے لگے ہوں گے۔ اور چونکہ بادشاہ خود دکھنی زبان کے شاعر تھے ان کی رسائی بھی دربار میں بہت جلد ہوگئی ہوگی۔ مثنوی قطب مشتری جس موضوع پر لکھی گئی ہے خود وہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ کوئی شاعر خود بادشاہ سلامت کو ہیرو بنا کر اس وقت تک کوئی عشقیہ قصہ نہیں لکھ سکتا جب تک کہ بادشاہ اس کے ساتھ غایت درجہ مانوس نہ ہوگئے ہیں۔

قطب مشتری کی تصنیف کے وقت وجہی کی شہرت اور مقبولیت یقیناً عروج حاصل کر چکی تھی اگرچہ اس وقت کئی شاعر موجود تھے، اُن میں سے بہت سوں نے متعدد قصے بھی نظم کئے، لیکن ان سب کا وجہی جس حقارت سے ذکر کرتے ہیں۔ وہ شاہد ہے کہ دربار میں کوئی ان کے پلے کا نہ تھا اگر ان کے سوا ایک بھی بادشاہ کا منظور ہوتا تو وجہی تمام شاعروں کی اس طرح بے دھڑک مذمت کرنے کی ہرگز جرات نہ کرتے۔

اور غالباً یہی غیر معمولی قدر و منزلت اور احساس یکتائی ہوگا جس نے انہیں ایک حد تک خود ستا اور مغرور بھی بنا دیا تھا۔ اگرچہ اکثر جگہ ان کی خود ستائی حق بہ جانب بھی معلوم ہوتی ہے لیکن اس قسم کے شعر قطب مشتری کے دیباچہ میں اس کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ ایک سرسری مطالعہ کرنے والا ان کو پڑھ لینے کے بعد وجہی کے اخلاق کے متعلق اول اول کوئی اچھی رائے نہیں قائم کر سکیگا۔ ان کی خود ستائیوں کے بعض نمونے یہ ہیں :-

(۱) نہ پہنچے نہ پہنچیا ہے گن گیاں میں | سو طوطی منج ایسا ہندوستان میں
کہ باتاں یو سن کر مرے گیان گیان | رصیان تھک ہو قرباں خاصطا گیان
جتے شاعران شاعر ہو آئیں گے | سو منج تے طرز شعر کا پائیں گے

(۲) نہ منج کیے بڑائی نہ منج لاف ہے | ولے عارفاں پاس انصاف ہے
دکھن میں اتھا کئی طرح ہور میں | دیا یوں سلاست کو بھی زور میں

(۳) جتے عقل و دڑاے انداز سون | کیا نین کنے بات اس ناز سون
(دیکھنے) نہ کین و یک کر کس تے پایا ہوں میں | (نہیں) (دکھنی) تو تازا طرح دل تے لیایا ہوں میں
جکوی فہم میں ٹک فہیاں رہیں | سو دو سر یاں کے دو خوشہ چیناں رہیں
اگر ٹک جو دو ڈرن لبند وھاون کوں | اٹر دن جگ کون سب باند کرپاؤں کوں

(۴) اگر کس تے تل خاص کچ جانتا | اسے دل میں استاد کر مانتا
ہنر ہے ہنر اس دنیا کس تے | نکر سے قدم کوں انگے اس تے
(دو منیٰ) اگر کوئی گیانی چتر گیان ہے | یدے یا نچ گو یا نچ میدان ہے
دکھن میں جو دکھنی مٹھی بات کا | ادا نین کیا کوئی اس دھات کا
ادا یوں اتال ہوے تو کیا عجب | کہ عالم سینا ہے یو جو بھیر سب
جو عاقل ہے یو بات مانے وہی | قدر اس ادا کی پچھانے وہی
دیوانا ہوں میں اس رنگی بات کا | کہ ہر دل میں جیو مھکرے ٹھار آ
کہاں بات و دیچپل ہوا چلبلی | کہ دل کوں نمواں سوں کر گدگدی
مری بات سن بات اس دھات بول | کہ جیو کون خوشی ہو دل کوں کھول
یو نہ مول ہے بات اسے بول نین | ہر یک بول ہے وحی یو بول نین

سخن گو وہی جس کی گفتار تھے — او چل کر پڑے آدمی ٹھار تھے
یو بولیا ہوں سب گنج نارنج ہے — اجھوں میرے دل میں بہت گنج ہے
جو لک برس کوئی سر لیوے رنج کون — نپاوے کدیں اس پچھے گنج کون

اظہار خود نمائی اور ہمعصر شاعروں کی عام تحقیر کے باوجود یہ ضرور ہے کہ وجہی غواصی کی بڑھتی ہوئی شہرت اور شاعری سے غافل نہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس شخص کے مقابلہ میں زیادہ زمانہ تک ٹکے رہنا آسان کام نہیں ہے۔ اگرچہ انہوں نے حتی الامکان اس بات کی کوشش کی کہ اپنے ملامتی تیروں کا اصل نشانہ غواصی ہی کو بنائیں لیکن ان کی ہمت نہ ہوئی کہ صاف صاف ان کا اور ان کے کارنامے کا (جو غالباً کسی فارسی قصہ کا منظوم ترجمہ ہوگا) مضحکہ اڑائیں۔ انہوں نے غواصی کی نسبت جن اشعار میں اشارہ کیا ہے وہ پیش کئے جا چکے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ وجہی کی قدر و منزلت کی معراج اور ملک الشعرائی محمد قلی ہی کے دم کے ساتھ تھی۔ محمد قطب شاہ (۱۰۲۰ھ تا ۱۰۳۵ھ) کے پندرہ سالہ زمانہ کی درباری قدردانیاں ابھی تک نامعلوم ہیں لیکن عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے عہد کے حالات ظاہر کرتے ہیں کہ اس وقت غواصی نے وجہی کو پیچھے ہٹا کر خود ان کی جگہ حاصل کر لی تھی۔ اگرچہ وجہی بھی دربار میں موجود تھے تاریخی قطعے اور قصیدے لکھا کرتے تھے اور موقع بموقع بادشاہ کی عنایتوں سے سرفراز ہوا کرتے تھے لیکن ان کے کم عمر مد مقابل غواصی کی شہرت اور شاعری نے ان کی قدیم عظمت پر نقاب ڈال دیا تھا۔ اس کے ثبوت میں اس زمانہ کے مورخ نظام الدین احمد کا وہ بیان پیش کیا جا سکتا ہے جس میں ایک ہی جگہ وجہی اور غواصی دونوں کا ذکر کیا گیا ہے لیکن غواصی کی زیادہ تعریف کی گئی ہے اس بارے میں خود نظام الدین کے الفاظ پیش کئے جا چکے ہیں۔

اس امر کا ایک اور ثبوت نظام الدین احمد ہی کے بیان کردہ ایک دوسرے واقعے سے ملتا ہے۔ یہ واقعہ ملا غواصی کو بیجاپور کے دربار میں ۱۰۴۵ھ میں ایلچی بنا کر روانہ کرنے سے متعلق ہے۔ اور جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۰۴۵ھ میں عادل شاہ نے اپنے دربار کے ایک مشہور شاعر ملک خوشنود کو (جن کی مثنوی کا میں نے مکتبہ ہی کے ایک مضمون میں ذکر کیا تھا) گولکنڈہ روانہ کیا تھا تاکہ عبداللہ قطب شاہ کی اس مدد کا محمد عادل شاہ کی جانب سے شکریہ ادا کریں جو خواص خاں کو بیجاپور کی حکومت سے بے اقتدار کرنے کے لیے روانہ کی گئی تھی۔ ملک خوشنود کی عبداللہ نے خاصی قدر و منزلت کی اور جب وہ واپس

ہونے لگے تو ان کے ساتھ غواصی کو بھی بیجاپور تک روانہ کیا جس کا ذکر خود مورخ کے الفاظ میں یہ ہے۔

"بعد از یک چندے ملا غواصی شاعر دکنی را رفیق او رساختہ با تحفہ و یادگار روانۂ بیجاپور ساختند و بعد از قتل خواص خاں...... حضرت عادل شاہ میرزین العابدین پسر شاہ ابوالحسن حاجب تعلیمی را ہمراہ ملا غواصی شاعر نمودہ دو زنجیر فیل بزرگ و شش راس اسپ عراقی و دو صندوق مقفل از تحف و ہدایا ارسال داشتند و مشارٌ الیہما بشرف بساط بوسی مشرف و سرفراز شدند"

(دیکھو حدیقۃ السلاطین مخطوطہ برٹش میوزیم ورق ۲۶۹ ب)

ان دو تو تاریخی بیانات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت غواصی کی زیادہ قدر و منزلت کی جاتی تھی حالانکہ وجہی زندہ تھے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ غواصی کی ترقی اور وجہی کی کم قدری کرنے میں موخر الذکر کی طویل عمری نے بھی کوئی حصہ لیا ہو۔

(۴)

وجہی کی شاعری

وجہی کئی باتوں کے لحاظ سے دکھن کے ایک واحد ادیب ہیں۔ ان کا موضوع خود انہی کی دماغی پیداوار ہے۔ ان کو اس بات پر فخر تھا کہ انہوں نے اور شاعروں کی طرح دوسروں سے مضمون اخذ نہیں کیا۔ دوسری زبانوں سے ترجمہ کرنا یا دوسرے مضمون کو ماخذ قرار دینا ان کی نظروں میں چوری اور دغا بازی جیسا جرم تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے موضوع کے اپچی ہونے اور دوسروں کی تصنیفات کے ماخوذ ہونے کی نسبت جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان کو اوپر نقل کر دیا گیا ہے۔

وجہی وہ خوش قسمت شاعر ہیں جن کے کلام سے نثر اور نظم دونوں کا نمونہ اس وقت موجود ہے اور حسن اتفاق سے دونوں ان کی ادبی قوتوں کے بہترین ثبوت ہیں۔ ان کی نثر "سب رس" کی خوبیوں سے اہل ذوق ناواقف نہیں اور ان کی نظم "قطب مشتری" کی خصوصیات کی نسبت اگرچہ اس مضمون میں کوئی تفصیلی بحث نہیں کی جا سکتی تاہم جو کچھ لکھا گیا ہے اور اس کے جتنے شعر پیش کئے گئے ہیں ان کے مطالعہ سے بھی ایک حد تک ضرور اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

وہ اس لحاظ سے بھی گولکنڈہ کے ایک واحد بڑے شاعر ہیں کہ اقسام نظم میں سے ان کی صرف مثنوی ہی نہیں بلکہ غزل اور رباعیوں کے بھی چند نمونے قطب مشتری میں موجود ہیں جن کا مطالعہ واضح

کرتا ہے کہ وہ دراصل دکھن کے ایک اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔ ان کی اکثر غزلیں شروع سے آخر تک ایک ہی مضمون پر لکھی گئی ہیں جس کی وجہ سے ان میں زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ ان میں بالعموم جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے اور ان کا اسلوب نہایت پاکیزہ اور فطری ہے۔ ان میں تکلف اور رسمی خیالات کو کوئی دخل نہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اول اول اردو شاعروں نے ہندی شاعری کی تقلید شروع کی تھی۔ اور یہ کہ اگر وہ اسی پر قائم رہتے تو شاید ان کی شاعری آج کسی دوسرے ہی رنگ میں ہوتی۔ وجہی کی غزلوں اور رباعیوں کے نمونے یہ ہیں:—

(۱)
پیو ملنے کوں نکل آج میں لس پینے دیکھی سو کر — جب پیو چلیا ساٹ منج تب سوتے اٹھی رو کر
ہاتھ بڑھا اپنا سار نے منج چل چل لگیا مارنے — نا جاؤں سائیں کارنے نبی اچنوں کیا کیا ہو کر
نا پوچھوں بہن جو سے کب ملنا پیو سوں ہو سے — غم برہا سب ہیں ہوسے نا جانے دکھ یو کو کر
کیوں نا لوں ہا جیال سکی نیں سکتی ہوں سنبھال سکی — اب سوں کر یاد لال سکی جو بیٹھی ہت نے کھو کر
یکتا ئیں سہیلی مرنا دل وجہی پر نا دھرنا — اس پیو کوں اپنا کرنا اس جاپی جیو یوں کھو کر

(ورق ۷۳-ب)

---

(۲) چلو نا جائیں اے سہیلیاں ہمارا لال جاں (جہاں) اچھتا — وے کوئی جانتا نیں ہے کہ بھوندو وو کہاں اچھتا
نشان نیں بے نشاں ہے وو نشاں سکا نہ کوئی منج کوں — سکی اڑ جائیں پنکی ہوا گر اس کہیں نشان اچھتا
وو تن کی بول ری سب ساری اے باد (دگاہا) چپ رہ — اگر تجہ کام ہے تو کہہ مراد و پیو (دکھیں) کان اچھتا
کسی ہیراں نت دیوں سیرا کھلے اب بخت کیوں میرا — نہ ہوتا حال یوں میرا اگر وو مہرباں اچھتا
ہوئے لب خشک نیناں تر کہے جگ منج عاشق کر — کہ مستی ہور نیہ ہور چھپ سکی یو نیں (ہیں) نیاں اچھتا

(ورق ۷۴-ب)

(۳) طاقت نہیں دوری کی اب توں بیگی آ مل رے پیا — تج بن منجے جینا بہوت ہوتا ہے مشکل رے پیا
کھانا برہ کیتی ہوں میں پانی انجھو پیتی ہوں میں — تج تے بچھڑ جیتی ہوں میں کیا سخت ہے دل رے پیا
ہر دم توں یاد آتا منجے اب عیش نیں بھاتا منجے — برہا یو ستاتا منجے تج باج تل تل رے پیا
منجین ہیش طالبے تھیں منج شمار بھولا نے نہیں — منج دل تدبیر بہانے نہیں کیتا ہے منزل رے پیا
تو جیو میرا ہیں ہو دل تج سات رہنا کیوں نہ مل — دن رات میں ہیں ایک تل میں تج تے غافل رے پیا

(ورق ۱۰۷-الف)

رباعیوں کے نمونے

(۱) خوشحال ہو جیو آج خوشی پاتا نہیں — پیتا ہوں شراب ہور اثر آتا نہیں
کا نیڈیا کے غرب ڈستے ایں پھل سب — تج باج سکی باغ ہنجے بھاتا نہیں

(۹۷-الف)

---

(۲) تج یاد بنا ہور ہنجے کام نہیں — نس جاگتے جاتی ہے دن آرام نہیں
میں تو تجے منگتی ادکہ جیو ویلے — توں کیوں ہنجے منگتا ہے سوچ فام نہیں

(۱۰۸-الف)

دنیا کے سو لوگاں ہیں وفا دستا نیں — دھند دیکھے جفا باج جفا دستا نیں
بے مہر بنی آدم ہے اس سوں اسکی — دل باندنے میں کچ نفا دستا نیں

(۱۱۱-الف)

وجہی کی متفرق اقسام نظم کے نمونوں کے بعد دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اگر شعر و شاعری کے متعلق ان کے ذاتی خیالات بھی پیش کر دئے جائیں۔ ذیل کے شعروں سے نہ صرف یہ معلوم ہوگا کہ وجہی کا معیار شاعری کیا تھا بلکہ یہ بھی کہ آج کے اور آج سے ساڑھے تین سو برس پہلے کے اردو شاعروں کے ذوق میں سیکڑوں سیاسی اور لسانی تبدیلیوں کے بعد بھی کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

کتا ہوں تجے پند کی ایک بات — کہ ہے فائدا اس تے دھات دھات
جو بے ربط بولے تو بتیاں پچیس — بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس
سلاست نہیں جس کگڑی بات میں — پڑیا جائے کیوں جز لیکر ہات میں
جسے بات کے ربط کا فام نیں — اسے شعر کہنے سوں کچہ کام نہیں
نکو کر توں بے بولنے کا ہوس — اگر خوب بولے تو یک بیت بس
دو کچ شعر کے فن میں مشکل اچھے — کہ لفظ ہور معنی یو سب مل اچھے
اسی لفظ کوں شعر میں لیائیں توں — کہ لیا یا ہے استاد جس لفظ کوں
اگر فام ہے شعر کا تج کوں پسند — سچے لفظ لیا ہور معنی بلند
رکھیا ایک معنی اگر زور ہے — ولے بھی مزا بات کا اور ہے

اگر خوب محبوب جیوں سور ہے — سنوارے تو نور علیٰ نور ہے
اگر لاکھ عیباں اچھے نار میں — ہنر ہو وسے خوب سنگار میں
ہنر مشکل اس شعر میں بوج ہے — کہ تھوڑے اچھیں حرف معنی سو کئے
۳ دیوانا ہوں میں اس رنگی بات کا — کہ ہر دل میں جیو ہو کرے ٹھار آ
کہاں بات وہ چنچل ہور چلبلی — کہ دل کوں سنواں سوں کرے گدگلی
۴ سخن گو وہی جس کی گفتار تھے — اچھل کر پڑے ادمی ٹھار تھے
نکو ابرال معنوں توں ہور کا — کہ کالا ہے دو جگ میں ہوں چور کا
جتا چوری کر چور اپیے سا ہوئے — دغا باز اچکے کوں مانے نکوئے
چھپا کر چراتا نہ کہیے چور کوئی — یو باتاں نہ سمجھتے سو ہیں ہور کوئی

"قطب مشتری" کا قلمی نسخہ انڈیا آفس لندن کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ پاکیزہ نستعلیق قلم سے لکھا گیا ہے مثنوی تقریباً دو ہزار شعر پر ختم ہوئی ہے۔ اور اس کے آخری شعر جن میں تاریخ تصنیف اور اس کا نام وغیرہ بیان کئے گئے ہیں حسب ذیل ہیں:-

قطب مشتری میں جو بولیا کتاب — سو ہوی جگ میں روشن کہ جیوں آفتاب
اول ہور آخر کے کاماں پچھان — دنیا میں رکھیا ہوں میں اپنا نشاں
نشانی رکھے باج چارا نہیں — کہ دائم کوئی رہنہارا نہیں
سنار ہو کے سنتے کے نقشاں گھڑیا — تن معنی چن چن دتن پہ جڑیا
جنے شعر بولیا اسے کیا ہے غم — کہ جیتا رہے ناؤں اس جگ میں جم
تمام اس کیا دیس بارہ منے — سنہ یک ہزار ہور اٹھارا منے

(ورق ۱۲۱ الف)

میں مثنوی کے قصہ کا پلاٹ طوالت کے خوف سے یہاں نہیں بیان کر سکتا۔ انڈیا آفس کے مرتب کیٹلاگ نے جنہیں مثنوی اور اس کے مصنف کے ناموں کا پتہ نہیں چل سکا اس کا مختصر سا پلاٹ نقل کیا ہے جس کے دیکھنے سے اس ادبی شہ کار کی کم از کم نوعیت معلوم ہو سکتی ہے۔

اس مضمون کو ختم کرنے کے وقت میں اپنے ہم وطن جوشیلے دوستوں کی تواضع کے لئے وجہی کے چند ایسے اشعار پیش کرتا ہوں جن کے مطالعہ سے وہ ضرور محظوظ ہوں گے۔

دکھن سا نہیں ٹھار سینسار میں — پنچ فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں
دکھن ہے نگینا انگوٹھی ہے جگ — انگوٹھی کوں حرمت نگینا ہی لگ
دکھن ملک کوں دھن عجب ساج ہے — کہ سب ملک سر ہور دکھن تاج ہے
دکھن ملک بہوتیچ خاصا رہے — تلنگانہ اس کا خلاصہ رہے

(ورق ۱۱۵ ب)

رباعی

حضرت صفی اورنگ آبادی

تکلیف کا رنج ہو نہ راحت کی خوشی
عسرت کا ملال ہو نہ عشرت کی خوشی
سب ایک سا ہے سمجھ تو اپنا کر لے
دوزخ کا ہو غم نہ ہو جنت کی خوشی

فریادِ اشک

از

جناب محمد جلال الدین صاحب اشکؔ بی اے

شاہدِ صبح کے انداز دکھانے والے — قلزمِ عیش کی موجوں کے اٹھانے والے
بادۂ عشق کے خم خانے لٹانے والے — بزمِ قدرت میں نئے رنگ جمانے والے
چاہتا ہوں کہ سناؤں تجھے فریاد اپنی
کیوں ہوئی بند سکون ہمت آزاد اپنی

عہدِ طفلی ہی سے جنگل کا تمنائی ہوں — بزمِ قدرت کے تماشوں کا تماشائی ہوں
ایک مدت سے میں آوارہ و سودائی ہوں — دشتِ پرخار کے کانٹوں کا تولائی ہوں
عمر گذری ہے میری بادیہ پیمائی میں
عتبۂ شاہدِ قدرت کی جبیں سائی میں

لذتِ دشت نوردی سے خبردار ہوں میں — حسنِ فطرت کے کرشموں کا طلبگار ہوں میں
شاہدِ صبح کی صورت کا پرستار ہوں میں — ساحتِ دشت کے شایاں ہوں سزاوار ہوں میں
راحتِ گوشۂ صحرا کوئی مجھ سے پوچھے
لذتِ موجۂ دریا کوئی مجھ سے پوچھے

دشت و کہسار سے وابستہ ہے قسمت میری — دامنِ دشت نہیں ہے یہی جنت میری
شفقِ شام میں پاتا ہوں میں دولت میری — کوئی دیکھے تو سہی آکے یہ وحشت میری
پاؤں پائے ہیں عجب بادیہ پیمائی نے
لے کیا کتنی دفعہ دامنِ صحرا میں نے

ہائے قسمت سے مراعیش یہ دیکھا نہ گیا — مجھ کو قدرت کے نظاروں سے جدا کر ہی دیا
جب کبھی یاد وہ آجاتی ہے جنگل کی فضا — دل پکڑ کر میں کیا کرتا ہوں یوں آہ و بکا
”ہائے تقدیر نے چھینی میری دولت مجھ سے
ہائے تقدیر نے لے لی مری جنت مجھ سے“

ساحتِ دشت کو گلزار بنایا تو نے گل کو خوش بوئے محبت میں بسایا تو نے
آبشاروں کو بلندی سے گرایا تو نے جلوۂ برق کو بادل میں دکھایا تو نے
مری قسمت کو پلٹ دے مجھے شاداں کردے
دامنِ کوہ میں گلزار بداماں کردے

روح پھر مستِ مئے ذوقِ تماشا ہو جائے پھر میسر مجھے جنگل کا نظارا ہو جائے
پھر مجھے دشت نوردی کا اشارا ہو جائے حشر جذبات کا پھر سینے میں برپا ہو جائے
وحشتِ دل کو میں پھر سلسلۂ جنباں دیکھوں
دامنِ کوہ میں پھر ابرِ بہاراں دیکھوں

سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب

از

مولوی سید غلام محی الدین صاحب قادری زورؔ ایم اے

سلطان محمود غزنوی سے پہلے اور بعد کے علم و ادب کے حالات سلطان محمود غزنوی کے علمی ادبی کارنامے ترتیب کتاب میں پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران سے استفادہ کیا گیا ہے ضخامت (۱۲۰) صفحے کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت صرف بارہ آنے

ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ ابراہیمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

خان بہادر ڈاکٹر خواجہ محمد حسین صاحب مرحوم

تیر بہدف

از جناب سید شبیر حسن صاحب قیس

دنیا سیاہ چادر میں ملفوف ہو چکی تھی ——— میرے دل میں ایک خفیف سی مسرت کی لہر دوڑی ——— "شائد وہ آج آجائے"۔ میرے ہجران نصیب دل نے آہستہ سے کہا۔ رات کے آٹھ بج گئے لیکن وہ نہ آئی۔

میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ ایک ہوک دل میں اٹھی۔ ایک درد سا قلب میں محسوس ہوا۔ میرے داغ دار دل کو تسکین نہ دیگی۔ کیا میں مایوس ہو جاؤں ——— قطعی ——— کیا اب میری آنکھیں جو عرصہ سے اس کے رخ زیبا کے لئے تڑپ رہی ہیں اس کو نہ دیکھ سکیں گی۔

دس بج گئے۔ لیکن میں ہمہ تن انتظار بنا ہوا تھا۔ میں اکیلا ساکت کھڑا تھا ——— سامنے کی جھاڑی میں سے سرسراہٹ سی ہوئی۔ امید میں جھلک دل میں مسرت پھر ایک بارگی خیالات میں ہیجان ہوا۔

کوئی آتا نظر آیا۔ آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ میں نے کیا دیکھا۔ ماحول کا چپہ چپہ کسی نور سے جگمگا اٹھا۔ گویا کوئی آسمانی حور تھی کہ بڑھی چلی آ رہی تھی۔ میری روح کو بشاش کرنے والی دوشیزہ اپنے دہقانی لباس میں ملبوس میری طرف نہایت سرعت سے بڑھی۔ آہ میری ملکہ ——— میری شہزادی ——— تو ——— تو ——— "آگئی" میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔ میرا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ اور وہ مسکرا رہی تھی۔ اس نے اپنے بازو پھیلا دئے۔ ایک ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے اپنے بلوریں سینہ سے چپٹا لیا۔ اور اس کے یاقوت خام میرے رقصاں ہونٹ سے مل گئے اور میں اس کی زلف عنبریں کو چومنے لگا۔

ہم دونوں علحدہ ہوئے اور سبزہ پر بیٹھ گئے۔

چاند نکل رہا تھا۔ اس کی شعاعیں پہلے سے زیادہ روشن و منور تھیں۔ شاید وہ ہماری مسرت پر ہنس رہا تھا۔

"میری عزیز ترین لبنیٰ۔ اب کی تمہاری جدائی نے بہت طول کھینچا، میں نے خیال کیا تھا کہ شاید میں اب تم سے نہیں مل سکونگا۔"

"ہاں میرے ہاشم۔ حقیقتاً تمہیں میری وجہ سے تکلیف ہوئی۔ میں اماں جان کے ساتھ مصر گئی تھی۔ مجھے چلتے وقت ذرا بھی موقع نہیں ملا کہ تم سے مل لیتی اور روانگی سے آگاہ کرتی۔ میرا قصور معاف کرو بیشک میں قصور وار ہوں، میں نادم ہوں" اس نے پشیمان ہوتے ہوئے کہا۔

نہیں میری لبنیٰ۔ تم میرے دل کی مالک ہو۔ میں تمہارا غلام ہوں۔ تمہارے معافی چاہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

میں اپنی کامیابی پر شادان و مسرور تھا۔ وہ روز آجایا کرتی ہے اور دل خوشکن باتوں سے دل کو لبھا جاتی ہے۔

اس نے مجھے بار ہا کہا "پیارے ہاشم تم مجھ کو سب سے زیادہ اچھے معلوم ہوتے ہو، میں تمہیں جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہوں، میرے قلب پر ہاتھ رکھکر دیکھو تو معلوم ہوگا یہ جام تمہاری فقط تمہاری الفت سے لبریز ہے۔"

مشاہدات

از

جناب ابوالفاضل راز چاندپوری

جب سارا جہانِ راز سو جاتا ہے (۱) اک عالم بیخودی میں کھو جاتا ہے

ہوتا ہے نیاز اس سے حاصل مجھ کو بیدار مرا نصیب ہو جاتا ہے

سالک کا اگر قیام ہو جاتا ہے (۲) کھانا سونا حرام ہو جاتا ہے

ملنے لگتی ہے اس کے دل کی دنیا برہم سارا نظام ہو جاتا ہے

قفقاز کے شمال کی زبانیں

مترجمہ محمد عبدالوہاب صاحب مسلم

مضمون کے آغاز سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قفقاز کے جغرافیہ اس کے مقام و توع اور حدود اربعہ پر تھوڑی سی روشنی ڈالی جائے۔

اس کے شمال میں مملکت روس، مشرق میں بحیرہ خضر، جنوب میں عراق و ترکی اور مغرب میں بحر اسود ہیں اسی خطہ ملک میں کوہ قاف کی مشہور پہاڑیاں ہیں جن کے متعلق اب بھی بوڑھی عورتیں بچوں سے اکثر کہتی رہتی ہیں کہ وہاں پریاں اور دیو رہتے ہیں۔ دیو تو خیر لیکن پریوں کے متعلق کہنے میں کوئی شک ہی نہیں کیونکہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس کی عورتیں حسن اور خوبصورتی میں یہاں کی عورتوں سے زیادہ ہوں۔

یہ مقام ایشا اور یورپ کے درمیان میں واقع ہونیکی وجہ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ازمنہ قدیم میں جب مشرق سے مختلف آریائی قبیلے نکلکر مغرب کی طرف گئے تو راستہ میں سلسلہ کوہ ملنے کی وجہ سے اول اول انہوں نے یہاں سکونت اختیار کی لیکن جوں جوں دوسرے قبیلوں کا ان پر حملہ اور غلبہ ہوگیا وہ آگے بڑھتے گئے حتی کہ یہ آریائی نسلیں تمام یورپ پر چھا گئیں۔

اس آمد و رفت اور رخلا ملا کی وجہ سے اس ملک کو بہت کچھ اہمیت حاصل ہوگئی کیونکہ جو قبائل جو وقتاً فوقتاً ایشیا سے یورپ گئے ان میں سے کچھ نہ کچھ لوگ اکثر یہاں مسکن گزین ہوگئے انہی مختلف قبائل کی سکونت یہاں کے لسانی اختلافات کا سبب ہے۔

پہاڑی مقام ہونیکی وجہ سے یہاں کے لوگ بہت محنتی، جفاکش اور طاقتور ہوتے ہیں یہاں کا سب سے بڑا شہر طفلس ہے۔ بحیرہ خضر کے کنارے باکو میں تیل کے چشمے ہیں۔ جنگ عظیم سے پیشتر یہ ملک روس کی عملداری میں شامل تھا لیکن جنگ کے بعد سے اس میں کئی جمہوری ریاستیں قائم ہوگئیں جن میں سے جارجیا کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہے۔

زبان کے ارتقاء اور تحقیق کے لحاظ سے جو اہمیت اس خطۂ عالم کو حاصل ہے غالباً دنیا کے کسی اور ملک کو [illegible]

عرب کے جغرافیہ اور تاریخ نویسوں نے قفقاز کو "زبانوں کا پہاڑ" خطاب دیا ہے اور واقعی قفقاز اس لیے بہت مشہور ہے کہ وہاں کے باشندے پچیس تیس مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ یہ لوگ تین مختلف نسلوں پر منقسم ہیں۔ آریی، ترکی، قفقازی، قفقاز کے جنوب میں چند زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں سے ہر ایک، ایک وسیع رقبۂ ملک کی حکمران ہے۔ ان زبانوں میں سے گرجی، ارمنی اور ترکی آذری بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ ماہرین لسانیات نے بہت کوشش کی کہ گرجی زبان کا تعلق کسی مشہور نسل سے ثابت کریں لیکن ان کی کوشش بیکار ثابت ہوئی اور وہ اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے کہ زبان گرجی ایک مخصوص نسل کی زبان ہے جو صرف مملکت قفقاز میں محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ از منہ قدیم میں یہ زبان بہت مشہور و معروف تھی اور اس کا اثری رقبہ بہت وسیع تھا۔

ارمنی زبان کی لغت اور اس کے قواعد صرف و نحو علماء لسانیات نے بآسانی مدون کر لیے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ اس زبان کا تعلق آریی زبان کے صرف و نحو سے ہے اور اسی بناء پر ابتداءً قیاس کیا گیا تھا کہ ارمنی زبان آریی کی ایک شاخ ہے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ واقعہ کچھ اور تھا یعنی سوا لغت اور صرف و نحو آریی کے ارمنی زبان کی ایک اور شاخ بھی ہے جس کا آریی سے کوئی تعلق نہیں۔ پس اسی بناء پر لازم ہوا کہ ارمنی زبان کو ایک مخلوط زبان مانیں جو لغت کے اعتبار سے دو شاخوں یعنی غیر آریی اور مخلوط آریی پر مشتمل ہو۔ ارمنی، آریی سے اس قدر مخلوط ہو گئی ہے کہ سوا علمی تحقیقات کے اور کسی طرح اس کا جدا کرنا غیر ممکن ہے۔ یہ زبان ان دونوں زبانوں سے اس طرح ملکر بنی ہے جس طرح زبان فارسی، عربی و ایرانی سے ملکر ارمنی مخلوط زبان کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ اور علمی تحقیقات کی نظر سے ماہرین لسانیات کی نظر میں اہمیت رکھتی ہے۔ ان کو بہت کد و کاوش اور غور و خوض کے بعد معلوم ہوا کہ ارمنی قدیم اور گرجی حقیقت میں ایک ہی ہیں۔

ماورا قفقاز کی تیسری زبان ترکی آذری ہے۔ یہ زبان مملکت آذربائیجان میں دوسری زبان کی بہ نسبت دیر میں آئی۔ اس کے آنے کا سبب ترکوں کے ایک قبیلے کا آنا تھا جن کی وجہ سے اس کی تخلیق ہوئی۔ ترکی آذری ترکی نسل کی زبانوں میں سے عثمانی، ازبکی اور تاتاری کے مانند ہے تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ اس میں ایرانی اور آریی کا عنصر اس وقت تک موجود ہے۔ اہل آذربائیجان اور شیروان ترکوں کے آنے سے قبل ایرانی بولتے تھے یہ صرف تحقیق علمی ہی کے ذریعے معلوم ہوا ہے

ورنہ یہاں کے تلفظ میں اس قدر فرق ہو گیا ہے کہ فرق معلوم کرنا بہت مشکل ہے۔

ایران کی گم شدہ زبان کے آثار اب تک کافی طور پر دریافت نہیں ہوئے ہیں لیکن ایران شناسی کے لئے اس کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ تقریباً دو سال پیشتر آقائے سید محمد تبریزی کا ایک اہم رسالہ "زبان آذری یا زبان باستان آذربائجان" اس موضوع پر شایع ہوا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ رسالہ مذکور تحقیقات زبان آذری میں سب سے پہلا رسالہ ہے جو علمی تحقیق کے لئے ایک نیا دروازہ کھولدیگا۔

مندرجہ بالا تینوں زبانیں دولت ادبی سے مالا مال اور اس وقت بھی مائل بہ ترقی ہیں۔ تلفظ کے لحاظ سے تینوں ایک دوسرے سے جدا دوسری مختلف حیثیتوں سے ایک ہی ہیں اکثر دیکھا جاتا ہے کہ محققین لسانیات کو نہیں معلوم ہوتا کہ کسی مقام کے تلفظ کو زبان کا اصلی تلفظ سمجھنا چاہئے یا کسی دوسرے مختلف زبان کے۔ پہاڑی مقامات میں تلفظ کا مختلف ہونا قدرتی ہے کیونکہ ان کی وجہ سے مختلف قبائل ایک دوسرے سے جدا رہتے ہیں اور چونکہ اکثر کوہستانوں میں آمد و رفت آسان نہیں ہوتی اسی وجہ سے پہاڑی قبیلے ایک دوسرے سے بہت کم اجتماعی اور اقتصادی تعلقات رکھتے ہیں جس کی وجہ سے لسانی اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ ...... کسی مقام کے "عوام" کا تلفظ وہاں کے اقتصادی اور اجتماعی حالات کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس بنا پر یقین ہوتا ہے کہ فلاں مقام کے "عوام" کا تلفظ بہ اعتبار لغت اور قواعد کے قدیم تلفظ اور زبان کے آثار کو محفوظ کئے ہوئے ہوگا۔ جو اکثر علماء و فضلا کی زبان میں متروک اور تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس لئے ماہرین لسانیات کو چاہئے کہ جس طرح ماہر نباتات ہر درخت اور ماہر حیوانات ہر حیوان کا معائنہ کرتا ہے۔ اسی طرح ہر زبان کا گہرا مطالعہ کریں۔ مورخ اور ماہر لسانیات کا فرض ہے کہ وہ تمام زبانوں کو اپنی تحقیقات کا مرکز قرار دے (خواہ وہ علمی ہوں یا نہوں) کسی حالت میں بھی بغیر کافی تحقیق کے نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں زبان کی تحصیل و تحقیق بیکار اور بے فائدہ ہے بلکہ اس کے خلاف یہ امید رکھنی چاہئے کہ اس زبان کی تحقیق انسانی زندگی پر ایک نئی روشنی ڈالے گی۔

اب ہم ماورائے قفقاز اس کے پہاڑی سلسلوں اور شمالی خطۂ ملک کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جہاں صرف چند قبیلے آباد ہیں اور مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ ان کی تعداد بہت قلیل ہے اسی خطۂ ملک میں بعض اوقات ہم کسی قبیلے سے ملتے ہیں جو کسی خاص زبان میں گفتگو کرتا اور صرف

پانچ چھ قریوں میں سکونت رکھتا ہے اور اس کے اطراف و اکناف میں رہنے والے اس کی زبان سے ناآشنائے محض ہوتے ہیں۔

شمالی مشرقی قفقاز یعنی داغستان میں چھ زبانیں ملتی ہیں جن میں سے ہر ایک صرف ایک گاؤں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے (کوباچی یا زرہ گران، ارچی، تبلیق، تکتیا، تیندی اور خواشی) ان میں سب سے بڑی زبان کوباچی یا زرہ گران ہے جو فقط تین سو خاندانوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

لسانی اختلافات کا سبب کوہستانی زندگی بھی ہے لیکن چونکہ یہ اختلاف اقتصادیات اور اجتماعیات کی ترقی میں مانع اور سدِّراہ ہوتے ہیں اس لئے ہمسایہ قبائل کے لئے لازم ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی زبان سے واقفیت حاصل کریں یا اپنی زبانوں کے علاوہ کسی دوسری زبان کو مشترکہ طور پر حاصل کریں اور اس طرح لسانی اختلافات کی مشکلوں کو آسان کریں۔ یہی سبب ہے کہ اس ملک کے جو قبیلے محدود اور غیر معروف زبانیں بولتے ہیں بچپن ہی سے علاوہ مادری زبان کے ایک دوسری زبان جو وہ اور ان کے ہمسایہ سمجھ سکتے ہیں حاصل کرتے اور اپنے ہمسایوں سے ربط و ضبط قائم رکھتے ہیں۔ اس ملک کی عورتیں صرف مادری زبان حاصل کرنے پر اکتفا کرتی ہیں گویا اس ملک کے باشندوں کی مادری زبان حقیقت میں مادری زبان ہوتی ہے

بعض مقامات پر روسی زبان نے اشتراکی زبان کی شکل اختیار کر لی ہے لیکن قفقاز مشرقی کی مختلف قومیں ترکی زبان کی ایک شاخ کو استعمال کرتی ہیں بحرۂ خزر (sea Caspian) کے شمال یعنی شہر دربند میں زبان قمق (ترکوں کی زبان جو وہاں رہتے ہیں) اچھی طرح بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اگر ہم شہر دربند کے جنوب میں جائیں تو ہم کو ان مقامات میں ترکی آذری کی اہمیت نظر آئیگی۔

داغستان کی پہاڑیوں میں ایک اور اشتراکی زبان ملتی ہے جو وہاں کے سب سے بڑے قبیلہ آوار کی زبان ہے (یہ قبیلہ صحرائے شمال سے گرجستان تک قفقاز کی پہاڑیوں کے دونو جانب مسکن گزیں ہے)۔ چونکہ لوگ شمالی قفقاز اور سلسلۂ کوہ کی مختلف زبانوں سے اچھی طرح واقف نہیں اس لئے ہم اس جگہ تمام معلوم شدہ زبانوں کو درج کرتے ہیں۔

بحرِ اسود کے ساحل اور جبال قفقاز کے جنوب میں ابخاز اور اسوان نامی دو قبیلے رہتے ہیں

ان میں سے قبیلۂ اسوان کی زبان گرجی زبان سے بہت مشابہ ہے اور اسوانی تمدن بھی گرجی تمدن کا خوشہ چین معلوم ہوتا ہے۔ قبیلۂ ابخاز جس زبان کو استعمال کرتا ہے اس کو گرجی یا نواح کی چرکسی زبانوں کی زنجیر اتحاد کہہ سکتے ہیں۔

چرکسی قبائل روسیون کے ہاتھ سے شکست کھانے کے قبل بحر اسود کے سواحل اور قفقاز کی پہاڑیوں کے شمال میں جھیل کوبان تک پھیلے ہوئے تھے۔ روسیون سے سخت اور خونریز جنگون کے بعد یہ لوگ اپنے ملک کا ایک بڑا حصہ ان کو سپرد کرنے پر مجبور ہوئے ان میں سے کچھ تو اپنے ملک سے ہجرت کر کے ترکی یعنی اپنے مسلمان بھائیون کے ملک میں چلے گئے اور کچھ اپنے وطن میں روس کے زیر اثر رہتے سہتے ہیں۔ قبیلۂ قبارداجو قفقاز کے شمالی پہاڑون اور جنگلون میں رہتا ہے ایک زبان استعمال کرتا ہے جو چرکسی زبان سے بہت مشابہ ہے۔ اسی حصۂ ملک میں دو اور قبیلے بھی پائے جاتے ہیں جو ترکی نسل سے ہیں اور تاراچائی اور باتقار کے نامون سے موسوم ہیں۔

مذکورۂ بالا قبائل کے مشرق یعنی راہ شوسہ گرجستان میں کہ شہر ولاد یانقفاز سے گرجستان کے پایۂ تخت یعنی طفلس تک جاتی ہے، قوم الستی کا مسکن ہے۔ یہ قوم جو جبال قفقاز کے وسط میں رہتی ہے اس وقت تک ایرانی آری زبان بولتی ہے۔ تحقیقات لسانی سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم السی ایرانی نسل کا ایک بڑا حصہ ہے یہ تو بہ ارمنہ قدیم میں روس کے جنوبی جنگلون میں بھٹک کر وہان کے پہاڑون میں مسکن گزین ہو گئی تھی۔ (اس کو اس زمانہ میں ساکا یا اسکیٹ کہتے تھے) مرورزمانہ اور دوسری قومون کے خلاملا سے جو اکثر ایشیا سے روس کے جنوبی جنگلون میں جا کر بس گئیں اس قوم کا نام صفحات تاریخ سے قریب قریب محو ہو گیا ہے لیکن ابھی بالکل نہیں مٹا کیونکہ ان کی اولاد اس وقت بھی وسط جبال قفقاز میں پائی جاتی ہے۔

زبان الستی بھی مثل ارمنی زبان کے ایک مخلوط زبان ہے جس کا ایک جز ایرانی اور دوسرا غیر ایرانی ہے۔ علمی تحقیقات اور ایران شناسی کے لئے زبان السی کافی اہمیت رکھتی ہے اور شاید کسی وقت محققین ایرانی کی نظر اپنی طرف ضرور متوجہ کر کے رہیگی۔

ہندی کی ابتدا اور نشوونما پر ایک نظر

از

جناب لالہ سیتارام صاحب بی اے صدر شعبہ ہندی آل انڈیا اورینٹل کانفرنس

جناب لالہ سیتارام صاحب کی شخصیت ہندوستان میں کسی تعرف کی محتاج نہیں ۔ آپ فارسی، عربی، سنسکرت، انگریزی اور فرانسیسی وغیرہ مختلف زبانوں کے ماہر ہیں کئی سنسکرت ڈراموں اور شاعری کے کتابوں کا ہندی نظم و نثر میں ترجمہ کیا ہے ۔ ذیل میں آپ کا وہ فاضلانہ خطبہ شایع کیا جاتا ہے جو آپ نے بحیثیت صدر شعبہ ہندی موتمر مستشرقین ہند کے اجلاس پنجم (آل انڈیا اورینٹل کانفرنس) میں بمقام لاہور علما و فضلا کے ایک بڑے مجمع کے آگے پڑھا تھا ۔ ہم اس کے لئے اپنے مکرم دوست مولوی غلام رسول صاحب مددگار سٹی کالج کے ممنون ہیں کہ آپ نے اس کو ہندی سے اردو کا جامہ پہنایا ۔ (مجلۂ مکتبہ)

اورینٹل کانفرنس کی استقبالی کمیٹی کے صدر نشین! خواتین اور برادران!

پانچوین اورینٹل کانفرنس کے ہندی شعبہ کی صدارت کے انتخاب کے لئے میں آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ اگر آپ حضرات نے مجھ سے بڑے عالم کو صدارت کے لئے منتخب کیا ہوتا، تو بہت اچھا ہوتا لیکن گو میں قابلیت میں کم ہوں تاہم یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں ہندی کی خدمت کرنے والوں میں سب سے قدیمی ہوں پچاس برس ہوئے میرا بھارتندو (ہلال ہند ہریشچندر) سے تعارف ہوا تھا اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ وہ موجودہ ہندی کے باوا آدم کہلانے کے ہر طرح سے مستحق ہیں ۔ اس سے پہلے میں اودھ اخبار کی ادارت کر چکا تھا ۔ جناب منشی نول کشور سی ائی اِس کے بانی تھے اور یہ اردو اخبارات میں بہترین پرچہ شمار کیا جاتا تھا، منشی نول کشور پہلے کوہ نور کے دفتر میں تھے وہ لاہور سے لکھنؤ آئے تھے اور وہیں بس گئے تھے ۔ ہم نے ۱۸۸۹ء میں دیکھا تھا کہ منشی ہر سکھ رائے پر منشی نول کشور کی بڑی نظر عنایت تھی ۔ منشی ہر سکھ رائے اس کالیستھ قوم کی کانفرنس کے صدر تھے ۔ جو الہ آباد میں ہوئی تھی ۔ بھارتندو ہریشچندر کے اشعار اور ان کی کتابوں کے مطالعہ سے میرے دل میں

ہندی کی محبت پیدا ہو گئی۔ اسی محبت کے سبب میں تقریباً نصف صدی تک ہندی کی خدمت کرتا رہا ہوں اس کے علاوہ آپ حضرات واقف ہی ہوں گے کہ کچھ ایسے حقوق ہیں جو مجھے اپنے بزرگوں سے ملے ہیں۔ کچھ ایسے امتیازات ہیں جنھیں خود میں نے پیدا کئے ہیں۔ اور ایک بات تو ایسی ہے جسے خود سری رام چندر جی نے مجھے عطا فرمائی ہے۔ میری مراد اپنے وطن سے ہے۔ میری پیدائش اسی شہر میں ہوئی ہے جہاں خود سری رام چندر جی نے اوتار لیا تھا۔ اجودھیا میں پیدا ہونے کا مجھے ہمیشہ فخر رہا ہے اور ہندی کے قارئین نے اکثر دیکھا ہوگا کہ میں اپنے نام اور دستخط کے ساتھ اجودھیا وی لکھتا ہوں۔

اس شہر کو سری رام چندر جی کے دوسرے صاحبزادے لَب نے بسایا تھا۔ اسی لئے یہاں آنے میں دراصل مجھے بہت مسرت حاصل ہوئی ہے۔ اگر میں استقبالیہ کمیٹی کے سکریٹری کے حکم کی تعمیل نہ کرتا تو میری ناموری نہ ہوتی۔ استقبالیہ کمیٹی کے سکریٹری کا نام لکشمن ہے اور سیتا رام کو بہت عزیز ہے۔

اب میں ہندی کی ابتدا کے متعلق عرض کروں گا۔ ہندی سے میری مراد ہندی ادب کی زبان ہے صوبہ جاتی زبانوں سے نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ حضرات میں سے بعضوں کو یہ حیرت واستعجاب ہوگا۔ ممکن ہے آپ حضرات میں سے کچھ اسے اپنے صوبہ کی حمایت سمجھیں۔ حضرت عیسیٰ کی ولادت سے سات سو سال قبل صوبہ متحدہ کا نام "کوشل" تھا۔ اس زمانہ میں یہاں سورج بنسیوں کی حکومت تھی مگر ان کا پایہ تخت اجودھیا نہیں سراوستی تھا۔ آج کل سراوستی کے کھنڈرات گونڈہ ضلع کی مغربی سرحد پر "مہیٹ" میں پائے جاتے ہیں۔ بدھسٹ انڈیا کا مصنف لکھتا ہے کہ کوشل کی سلطنت آج کل کے صوبہ متحدہ سے بھی کچھ بڑی تھی۔ کوشل کی وسیع سلطنت میں نظم و نسق بہت اچھا تھا کوشل کی سلطنت میں پربراجک (سیلانی فقرائے کامل) ادھر ادھر گھوما کرتے تھے۔ کیونکہ اس سلطنت سے پہلے ان فقراء کا وجود ہی نہیں پایا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں ملک کی سیاسی حالت ہی کچھ ایسی تھی کہ ان فقراء کی بدولت عام زبان کی بدھی اور تاریخی حصوں کے ساتھ ساتھ ترقی ہوتی چلی گئی۔ اس طرح ظاہر ہے کہ ان فقراء نے کوشل سلطنت کے زیر سایہ عوام الناس کی زبان کو بڑی ترقی دی۔ اس زمانہ میں سراوستی میں عام لوگوں کی ایک زبان تھی۔ اسی زبان میں سراوستی کے باشندے آپس میں بات چیت کرتے تھے سلطنت ...

عہدہ دار اس میں کام کرتے تھے۔ تجارت پیشہ لوگ اسی کا استعمال کرتے تھے اور علماء بھی اسی زبان کے ذریعہ اپنی قابلیت کا اظہار کرتے تھے۔ اس زبان کا دائرہ صرف کوشل حکومت تک ہی محدود نہیں تھا۔ بلکہ اس کا پھیلاؤ دلی سے پٹنہ اور مراد ستی سے اوتی تک پایا جاتا تھا۔

آپ حضرات اس بات کو کامل توجہ سے ذہن نشین کر لیں کہ یہ فقراء کامل در اصل اچھے ساد ھوا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی بہت بڑے عالم بھی۔ جہاں تک میرا حافظہ ساعدت کرتا ہے سوامی دیانند سرسوتی جو آریہ سماج کے بانی ہیں۔ پربراجک چاری ہی کہلاتے ہیں۔

گوتم بدھ نے بھی اسی عوام الناس کی زبان میں اپنی تعلیم و تلقین کی تھی اور تین صدیوں کے بعد اشوک نے بھی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اسی زبان میں پتھروں پر تحریرات کندہ کروائی تھیں جو لوگ ان کتابوں کو ذرا سی توجہ سے بھی پڑھیں گے۔ انہیں اس تبدیلی کا پتہ چل جائیگا۔ یہ کتبات مشرق میں گنجام سے لے کر مغرب میں شہوار گڈھی افغانستان تک اور شمال میں کالسی (ہمالیہ کی ترائی) سے لے کر جنوب میں سدھاپور (میسور) تک لکھے گئے تھے۔ اور یہ توقع کی جاتی تھی کہ سرکاری ملازمین اور پبلک انہیں سمجھیں۔ اس بات سے ظاہر ہے کہ اشوک کے عہد حکومت میں سب لوگ اس زبان کو سمجھتے تھے۔ اسی زبان سے ہندی کی ابتداء ہوتی ہے۔ در اصل ہندی کے معنی ہند کی زبان ہے۔ ان سب وجوہ سے ہم لوگوں کو اسے ہندی کہنا چاہئے۔ اور یہی مناسب بھی ہے۔ اردو تو ترکی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی فیصل شدہ نہیں ہوا۔ اس لئے اس زبان کو اردو کی بہ نسبت ہندی کہنا زیادہ مناسب و موزون ہے۔ میں نے پورانوں کا مطالعہ کیا ہے اور میں مسٹر پارجیٹر کی اس رائے سے بالکل متفق ہوں کہ ہندوستان میں شمال مغربی گوشہ سے آریوں کا حملہ کبھی نہیں ہوا۔ آریوں نے مشرق کی طرف کبھی کوچ نہیں کیا۔ آریوں کی قوت کا مرکز الہ آباد اور کوشل تھے۔ اور وہ یہیں سے آریہ لوگ چاروں طرف گئے اور پھیلے۔ ایسی روایت بھی ہے کہ دریوہ بھی آریہ تھے اور یہ شمال مغربی گوشہ کی طرف افغانستان اور اس کے آگے بھی چلے گئے تھے۔

دریوہ بیاتی کے پانچ بیٹوں میں سے ایک تھا بیاتی پرتشٹھاپور کا راجہ تھا۔ جو آج کل جھوسی کے نام سے مشہور ہے۔ جھوسی الہ آباد کے سامنے گنگا کے دوسرے کنارے پر ہے۔ بیاتی کے اور بیٹوں کے نام یدو، تروسو، انو اور پرو تھے۔ پرو پرتشٹھاپور کی گدی پر بٹھایا گیا۔ یدو کو جنوب مغرب کی، تروسو کو جنوب مشرق کی، دریوہ کو مغرب کی اور انو کو شمال کی سلطنت ملی تھی۔

چندر بنشیوں میں ششونندو ایک مشہور راجہ تھا اور خیال ہے اس نے دریو ہوں کو پنجاب کی طرف بھگا دیا تھا۔ ششونندو کی بیٹی کا بیاہ ماندھاتا سے ہوا تھا۔ اسی ماندھاتا کے عہد حکومت میں اجودھیا کو بڑی ترقی ہوئی تھی۔ ماندھاتا کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کی حکومت میں سورج کبھی نہیں ڈوبتا تھا۔ پنجاب میں انگر نامی دریوہ راجہ تھا۔ ماندھاتا سے اور اس سے لڑائی ہوئی تھی اور آخر میں اس نے انگر کو شکست دی تھی۔ اسی لئے کانے کیکیوں اور یونانیوں کے ملکوں نے ضرور اس کی بڑائی کو تسلیم کیا ہوگا۔ انوبنسی بھی شاید اس کا لوہا مان گئے تھے۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اس نے دشمنوں پر حملہ کیا تھا یا نہیں۔ کیونکہ ششونندو اس کے سالے تھے۔ دریوہ راجاؤں میں سے ایک کا نام گاندھار تھا۔ اور یہ گاندھار ملک کا راجہ تھا۔ یہاں دریوہ راجاؤں کا اقتدار دائمی رہا۔ ان کے بارہ میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پانچ پشت کے بعد ان کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ اور یہ بہت ملکوں میں ہو گئے اور تب انہوں نے اپنی حکومت ہندوستان کے شمالی ملیچھ ملکوں پر قائم کی لوگ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک پوران کا قصہ ہے۔ لیکن قصے جعلی نہیں ہوتے ہیں۔ ان سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ ہندوستان میں آریوں کے دو حملے ہوئے تھے۔ اور اس سے ہندوستان میں دو طرح کی زبانوں کی ابتدا ہو گئی اشوک کے عہد حکومت سے لیکر سری ہرش کے زمانہ تک کا تاریخی مواد پورے طور پر نہیں مل سکتا اس لئے میں ٹھیک ٹھیک یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ اس عام زبان میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں؟ کیسی کیسی ترقیاں ہوئیں اور آخر میں اس نے کیسی صورت اختیار کر لی۔ شیو سنگھ سروج کے مطابق ہندی کی پہلی کتاب سری ہرش کے زمانہ ہی میں لکھی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب فن شاعری پر لکھی گئی تھی۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پہلے اس زبان میں نظمیں بھی لکھی گئی ہونگی۔ جو لوگ اس بات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں کہ اشوک کے زمانہ کی پراکرت نے موجودہ ہندی کی شکل کیسی اختیار کر لی انہیں بدھ اور جین دھرم کی کتابوں کا کامل توجہ سے مطالعہ کرنا چاہئے جینوں کے انگ نام کی کتاب عوام کی زبان میں لکھی گئی ہے۔ اور یہ یقین کیا جاتا ہے کہ قبل مسیح کی چوتھی صدی کے اخیر اور تیسری صدی کی ابتداء میں یہ لکھی گئی تھیں مگر ان کا وجود ۴۶۶ء کے اختتام ہی میں پایا جاتا ہے۔ یہ سب کتابیں یا تو پراکرت میں لکھی گئی ہیں یا اردھ ماگدھی میں اردھ ماگدھی کا دوسرا نام اودھی یا کوشل کی زبان ہے۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ ہندی ادب کی سب سے قدیم کتابیں اسی اودھی زبان میں پائی جاتی ہیں، تو آپ حضرات کو تعجب نہیں کرنا

جا ہئے - حال کی تحقیق اور انکشافات اس بات کو اور بھی زیادہ مستند کرتے ہیں - بھال نے دسمت ۱۰۰۱ میں سری مدھگو دگیتا کا ترجمہ اودھی زبان میں کیا تھا لیکن کچھ علما اس تاریخ کو مستند نہیں مانتے دوسرے مشہور مصنف امیر خسرو تھے یہ چودھویں صدی بکرمی میں ہوئے تھے یہ اجودھیا میں دو برس تک رہے اور مشہور کتاب خالق باری کو اودھی زبان میں اجودھیا میں ہی تصنیف کیا تھا - ان کے تھوڑے دنوں کے بعد ہی کبیر داس بنارس میں منودا کھوے اپنے بول اور نصائح کو اسی زمانے کی اودھی زبان میں لکھا - اس کے بعد کئی سنتوں نے بھی اودھی زبان میں شاعری کی - اس میں شبہ نہیں کہ ان سنتوں کی زبان پر اپنے اپنے صوبوں کی بولی کا بھی ضرور سا اثر پڑا تھا لیکن اصل میں ان کی بڑی زبان اودھی ہی تھی - یہ لوگ عوام کے فائدے کے لئے لکھتے اور عام لوگوں کی زبان کا ہی استعمال کرتے تھے میرے پاس ابتیں واس کی ایک کتاب اودھی زبان میں ہے - اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ کتاب مذکور سن ۱۵۵۰ ء میں دلی میں لکھی گئی اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ سولھویں صدی کی ابتدا میں بھی برج بھاشا کا وجود دلی میں نہیں تھا -

اودھی زبان پر مغربی ممالک کا اثر یقینی پڑا تھا اسی اثر کے سبب مغربی اودھی بیسواڑی کہلاتی ہے - اس بات سے کچھ عالموں نے یہ قیاس کیا ہے کہ اودھی پر برج بھاشا کا اثر پڑا ہے - لیکن یہ ایک بڑی غلطی ہے - ولبھا چاریا کے "کرشن سمپرداے" کے پہلے ادبی زبان کی حیثیت سے برج بھاشا کا وجود ہی نہیں پایا جاتا تھا - مگر ولبھا چاریا کے مشہور چیلے سورداس نے اپنے غیر فانی کلام میں برج بھاشا کا استعمال کیا اور اس وقت سے برج بھاشا کا شمار مشہور زبانوں میں ہونے لگا -

ان سب بیانات سے میرا یہ منشا نہیں کہ میں برج بھاشا کی عظمت کو نہیں مانتا یا اس کی برائیاں ہی گنانا منظور ہے - ہرگز نہیں ایسا کرنے سے میرا منشا اپنی صوبہ کی زبان کے بارے میں ایک غلطی کی اصلاح کرنا ہے - موجودہ زمانے میں کھڑی بولی میں صرف نظم ہی نہیں لکھی جاتی نثر بھی لکھی جاتی ہے - لیکن کھڑی بولی اور سورداس کی زبان میں کچھ بھی رشتہ نہیں ہے -

اس میں کچھ بھی شبہ نہیں کہ آج کل برج بھاشا میں پوری کامیاب نظم لکھی جاتی ہے بابو جگناتھ داس رتناکر نے "گنگا وترن" نام کتاب پر ہندوستانی اکاڈیمی کی جانب سے انعام حاصل کیا ہے - کیونکہ آخری سال میں یہی کتاب بہترین مانی گئی ہے - سرکاری گی ہری کو بیرست سئی پر منگل پرشاد

پرشاد انعام ملاہے۔ یہ انعام ہندی ساہتیہ سمیلن ہر سال عطا کرتا ہے۔

اب میں اس بارے میں اپنے خیالات ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں ہندی ادب میں کیا ترقی ہوئی ہے۔ آٹھ برس ہوئے کلکتہ یونیورسٹی کے اُس وقت کے چانسلر اور مشہور ماہر تعلیم مسٹر آشوتوش مکرجی کے حسب ایما میں نے ہندی ادب سے متعلق انتخابات مرتب کیا تھا۔ اس میں سات حصے تھے۔ اور میں نے ہندی ادب کی مندرجہ ذیل چھ عنوانات کے تحت تقسیم کی تھی۔

(۱) چارن کاوے (چارن کی شاعری) (۴) سنت کاوے

(۲) کرشن کاوے (کرشن کی شاعری) (۵) ساہتیہ شاستر (علم ادب)

(۳) تلسی داس۔ (۶) اتے کوئی (دو جلدوں میں)

پہلے عنوان کے سوا کل دوسری نظموں کا تعلق دھرم سے زیادہ تر ہے۔ اس لئے یہ دھارمک (مذہبی) کہی جاسکتی ہے۔ اس میں تو کچھ بھی شبہ نہیں ہے کہ کرشن کاوے، رام کاوے اور سنت کاوے دھارمک ہیں۔ لیکن ہندی ادب میں شرنگار رس (تغزل کا رنگ) سب سے اعلیٰ وارفع ہے۔ ہندی کے شاعروں نے اسکاٹ کی نظموں کو بھی مات کر دیا ہے اور عشق و محبت کے بیان کرنے میں اس سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ اسکاٹ کہتا ہے کہ "عشق ہمیشہ نغمہ ساز کے جذبات کو ابھارتا رہا ہے" ایسے مضمون کی نسبت میں کیسے کم مایہ کہہ سکتا ہوں۔ ہندی کے ان شاعروں نے اپنے کو صرف فروتر ہی ثابت نہیں کر دیا ہے۔ بلکہ یہ غازی مرد بن گئے۔ اس میں بھی کچھ شبہ نہیں کہ ہندی کے کچھ شاعر ڈرائیڈن کی طرح ہوتے تھے۔ ڈرائیڈن کے متعلق مندرجہ ذیل امور بیان کئے جاتے ہیں:۔

لچے راجا اور بدمعاش درباری شاعروں کو تھوڑا چتین دیتے تھے اور یہ ان کا دل لبھانے کی کوشش کرتے تھے۔ شعرا ان کے نفسانی جذبات کے لائق بیہودہ شاعری کرتے تھے۔ یہ بہت سی لچر رمز، گیت، اور نظمیں کہتے تھے۔ بہرحال یہ شاعری کے مقصد سے بے خبر تھے۔ اسے دھوکا دیتے تھے اور الیشور شکتی کو ناپاک کرتے تھے اسی طرح یہ اعلیٰ خیالات کا خون کرتے تھے یہ شاعر بھی لاعلمی سے کرشن کو نایک اور رادھا کو نایکا مان کر شاعری کرتے تھے ہندی ادب میں کرشن کا وہی درجہ ہے جو تغزل کا ہندمیں زیڈ کا۔ اس ادب میں کرشن، پریم نیتی کی ہر خطا کو کرتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ داس ہندی شاعری میں بہترین تھے لیکن وہ بھی لکھتے ہیں:۔

آگے کے سکوی ریجھی ہیں تو کبتائی۔ نہ تو رادھیکا کنہائی سمرن کو بہانو ہے

لیکن ملک میں مغربی تعلیم کی اشاعت سے ایسے شاعروں کی کمی ہوتی چلی جاتی ہے اور بڑی تیزی کے ساتھ ان کی تعداد گھٹ رہی ہے۔ ہندی ادب نے ایک نیا روپ اختیار کر لیا ہے۔

کاشی نگری پرچارنی سبھا نے سب سے پہلے ہندی کی حمایت کی اور اس کی ترقی کے لئے جدوجہد کرنا شروع کیا۔ آخری تیس برسوں میں اس نے کئی مشہور کتابوں کو شایع کیا ہے۔ ان میں سے کچھ قدیم ہیں اور کچھ جدید۔ مثال کے طور پر ہندی لغت "ہندی شبد ساگر" کا نام لیا جا سکتا ہے۔ یہ بہت جلد مکمل ہو جائیگا۔

اسی سبھا کے باہمت ارکین نے ساہتیہ سمیلن کی بھی بنیاد ڈالی تھی۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں سمیلن کے اٹھارہ اجلاس ہو چکے ہیں اس کا ایک صدر دفتر الہ آباد میں ہے سمیلن کئی قسم کے کام کرتا ہے وہ امتحان لیتا ہے اور اسناد بھی دیتا ہے۔ اس نے کئی کارآمد کتابیں بھی شایع کی ہیں ہندی اہل قلم کا کام صرف سبھا اور سمیلن تک ہی موقوف نہیں ہے۔ سرسوتی، مادھری، سُدھا، مہارتھی اور وشال بھارت جیسے مشہور رسائل کے علاوہ دس سال (۱۹۱۷ تا ۱۹۲۶ ع) میں مختلف موضوع پر صرف صوبجات متحدہ آگرہ اودھ میں (۱۲۸۷۹) کتابیں شایع ہوئی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

صنعت و حرفت	(۶۶)	مصوری	(۱۴۲۴)
سیر و تذکرہ	(۲۷۱)	شاعری	(۵۶۰۹)
ڈراما	(۳۰۰)	سیاست	(۳۶۸)
افسانہ	(۱۲۸۲)	فلسفہ (نفسیات و اخلاقیات)	(۶۸)
تاریخ	(۵۶۱)	مذہب	(۸۰۰)
السنہ	(۲۰۷)	سائنس (ریاضی اور آلات سے متعلق)	(۳۸۲)
قانون	(۶۸)	سائنس (مطالعہ قدرت اور دھرم بگری وغیرہ)	(۳۶)
ویدک	(۲۶۴)	جملہ میزان	(۱۲۸۷۹)

اس میں کلام نہیں کہ یہ طمانیت بخش ہے لیکن ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ کچھ علماء نے اور میں نے ہندی کی ضروریات سے متعلق ایک بڑی بھاری فہرست بنائی ہے۔ اور اسے میں نے ہندوستانی اکاڈیمی کو بھیج دیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ جو لوگ ہندی زبان میں ترقی کرنا چاہتے ہیں وہ کامل توجہ سے اسے پڑھیں گے۔ اور ان ضروریات اور کمی کو پورا کریں گے۔ اور

ہندی کو بھی اپ ٹو ڈیٹ بنانے کی سعی کریں گے۔ سائینس اور اس سے تعلق رکھنے والے مضامین کے لکھنے والوں کی راہ میں یہ دشواریاں حائل ہوتی ہیں کہ موزون اصطلاحات نہیں ملتیں۔

ایک اور مضمون پر میں بہت ہی زیادہ زور دینا چاہتا ہوں۔ وہ تاریخ ہے اس کا خوب مطالعہ کرنا چاہئے۔ دور متوسط کی تاریخ اکثر فارسی نویسوں کے ذریعہ لکھی گئی ہے۔ اور ہندوستان کے فارسی مورخین ان ہندوؤں کی بھی بہت ہی کم تعریف کرتے ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو دلی کی گدی دلانے میں امداد دی تھی صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ کی تاریخی سبھا میں میں نے دو مقالے پڑھے تھے۔ ان میں سے ایک میں میں نے اس زمانہ کی ہندی تاریخ کی مدد سے یہ ثابت کرنے کی سعی کی تھی کہ فرخ سیر دلی کا تخت ناگروں کی امداد سے حاصل کیا تھا۔ دوسرے مقالے میں میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ بیر سنگھ دراصل ایک بہت ہی اچھا حکمران تھا۔ یہی بیر سنگھ دیو مدارس کی تاریخی کتابوں میں ڈاکو اور رلیٹرا لکھا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بیر سنگھ دیو نے اکبر کے وزیر اعظم ابوالفضل کو مار ڈالا تھا۔ لیکن ہمیں یہ نہیں فراموش کرنا چاہئے کہ بیر سنگھ دیو نے خود ایسا نہیں کیا، بلکہ ابوالفضل نے اپنی چالوں سے ایسا کرنے کے لئے بیر سنگھ دیو کو بے قابو کر دیا تھا۔ مسٹر توش کرجی کا بیان ہے کہ چارن کا ویوں میں تاریخی مضامین ایک مصرع سے لیکر آٹھ یا دس ہزار مصرعوں تک پائے جاتے ہیں انکی اہمیت تاریخی ہونے کے سبب اور بھی شاندار ہو جاتی ہے کسی چارن کاوے سے کسی تاریخی واقعہ کا پتہ چلتا ہے تو کسی سے کسی مورخانہ تاریخ کا۔ کبھی کبھی یہ تاریخی واقعات کو ثابت کرنے میں بھی مدد دیتی ہیں۔ ایسے چارن کاویوں کا کچھ مجموعہ میری منتخب کتابوں کے پہلے حصہ میں جن کا ابھی ذکر کیا گیا ہے پایا جاتا ہے۔

دوسرا مضمون جس کی جانب ہندی اہل قلم کی توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں وہ ہندی ادب کی اصلاح و درستی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندی کا لغت بہت ہی جامع و بسیط ہے۔ اس میں صحیح معانی کے اظہار کا سب طرح کا مسالہ موجود ہے۔ ہندی کی قدیم شاعری میں تخیلات کی بلندی ہے۔ اور اس میں مذہبی خیالات بہ احسن وجوہ ظاہر کئے گئے ہیں۔ ایشیا کے مذاہب کی تباہی کا تذکرہ اس شاعری میں خوب کیا گیا ہے۔ اس میں فلسفہ اور ادب سے متعلق مختلف کتابیں بھی ہیں۔ ان میں سنسکرت کی کتابوں کی طرح اعلی مضامین حسن طریق پر بیان کئے گئے ہیں اور باوصف اس کے ایسا کرنے میں سنسکرت کے الفاظ کا استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہندی میں الفاظ کی کچھ کمی نہیں ہے۔ اظہار بیان کی قوت بھی انگریزی سے کم نہیں ہے۔ تاہم یہاں

کچھ ایسی چال چل پڑی ہے کہ لوگ عوام کے لئے کتابیں نہیں لکھتے اور اکثر اپنی قابلیت کا اظہار کرنے کے لئے دقیق و مشکل الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام جن کی تعداد کئی لاکھ ہے اسے نہیں سمجھ سکتے اسے صرف سنسکرت کے عالم ہی سمجھ سکتے ہیں جن کی تعداد بہت ہی کم ہے۔

ایک دفعہ انگلستان میں رومانوی مصنفین کا دور دورہ تھا۔ لیکن اس کے خلاف بڑی بھاری یورش ہوئی۔ پہلے لوگ سچی باتوں کو ملمع سازی سے بیان کرتے تھے۔ اس کی مخالفت میں انگلستان کے باشندوں نے صدائے احتجاج بلند کیا۔ اور مصنوعی زبان کی ساری برائیوں کو دور کر دیا۔ جب انگلستان میں "رائل سوسائیٹی" کی بنیاد پڑی۔ تو اس میں زیادہ تر صفائی، سادگی اور سلاست پہ زور دیا گیا۔ سوسائٹی کے اراکین نے ان سب باتوں کو تحریر کے بارے میں اپنا مقصد ٹھیرا لیا اور وہ کامیاب ہوئے۔

روچیسٹر کے بشپ "رائل سوسائٹی" کے اولین مورخ تھے صاحب موصوف نے ایک بار لکھا تھا "رائل سوسائٹی نے اپنے ممبروں کو صاف ستھرا، فطری، موافق مضمون پیرایہ کی طرف خاص توجہ کرنے پر بہت ہی زور دیا ہے۔ سوسائٹی کے اراکین نے ساری باتوں کو علم حساب کی طرح سریع الفہم صاف اور روشن بنانے کی ہدایت کی ہے۔ وہ لوگ عالموں اور بناوٹی زبانوں کی نسبت صناع، عوام اور تاجروں کی زبان کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔"

میرے بیان کرنے کا منشاء یہ ہے کہ ہندی کے اہل قلم کو بھی اسی طرح عمل کرنا چاہیئے۔

اب میں اپنی تقریر کو اسی پر ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ مختلف ساہیتہ سیلنوں کے صدر نشینوں نے ہمارے قومی ادب کی ترقی کے بارے میں آرا کا اظہار کیا ہے اور صلاح دی ہے اس میں کلام نہیں کہ ان کی رایوں اور مشوروں سے ہندی کے اہل قلم نے استفادہ بھی کیا ہے لہٰذا مجھے کامل یقین ہے کہ وہ دن کچھ دور نہیں جب کہ دنیا کے ادب العالیہ میں ہندی ادب ایک اونچا درجہ حاصل کر لیگا۔ اب میں اورینٹل کانفرنس کی کامل کامیابی کے لئے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے دعا کرتا ہوں اور اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں۔

عزازیل کا دربار

از جناب "الف لیلہ"

یون تو ملاحون کے قصے دلچسپ ہی ہوتے ہیں۔ جیسے "سند باد کا قصہ" لیکن ہمارے شط العرب پر دریائی تفریح کے دوران میں ایک عجیب وغریب ملاح سے ملاقات ہوئی جس نے ایک روز شام کا کھانا کھا چکنے کے بعد اپنا پائپ پیتے ہوئے ایک نیم فوق فطری قصے کا آغاز اس طرح کیا۔

"بلال بڑا سخت جان انسان تھا" وہ ہماری برادری ہی کا ایک قوی ہیکل شخص تھا لیکن بے حد درشت مزاج یقین مانئے چین سے لیکر آفریقہ تک کوئی ایسا ساحلی مقام خصوصاً بندرگاہ نہیں تھی جس سے وہ واقف نہ ہو گا۔ سفر کا بڑا شیدائی تھا۔"

ایک روز کا قصہ سنئے۔ غریب بلال مر گیا۔ وہ جہاز کے کسی حصہ پر پھیر رہا تھا کہ اوپر سے ایک موٹا لکڑی کا کندا رسون کو چیرتا پھاڑتا اس کے سر پر نازل ہوا۔ غریب بلال پس کر رہ گیا۔ بلال کے مرنے میں تو کچھ شبہ نہیں جب وہ اٹھایا گیا تو خون میں لتھڑی ہوئی لاش تھی۔ سولی دی گئی، گولی سے ہلاکت ہوئی، چاقو سے بھونکا گیا، اور نہ صلیب پر چڑھا گیا۔ بلکہ اسکی موت صرف ایک معمولی زبردست لکڑی کے کندے کے گرنے سے واقع ہوئی۔ خیال کیجئے کہ بلال جیسا سخت جان آدمی تقریباً ایک آسان موت کا شکار ہوتا ہے! اور پھر ایسی شہرۂ آفاق زندگی کے بعد...... خیر......"

اب اس کے ساتھیون نے کتاب نکالی اور تاریخ ڈھونڈکر اس کے نیچے لکھا بلال ابن عتبی حادثے کا شکار رہا، مقام بحیرہ سرخ" ایک ساٹن کا تھیلا نکالا گیا جس میں بلال کو ڈالکر سی دیا گیا۔ اس کے پاؤں میں لوہے کی دو موٹی سلاخین بھی باندھ دی گئین تاکہ وہ اپنے وقت سے پہلے نہ اٹھ بیٹھے۔ جنازہ کی نماز پڑھائی گئی لیکن جلدی میں کیونکہ جنوب مغرب سے طوفان کے آثار ہویدا تھے، اور کپتان کو محفوظ مقام پر پہونچنے کی خواہش تھی۔ تختے پر رکھ کر ایک دھکا دیتے ہی وہ چلا بلال! سمندر کے عمق کو ناپ چکا، اور گھڑیالون اور مچھلیون کے درمیان جا کر دم لیتا ہے۔

اب دیکھئے کہ بلال مر تو گیا، اور اس کے ساتھیوں نے اس کے حادثہ کو قلمبند بھی کر لیا لیکن بلال کو اس کا علم نہ تھا کہ وہ مردہ ہے جب سمندر کی ہری ہری زمین پر پہونچکر اس نے آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو بلال ابن حبشی ہی تصور کرتا رہا۔ حالانکہ آپ سمجھ گئے ہونگے وہ یہ نہیں تھا بلکہ اسکی روح تھی۔ مذہب سے نا آشنا تو تھا ہی۔ یا کم سے کم ان خیالات کو بھلا چکا تھا ورنہ وہ کیسے بیخبر رہتا تھا کہ وہ روح ہے اور اس کو اپنے شایان حیثیت حرکات کرنی چاہئیں۔

خیر۔ بلال پہلے تو بے حد پریشان ہوا، جو بالکل فطری تقاضا تھا۔ بلال عجیب عجیب اجنبی مقامات میں رہ چکا تھا لیکن یہ اس کے لئے جہان دیگر ہی تھا۔ یہاں دھوپ، ہوا، ابر کا پتہ نہیں تھا بلکہ ہلکی زرد روشنی جو چاندنی سے ملتی جلتی تھی، اور ہر طرح کی مچھلیاں چھوٹی بڑی ادہر ادہر آتیاں جاتیاں، اور بلال کو آنکھیں پھاڑ کر گھورتیاں۔ بلال کو اضطراب ہونے لگا۔

"یہ بھی عجیب طرفہ سرزمین ہے"۔ بلال نے کہا کیونکہ جیسے میں نے کہا وہ مردہ ہونے سے بے خبر تھا۔ "تعجب ہے کہ میں کیسے اس جہنم میں پہونچ گیا"؟

ہاں جب وہ ادہر ادہر دیکھکر اپنے ماحول کو جانچنا چاہتا تھا جیسا کہ اس کی جگہ آپ یا میں ہوتا تو کرتا، اس نے دفعتاً ایک اجنبی کو ایک خم پر بیٹھے دیکھا، بلال مردہ، ہو یا زندہ اس کو طرفہ ترین انسان پاتا ہے۔ کیونکہ اس کے سر کے گرد ایک بڑا عمامہ بندھا ہوا تھا، ایک آنکھ پر سیاہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ پاؤں میں موٹا سمندری جوتا گھٹنوں سے اوپر پہونچ رہا تھا اور ایک سفید ڈھیلا ڈھالا پائجامہ پہنے ہوئے تھا۔ کمر میں ایک ڈھلی تھی، جس میں دو پستول اور ایک زنگ آلود چھرا لٹکا ہوا تھا"

"اچھا۔ تم بھی" اس نے اپنی ایک آنکھ کو بلال کی طرف گھما کر کہا۔

"اچھا تم بھی" بلال نے جواب دیا۔

"کس مقام سے آ رہے ہو" سیاہ پٹی والے نے پوچھا۔

"سورت سے" بلال نے کہا۔ گو میں یہ نہیں جانتا کہ کس شیطان نے مجھے یہاں لا ڈالا اور یہ کون مقام ہے؟"

"خوب! دوسرے نے جواب دیا "تم مردوں میں پہونچ گئے ہو، یہ وہی مقام ہے"

"لیکن میں مرنے کیوں چلا تھا" بلال کہتا ہے۔

اس پر سیاہ پٹی والا ہنسنے لگا۔ بلال کو اس طرح بناتے ہوئے کہ اگر بلال روح نہ ہوتا تو انتقام لینے پر آمادہ ہو جاتا۔

"اگر اب تم مردہ نہیں ہو تو پھر کبھی نہیں ہو سکتے" اس نے کہا "ہم سب یہاں مردے ہیں۔ ہر ایک ماں جایا۔"

"مردہ"! بلال چیخ کر کہتا ہے۔

"ہاں مردہ، دوست مردہ"

خیر اس سے بلال اپنے کو مردہ سمجھنے پر مجبور تو ہو گیا لیکن عجیب کرب کی حالت میں مبتلا ہو گیا۔ آپ خود سوچئے۔ کیا محسوس کرو گے جب آپ اپنے آپ کو زندہ تصور کر رہے ہو اور کہا جائے کہ تم مردہ ہو"

"تو پھر میں کبھی اپنی تنخواہ نہیں اٹھا سکوں گا اور نہ زمین کو دیکھ سکونگا"! بلال نے گویا اپنے آپ سے کہا۔

"کبھی نہیں دوست کبھی نہیں" سیاہ پٹی والے نے کہا "اب تمہیں یقین ہوا۔ تم مردوں میں ہو اس کو سمجھ رکھو" اور پھر وہی ہنسی ہوئی جو کراہنے سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔

"چلو دوست چلو" اس نے بلال کی غمگین نظروں کو دیکھ کر کہا "خوش ہو کہ تم کو ہم جیسوں کی نیک صحبت نصیب ہوئی۔ ادھر نوفل ہیں۔ اس طرف کو چلو جہاں کپتان طارق اور امیر البحر عیسٰی ہیں۔ ہاں ہزاروں اور بہتر اور بدتر انسان بھی ہیں"

غرض بلال بے دست و پا ہو کر سیاہ پٹی والے کے پیچھے پیچھے جاتا ہے حتیٰ کہ وہ ایک غار نما کے قریب جا پہونچتے ہیں۔

"تمہارا نام کیا ہے" یکایک سیاہ پٹی والا دریافت کرتا ہے۔

"بلال ابن عقبی" بلال کہتا ہے۔

"خوب! اب ہم اندر چلے چلیں گے" سیاہ پٹی والا کہتا ہے لیکن ڈھانچی انگلی بلال کی طرف اٹھا کر وہ کہتا ہے "دوست ہوشیار رہو، اپنے جبڑوں کو مضبوط پکڑے رہو جب تک تم سے نہ کہا جائے منہ نہ کھولنا بس اب خاموش رہو"

وہ اندر گئے۔ بلال غار کی وسعت کو دیکھکر حیران ہو گیا حقیقت یہ ہے کہ وہ اس قدر

وسیع تھا کہ اس کی حدیں ناپید اور پہلو غائب تھے جس طرف اس کی نگاہ اٹھ گئی اس نے آدمیوں کو شطرنج، گنجفہ کھیلتے ہوئے سکے اچھالتے ہوئے اور دوسرے تمام چپ چپ کھیلوں میں مشغول پایا۔ اکثر تمباکو اور شراب پی رہے تھے جس کی بو سے بلال نے پہچان لیا کہ قیمتی ہے۔

یہ عجیب مجمع تھا بعض سر سے رومال باندھے ہوئے تھے اور سیاہ پٹی والے کی طرح ان میں سے اکثر بھدے موٹے موٹے سمندری جوتیاں اور بعض کیانولیس کے گھاگرے پہنے ہوئے تھے کسی کے بال چوٹی میں گوندھے ہوئے اور کسی کی زلفوں کی شکل میں جمے ہوئے تھے۔ ان میں سے کئی ایک آنکھ، ایک پاؤں اور ایک بازو رکھتے تھے، رنگ بھی ان کے مختلف تھے، کالے گورے گندمی، زرد، اور وہ یا تو خم پر بیٹھے ہوئے تھے یا زمین پر دراز۔

ان میں سے ایک نے دفعتاً کہا۔ "گھنٹی بجاؤ"

سیاہ پٹی والا ایک بڑے جہاز کے گھنٹے کے قریب گیا جو ایک شکستہ تختہ جہاز سے لٹکا ہوا تھا اور ایک ہتھوڑے سے تین زور لگائے جس پر سبھوں نے پینا اور کھیلنا موقوف کر دیا۔ ایک بھی نہیں ہلتا تھا۔

گھنٹے کی گونج ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ کمرہ کا دروازہ کھلا، اور ایک ایسا قوی ہیکل آدمی باہر نکلا کہ بلال نے شاید ہی دیکھا ہو۔ اس کا قد سوا تین گز لمبا، لانبی ناک طوطے کی چونچ کی طرح خمیدہ، پیلے دانت، آنکھیں آگ کے ڈلے، اور تیور ایسے تھے کہ بلال خوف سے تھرانے لگا ٹیلہ پر چڑھتا ہے اور ایک خم پر آسن جماتا ہے۔ اس کے پیچھے سے ایک ظریف نمودار ہوا جسکی آنکھوں پر زبردست چشمے لگے ہوئے سر پر بھاری ٹوپی تھی جس سے سر ایک طرف جھک گیا تھا۔ یہ ظریف ہتھوڑے کو اٹھا کر ایک دفعہ گھنٹے پر مارتا ہے۔

"خاموش"! اس نے کہا، حالانکہ اس وقت کسی کے سانس کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ خاموش! حضور ہیبت مآب عزازیل رونق افروز ہیں۔

"یہ نیا رکن کون ہے"؟ عزازیل نے ایسی آواز میں دریافت کیا گویا وہ دور سے تار کے ذریعہ کہہ رہا ہے۔

اس پر سیاہ پٹی والا چہرہ پر کی لٹوں کو سنبھال کر زمین بوس ہوتا ہے اور مودبانہ بلال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

"نام؟" عزازیل نے بلال کی طرف متوجہ ہو کر اس طرح کہا، غریب ایک بے سہارا پتے کی طرح ہلنے لگا۔

"بلال ابن عقبیٰ خداوند" بلال نے بہ مشکل جواب دیا۔

"حضور کہ حضور" ظریف نے ڈانٹ کر کہا۔

"کتاب لاؤ۔ جلد چار ہزار چھیاسی" عزازیل نے حکم دیا۔

اس پر دو شخص ایک زبردست ترین کتاب جو بلال کی نظروں سے گذر سکتی تھی لیکر حاضر ہوئے۔ اور مسخرہ ظریف اوراق الٹنے لگا۔

"ب، ب، ب" وہ گنگناتا جاتا ہے۔

اور بلال، بلال، یہ لو یہ نکل گیا۔ بلال ابن عقبیٰ پیدائش سنہ انیس لاکھ چوبیس ہزار اخراج[1] حضور ہیبت مآب یہ تم ہو" ظریف نے عینک کے کناروں پر سے نظر دوڑا کر بلال سے دریافت کیا۔"

"ہاں جناب" بلال جواب دیتا ہے۔ اور، اور۔

"اس کا عمل نامہ کیا ہے؟" عزازیل نے دریافت فرمایا۔

اس پر ظریف نے بلال کے جرائم اور سیاہ کاریوں کو یکے بعد دیگرے پڑھنا شروع کیا۔ اور میری بات پر یقین کیجئے کہ ظریف کو عمل نامہ ختم کرنے کے لئے کچھ وقت صرف ہوا۔ دوسرا ورق الٹنے کے لئے جب وہ رکتا ہے۔ تو بلال دیکھتا ہے کہ حاضرین میں سے ہر ایک بشمول عزازیل اسکی طرف خوش اور دوستانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے وہ بھی مطمئن ہو گیا کہ اب کوئی دم میں دوزخ کے ہمراہ شراب نوشی اور قمار بازی میں مصروف ہو جائیگا۔"

یہاں تک تو نہایت قابل قدر اعمال ہیں عزازیل نے بلال کی طرف دیکھکر فرمایا لیکن بلال! بھول نہ جانا کہ افتخار کے قابل نہیں"۔ ظریف پھر پڑھنا شروع کرتا ہے۔

"سن بتیس[۲۲] سال ارتکاب بغاوت اور قتل عمد۔ سن اڑتیش[۳] سال" وہ یکایک رک گیا اور بلال کے جسم میں رعشہ محسوس ہونے لگا۔ ظریف آہستہ اور سنجیدہ لہجے میں پڑھنے لگتا ہے۔

"عمر اٹھیس سال۔ طوفان کی حالت میں جہاز سے کود کر ایک لڑکی کی جان بچائی۔" ہر طرف خوفناک خاموشی چھا گئی۔ اور بلال نے دیکھا کہ ہر ایک کے تیور بدل گئے

---

[1] اخراج سے مراد اخراج عزازیل از بہشت ہے۔

ہیں۔ دوستانہ نظروں سے دیکھنے کے بجائے اب وہ اس سے نفرت کرنے لگے تھے۔ اب اس کو یقین ہو گیا کہ آتش سیال کا لطف تمباکو کی خوشگوار بو، قمار بازی کا دلچسپ مشغلہ اس کے لئے نہیں۔

"بلال کیا یہ صحیح ہے"؟ غصہ سے عزازیل نے کہا۔ بلال نے جھوٹ کہنے کی کوشش کی لیکن الفاظ اس کے حلق میں پیچیدہ ہو گئے۔

"بلال تو بڑا بد معاش ہے" عزازیل گرجنے لگا۔

"بدنصیب میرے سامنے سے نکل جا تو اس مقام کے شایان نہیں"

بلال کو دھکا محسوس ہوا۔ اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ڈر رہا تھا کہ اب کیا بلا نازل ہوا چاہتی ہے۔ لیکن آخر کار جب اس نے آنکھیں کھولیں، تو کیا آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ اُس نے کیا دیکھا؟

اس نے دیکھا کہ ایک عالیشان مرمریں شہر ہے مکانات کی چھتیں سونے کی اور دیواریں چاندی کی بنی ہوئی ہیں۔ ہر طرف خوبصورت فرشتے سفید لباس میں اپنے بازوؤں کو پھڑ پھڑاتے اِدھر سے اُدھر آتے جاتے تھے۔ دریا میں پانی کے بجائے دودھ اور شہد خالص دوڑ رہے تھے پرندوں کی آوازیں کیا تھیں بہترین موسیقی کا ارغنون تھا جس سے "سلام علیکم طبتم فادخلوھا خالدین" ترانے مدھم سروں میں سنائی دیتے دکھائی دیتے تھے۔

بلال ششدر کھڑا دیکھ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے، اتنے میں ایک حسین ترین فرشتہ اس کی طرف خراماں خراماں نازل ہوا۔ اور حلۂ بہشتی اس کو دیا۔ اب بلال کو معلوم ہوا کہ وہ کہاں ہے۔

"بلال" اس حسین فرشتے نے کہا "بہشت میں تمہارا آنا مبارک ہو"

بلال نے غور کیا تو دیکھا ہے کہ یہ حسین فرشتہ وہی لڑکی ہے جس کی جان اس نے سمندر میں بچائی تھی۔ اب وہ پورا بیوقوف تھا۔

علاوہ اُس وقت کے تاریخی ماحول کا اندازہ بھی لگ جاتا ہے۔

رہبر راہ دین ملک صاحب — از جہان شد چو عازم رحلت
سال فوتش رقم نمود سخن — نور افزائے گلشن جنت

۱۲۰۸ھ

(۲)

پئے سیر محمد برکت اسد — مہیّا مسکن فردوس بادا
خرد فرمود تاریخ وفاتش — نصیبش گلشن فردوس بادا

۱۲۱۰ھ

(۳)

ہمچوں مرداں چو میر جانِ امیں — فرس خویش زین کلا بہ جہاں ند
سال فوتش رقم نمود خرد — وائے آں فاضل زمانہ نماند

۱۲۲۶ھ

(۴)

تا محمد رضا براہ رضا — یا بحقیقہ در شہ وفات گزین
گفت تاریخ رحلتش ہاتف — نازل مسکن بہشتِ برین

۱۲۲۷

(۵)

رفیع الدین و قطب الدین ز عالم — سفر کردند با چند نیک نامی
پئے تاریخ آں ہر دو مقدس — خرد فرمود شیخین گرامی

۱۲۳۱ھ

(۶)

شد چو از دنیائے دوں رحلت گزین — مسکن سید محمد خلد شد
گفت رضوانِ جناں سالش چنیں — مامنِ سید محمد خلد شد

۱۲۳۵ھ

(۷)

زہے سعادت عبد الکریم مولانا — کہ نقد زندگیش صرف راہ سرور شد
سروش از پئے سالِ شہادتش فرمود [1] — بیوم ماہ محرم شہید اکبر شد

۱۲۳۸ھ

(۸)

ہر گاہ بہ سجدہ آں عبادت آئیں — بسپرد بحق متاع جانِ شیریں
جاں ز تن چو رفت سالش بہ چنیں — آسودہ بہ خلد مولوی قمر الدین

۱۲۳۹

---

[1] [illegible]

تذکرہ شعرا نقش (قلمی) میں ان کا حال اس طرح لکھا ہے :-

سخن تخلص شاعر عالی مقام میر غلام مصطفیٰ نام بمشورۂ سخن با چھمی نارائن تخلص صاحب می کرد طبعش بر جادۂ استقامت روان، کلامش از طلب دیابس برکران، وصفش مرغوب پسندیدہ، طرزش دل کش و سنجیدہ۔ از اشعار آبدار ایشان است (انتخاب) ؎

نہ ایسا بے خود و بے ہوش دیوانہ سمجھ مجھ کو — بکار خویشتن ہشیار و مستانہ سمجھ مجھ کو

یاقوت سے مرجان بھی گو سرخ زیادہ ہے — پر لعل لب جاناں دو سرخ زیادہ ہے

اشک سے چشم تر نہیں جلتے — گرم پانی سے گھر نہیں جلتے

حضرت آصف جاہ ثانی (جلوس ۱۱۷۵ھ۔ وفات ۱۲۱۸ھ) سے ان کی شاعری کا دور شروع ہوتا ہے اور حضرت آصف جاہ رابع (جلوس ۱۲۴۴ھ۔ وفات ۱۲۷۳ھ) کے عہد تک ان کی عمر (۹۹) سال ہوتی ہے جو زیادہ تر قرین قیاس ہو کر اوسط عمریات کا تقریباً صحیح صحیح پتہ دیتی ہے حضرت آصف جاہ ثانی کا دُر بار دربار بعض ملکی نظم و نسق کے اعتبار سے "شعر و شاعری" کی طاق نسیان کے لئے آگرہ" کا سا میدان نہ تھا پھر بھی کچھ اورنگ آباد کے اور کچھ باہر کے شعرا بادشاہ اور وزیر (ارسطو جاہ) کی قدر سخن کی بدولت یہاں جمع ہو گئے، دہلی کی اینٹ سے اینٹ بج جانے کے بعد لکھنو اور حیدرآباد ہی علم و فن اور دولت و حکومت کے مرکز تھے اور جب لکھنو میں نواب آصف الدولہ کا آخری زمانہ شروع ہونے لگا تو پھر حیدرآباد ہی مامن و ملجا نظر آیا حضرت آصف جاہ ثالث (جلوس ۱۲۱۸ھ۔ وفات ۱۲۴۴ھ) کا عہد حکومت مہاراجہ چندو لال شاداں وفات ۱۲۶۱ھ کی وزارت اور اس کے ساتھ قدردانی سخن سونے پہ سہاگہ تھی سخن بھی اورنگ آباد سے آصفی برکات کے فیوضات حاصل کرنے کے لئے آ گئے ہونگے یہاں آتے ہی آصف جاہ ثانی کے شہزادوں عالی جاہ، فریدوں جاہ، کیوان جاہ کا تقرب میسر ہوا۔ ارسطو جاہ (وزارت ۱۱۹۵ھ۔ وفات ۱۲۱۹ھ) میر عالم (وزارت ۱۲۱۹ھ وفات ۱۲۲۳ھ) منیر الملک (وزارت ۱۲۲۴ھ۔ وفات ۱۲۴۸ھ) اور چندو لال وزرا کے دربار میں باریاب ہوئے، امرا کے پاس رسائی نصیب ہوئی۔ ایک قصیدہ میں اضافۂ معاش کی استدعا یوں کی ہے ؎

[illegible] — کہ عرض حال اپنا یہاں سے تو [illegible]

شش سال سے زیادہ گزرے کہ آجتک ہوں — محوِ دعائے دولت روزانہ اور شبانہ
اس حشم پر کہ چشم ہم چشم ہیں یہ عزت — رہیئے کرم سے تیرے محفوظ جاودانہ
سوا اس معاش پر تو ہے ممتنع کہ حضرت — داخل کم اور افزوں ہے خرچ ماہیانہ
ہو جائے اب اضافہ ایسا کہ حسب خاطر — دل سے ادا کروں تا اک شکر کا دوگانہ

ایک دوسرے قصیدے میں معافی اسپ کی درخواست کی ہے:-

صاحبا! بندہ پرورا! تیرا — بس کہ پروردۂ کرم ہے سخنؔ
کہ سر مو اٹھا نہیں سکتا — بار احسان سے سر و گردن
لیک اتنی ہی عرض ہے تجھ سے — اے کرم بخش و چارہ ساز من!
فکر سائیس و فکر دانہ و کاہ — جاں گزا ہے زبس کہ او رجان کن
عینِ جاں بخشی و عنایت ہے — گر سخنؔ کو معاف ہو توسن

امرا میں دو امیروں کے نام لئے ہیں۔

شاہ دکن سے ہم کو مطلب نہیں سخنؔ اب — ہے شاہ یار[1] ہی بس شاہ دکن ہمارا
ہائے وہ عبدالکریم[2] ہائے اکبر یار جنگ[3] — سر گیا۔ ہم سر گیا یہ بھی گیا وہ بھی گیا

پیر اشرف اور شمس الدین یہ دونوں حضرات شاید بزرگ تھے، ان کی مدح بھی کی ہے
شعرا معاصر سے چشمک بھی تھی کہتے ہیں ؎

سخنؔ کے شعر سن کے محفل ارباب معنی سے — خجل ہو لطف[4] نکلا اک طرف یکسو صفا[5] نکلا

ایک قطعہ بھی چشمک کی ہے۔

جہلا دیکھ کر مجھے غیور — مستِ کبر و غرور کہتے ہیں
اور بے غیرتوں کو۔ یہ کج فہم — عاقل و ذی شعور کہتے ہیں
ہیں۔ انھیں کیا کہوں کہ ان کو سب — آدمیت سے دور کہتے ہیں
لطف تو یہ کہ غائبانہ نہیں — صاف ان کے حضور کہتے ہیں
ایک میں ہی تو یہ نہیں کہتا — تا اناث و ذکور کہتے ہیں
حق تو یہ ہے کہ مردم بینا — نور کو عینِ نور کہتے ہیں

---

[1] ان کے حالات کے لئے دیکھئے گلزار آصفیہ صفحہ ۲۹۵۔ [2] وہی مولانا شہید ہوں گے جن کا ذکر اوپر بھی آ چکا ہے۔ [3] گلزار آصفیہ صفحہ ۱۹۶۔ [4] مرزا علی لطف صاحب گلشن ہند ان کے بیانات دوسری جگہ دیکھئے۔ [5] میر دو الفقار علی ان کا تخلص صفا تھا گلزار آصفیہ صفحہ ۴۲۶

کور خورشید کو نہیں کہتے شپرک ہی کو۔کور کہتے ہیں

ناقدر دانی وطن کی بھی شکایت ہے

حُبّ وطن سے فائدہ بھی کچھ سخن! گذر کہتے ہیں قدر دانی جسے کم بہت ہے یہاں

طبیعت پر فارسی کا رنگ زیادہ غالب تھا۔ "ریختہ گوئی" اصل جوہر نہیں، خیالات فارسی سے لینے کی کوشش کی ہے:۔

بردر دوست چہ گویم بچہ عنوان رفتم ہمہ شوق آمدہ بودم۔ ہمہ حرمان رفتم

میں اپنی آمد و شد کی حقیقت کیا کہوں تجھ سے

ہمہ حرمان گیا تھا۔ پھر سراپا آرزو آیا

صد ہزار لعل و گہر می دہی چہ سود؟ دل را شکستئی نہ کہ گوہر شکستئی

پھر بھی ہو سکتا نہیں عشر عشیر اے دل شکن!

لعل دیوے تو اگر تاوان اس دل کے عوض

فارسی دیکھیے کیسی کہتے ہیں:۔

خود را بدرد عشق تو افسانہ ساختیم چون شمع سوختیم بہ پروانہ ساختیم

با این نامحرمی رسوائے عالم کرد باز این دل نمی دانم چہا می کرد اگر ہم رازمی کردم

آزردہ گشت بے سبب آن بے وفا چہ کرد؟ تحقیق ہم نہ کرد کہ عاشق خطا چہ کرد؟

از دیگراں چہ شکوہ؟ با این غم گسار ہم دل کرد۔ ہرچہ کرد بمن۔ دل با چہ کرد؟

دیگر ازین مپرس تو اے ہمدیدۂ سخن آنچہ کردہ ایم با او۔ او بما چہ کرد؟

شاعری اور "ریختہ گوئی" کے متعلق کہتے ہیں:۔

مضمون کی تلاش تو بالکل ہی اٹھ گئی ٹھہری بنائے شعر فقط صاف بات پر

نادم ہے جو تو اے سخن! اب ریختہ کہہ کر کس نے تجھے بولا تھا کہ تو فکر غزل کر

سخن کی سخن سنجی کا معیار مضمون آفرینی ہے یا "صاف بات" یہ دونوں پہلو اس ایک شعر میں موجود ہیں۔ کلام کے بالاستیعاب مطالعہ سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ پہلے اقتضائے وقت کے لحاظ سے وہ "مضمون آفرینی" کرتے تھے مگر بعد کو ماحول بدل جانے سے "صاف بات" پر اتر آتے ہیں۔ "صاف بات" زیادہ پسند کی ہے اور انتخاب کلام میں یہی سخن کی

صفائی سخن مدنظر ہے۔ اس "ریختہ گوئی" کے انکسار کے باوجود اپنی طرز سخن کی نسبت سخن سے رہا نہیں گیا ؎

سودا تو نہیں کہوں جو سودا جانو	یا میر کا تم نظیر و ہمتا جانو
لیکن بہ خدا سخن کو اپنے یارو	شاگرد رشید میرو مرزا جانو

شفیق اورنگ آبادی کی معنوی شاگردی کے علاوہ میر و مرزا کی طرز پسند ہے ؎

منکر محض ہیں جو طرز سخن کے سودا	ان کی خدمت میں لئے میر غزل جاؤنگا

سخن، شفیق کے شاگرد۔ سخن کے شاگرد رضا حسین رضا، ڈاکٹر احمد حسین مائل دکنی کے والد ماجد اور مائل دکنی حیدرآباد کے مسلم الثبوت استاد۔ اب قارئین کو سخن کا کچھ اور حال معلوم ہو تو وہ لکھیں۔

(عمر یافعی)

دیوان کی پہلی غزل

گرچہ گہر سے کیسہ معمور ہے زباں کا	پر حمد حق میں کوئی مقدور ہے زباں کا
یہ وہ مقام ہے یہاں خامش رہے تو خوش تر	معجز بیانیاں گو دستور ہے زباں کا
آداب نعت احمد فطرت گداز ہے بس	جون شمع آب ہونا کیا دور ہے زباں کا
رتبہ دل و زبان کا کیا پوچھتے ہو ہم سے	قدرت ہے جو کہ دل کو مقدور ہے زباں کا
غیر از بیان شیریں کچھ اور ہو تو کہیئے	یہ ہی تو ایک جوہر مشہور ہے زباں کا
دل کی فضیلتوں سے واقف ہیں اہل دل ہی	جائے ادب ہے۔ یہاں کا مذکور ہے زباں کا

با این ہمہ فضائل نوبت ہے یہ تو دل کی
گونگے کی طرح بالکل معذور ہے زباں کا

شبیہ شاہد دیوان سخن اول خواہ لکھئے گا	بجائے مد آبرد۔ مد بسم اللہ لکھئے گا

اس شعر پر دیوان کا صفحہ ختم دوسرے صفحے سے دوسری غزل شروع ہوتی ہے۔ کم سے کم یہاں سے ایک ورق غائب معلوم ہوتا ہے۔

دیوان کا پہلا قصیدہ

بجائے خوش ہے بشاشت ہر صغیر و کبیر	خیال عام کر اپنے سمجھ خیال اسیر

کسو کو بلبل آمل سے دعوے سبقت — کسو کو نشۂ رجحان بہ طوطیٔ کشمیر
کسو کو نسخ مضامین بے دلی پر ناز — کسو کو معنیٔ صاحب مسیح کی تدبیر
کسو کو سلخ ادائے کلیم پر پندار — کسو کو نقل نظیری ہے باعث توقیر
تراش معنیٔ شوکت کسو کو ہے ملحوظ — کسو کو مصرع خاطر خراش جان ضمیر
کسو کو طرز ظہوری ہے چشم استنباط — کسو کو مشغلۂ اقتباس شعر میر
کسو کو اخذ فصیحی کے شعر سے مرکوز — کسو کو مد نظر دردی[1] کلام نظیر
فقط انھیں پہ نہیں اکتفا چراتے ہیں — ....
غرض بایں ہمہ گر آوری ہیں بے مایہ — غنی اگرچہ ....
ستم تو یہ ہے باین گدائی مضموں — ہنوز بوئے شہی ہے دماغ میں ہاگیر
بجائے خویش ہیں گل چین عقل پر مجھ سے — جو بو چھیئے تو یہ کناس ہیں نجاست گیر
بزعم عطر کش غنچۂ معانی ہیں — نہیں مشام سے نکلی اگرچہ بوئے سیر
ہوئے معلم ملکوت یہ جہاں ان کے — تلامذے میں ہوئے چند طفل ذی ویر
مزخرفات سوا اپنے اور اہل سخن — پسند ہی نہیں ان کے کسو کا شعر شعیر
کبھو بھو ن متکلم کسو سے جز ایما — کریں بقاعدہ کم صلا ہیم تقریر
غرض یہ تعمیہ گوئی سے غرض جو ہر ہے — سوائے اس کے نہ ہو کوئی استفادہ پذیر
ہوا تغافل و اغماض کے سر محفل — کریں کسو کی نہ تعظیم و کید کر توقیر
حقیقتًہ تو یہ کرپاس باف ہیں یکسر — ہے بس یہ دعوے بافندگی خز و حریر
نہیں عزیز تر ہو جو طبع زاد سے ان کی — تو پھر وہ یوسف و یعقوب پر دوا تحمیر
نظر کریں نہ ادا پر خطا کو صاف کہیں — زبس کہ ہیں یہ ہنر منکر اور عیب پذیر
مآل معنیٔ بے گانہ پھر کسو کا ہو — ملاحظہ نہ کریں یہ سگان آہو گیر
.... — دو بارہ آنا نہ سینن اور کریں تنخوض بعیر
.... — تلامذے سے پڑھے شعر لوچ دبے تاثیر

---

[1] اصل دیوان میں اوراق کے کونے ترشے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے مصرعوں کے مصرعے کام آ گئے ... ہر جگہ ... مصرعے ترش جانے سے ہے۔ ... روپ۔ ... پر ی رو۔

. . . . . . بصدائے بلند فرماوین — زہے تلاش زہے معنی و زہے تعبیر

برنگ نقش قدم در پئے شکست ہم — بسان جادۂ بے قطع یکدگر ہیں دلیر

سخن بخموش تظلم سے داد خواہ نہ ہو — سوائے شاہ عدالت پناہ عرش سریر

زہے جناب کہ دیوان عدل میں جس کے — ہے ذرّہ ذرّہ بھی مہر منیر۔ مہر منیر

علیم علم لدنی۔ علی عالی قدر — وصی احمد مرسل سمیٔ حی قدیر

علی نبی ہے۔ نبی ہے علی یقین یہ ہے — علی کی ذات شکر ہے اگر نبی ہے شیر

عدیل ہم جو یہ خود ہوں تو ہوں سوا اس کے — نہ ہے عدیل علی کا نہ ہے نبی کا نظیر

زہے سعادت اگر نعت و منقبت میں ہو — باعتقاد صفا مطلع دوم تحریر

علی حلیم و سلیم و نبی قدیم و قدیر
علی جمیل و جلیل و نبی سمیع و بصیر

علی کریم و شجیع و نبی خلیق و شفیق — علی امیر۔ نبی ہے امیر کل امیر

علی ہے حاشیہ وہ ہے نبی بجائے متن — علی ہے "باب" منطا اور نبی "مدینہ" نظیر

علی ہے حاضر و ناظر۔ نبی علیم و کلیم — علی ہے قایم و دایم۔ نبی بشیر و نذیر

علی امام ہما اور نبی ذوالاکرام — علی . . . .

علی ابوالحسن وہ ہے نبی ابوالقاسم — علی عجیب و . . . .

علی ہے ہم سر ہارون نبی کلیم اللہ — علی وزیر۔ نبی پادشاہِ عرش سریر

علی ہے ماحیٔ کفر و نبی ہے حامیٔ دیں — علی ہے غافر جرم اور نبی ہے عذر پذیر

علی ہے روح مجسم نبی ہے جان روح — علی ہے ترجمہ۔ ذات نبی کلام قدیر

علی ہے دُرّ ثمیں۔ اور نبی ہے دُرّ یتیم — علی ہے بدر منیر۔ اور نبی ہے مہرِ منیر

علی ہے جوہر ذات نبی حسام اللہ — علی ہے بُرّشِ شمشیر۔ اور نبی شمشیر

علی مُعینِ ازل۔ اور نبی مُمدِ ابد — علی ہے اولِ اول۔ نبی اخیر اخیر

علی تمام نیاز۔ اور نبی سراپا ناز — علی خمیر وفا۔ اور نبی صفا تخمیر

علی کشندۂ کفار۔ اور نبی رہبر — علی جوان (و) جوان مرد اور نبی ہے پیر

علی ہے مصدر لطف۔ اور نبی ہے مہبط وحی — نبی تمام . . . . . .

علی ہے نکہت گل۔ اور نبی ہے دستۂ گل — علی ہے نور سراج۔ اور نبی سراج منیر

دلا خموش! کہ طول سخن ہے ترک ادب — علی نبی سے کر اظہار مدعائے ضمیر

.... — گناہ عفو مرے از صغیر (و) تا بہ کبیر

.... — بروز مرگ نجات اور بروز حشر[1] ظہیر

سوائے اس کے مُلقّب بنامۂ "غفران" — رہے یہ نظم مرا پایہ دار و عالمگیر

سخن! اشتاب کہ ہے وقت خاص بہرِ دعا — کشادہ ہے درِ اقبال و منتظر تاثیر

سپہر۔ تا مہ و انجم سے ہے بزینت و زیب — زمین۔ تا کہ ہمہ دم ہے انتظام پذیر

رجوع۔ تا کہ بہ آہن رہا ہے آہن کو — چراغ کا رہے پروانہ جب تلک تسخیر

چکور۔ چاند پہ تا غش ہے اور گل خورشید — پھرا کرے بہوس سوئے آفتاب دلیر

کلاہ فرقِ محب، پر توِ ہلال عید — اتا قۂ سرِ حاسد ہو سایۂ شمشیر

غزلیات

دلا! امید وفا پہ اس سے کہہ کے کب تک ملا کرے گا — کسو سے اس نے وفا کیا ہے؟ کہ تجھ سے ناداں! وفا کریگا

شروعِ الفت تجھے نہ اے دل! جتا دیا تھا کہ اس سے مت مل — وگرنہ ہو گا نباہ مشکل جو دل لبھا کر[2] دغا کرے گا

خدا ہی پر ہے کہ اب شفا ہو تپ محبت جو یہ بلا ہو — طبیب عاجز نہ ہو تو کیا ہو غریب کب تک دوا کریگا

ہمیں تم اپنا جو کر رکھو گے کرم کی ہم پر نظر رکھو گے — بھلے برے کی خبر رکھو گے، خدا تمہارا بھلا کریگا

اگر ہم ایسے ستم سہیں گے تو لوگ کہئیے کہ کیا کہیں گے؟ — یہی رہے گا کہ ہم رہیں گے رقیب دیکھیں تو کیا کریگا

سخن! اگرچہ افادہ ہوگا حصول؟ کا ارادہ ہوگا — یہ دردِ سر بھی زیادہ ہوگا جو سر پہ سایہ ہما کریگا

استاد نے جس دم نقطہ نقطہ درسِ وفا تکرار کیا — دیوانہ کیا صد عاقل کو مدہوشوں کو ہشیار کیا

صورت گر نے طرح کیا جب صورت اپنی صورت پر — اعجاز مسیحی لب کو بخشا آنکھوں کو بیمار کیا

عشاق کیا عشاقوں کا مشتاق کیا مشتاقوں کا — محبوب کیا محبوبوں کا دل داروں کا دلدار کیا

معذور ہمیں اب رکھئے گا آ جائے جو منہ پر اندر و بیرون — اک جام پلا کر ساقی نے سرشار مئے اسرار کیا

اسرار حقیقت ہستی میں بے خواست زباں پہ جب گذرا

اکثر نے کیا انکار سخن۔ اور بعضوں نے اقرار کیا

---

[1] نقل ہے؟ — [2] انکار۔

نہ ڈریئے یار سے، جتنا بدآموزوں سے ڈریئے گا | لگادیں آگ شاید آتش افروزوں سے ڈریئے گا
لگادیں آپ ہی اور آپ ہی دوڑیں بجھانے کو | خدا محفوظ رکھے۔ ایسے دل سوزوں سے ڈریئے گا
فزوں ہے زخم سوزاں سے اذیت زخم پیکاں کی | نہ ڈریئے زخم دوزوں سے جگردوزوں سے ڈریئے گا

سخن! ایام ہجراں ہیں کہ ایام مصیبت ہیں
غرض یہ ہے کہ تا مقدوران روزوں سے ڈریئے گا

خال۔ اس سرخ گال میں کالا | مثل لالہ ہے۔ لال میں کالا
ہاتھ آ ہی گیا تھا۔ اُلجھی زلف | بچ گیا۔ بال بال میں کالا
رنگ۔ اس دل جلے کا مت پوچھو | ہو گیا۔ حال حال میں کالا
خال۔ رُخ پر جو وہ بتاتا ہے | کچھ تو ہے۔ آج دال میں کالا

یا یہ اسپند کا دھواں ہے سخن؟
بال ہے یا یہ خال میں کالا

کچھ سبب اجتناب کا نہ کھلا؟ | رازِ خشم و عتاب کا نہ کھلا؟
کس کی زلفوں نے دل کو پیچ دیا | پیچ اس پیچ و تاب کا نہ کھلا؟
بتلائے محاسبہ تو ہوئے | پر خلاصہ حساب کا نہ کھلا؟
آہ! مافی الضمیر آج تلک | دلِ خانہ خراب کا نہ کھلا؟

فائدہ کیا مطالعہ سے سخن؟
جب کہ مطلب کتاب کا نہ کھلا؟

ساتھ۔ کیا پیرہن نہیں دیتا | جانِ من! تن بھی تن نہیں دیتا
کس قدر بدگمان ہے گل رو | حکمِ سیرِ چمن نہیں دیتا
دلِ خانہ خراب چین مجھے | ایک دم جانِ من نہیں دیتا
زندگی کس طرح بسر کریئے؟ | اس چرخ کہن نہیں دیتا

آہ! ظالم ہیں کس قدر یہ لوگ
کوئی دادِ سخن نہیں دیتا

انتخاب اشعار

آہ! کچھ لطف ملاقات کا پایا نہ گیا
ہم کچھ ایسے ہوئے بے خود بخود آیا نہ گیا

یہ تو پھر زخم جگر ہے نہ سیا جاوے گا
اک گریبان ہی جب ہم سے سلایا نہ گیا

ہم نے اگرچہ چھوڑا ملنا پری وشوں کا
پر بدظنی نے تیری اے بدگمان! مارا

پاس بندگی جس کو مد نظر نہ ہووے
وہ بے ادب الٰہی! جاوے ہجران مارا

آخر سراغ اس کا دل ہی میں اپنے پایا
جس کے لئے سخن نے عالم کو چھان مارا

خانہ خرابیاں ہوئیں جتنی کہ آج تک
آنکھوں ہی نے کیا، دلِ مضطر نے کیا کیا؟

حاسد کے شعر خوب کو بد کس طرح کہیں
کد ہے شکر فروش سے شکر نے کیا کیا

جس جا ہوا کو دخل نہ تھا نامہ لے گیا
اے آفریں کام کبوتر نے کیا کیا

ہوئے ہیں ان بتوں سے تنگ ہم اتنے کہ اب باقی
قسم کھاتا رہا ہے سو قسم کھایا نہیں جاتا

تصور میں ترے جو شخص اپنے روبرو آیا
تکلف برطرف ہم نے یہی جانا کہ تو آیا

گذرتی ہے اسی ہی کش مکش میں عمر عاشق کی
کبھو باہر ہوا اپنے سے۔ اپنے میں کبھو آیا

حواس و ہوش اس کو دیکھتے ہی اڑ گئے سب کے
کچھ ایسی وضع سے محفل میں شب وہ تندخو آیا

میل دینداری اگرچہ نقش خاطر ہی رہا
پر یہ نفس بے حیا کافر کا کافر ہی رہا

ایک دن بھی ملتفت پایا نہ اس بے رحم کو
گرچہ میں آٹھوں پہر خدمت میں حاضر ہی رہا

کچھ رحم تجھے اے ستم ایجاد نہ آیا
ایسا مجھے بھولا کہ میں پھر یاد نہ آیا

ایسا ہی فراموش کیا میں نے خودی کو
پھر آپ ہی اپنے تئیں میں یاد نہ آیا

الجھ ایسا گیا ہے دل کہ سلجھایا نہیں جاتا
رہائی کا مجھے اسلوب کچھ پایا نہیں جاتا

سو طرح کی آفتیں اب عشق میں ہوویں تو ہوں
جان ہی سے اپنی جب گزرے تو پھر ڈر ہے کیا؟

اپنی 'ہست و نیست' کا کریئے بیاں کیونکر سخن!
ہم نہیں واقف کہ جینا کیا ہے اور مرنا ہے کیا

برگِ گل رنگ پکڑتا تو زباں ہو جاتا
غنچۂ تنگ جو ہوتا تو دہاں ہو جاتا

کشمکش ہے دم آخر کی سخن! چھٹ جاتے
یہ دم سرد اگر صرف فغاں ہو جاتا

ہے زلیخا نے یہ کیا کام کیا کچھ نہ کیا
یوسف مصر کو بدنام کیا کچھ نہ کیا

امید وصل یار کیا ہم نے کیا کیا؟ بے وعدہ انتظار کیا ہم نے کیا کیا؟
اُف رے پندار یہ بات بھی نہ کیا؟ اس طرف التفات بھی نہ کیا؟
سنتے ہی ہو گئے صفات پہ غش ہم نے تحقیق ذات بھی نہ کیا؟

سنا ہے جن دنوں حسن اُس بت زہرہ جبین پہ تھا قدم فرش زمین پر تھا تو سر عرش برین پر تھا
غضب ہونا تمہارا بے سبب جو ہم نشین پر تھا غرض ہم بھی سمجھتے ہیں کہ وہ غصہ ہمیں پر تھا

کھلتی نہیں ہے آنکھ جو اس غنچہ چشم کی ہے کچھ نہ کچھ تو دیدۂ بادام میں گرا
تھا جس قدر گھمنڈ وہ خود بین کو اے ابر ویسا نظر سے ایک ہی الزام میں گرا

تماشائی ہوئے غش دیکھ کر شکل و شمائل کو بلائے جانِ عالم تھا اٹھانا اسکی کھونگٹے کا
دل گیا۔ دلبر گیا۔ یہ بھی گیا۔ وہ بھی گیا گھر گیا۔ باہر گیا۔ یہ بھی گیا وہ بھی گیا

مادری مہر و محبت کو نظر میں نہ رکھا چشم نے اپنے جگر گوشہ کو گھر میں رکھا
آسمان ٹوٹ پڑا دل جو قضا را ٹوٹا اشک خون چشم سے ٹپکا نہیں تارا ٹوٹا

وضع دستار نے کیا پیدا لطف گفتار نے کیا پیدا
اشک لخت جگر کے ساتھ ہوئے فوج سردار نے کیا پیدا
دلِ گم گشتہ کو سخن اپنے آخر عیار نے کیا پیدا

کہاں کا نامہ پیغام زبانی بھی نہیں سنتا وہ دکھ سنتا ہے کس کا جو کہانی بھی نہیں سنتا
وہ کب سنتا ہے فریاد و فغان ان بے قراروں کی فغان کے نام سے شعر فغانی بھی نہیں سنتا

تک چشمۂ چشم اپنا اُبل جائے تو اچھا رونے کی ہوس جی سے نکل جائے تو اچھا
عشاق کی کثرت سے وہ کچھ تنگ ہے اتنا جو بن ہی کو کہتا ہے کہ "ڈھل جائے تو اچھا"

کسو نے روم لیا اور کسو نے شام لیا ہمیں نے کچھ نہ لیا ورنہ سب نے کام لیا
قیس سے کم ہوں کہ میں قیس سے ٹل جاؤں گا؟ بے ستون ہوں کہ جو فرہاد سے ہل جاؤنگا

تنقیدیں

بقائے دوام - مولفہ مولوی ایم - ایم اسلم صاحب - قیمت عہ مجلد عمہ ملنے کا پتہ نسیم بکڈپو بارود خانہ لاہور یہ مختصر کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے بقائے دوام یا دوسرے الفاظ میں حیات بعد الممات کے موضوع پر لکھی گئی ہے آج کل یورپ اور امریکہ کے علمی اداروں میں اس موضوع پر بے حد تحقیق کی جارہی ہے نہ صرف نظری بلکہ عملی نقطۂ نظر سے بھی، یوں تو اس میدان میں اکثر و بیشتر علما اپنی جولانیاں دکھلا رہے ہیں لیکن سر آلیور لاج کو جو طرۂ امتیاز حاصل ہے وہ کسی اور کو نہیں بلکہ بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے وہ اس علمی تحقیق کے علمبردار ہیں -

اس کتاب کی تالیف میں قابل مولف نے اس برگزیدہ ہستی کے خیالات سے بہت مدد لی ہے، اسکے علاوہ اور دیگر محققین کے خیالات بھی جمع کئے گئے ہیں، یہ کتاب انہیں مغربی خیالات کا مجموعہ ہے جن کو اسلم صاحب نے عام فہم اور سلیس اُردو میں عوام کے سامنے پیش کیا ہے۔ میرے خیال میں اردو ادب میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے۔ اسکا مطالعہ ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے۔ جو وقتاً فوقتاً مغربی خیالات سے آگاہ ہونا چاہتا ہے -

کتاب کے پڑھنے کے بعد جب ہم مغربی علماء کے ان نتائج کا جو عملی طور پر حاصل کئے گئے ہیں مشرقی علماء کے نظریات (متعلق بہ بقائے دوام) سے مقابلہ کرتے ہیں تو ہمیں اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ چیز بالکل وہی ہے مگر انداز بیان جدا۔ مشرقی علماء میں مولانا روم اور بو علی سینا کی وہ مہتم بالشان شخصیتیں ہیں جنہوں نے روح کے اسرار معلوم کرنے میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ وقف کر دیا تھا اور اسی سلسلہ میں وہ جن نتائج پر پہنچے ہیں اٹل قانون کی حیثیت رکھتے ہیں سچ پوچھو تو مغرب انہیں قوانین کو تجربہ کی کسوٹی پر جانچ رہا ہے۔ ہماری رائے میں بہتر ہوتا اگر مغربی خیالات کیساتھ ساتھ مشرقی خیالات کا بھی ذکر کرکے ان کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا تاکہ مشرق والوں کو یہ معلوم ہوجاتا کہ اس دور میں مشرقی علما مغرب والوں سے کچھ پیچھے نہیں ہیں ہمیں اُمید ہے کہ اسلم صاحب آئندہ ایڈیشن میں ضرور اس کمی کو پورا کردیں گے۔ آخر میں، ہم آپ کی اس کامیاب کوشش پر مبارکباد دیتے ہیں -

اردو ادب کا پہلا رسالہ

مخزن لاہور

اس صدی کے آغاز سے اُردو زبان کی سچی خدمت کر رہا ہے

شیخ سر عبدالقادر بیرسٹر ایٹ لا

کے

شاندار دور کے بعد

صرف ایک ہی شخصیت تھی جو اس رسالے کو از سرِ نو اس بلندی پر لے جا سکتی تھی چنانچہ دو سال سے مخزن کی ادارت مستقل

حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری

(مصنف شاہنامۂ اسلام)

نے سنبھال لی ہے۔ اور آج مخزن اُردو کے رسائل کا سرتاج بن گیا ہے۔ مخزن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بغیر امتیاز مذہب و ملت بچے بوڑھے، جوان، عورتیں مرد بے تامل اس کو پڑھ سکتے ہیں۔ اس میں کوئی مخرب اخلاق مضمون نظم یا تصویر نہیں ہوتی۔ تصاویر میں بلند جذبات، نظموں اور مضمونوں کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ زبان نہایت آسان اور عام فہم چندہ سالانہ للعہ بذریعہ وی پی

منیجر مخزن بھاٹی گیٹ لاہور سے منگائیں

ہندوستان بھر کا واحد تعلیمی ہفتہ وار

اخبار تعلیم لاہور

یہ بات مسلمہ ہے کہ کسی ملک کی زندگی اور موت کا انحصار محض اُس کی تعلیم پر ہوتا ہے لیکن افسوس ہے کہ ہمارے ملک کی تعلیمی حالت نہایت گری ہوئی ہے۔ چنانچہ تعلیم سے بے اعتنائی کا یہ بھی ایک ثبوت ہے کہ ملک بھر میں اخبار ہذا کے اجراء سے پہلے کوئی بھی خالص تعلیمی اخبار نہ تھا۔ بس یہ ہفتہ وار اخبار سنہ ۱۹۲۲ء سے محض تعلیمی معاملات پر بحث اور رائے زنی کرنے اشاعت تعلیم کی تجاویز سوچنے۔ سررشتہ تعلیم کے جملہ اہلکاران اور بالخصوص کم مشاہرہ مدرسین کی زبردست وکالت اور ترجمانی کرنے اور ہر قسم کے علمی عملی اور اخلاقی مضامین اور نیز تازہ بتازہ معلومات اور خبروں کے شائع کرنے کے لئے جاری کیا گیا ہے۔ اور اس اخبار میں چار صفحات رفیق الاطفال کے نام سے علیحدہ کے علیحدہ موٹے خط سے چھوٹے بچوں کے لئے بھی چھاپے جاتے ہیں۔ جو بچوں کے ہاتھوں میں علیحدہ کے علیحدہ دے جا سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں رفیق نسوان کے عنوان سے دو صفحے لڑکیوں اور عورتوں کیلئے ہوتے ہیں۔ الغرض یہ اخبار تعلیمی خبروں اور مضامین کی اشاعت کے علاوہ ہر قسم کی دلچسپیوں کا بینظیر مجموعہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اخبار نہایت مقبول ہوا ہے۔ اور سرکاری اور غیر سرکاری طور پر بکثرت سکولوں میں بہم پہنچایا گیا ہے۔ چنانچہ اسوقت ہندوستان بھر کے قریباً سب اُردو ہفتہ وار اخبارات سے زیادہ چھپتا ہے۔ پس ہر مدرس ہر طالب العلم اور ہر بہی خواہ ملک و قوم کو اس کا خریدار بنکر خود مستفید ہونے کے علاوہ اپنے ملک و قوم کو بھی بام عروج پر پہنچانا چاہیئے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ دیدہ زیب ہیں۔ اور ایسی سب خوبیوں کے باوجود قیمت سالانہ صرف دو روپے ششماہی ایک روپیہ ۴ آنے اور سہ ماہی عـہ روپے لی جاتی ہے۔ نمونہ مفت ارسال ہوتا ہے۔ اس اخبار کو ڈائرکٹر صاحب بہادر سررشتہ تعلیم ریاست حیدرآباد دکن نے اپنی چٹھی نمبر ۱۹۹ مورخہ ۳ آذر دسمبر ۱۹۲۴ء کے ذریعہ تمام مدارس تحتانیہ۔ وسطانیہ اور فوقانیہ کے لئے منظور کیا ہوا ہے۔ اور اسے اکثر مہتمم صاحبان تعلیمات اور صدر مدرسین صاحبان سرکاری روپیہ سے اپنے اپنے مدارس کے لئے خرید رہے ہیں۔

المشتہر منیجر اخبار تعلیم۔ لاہور۔ موہنی روڈ

رسالہ "بہارستان" کا دورِ جدید

زیرِ ادارت

(جناب اختر شیرانی)

جیسا کہ ناظرین کو علم ہے ملک کا مشہور اور گراں پایہ ادبی صحیفہ "بہارستان" جناب اختر شیرانی کے قطع تعلق کے بعد، نئے مالک و مدیر کی ناتجربہ کاری یا کسی اور وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ ہم اہلِ ذوق کو یہ خوشخبری سناتے ہیں کہ احباب کے پیہم اصرار پر، اختر صاحب نے اس کی ادارت از سرِ نو قبول فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک گرم جماعت انتظامیہ قائم ہو گئی ہے۔ جس کے حسنِ اہتمام کے ماتحت "بہارستان" عنقریب اپنی رنگا رنگ ادبی، علمی، اور سیاسی دلاویزیوں، اور جدت طرازیوں کے ساتھ، نہایت شان سے شائع ہونا شروع ہو گا۔ اب کے پرچے کو شاندار اور باوقار بنانے کے لئے ایسی اہم، اور دلچسپ تجاویز، سوچی گئی ہیں کہ آپ بے اختیار، داد دینے پر مجبور ہونگے۔ حجم تقریباً تمام رسائل سے زیادہ ہو گا کتابت و طباعت کی نفاست کا خاص انتظام کیا جا رہا ہے۔ کامل طور پر امید کی جاتی ہے کہ اردو صحافت میں "بہارستان" حقیقتاً، اپنے رنگ کا اولین ادبی کارنامہ ہو گا۔ فی الحال ہم صرف مستقل خریداروں کے نام درج رجسٹر کر رہے ہیں، اس لئے آپ کو بھی اپنی خریداری ہی کی فرمائش بھجوانی چاہئے۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ پرچے کا نمونہ دیکھنے کی آپ کو مطلقاً ضرورت نہ ہو گی۔ تمام خط و کتابت اور ترسیلِ زر "منیجر رسالہ "بہارستان"۔ ۱۸۔ فلیمنگ روڈ۔ لاہور" کے نام ہونی چاہئے

المعلن

آغا سید مصطفےٰ حسین بی۔ اے۔ نجم الدین عزیز ام۔ ایس سی (آنرز)

منظور حسن ام۔ اے۔ (علیگ)۔ بنارسی داس بی۔ اے۔ (آنرز)

زندہ طلسمات

جس کو باشندگان حیدرآباد کے علاوہ معزز حکماء اور ڈاکٹروں نے صدہا مریضوں پر امتحان کر کے سینکڑوں سرٹیفکٹ عطا کئے۔ زندہ طلسمات ملکی ہونے کے علاوہ رجسٹرڈ اور پٹنٹ شدہ ہے۔ حسب ذیل امراض پر آناً فاناً طلسمی اثر دکھانا اس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ مثلاً ہیضہ۔ پلیگ۔ بخار۔ پیچش۔ تلی۔ کھانسی۔ دمہ۔ بواسیر خارش۔ سانپ۔ بچھو کے زہر اور ہمہ اقسام کے درد کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے آزمائیے ایک بار ضرور آزمائیے۔ پبلک کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے۔ شیشی نمبر (۱) عہ نمبر (۲) ۸ر نمبر (۳) ۴ر ایک درجن کے خریدار کو خرچہ وی۔ پی۔ معاف ہوگا۔

خط اور تار کا پتہ

"زندہ طلسمات حیدرآباد دکن"

ویجیٹال بام

بیرونی استعمال کی پرتاثیر اور لاجواب دوا

یہ دوا بیرونی استعمال کے لئے آپ اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزا سے مرکب اور بالکل بے ضرر ثابت ہو چکی ہے جو اقسام کے اعصابی و اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس کو سالہا سال کے تجربہ اور عرق ریزی کے بعد اعلیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے اور متعدد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اسکو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں اس سے زیادہ پراثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے کوئی گھر اور خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہئے استعمال کے ساتھ ہی اپنا برقی اثر دکھلاتی ہے اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہو جاتا ہے۔ علی الخصوص نقرس وجع مفاصل۔ دمہ۔ درد سر۔ درد سول۔ بچھو کے زہر کے لئے زخم کے لئے اور جلے ہوئے جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال۔ تھوڑی دوا لے کر دن میں تین چار وقت مقام ماؤف پر ملیں اور اگر افاقہ نہ ہو تو دوا کے استعمال سے پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر اچھی طرح اعصاب کو بھاپ دیں اور ملا کریں جو اصحاب بغرض امتحان دوا طلب فرمادیں بخوشی تعمیل کیجائے گی نمونہ مفت۔ ہمارے دواخانہ میں ہر قسم کی تازہ ادویات کا ذخیرہ ہر وقت مہیا رہتا ہے اور نسخہ جات نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کئے جاتے ہیں

المشتہر حسین اینڈ کمپنی ڈسپنسنگ کیمسٹ اسٹیشن روڈ قریب محکمہ مالگزاری حیدرآباد دکن

مطبوعات مکتبہ

دکن میں اُردو مولفہ مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب منشی فاضل۔ جنوبی ہند میں اردو کی ابتدائی تاریخ قطب شاہی، عادل شاہی و آصف جاہی دور میں اردو نظم و نثر کی حالت اور شعرائے اردو کا تذکرہ معہ نمونہ کلام ضخامت ۲۸۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ٢٠×٢٦/١٦ کاغذ چکنا بار دوم قیمت ۱؎

خیابانِ اُردو مرتبہ جناب محمد عارف صاحب حیدرآبادی ہندوستان کے ممتاز اردو انشا پردازوں اور نامی گرامی شعرا کے نظم و نثر کا بہترین انتخاب جو مدارس کے تعلیمی نصاب کیلئے نہایت موزوں ہے ضخامت تقریباً ۲۶۴ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ٢٠×٢٦/١٦ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد سلو ۱؎

روحِ تنقید مصنفہ مولوی ابو الحسنات سید غلام محی الدین قادری زور ایم اے۔ فنِ تنقید کے متعلق اُردو زبان میں پہلی کتاب ہے جسمیں ماضی حال کے علمائے یورپ کی تنقیدی اصول بیان کیے گئے ہیں اور ان اصولوں کی روشنی میں مثنوی سحر البیان پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے ضخامت ۲۵۰ سائز پاکٹ ایڈیشن ٢٠×٢٦/١٦ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ بار دوم قیمت عـہ

تنقیدی مقالات مصنفہ زور صاحب۔ یہ روحِ تنقید کا دوسرا حصہ ہے جس میں مصنف نے روحِ تنقید کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں انگریزی، فارسی اور اُردو زبانوں کے مشہور اہلِ قلم کی قلمکاریوں پر تنقید کرکے ان کا استعمال دکھلایا ہے اور نیز بعض مشہور اردو انشاپردازوں کے طرزِ تحریر پر تبصرہ کرنے کے خاص خاص اصول بیان کئے گئے ہیں ضخامت ۵۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ٢٠×٢٦/١٦ کاغذ چکنا لکھائی وغیرہ عمدہ مجلد سلو ۱؎

اُردو کے اسالیبِ بیان مصنفہ زور صاحب۔ نثر نگاری کی ابتدائی کیفیت ابتدا سے لیکر آج تک کے نثر نگاروں کے طرزِ تحریر و اندازِ بیان کا تذکرہ۔ خاص طرزِ تحریر کے اُردو انشا پردازوں کے اسالیبِ بیان پر تبصرہ ضخامت ۳۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد سادہ عـہ

سلطان محمود غزنوی کی بزمِ ادب مصنفہ زور صاحب۔ سلطان محمود غزنوی سے پہلے اور بعد کے علم و ادب کے حالات سلطان محمود غزنوی کے علمی و ادبی کارنامے۔ ترتیبِ کتاب میں پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیاتِ ایران سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ضخامت ۱۲۰ صفحے کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۱۲ر

دنیا سے افسانہ مصنفہ مولوی محمد عبد القادر سروری ایم اے ایل ایل بی۔ افسانہ نگاری کی ابتدائی تاریخ اور افسانہ نویسی کے اصول و مبادیات۔ یہ اُردو زبان میں اپنے مضمون کی پہلی کتاب ہے ضخامت ۲۱۸ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی بہترین قیمت عـہ

مبادیِ فلسفہ مولفہ مولوی میر حسن الدین صاحب بی اے ایل ایل بی، ڈاکٹر اے لیس ساپورٹ پی۔ ایچ۔ ڈی کی پرائمر آف فلاسفی کا ملخص با محاورہ اور عام فہم اردو ترجمہ ضخامت ۱۳۶ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۱۴ر

اربابِ نثرِ اُردو مصنفہ مولوی سید محمد صاحب قادری ایم اے۔ فورٹ ولیم کالج کے اُردو اہلِ قلم کے تحقیقی حالات اور ان کے مصنفات پر تنقید و تبصرہ۔ انیسویں صدی عیسوی کی اردو نثر نگاری کی تاریخ ضخامت ۲۴۳ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت عـلہ

آثار الکرام جلد اول مصنفہ شمس المورخین جناب حکیم سید شمس اللہ قادری ایم آر اے ایس۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے علمی و ادبی کارناموں کی محققانہ تاریخ ضخامت ۱۴۴ صفحے۔ سائز ٢٠×٢٦/١٦ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی خاصی قیمت ۱۲ر

جواہرِ کلیاتِ نظیر منتخبہ جناب مولانا ذہین و سید مختار احمد۔ نظیر اکبرآبادی کے کلیات سے اخلاقی۔ ادبی۔ نصیحت آموز، ظرافت آمیز اور دلنواز نظموں کا مجموعہ ضخامت ۲۸۰ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی خاصی قیمت عـہ

عقائدِ امام مترجمہ مولوی محمد عبد الغفور عابدی صاحب فقہ اکبر کا عام فہم اور با محاورہ اردو ترجمہ۔ قیمت ۴ر

اسوۂ حسنہ مصنفہ مولوی احمد عبد اللہ مسعودی بی اے ایس۔ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کے سامنے کیسی زندگی پیش کی تھی ضخامت (۸۰) صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۸ر

دکنی لغت مولفہ مولوی سید شعار احمد شعار ہاشمی۔ اردوئے قدیم یعنے دکنیات کا لغت جس میں دکنی زبان کے الفاظ و محاورات کی تشریح کی گئی ہے ضخامت ۱۲۱ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ۸ر

شاہ رفیع الدین قندھاری مرتبہ مولوی محمد عبد الغفور صاحب عابدی۔ دکن کے ایک مشہور صاحب دل صوفی عالم کے دلچسپ حالات ضخامت ۴۸ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی قیمت ۵ر

خزینۂ اخلاق مصنفہ مولوی سید عبد العزیز صاحب عزیز۔ اخلاقی و ادبی نظم و نثر کا مجموعہ۔ ضخامت ۶۴ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۶ر

سیرتِ خیر البشر و سیرتِ مبارک مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالے جس میں آنحضرت م کے مکارمِ اخلاق بیان کیے گئے ہیں۔ قیمت ۱ر

نیک بی بی مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالہ جس میں بتلایا گیا ہے۔ نیک خو بی بی کس طرح اپنے بدخو شوہر کو نیک کر سکتی ہے۔ قیمت ۲ر

چھوٹا شیطان مصنفہ مولانا ذہین۔ منظوم اخلاقی رسالہ قیمت ۱ر

ملنے کا پتہ۔ انجمن امداد باہمی مکتبۂ ابراہیمیہ روبروئے محکمۂ مالگذاری اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

مطبوعہ مطبع مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن باہتمام رام کشن لیتھوگرافر منیجر مطبع

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ

مدیر

محمد عبدالقادر سروری

ایم اے، ال ال بی

مجلۂ مکتبہ

۱۔ یہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا ماہوار رسالہ ہے۔
۲۔ یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جسمیں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔
۳۔ بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالۂ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔
۴۔ قیمت سالانہ (لله) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عاہر) فی پرچہ ۶ پائی
۵۔ اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (صہ) نصف کے لئے (سے) اور چوتھائی کے لئے ۱ہر ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲½ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

مجلۂ مکتبہ کی خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے انکے نام رسالہ سال بھر کیلئے بلاقیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خریدیں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلۂ مکتبہ بلاقیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے ان کو ایک رسید دیجائے گی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبوں کو چاہیے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحت بالا رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں "منتظم مجلہ مکتبہ" کے پاس بھیجدیں رسالہ انکے نام جاری کر دیا جائیگا یہ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس علایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ترسیل زر، مضامین اور جملہ خط و کتابت بتوسط "منتظم مجلہ مکتبہ" مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ہونی چاہیے۔

رجسٹرڈ نشان سرکار آصفیہ (۶۵) جلد (۳)

رجسٹرڈ نشان سرکار انگلشیہ (۰۰۰۰۰۰۰) شمارہ (۲ و ۳)

مجلہ مکتبہ

بابتہ ماہ تیر و امرداد ۱۳۳۸ف م مئی و جون ۱۹۲۹ء

تصاویر

(۱) جدید کتب خانہ آصفیہ (۲) کتب خانہ قصر فلک نما

فہرست

شذرات

افغانستان کی گذشتہ چند ماہ کی کشمکش کا ایک حد تک نتیجہ برآمد ہوگیا۔ لیکن جس صورت میں وہ دنیا کے سامنے پیش ہوا وہ ظاہر ہے کہ افسوس ناک ہے۔ افغانستان کے اس تصفیہ سے بحالت موجودہ جس قدر نقصان افغانی مفاد کو پہنچ سکتا ہے وہ ایک دھندلے خاکے کی صورت میں پیش ہو رہا ہے۔ لیکن اس ہنگامہ خیزی سے مشرقی آزادی کو جو ٹھیس لگے گی وہ بہت زیادہ خطرناک ہوگی۔ خدا نہ کرے افغان قوم اغیار کی کاربراری کا نتیجہ بنکر پھر۔ اور پھر خمول میں گم ہو جائے۔ افغانیوں کی یہ حریت پسندی اور آزادروی یقیناً قابل ستائش ہے کہ اس نے اپنی طبیعت کے خلاف اپنے بادشاہ کی بھی چلنے نہیں دی۔ کاش وہ اسی جوش کے ساتھ کسی مفید مرکز پر بھی جمنے کے قابل ہو جائے۔ وہ واقعات بھی ظاہر ہو جائیں گے جو اس تمام ہنگامہ آرائی کی تہ میں کام کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ شاہ امان اللہ کو اپنے ملک کے جانے کا غم ہو لیکن اصلی رنج دنیا کو ان کے ملک سے جانے کا ہے۔ اگر انجام بد ہو ــــ جس کے آثار نظر آرہے ہیں ــــ تو ساری افغان قوم اس کی ذمہ دار ہے۔

ہندوستان کے دور جدید میں جہاں یورپ کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کی جارہی ہے وہاں کچھ قومیت کا بھی احساس پیدا ہونے لگا ہے۔ اور اسی لئے بعض قدیم ہندی قومی اداروں کی تجدید اور احیا کی طرف بھی توجہ منعطف ہونے لگی ہے۔ موسیقی جو کچھ عرصہ پہلے تک ہمارے پاس گویّوں کا پیشہ سمجھی جاتی تھی، اب ایک علمی امتیاز حاصل کرنے کو ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں یہ خبر خوش آئند ہے کہ مدراس کے ایک شہر میں "اناملی موسیقی کالج" قائم ہوا تھا جو یہ راجہ سر انا ملی چٹی کی مساعی کا نتیجہ ہے۔ ابھی ابھی اس ادارہ کو جامعہ موسیقی کے درجہ تک ترقی دی گئی ہے۔ اس کے نائب امیر جامعہ کمبا کونم کالج کے پرنسپل مسٹر ایس۔ ڈی۔ اگنا دہن مقرر ہوئے ہیں۔ دو طرح کے نصاب ہیں۔ ایک سندی، دوسرے مہارتی۔ اس کام میں جس قدر مصارف ہوں گے اُس کا بڑا حصہ خود سر انا ملی چٹی نے اپنے ذمہ لیا ہے۔

انسانیت کا مقصد مال و دولت بذات خود نہیں۔ بلکہ وہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ وہ لوگ جو روپیہ کو صرف روپیہ کی خاطر فراہم کرتے ہیں، درحقیقت ایک طرح کے دماغی مرض میں مبتلا ہیں۔ اسی قسم کے روپیہ کے متعلق کہا گیا ہے۔ "بُرے نہادن چہ سنگ و چہ زر" ہمارے پاس اس قسم کے مریض صدہا ملینگے۔ جو دوسری صنف میں داخل ہیں یا اُن سے بھی زیادہ خردماغ وہ ہیں، جو روپیہ جیسی قیمتی شئے کو سستے معاوضہ پر بے دریغ صرف کر بیٹھتے ہیں۔ روشن دماغ جس طرح روپیہ کو کمانے کے بہترین طریقے جانتے ہیں، وہیں اس کے مصرف سے بھی ناواقف نہیں رہتے۔ اگرچہ سینٹ جارج

کالج کے ایک سابق صدر مسٹر کیانن اے ڈیوس جو بڑے جاگیردار تھے اور نہ راجہ یا نواب۔ اپنی محنت سے کمائے ہوئے روپیہ کا کس قدر عمدہ مصرف نکالتے ہیں اپنی خدمت سے سبکدوش ہو کر انگلستان جاتے ہوئے انہوں نے آگرہ کے مشن ہسپتال کے لئے تین ہزار پونڈ (تقریباً پینتالیس ہزار روپیہ) اس قدر خاموشی کے ساتھ عطا کئے کہ عرصہ تک کارکنوں کو معطی کا نام ہی معلوم نہ تھا۔

علامہ ابن خلدون کی تصنیف کو لکھے ہوئے اب کوئی ہزار سال ہوتے ہیں لیکن حال میں ایک جرمن مستشرق فان فینڈنگ کے مقدمہ کے ساتھ ایک عربی کتاب مصر میں شائع ہوئی ہے جس میں علامہ موصوف کے فلسفہ اجتماع کا ایک تقابلی مطالعہ ارسطو، میکاولی، مونتسکو اور دوسرے مغربی فلسفیوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب پچیس ۲۵ قرش (تقریباً چار روپیہ) کو "لجنۃ التالیف دار الترجمۃ الحاجۃ بین اسنانہ الرابعۃ نمبر ۳ مصر" سے مل سکتی ہے۔ عربی علوم و فنون کے متلاشیوں کے لئے یہ کتاب دلچسپی سے خالی ثابت ہوگی۔

جامعہ لندن کے مستشرق پروفیسر سر ڈینی سن راس اپنے اسلامی ممالک کے سفر سے ابھی ابھی لندن واپس ہوئے ہیں، مصر، فلسطین، ایران وغیرہ میں انہوں نے انگریزی یا فارسی میں تقریریں کیں۔ انکی فارسی تقریروں نے انہیں ایران میں بہت ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ اپنے تاثرات کو جمع کرتے ہوئے انہوں نے حال میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ تین امور سے بے حد متاثر ہوئے، جن کو وہ مشرقی ترقی کا فال نیک بھی سمجھتے ہیں۔ ان امور میں سے پہلا شاہ فواد کا انہماک عربی فلاح اور ترقی ہیں، دوسرا ان کے خیال کے مطابق کوہ زیتون پر جامعہ عبرانی کا قیام، اور تیسرا رضا پہلوی شاہ ایران کا ملکی اور مادی ترقی کے ساتھ ساتھ ذہنی ترقی کے لئے بھی سعی کن ہونا ہے۔

ایک فرانسیسی مصنف اندرے مایو نے "اسپکٹیٹر" کی صد سالہ اشاعت میں انگلستان کی سہ جامعات آکسفورڈ اور کیمبرج کے مستقبل کے متعلق ایک مضمون لکھا ہے، جس میں اس نے بعض ایسے انگریزوں کے خیالات کو جانچنے کی کوشش کی ہے، جو ان جامعات کی تعلیمی نزاکتوں کو تعیش اور ان کو قدامت پسندی کا مرکز سمجھتے ہیں۔ اس ضمن میں اس نے بعض معرکۃ الآرا امور پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً وہ اس کو غلط سمجھتا ہے کہ محض کسی جامعہ کی تعلیم ہی مفید ملک و قوم ہستیاں پیدا کر سکتی ہے۔ اس کے خیال میں یہ کام قومی قابلیت کا ہے جس پر مخالف نظام تعلیم کا بھی کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ وہ انگریزوں میں دوسری قوموں سے زیادہ قابل افراد کے پیدا ہونے کی یہ وجہ بتلاتا ہے کہ اعلیٰ نوعیت کا کلچر یا تمدن، انگلستان میں عام ہے، گو یورپ کے دوسرے

ممالک کا اوسط معیار تمدن کیمبرج اور آکسفورڈ سے بڑھا ہوا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہوگی کہ پست ممالک میں بہترین اصول پر کام کرنے والی جامعات بھی درخشاں نتائج عام طور سے نہیں پیدا کرسکتیں۔ آگے چل کر وہ کیسرلنگ کے ایک خیال کی تائید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بے شک انگریزی جامعات کا مقصد حکمرانوں یا نشیبوں کو پیدا کرنا ہے، لیکن کیا اب ایسے اشخاص کی ضرورت نہیں ہے؟ ہے اور یقیناً ہے۔ لیکن ان کی مخصوص علمیت سے زیادہ قوی کردار کے ساتھ۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ مجھے کسی تعلیم یافتہ قومی کردار شخص کو نوکری کی تلاش میں سرگرداں دکھادیں۔ تعلیم یافتوں کی ضرورت ہر جگہ ان کی پیداوار سے زیادہ ہے۔

آخر میں وہ سفارش کرتا ہے کہ جامعہ جو ایک مقدس ادارہ ہے، اس کی سعی کرے کہ علماء اور فضلا کو تلاش روزی کی پریشانیوں سے امان دیکر حکومت کے دست نگر بننے سے بچائے اور علمی مشاغل میں مصروف رکھے۔ اور ان لوگوں کا جو اس کی خوش گوار فضا میں رہتے ہیں، یہ فرض ہے کہ بغض و کینہ اور حرص و آز سے علیحدہ رہکر ایک مشترکہ تمدن کے بنانے اور پھیلانے میں مصروف رہیں۔

گذشتہ ماہ میں مئی کا رسالہ پریس کی گوناگون مصروفیتوں کی وجہ سے دیر میں شایع ہو رہا تھا، مناسب یہ سمجھا گیا کہ مئی کے ساتھ جون کا رسالہ بھی شایع کر دیا جائے کیونکہ اس سے اس غیر معمولی تعویق کی تلافی ہو جائیگی جو اس دفعہ ہوئی جولائی کا رسالہ اپنے وقت پر شایع ہو سکیگا۔ رسالہ کی تعویق کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی تھا کہ مکتبہ کا پریس اس دفعہ زیادہ مصروف تھا اور کارکنان مطبع دستی لیتھو پریس کے جھگڑوں سے عاجز آکر رسالہ کو بروقت شایع کرنے کے خیال سے مشین پریس کی خریدی کی فکر میں عرصہ سے لگے ہوئے تھے اب مشین پریس خرید لیا گیا ہے جولائی کا رسالہ تیار ہے امید ہے کہ اگست سے رسالہ مشین پریس پر زیادہ نفاست کے ساتھ شایع ہوگا۔ اور بہت سے جھگڑوں سے نجات مل جائیگی۔ کاش اردو کے ارباب حل و عقد ذرا روشن خیالی سے کام لیں اور نستعلیق ٹائپ عام ہونے تک (جس کو معلوم نہیں ابھی کس قدر عرصہ درکار ہے) نسخی ٹائپ ہی کو اپنا رسم الخط قرار دے لیں جسطرح فارسی والوں نے کیا ہے تو یقین ہے کہ علمی اداروں کو وہ پریس کی گوناگون الجھنوں میں پھنسکر وقت ضایع کرنے سے اور اپنے آپ کو انتظار کی تکلیفوں سے بچا سکیں گے۔ ورنہ اگر ہماری قدامت پسندی کا یہی عالم ہے تو کیا تعجب ہے کہ ہمارے بعد کی نسلیں ہماری اس حماقت کی بھی پابند نہ رہے اور راست لاطینی رسم الخط کی طرف رجوع کرے۔
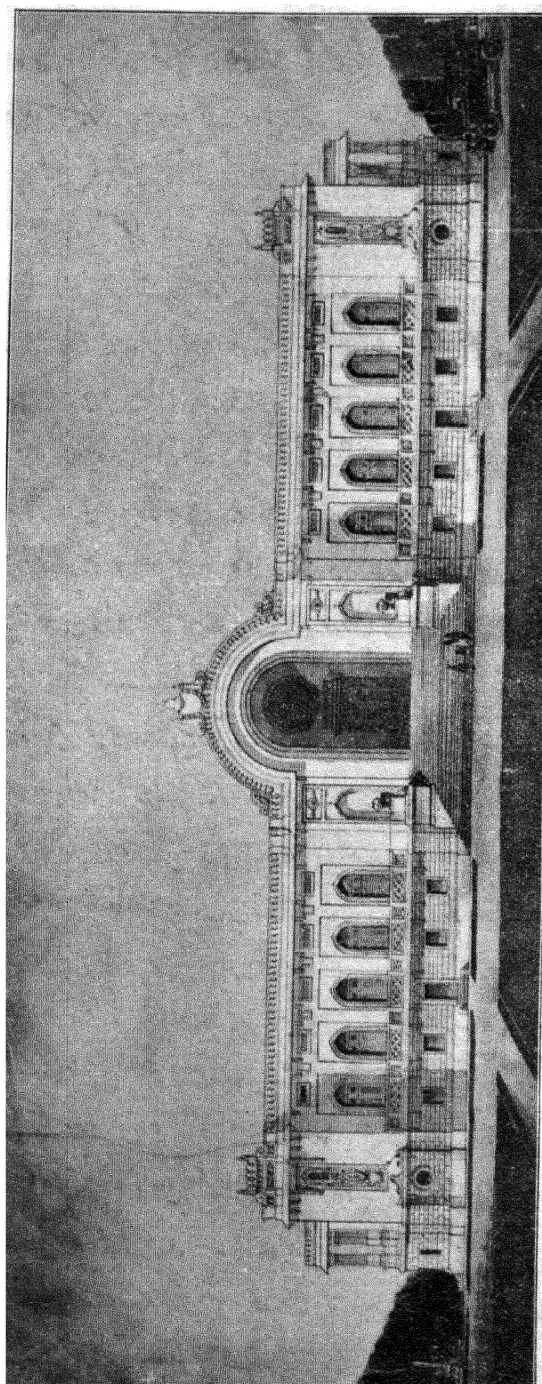
جدید کتب خانہ آصفیہ

علم صحت

از جناب ابو لمکارم فیض محمد صاحب صدیقی۔ بی۔ اے

یہ مضمون (The Outline of Science) سے ماخوذ ہے۔ اس کا بیشتر حصہ اصل مضمون کا ترجمہ ہے۔ فیض

صحت ایک ایسا لفظ ہے جس کے بہت سے معنی ہیں اور جو بہت ساری چیزوں پر حاوی ہے اس لئے ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ اس کے دائرۂ معنی کی وسعت اور اس کے مفہوم کے تنوع کا لحاظ کرتے ہم اس کی کوئی مختصر تعریف پیش کریں یہ ایک بہت ہی قدیم لفظ ہے' اس کے معنی پہلے کچھ لئے جاتے تھے اور اب کچھ لئے جاتے ہیں۔ آئے دن اس کے معنی اور مفہوم میں اضافہ ہوتا جارہا ہے سرسری طور پر اس کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے کہ صحت ایک ایسی حالت کا نام ہے جس میں جسم زخموں اور بیماریوں سے پاک رہتا ہے' خدائے طب ہیاکریٹیس نے فعلیاتی نقطۂ نظر سے اس کی تعریف یوں کی ہے کہ صحت ایک ایسی حالت کا نام ہے جس میں کہ جسم اور اس کی قوت دونوں حالت تعادل میں رہتے ہیں۔ ایک حد تک یہ بیان درست ہے مگر ساتھ ہی اس کے یہ بھی یاد رہے کہ اس زمانہ میں فعلیات کا علم ابھی اپنے بچپن میں تھا اور ہیاکریٹیس کو یہ تک نہیں معلوم تھا کہ معمولی رگ اور شریان میں کیا فرق ہے حکیم ارسطو نے بھی اس قسم کی تعلیم دی ہے کہ دماغ ایک اسپنج ہے جو خون کو سرد رکھتا ہے' یہ ایک نہایت اچھی تشبیہ ہے لیکن فعلیاتی نقطۂ نظر سے ایک بے معنی چیز' گیالن کے کارناموں نے فعلیات صحت کے موضوع پر خاص روشنی ڈالی ہے' اور آج کل جب کہ فعلیات سائنس کا ایک خاص شعبہ بن گیا ہے' ڈاکٹروں اور سائنس دانوں نے فعلیاتی نقطۂ نظر سے بہت ساری تعریفات کی ہیں اور جسم کو ایک کیمیائی اور طبعی نظام قرار دیا ہے۔ اور اب صحت سے مراد ہم ایک ایسی حالت تصور کرتے ہیں جس میں جسم مفید اور کار آمد توانائی پیدا کرتا ہے' یہ ایک ایسی چیز ہے جس کا انحصار ہاتھ پیر، ناک آنکھ کے ٹھیک ہونے ہی پر نہیں بلکہ زیادہ تر اس صلاحیت پر ہے جس کی وجہ سے کارآمد توانائی پیدا ہوتی ہے۔

کام کرنیکی قابلیت کا نام صحت ہے

کیمیائی اور فعلیاتی اصولوں کی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ صحت کام کرنیکی قابلیت کا نام ہے، فعلیات اور اس سے متعلقہ علوم کی موجودہ صورت کی بنا پر اس مسئلے نے نہایت دلچسپ اور نازک صورت اختیار کر لی ہے کیوں کہ اس میں ہم کو بعض ایسی باتیں معلوم ہوئی ہیں کہ جو توانائی کی ذرا آمد اور برآمد پر اپنا کافی اثر رکھتی ہیں، آج ہم ایک تپش پیما لیکر کسی آدمی کی زبان کے نیچے رکھتے ہیں اور جب وہ (۲۰۱°) ف کا نشان تبلاتا ہے تو ہم ساتھ ہی یہ کہتے ہیں کہ اس شخص کی صحت اچھی نہیں ہے اور وہ اس انجن کی طرح کام کرنے سے مجبور ہے جس میں حرارت ضرورت سے زیادہ ہوگئی ہے، جب ہم کسی کے دل کی حرکت کو سنکر یہ معلوم کرتے ہیں کہ اس کے حمام میں ایک قسم کی بھر ہوگئی ہے تو ہم فوراً اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ وہ ایک ایسے پمپ کی طرح جس میں سوراخ ہو گیا ہو کام کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا یا جب کسی کے خون کی تشریح کرتے ہیں اور اس کی صحت کو خراب پاتے ہیں تو ہم صاف کہدیتے ہیں کہ اس میں اپنے جسم کے ایندھن کو جلانے کے لئے کافی اکسیجن موجود نہیں ہے اسی طرح سے جب کسی کی نبض میں یہ بات دیکھتے ہیں کہ وہ ایک منٹ میں (۱۴۰) مرتبہ حرکت کرتی ہے تو فوراً اس کی خرابی صحت کا یقین ہو جاتا ہے، برخلاف اس کے اگر کسی انسان کی تپش (۴ء۹۸) ف تو دل کی حرکت حالت اعتدال پر ہو رگوں میں کوئی مانکروب دھوں اور نبض (۷۲) دفعہ فی منٹ حرکت کرتی ہو تو ایسے آدمی کی صحت کو خواہ وہ لنگڑا اندھا کیوں نہ ہو ہم اچھی صحت کہتے ہیں یعنی اس کی صحت حالت اعتدال پر ہے یا بہ الفاظ دیگر اس میں کام کرنیکی پوری قابلیت موجود ہے، ہمارا فعلیاتی علم درحقیقت ہم کو اس قابل بناتا ہے کہ ہم انسان کی صحت کی پیمائش نہ کر کے اس کے متعلق رائے قائم کرسکیں۔

غذا کی توانائی

بحیثیت ایک مادی نظام کے جو توانائی کے مفید استعمال کے لئے درکار ہے ایک جاندار کئی لحاظ سے جیلی خصوصیات رکھتا ہے، دوسرے مشینوں کی طرح اس کے لئے بھی جلنے والے اشیاء کی ضرورت ہے۔ ایسی اشیاء میں کاربن کو خاص اہمیت حاصل ہے لیکن وہ کاربن نہیں جو کوئلہ یا تیل کا ہوتا ہے۔ بلکہ غذا کا کاربن وہی کاربن ہے جو سورج کی سرخ شعاعوں کے زیر اثر سبز پتوں کے کاربن ڈائی آکسائیڈ سے جدا ہوتا ہے، سورج کی قوت سے کاربن نئی توانائی حاصل کرکے ارتقاش کرنے لگتا ہے اور جب سب کا سب نشاستہ بن جاتا ہے تو یہ توانائی مخفی ہو جاتی ہے اور نشاستہ کہانے والے جانوروں کے اندر رونما

ہوتی ہے اور جیسے ہی غذا جسمانی ریشوں کے اندر اکسائی جاتی ہے تو اس کا مظاہرہ بالکل حقیقی حیوانی توانائی کی صورت میں ہو جاتا ہے جس طرح سے کوئلہ کے بھٹی میں اکسائے جانے سے توانائی حرارت کی شکل میں خارج ہوتی ہے (جب کوئی عنصر آکسیجن سے ملتا ہے جیسا کہ ہم کوئلے کی نسبت دیکھتے ہیں تو کہا جاتا ہے وہ اکسایا گیا ہے یہ عمل احتراق کی وجہ ہوتا ہے جس سے حرارت اور توانائی دونوں آزاد ہوتی ہیں) اگر ہم جلتے ہوئے کاربن کو ایک ایسے برتن میں داخل کریں جس میں آکسیجن بھری ہوئی ہے تو وہ بہت جلد اکسایا جاتا ہے اور بہت زور سے جلنے لگتا ہے، برخلاف اس کے جب ہماری غذا کا کاربن ہمارے خون کے سرخ جسیمات کی آکسیجن سے ملتا ہے تو آہستگی سے اکسایا جاتا ہے اور خاموشی سے جلتا ہے جس کی وجہ سے جسم کی تپش عام طور پر (۹۸،۴) ف سے بڑھنے نہیں پاتی۔ اس توانائی کا مظاہرہ نہ صرف حرارت کی شکل میں ہوتا ہے بلکہ کیمیائی، حیلی اور برقی توانائی کے شکل میں بھی، ہر صورت میں یہ وہی شمسی توانائی ہے جس کو کاربن نے حاصل کیا تھا اس لحاظ سے ہمارے جسم گویا شمسی مشین ہیں جو ہم سے (۹۳) ملین میل فاصلہ پر کے سیارہ کی سرخ شعاعوں کے زیر اثر جس کو نکلے ہوئے آج کئی لاکھ سال کا عرصہ ہوتا ہے، چلتے ہیں، ہر شخص انہی سرخ شعاعوں کی وجہ سے زندہ ہے اور حرکت کر سکتا ہے۔ ان شعاعوں کی توانائی ہماری غذا کے اجزا مثلاً آلو، مسکہ، روٹی وغیرہ کے ذریعہ ہمارے جسم میں آجاتی ہے۔ بغیر اس توانائی کی مدد کے انسان پلک تک نہیں مار سکتا۔

کیمیائی نقطۂ نظر سے غذا کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، کاربوہائیڈریٹ مثلاً نشاستہ اور شکر، روغنیات یا چربی مثلاً مسکہ، البومینی مادہ مثلاً انڈے کی سفیدی، ایسی غذائیں جلنے کے بعد اکسائی جاتی ہیں اور ان کی قیمت بحیثیت مبدہ توانائی کے اس حرارت میں محسوس کی جاتی ہے جو دوران احتراق میں دیتے ہیں اس حرارت کا حساب ہم حراروں میں کرتے ہیں، ایک حرارہ حرارت کی وہ مقدار ہے جو ایک گرام پانی کی تپش میں ایک درجہ کا اضافہ کرے۔ جب ہم غذا کی ان تینوں اقسام کو آکسیجن میں جلاتے ہیں تو ایک گرام کاربوہائیڈریٹ سے (۴،۱) حرارے، ایک گرام چربی سے (۹،۳) حرارے اور ایک گرام البومینی مادہ سے (۴،۱) حرارے حاصل ہوتے ہیں، حرارت توانائی کی ایک قسم ہے جس کو مختلف چیزوں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے مثلاً عضلی حرکت میں چنانچہ حرارت کا ایک حرارہ معادل ہے اس توانائی کے جو (۴۲۵،۵) گرام وزن کو ایک میٹر اوپر اٹھانے کے لئے درکار ہے، پس ہم اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جسم کو کس قدر حرارت اور عصبی توانائی کی ضرورت ہے اگر ہم ایک شخص کو ایک حرارہ پیما میں داخل کریں جہاں حرارت کی مقدار اور دوسرے قسم کی

توانائی جو وہ صرف کرتا ہے محسوب کی جا سکتی ہے تو معلوم ہوگا کہ اس سے اس قدر حرارے خارج ہوتے ہیں جتنے کہ غذا کو جسم کے باہر جلانے سے حاصل ہوتے ہیں، پس اگر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ مختلف حالتوں کے تحت انسان کس قدر توانائی خرچ کرتا ہے تو اس کا اندازہ لگانا کوئی دشوار کام نہیں کہ اس کو کس قدر غذا کی ضرورت ہے، ہماری زندگی کا انحصار صرف توانائی پر ہے۔ سانس لینے غور وفکر کرنے اور ذہنی اور جسمانی ورزش کرنے کے لئے غرض ہر کام میں توانائی لازمی طور پر درکار ہے غذا کے خرچ کی فہرست کے معائنہ سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک اوسط آدمی کی غذا کے لئے کس قدر حرارے درکار ہیں، جنگ سے قبل ایک انگریز کی غذا کے لئے (۲۲۴۳) حرارے درکار تھے (چوبیس گھنٹے میں) جنگ کے زمانہ میں رائل سوسائٹی کی طعامی انجمن نے تخمینہ کیا ہے کہ اوسط آدمی کیلئے روزانہ (۳۴۹۰) حرارے درکار ہیں جس سے وہ اپنی حالت کو قائم اور برقرار رکھ سکتا ہے۔ صرف قلب کی حرکت اور دیگر عضلی کاموں کو برقرار رکھنے اور جسم کی تپش کو قائم رکھنے کے لئے (۲۸۳۶) حراروں کی ضرورت ہے اس کے علاوہ جس قدر بھی حرارے بچ جائیں وہ عضلی توانائی میں تبدیل ہو جاتے ہیں صرف بیس فیصدی حرارے حقیقی عضلی توانائی میں اور باقی حرارت کی شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں اگرچہ بظاہر ۲۰ فیصدی بہت چھوٹا عدد معلوم ہوتا ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ وہ تناسب ہے جو اعلیٰ قابلیتوں کے بھاپ انجن میں بھی حاصل نہیں ہوتا ہے۔

غذا کے مختلف اقسام کا تناسب

ان واقعات کے مدنظر اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ انسان کو اپنے عضلات سے کام کرنے کے لئے حراروں کی ایک خاص مقدار درکار ہے، ضرورت سے زیادہ کھانا محض اس لئے کہ طاقت میں اضافہ ہو، بیوقوفی ہے غذا کی مقدار کے تعین اور اس کے انتخاب میں کافی ہوشیاری برتنے کی ضرورت ہے، غذا کے انتخاب کا انحصار معدہ کی قابلیت ہاضمہ، تنفس اور دوران خون پر ہے، بے سوچے سمجھے غذا کبھی استعمال نہ کرنی چاہیئے، کاربوہائیڈریٹ، روغنیات اور البومینی مادہ کا غذا میں شامل ہونا ضروری ہے ان تینوں میں البومینی مادہ بہت اہمیت رکھتا ہے وہ نہ صرف انسان میں کام کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے بلکہ اکثر دفعہ جسم کی ساخت میں بھی بہت بڑی مدد دیتا ہے ہمیں غذا ایسی استعمال کرنی چاہیئے کہ وہ ہضم ہو سکے، اس لئے اس کے ہضم ہونے کی قابلیت بھی معلوم کرنا ضروری ہے، مزید برآں ہمیں خون دل اور تنفس کی اکسائی کی حالت کا بھی علم ہونا چاہیئے کیونکہ غذا کا کاربن کوئی اہمیت نہیں رکھتا اگر اس کے جلانے کے لئے آکسیجن موجود نہ ہو، جو شخص خوب طاقت حاصل کرنے کے لئے زیادہ غذا کا استعمال

کرتا ہے تو اس کے رگ اور پٹھے مضبوط اور طاقتور ہیں تو ہم سمجھینگے غذا کارآمد ہوئی۔ اگر نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ساری غذا فضلہ بن کر رہ گئی۔ اچھی صحت کا تندرست آدمی چوبیس گھنٹے کے اندر دس ہزار حرارے بھی استعمال کر سکتا ہے لیکن ہر شخص کا یہی حال نہیں ہے اور اسی لئے ہر شخص یکساں نہیں ہوتا۔

انسان کے لئے، یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ اپنی غذا کو ناپ تول کر استعمال کیا کرے بلکہ اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ کچھ دنوں کے وقفہ سے اپنے جسم کا وزن کیا کرے، اگر اس کا وزن سرعت کے ساتھ بڑھ رہا ہے تو یہ اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ وہ زیادہ غذا استعمال کر رہا ہے، برخلاف اس کے اگر کم ہو رہا ہے اور صحت بھی اچھی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ توانائی کے لئے وہ خود اپنے ریشوں کو استعمال کر رہا ہے، ایسی صورت میں غذا کی مقدار کا بڑھانا از بس ضروری ہے، سچ تو یہ ہے کہ ہوشیار آدمی محض تجربہ کی بنا پر اپنی خوراک کو معین کر سکتا ہے تاکہ توانائی کو برقرار رکھ سکے بڑی مشکل ہے یہ کہ اس معاملہ میں لوگ حد درجہ لاپروائی برتتے ہیں بالخصوص ہندوستان میں تو اس معاملہ پر ذرا بھی توجہ نہیں دی جاتی مصروف اور کاروباری آدمی ان پابندیوں اور نگہداشتوں پر کبھی غور نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند دنوں کے بعد ان کی ہڈیاں نکل آتی ہیں اور وہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ کام کرنے کی صلاحیت ان میں دن بدن گھٹتی جا رہی ہے۔

(۱)

وائٹامن کی اہمیت

ہم نے ابھی بیان کیا ہے کہ غذا کی تین قسمیں ہیں، کاربوہائیڈریٹ چربی اور البومینی مادہ، یہ لازمی چیزیں ہیں جن کے اکسادے سے توانائی پیدا ہوتی ہے، لیکن ان تینوں کے علاوہ کامل صحت کے لئے انسان کو اپنی غذا کی فہرست میں اور چیزوں کو بھی شریک کرنا ضروری ہے مثلاً پانی یہ جزو لاینفک ہے۔ علاوہ ازیں چند نمک مثلاً معمولی نمک اور دیگر مخصوص مادوں کی ضرورت ہے جن کو وائٹامن کہا جاتا ہے۔ عام طور پر کھانے کی چیزوں میں پانی شریک ہوتا ہے لیکن بعض میں مثلاً دودھ، گوشت، ترکاری، میں زیادہ تر وائٹامن شریک ہوتے ہیں۔

وائٹامن سے خوراک کے مسئلہ میں ایک نئے خیال کا اضافہ ہوتا ہے یعنی یہ کہ وہ حرارت یا حریروں سے بالکل بے تعلق ہے، یہ اشیاء ہماری غذا میں اس قدر کم مقدار میں موجود ہیں کہ بجائے

خود ان کو مبدا توانائی خیال نہیں کیا جاسکتا البتہ صحت جسمانی ترقی اور حتیٰ کہ جسم کی زندگی کا دارومدار انہی پر ہے اب تک ان کی کوئی باضابطہ کیمیائی تعریف نہیں کی گئی ہاں البتہ بتدریج یہ معلوم کیا جارہا ہے کہ یہ کن کن چیزوں میں شریک ہوتے ہیں اور کن چیزوں میں ان کی عدم موجودگی مہلک نتائج کا باعث ہوتی ہے۔

ان کو غذا کا زائد اجزء کہا جاتا ہے کہ ان کی عدم موجودگی خارشت کا باعث ہوتی ہے جہازوں میں جب مسلسل سفر کیا جاتا ہے تو خاص صورتوں کے علاوہ اکثر دفعہ کو تازہ چیزیں کھانے کے لئے نصیب نہیں ہوتیں جس سے اس مرض کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ دیگر جزیات کی عدم موجودگی کھجلی، گنٹھیا اور دیگر بیماریوں کا باعث ہوتی ہے حکیم لوگ جب ہم کو خاص غذا کے استعمال سے روکتے ہیں تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس میں یہ جزئیات کافی مقدار میں موجود نہیں۔ محاصرۂ کوت کے زمانہ میں برطانوی افواج میں خارشت اور ہندوستانیوں میں بیری بیری کا مرض عام ہوگیا تھا، اس کے ذمہ دار رسد پہونچانے والے تھے، بچوں، بوڑھوں اور فوجیوں کی غذا کا انتظام کرنے والوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ غذا میں وائٹامن کی موجودگی کا اطمینان کرلیں کیونکہ ان کی عدم موجودگی میں کاربوہائیڈریٹ، چربی اور البومینی مادہ انسان کی صحت کو قائم رکھنے کے لئے اپنا فعل پورے طور پر انجام نہیں دے سکتے۔

غذا کا لطف اٹھانا

انسان کا عضویاتی نظام غذا کی وجہ سے قائم ہے کسی شخص میں کارآمد توانائی حالت اعتدال پر نہ ہوگی اگر وہ بہت زیادہ یا بہت ہی کم غذا استعمال کرے یا اس کا ہاضمہ خراب ہو۔ ہاضمہ کا عمل نظمی عضو سے شروع ہوکر اس کو لائڈ محلول میں ختم ہوتا ہے جس میں زندہ خمایہ (PROTOPLASM) شریک ہے بدہضمی، ہاضمہ کی عضویات کی ناکارگی کی وجہ نہیں ہے بلکہ اس کے دوسرے اسباب ہیں کھانا ہضم کرنے کے لئے ہم کو چاہئے کہ ہم غذا کا پورا پورا لطف اٹھائیں جو شخص غذا کا لطف نہیں اٹھاتا وہ کسی چیز کا بھی لطف نہیں اٹھا سکتا۔ غذا کا پورے طور پر لطف اٹھانے کے لئے ہم کو چاہئے کہ اس کو سونگھیں اور چکھیں۔ غذا کے سونگھنے اور چکھنے سے ہمارے منہ میں پانی چھوٹتا ہے اور یہی ہاضمہ کی وجہ ہے روسی حکیم پاؤلاف کا بھی یہی خیال ہے کہ بو اور ذائقہ سے پیٹ میں بھی پانی چھوٹتا ہے بعض لوگ خوب کھاتے ہیں صرف اس لئے کہ بہت زیادہ کھائیں، نہ تو وہ اس کا لطف اٹھاتے ہیں اور نہ کچھ اس سے

صحت پر مضر اثر پڑتا ہے اور انسان بیمار ہو جاتا ہے صحت کی ترقی یا توانائی کی زیادتی کا انحصار ذائقہ اور سونگھنے کے احساس کی تحریک پر ہے۔ ہاضمی رس جس کو ڈاکٹر پاؤلاف نے PSYCHIC JUICES نام دیا ہے۔ بو اور ذائقہ کے احساس سے پیدا ہوتا ہے اور ہاضمہ میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔ سوئے ہضمی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ طعام خانوں میں کھلی ہوا کا گذر نہیں ہوتا اور ظاہر ہے کہ بغیر صاف ہوا کے تنفس اور دوران خون کا ٹھیک عمل نہیں ہوتا اور جب ایسا ہو تو پھر ہاضمہ کا عمل کس طرح پورے طور پر انجام پا سکتا ہے اسی لئے سوئے ہضمی کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔

عام طور پر لوگوں کے ہاضمہ میں اتنی قابلیت ہوتی ہے کہ وہ اس قدر توانائی پیدا کر سکیں جتنی کہ ان کو درکار ہے، زبردست رگ پٹھوں اور عضلی توانائی رکھنے کی چنداں ضرورت نہیں اس لئے کہ کامل صحت کا انحصار رگ پٹھوں کی مضبوطی اور غیر معمولی طاقت پر نہیں ہے مختلف طریقے جن سے رگ پٹھوں کو مضبوط اور طاقتور بنایا جاتا ہے توانائی کے نقطۂ نظر سے قطعاً بیکار ہیں اس لئے کہ طاقتور رگ پٹھے صرف چند سال کے لئے نمایاں توانائی کا مظاہرہ کرتے ہیں اس طرح جو توانائی صرف ہوتی ہے وہ جاندار عضویات پر ایک قسم کا بار ہے یہ گویا کاربن کے مرکبات کی توانائی یا القوہ کا بیجا اسراف ہے اس میں شک نہیں کہ قدیم زمانہ میں عضلی توانائی یا جسمانی طاقت تنازع للبقاء کے لئے ضروری چیز تھی اس زمانہ میں کسی بھاری وزن کا اٹھانا یا کسی زبردست کمان کا کھینچنا ایسے کام تصور کئے جاتے تھے کہ جن کے انجام دینے سے کمزوروں پر فوقیت حاصل ہوتی تھی لیکن آج کل جب کہ ہمارے پاس کارتوس کی بندوقیں اور زہریلی گیس موجود ہیں عضلی توانائی ایک تحت کی چیز تصور کی جاتی ہے غذا کے کاربن سے ایک انسان چند سو حرارے پیدا کر کے اپنے بازوؤں کی توانائی کو بڑھا سکتا ہے تاکہ کچھ کام کر سکے لیکن کوئلہ کی توانائی اگر وہ اپنے دماغ کو کام میں لائے تو اس سے ہزار گنا زیادہ کام کر سکتی ہے تیل کی توانائی سے انسان موٹر کے ذریعہ سیکڑوں میل کی مسافت طے کرتا ہے جس کے لئے اس کے پیروں کی توانائی ناکافی ہے۔ پھر ایسی صورت میں ہم کو عضلی توانائی کی اتنی ضرورت باقی نہیں رہتی ہم اس انسان کی صحت کو اچھی صحت کہتے ہیں جس میں اپنے عضلات کی توانائی کو سلیقہ سے استعمال کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ آج کل کے زمانہ میں انسان کو عضلی توانائی سے زیادہ دماغی یا ذہنی توانائی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ دماغی توانائی کی مدد سے وہ مشینوں سے کام لیکر عضلی توانائی کی ضرورت کو باقی نہیں رکھتا، لہٰذا ہم کو صرف اس قدر توانائی کی ضرورت ہے کہ

ہم اس کی مدد سے اپنے ہاضمے، سانس لینے کے عضویات اور دوران خون کو برقرار رکھ سکیں - آج کل یہ نہیں دیکھا جاتا ہے کہ انسان کی صحت کامل ہے کہ نہیں بلکہ اس بات پر غور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی روحانی اور دماغی قابلیتوں کو کس طور پر صرف کرتا ہے ہم اس کی پروا نہیں کرتے کہ آیا وہ شتر مرغ کا ہاضمہ رکھتا ہے یا شیر سے لڑنے کی طاقت بلکہ ہم جس چیز پر توجہ دیتے ہیں وہ یہی کہ اس میں اپنی توانائی کی قدر و قیمت کو جاننے اور اس کو استعمال کرنے کی کہاں تک صلاحیت موجود ہے۔

ورزش

ذہنی کاموں کے لئے زیادہ غذا کی ضرورت نہیں بس اتنی غذا کافی ہے کہ قلب اور پھیپڑوں کی حرکات اور جسم کی حرارت کو برقرار رکھ سکے' برخلاف اس کے بعض لوگ جتنی توانائی خرچ کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ کھاتے ہیں اور بعض لوگ عضلی حرکت میں بہت زیادہ توانائی خرچ کر دیتے ہیں اس سے نقصان ہوتا ہے ورزش بھی اعتدال پر ہو اور غذا بھی معتدل تو حاصل توانائی کی مقدار بڑھ جاتی ہے معمولی صحت کا آدمی ناچ سکتا ہے' چل سکتا ہے' تیر سکتا ہے' کھیل سکتا ہے' اور دیگر قسم کی ورزش بھی کر سکتا ہے اور ایسا کرنے سے اس کے ہاضمہ تنفس اور دوران خون میں اضافہ ہوتا ہے' اتنا کام کرنے پر بھی توانائی کی ایک کافی مقدار بچ رہتی ہے جس کو دوسرے کاموں میں لایا جا سکتا ہے' سستی کے وقت اگر تھوڑی سی ورزش کر لی جائے تو جسم کا کارخانہ کام کرنے لگتا ہے' اس کی مثال ایک مشین کی سی ہے کہ اس کے ایک پہیے کو ذرا سی گردش دیدی اور پھر وہ چلنے لگا' بغیر ورزش کے بھی انسان اپنی دماغی توانائی کو قائم رکھ سکتا ہے لیکن اس کیلئے تھوڑی بہت ورزش درکار ہے۔

صحت اور خوشی کا تعلق

ہم نے قبل ازیں اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ بعض لوگ بہت کھاتے ہیں یا کم از کم اتنا کھاتے ہیں کہ وہ ضرورت سے زیادہ ہو جاتا ہے' غذا نہ صرف جسم انسانی کو گرم رکھتی ہے بلکہ اس کا اثر کردار اور طبیعت پر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً مشہور ہے کہ بھوکا آدمی کتے کے برابر ہوتا ہے یعنی اس کی طبیعت میں کتے کے جیسا غصہ ہوتا ہے' جو آدمی کم کھاتا ہے وہ ہمیشہ آگ بگولہ رہتا ہے اور موٹا آدمی یا خوب کھانیوالا ہمیشہ مستغنی۔ انسان کی توانائی اور صرف دماغی توانائی ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کی توانائی کا کچھ حصہ اس کو خوش رکھنے کے لئے بھی استعمال ہونا چاہئے کیونکہ صحت کی عدم موجودگی کی خوشی بہتر ہے صحت کی غمی سے۔ کیونکہ اگرچہ خوشی توانائی کو پیدا نہیں کرتی تاہم وہ اس کے صرف کا راستہ بتلاتی ہے۔

بنا بریں تھوڑی سی اور ہلکی شراب کا استعمال جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ الکحل کسی صورت میں بھی غذا کا کام نہیں دیتا اور اگر اسے معمولی غذا کے ساتھ استعمال کیا جائے تو ایک حد تک وہ توانائی کو گھٹاتا ہے لیکن کسی مغموم دل کے لئے وہ اکسیر کا کام کرتا ہے دل اور دماغ کی قوت کو بڑھا کر زندگی کو کار آمد بنا سکتا ہے۔ جسم کے مشین میں غذا وہ کام کرتی ہے جو معمولی مشین میں کوئلہ۔ لیکن مشین چلتے چلتے جب رک جاتا ہے یعنی اس کے پہیئے اچھی طرح نہیں پھرتے تو خوشی کا تیل ملائمت پیدا کرنے کے لئے مفید ثابت ہوتا ہے۔

(۲)

تنفس اور دوران خون

غذا، جسمانی ورزش اور صحت کے مابین جو تعلق ہے اس کو ہم نے ایک بڑی حد تک وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے اور جیسا کہ ہم نے پہلے بتلا دیا ہے غذا اور جسمانی ورزش کو تنفس اور دوران خون سے جدا تصور نہیں کر سکتے اگرچہ غذا دل و دماغ کو بنائے رکھتی ہے تو دل و دماغ بھی غذا کے کام میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ نیز ہم نے اس بات کو بھی واضح طور پر سمجھا دیا کہ جسم کی توانائی کا اصل مبدا وہ توانائی ہے جو کاربن کے اکساؤ سے خارج ہوتی ہے۔ کاربن کا اکساؤ اس آکسیجن سے ہوتا ہے جو سرخ خون کے جسیمات کے رنگین مادہ کے ساتھ شامل ہے۔ تنفس کا عمل آکسیجن کو خون میں لاتا ہے اور اس سے کاربن ڈائی آکسائیڈ کو جدا کرتا ہے جو کاربن کے احتراق کی وجہ سے اس میں جمع ہے۔

تنفس اور خون کا دوران ایک قسری فعل ہے جب کوئی شخص کافی جسمانی ورزش کرتا ہے تو سانس بلا ارادے کے تند و زور سے چلنے لگتی ہے تاکہ آکسیجن کو حاصل کرے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کو علحدہ۔ ساتھ ہی ساتھ دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے تاکہ ریشوں (TISSUES) تک آکسیجن کو پہونچا کر وہاں سے کاربن ڈائی آکسائیڈ حاصل کرے۔ دوران ورزش میں دس گنا آکسیجن صرف ہوتی ہے اور آرام کے موقع پر دس گنا کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج ہوتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کی عضلی توانائی کا دار و مدار نہ صرف غذا کی توانائی پر ہے بلکہ زیادہ تر دوران خون اور تنفس کی قابلیت پر بھی، اگر کسی شخص کا ہاضمہ درست ہے مگر پھیپھڑے اور دل خراب تو وہ پوری توانائی حاصل نہیں کر سکتا۔ ان تینوں میں ایک قسم کا توافق ہونا چاہئے صحت کا جز و اعظم توانائی کا توافق ہے اور توافق کا نہ ہونا خرابی صحت کی دلیل اوسط صحت کے آدمی کے لئے یہ کوئی ضروری

ہیں کہ توانائی کی درآمد اور برآمد بہت زیادہ ہو بس اتنا کافی ہے کہ اس کا اندرونی نظام تعادل کی حالت میں رہے۔ یہ بات اس وقت ہو سکتی ہے جب کہ وہ عقلمندی سے کھائے پیئے، کام کرے اور سانس لے غذا اور ورزش کے متعلق تو خیر ہم نے کافی سے زیادہ بحث کی ہے۔ اب ذرا سانس لینے کے فعل پر غور کریں گے۔

زندگی کی سانس

زمانہ حال میں تنفسی ورزش پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، تنفس ایک غیر ارادی فعل ہے جس کا عمل پیدائش سے لیکر موت تک برابر ہوتا چلا آتا ہے، یہ ایک عمل ہے جو کچھ تو عضلی افعال اور کچھ کیمیائی اثرات پر مبنی ہے اگر روزانہ کچھ منٹ کے لئے تنفسی ورزش کی جائے تو تنفسی قابلیت پر بہ حیثیت مجموعی بہت کچھ اثر پڑتا ہے تنفسی ورزش کی بہترین قسم یہ ہے کہ کھلی ہوا میں ورزش کی جائے لیکن یاد رہے کہ ورزش کرنے سے قبل دل اور پھیپھڑوں کی قابلیت کا لحاظ کرنا ضروری ہے کھلی ہوا میں اس لئے ورزش کی جاتی ہے تاکہ آکسیجن کی کافی مقدار حاصل ہو سکے، اس طریقہ سے اکساد کے عمل اور ذی حیات توانائی میں کافی اضافہ ہوتا ہے کسی کاہل اور سست آدمی کے لئے اس قسم کی ورزش نہایت مفید ہے اس لئے کہ تنفسی ورزش اس کی ذی حیات اور دماغی توانائی کو بڑھانے میں بہت مدد پہنچاتی ہے۔

جسم کی تپش

عضلی ورزش کے علاوہ بھی اور بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جو تنفسی عمل میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں مثلاً تپش اور جلد۔ ہم نے قبل ازیں اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ غذا کی توانائی کا (۸۰) فیصدی حصہ حرارت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور یہ حرارت بالعموم جسم کی تپش کو (۹۸ء۴)° ف پر برقرار رکھتی ہے پس اگر عضلی توانائی میں اضافہ ہوتا ہے تو اس کا صاف طور پر یہی مطلب ہوا کہ جسم کی حرارت میں اضافہ ہو رہا ہے یعنی جسم سے حرارت زیادہ خارج ہو رہی ہے، کیوں ؟ اس لئے کہ اگر حرارت کا اخراج نہ ہو تو جسم کی تپش بلند ہو جائیگی اور سخت بخار آجائیگا مگر فطرت نے اس کی کمی اور زیادتی کا خاص انتظام کر رکھا ہے، جسم کے اندر حرارت اگر زیادہ ہو جائے تو جسم یکایک سرخ ہو جاتا ہے اور حرارت اشعاع کے ذریعہ خارج ہو جاتی ہے جسم پر پسینہ آجاتا ہے تاکہ حرارت بخارات کی شکل میں خارج ہو جائے لیکن اگر فضا گرم، مرطوب یا خشک ہو تو فطرت کے یہ انتظامات اتنے زیادہ مفید ثابت نہیں ہوتے مگر ایسی حالتوں میں فطرت نے خود اسطرح کا انتظام کر رکھا ہے ایسی حالتوں میں توانائی میں اضافہ ہونے نہیں پاتا، چنانچہ گرم ممالک کے لوگوں میں توانائی نسبتاً کم ہوتی ہے اور وہ سرد ممالک والوں کے مقابلہ میں بہت کم کام کرتے ہیں یورپ کے لوگ

آفریقہ والوں سے زیادہ کام کر سکتے ہیں۔

لباس کے اندر کی فضاء

اب ہم ایک نئے موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں وہ لباس کے اندر کی فضاء ہے، عام طور پر صحت کی خرابی بھوک کا نہ لگنا، توانائی کا انحطاط، جوش کی کمی اور عام سستی کی ایک وجہ ہمارے جسم کے اطراف کی گرم مرطوب اور خاموش فضاء ہے، جو لوگ گرم منطقی حصوں میں رہتے ہیں انہیں باہر کی فضاء ناگوار معلوم ہوتی ہے برخلاف اس کے وہ لوگ جو سرد ممالک میں رہتے ہیں یہ چاہتے ہیں کہ ان کے کمروں اور لباس کے اندر کی فضاء گرم، مرطوب، اور خاموش ہو، لباس کے اندر کی فضاء صحت کے معاملہ میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے، انگلستان میں رہنے والے لوگ اپنے لباس کے اندر کی فضاء کو ہمیشہ گرم رکھتے ہیں، تمام جسم کو کپڑوں سے ڈھانک لیتے ہیں، لیکن ان کا چہرہ اور دونوں ہاتھ کھلے رہتے ہیں تاکہ حرارت کا اشعاع ہو سکے، اگر یہ نہ ہو تو انسان کے عضو معطل ہو جائیں گے، کسی نہ کسی جگہ سے اشعاع کا ہونا لازمی ہے، چنانچہ انگلستان کی عورتیں آج کل اپنے جسم کا بہت سا حصہ کھلا رکھتی ہیں۔ شائد اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہ اتنا حصہ صرف اشعاع حرارت کے لئے کھلا چھوڑتی ہیں، اس سے بہتر یہ ہے کہ انسان دن کے کسی حصہ میں اپنے جسم کو اس بات کا موقع دے کہ اس سے نہایت آزادی کے ساتھ اشعاع ہو سکے، جب ہم کسی پہاڑ پر چڑھتے ہیں یا سمندر کے کنارے ٹہلتے ہیں تو ہمیں ایک قسم کی فرحت حاصل ہوتی ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ شائد یہ ہوا کی تبدیلی کی وجہ ہوگی۔ مگر واقعہ اس کے بالکل برخلاف ہے، ہوا میں تو کچھ ایسی زیادہ تبدیلی نہیں ہوتی مگر سمندر کے کنارے اور پہاڑ پر ہوا زوروں سے چلتی ہے اور ہمارے جسم کے تقریبًا تمام حصوں سے گذرتی ہے، اس سے حرارت کا کافی اشعاع ہوتا ہے اور اسی لئے ہمیں فرحت معلوم ہوتی ہے کافی اشعاع کے بغیر نہ تو جسمانی مشین ہی کام کر سکتا ہے اور نہ موٹر کا مشین ہمارے مکان اور ہمارے لباس کے اندر کی متحرک ہوا ہم میں کام کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔

لباس کے اندر کی فضاء نہ صرف نقصانِ حرارت کے نقطۂ نگاہ سے ہی اہم ہے بلکہ نقصان آب کی وجہ سے بھی حرارت اور ورزش کی معتدل حالت کے تحت جسم کی جلد سے روزانہ تقریبًا ایک پنٹ پانی خارج ہوتا ہے اگر خوب ورزش کی جائے تو پسینہ کافی مقدار میں نکلتا ہے، اب اگر کپڑوں کی اندر کی فضاء رطوبت کے باعث سیر شدہ ہوگئی ہے تو پانی کا نکلنا بند ہو جاتا ہے اور سارا پانی جلدی ریشوں کے اندر بھر جاتا ہے، جسم کے اندر جلد کے نیچے پسینے کے ایسے ہزاروں غدود ہیں اگر ان سے پسینہ خارج ہونا بند ہو جائے تو لازمی طور پر صحت خراب ہو جائیگی، چنانچہ جب جسم پر چست بنائن اور موٹا کوٹ ہو تو ایک

قسم کی سستی محسوس ہوتی ہے علاوہ ازیں کمرون کے اندر صاف ہوا کے آنے کے لئے بڑے بڑے روشندان ہونے چاہئیں جس طرح سے بھٹی کے اندر کی آگ اس وقت تک اچھی طرح جل نہیں سکتی جبتک اس میں ہوا کے گزرنے کے لئے کوئی سوراخ نہ ہو اسی طرح جسمانی مشین بھی کام نہیں کر سکتا جب تک کہ وقتاً فوقتاً اس کے ایندھن کو تازہ ہوا نصیب نہ ہو۔

کھلی ہوا اور روشنی

مرض سل میں ڈاکٹر لوگ ہمیشہ عضویاتی اصول سے کام لیتے ہیں مریض کو ہمیشہ کھلی اور متحرک ہوا میں رکھنے کی ہدایت کرتے ہیں اس سے نہ صرف مریض کی توانائی میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ افراز کا عمل بھی بخوبی انجام پاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ کھلی ہوا کا اثر ہماری صحت پر پڑتا ہے یہی حال سورج کی شعاعوں کا بھی ہے لیکن اس کے متعلق ابھی زیادہ علم نہیں ہے البتہ حال کی تحقیقات سے اس بات کا پتہ چلا ہے کہ سورج کی روشنی کا اثر اس کیمیائی عمل پر پڑتا ہے جو خون کے اندر ہوتا ہے [illegible] تمام مشنری مرکز [illegible] خوب [illegible] کی کوشش [illegible] رہی ہے۔

(۳)

نیند

اب ہم ایک اہم بات بیان کرنا چاہتے ہیں جس کا تعلق براہ راست ذی حیات توانائی سے ہے انسان ایک ہفتہ تو کیا مہینوں بھوکا رہ سکتا ہے لیکن بغیر نیند کے اس کی زندگی دشوار ہے خواہ وہ کتنا ہی کیوں نہ کھائے اور کتنی ہی سیمپن کیوں نہ پیدا کرے اس کیلئے نیند ضروری ہے اس لیے کہ بغیر نیند کے توانائی گھٹتی جاتی ہے اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آخر نیند اس قدر ضروری کیوں ہے؟ اس کا سمجھنا قدرے دشوار ہے نظری حیثیت سے جہان تک دوران خون ہاضمہ اور تنفس کا تعلق ہے توانائی کی سخت ضرورت ہے لیکن فرحت بشاشت اور جولانی طبع کو قائم رکھنے کے لئے اور بالخصوص دماغ اور عصبی نظام کے منبع کو بیدار رکھنے کے لیے نیند ازبس ضروری ہے نیند میں شعور غائب ہو جاتا ہے اس کے چند وجوہات میں مثلاً [illegible] فضلہ کا ایک جگہ جمع ہو جانا اور حسیات کے اعصاب میں ایک قسم کی سستی پیدا ہو جانا وغیرہ نیند میں ذی حیات اعضا بہت ہی کمزوری کے ساتھ کام کرتے ہیں اور بہت سی آکسیجن جذب اور خارج ہوتی ہے اور کوئی شخص اپنی توانائی سے پورا لطف اٹھانا چاہتا ہے تو اسے خوب گہری نیند سونا چاہئے راتوں کو بہت دیر تک جاگنے اور پھر صبح جلدی اٹھ جانے سے سستی کاہلی اور پژمردگی کا حملہ ہوتا ہے خوش قسمت انسان نیند کے لطف سے اچھی طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں برخلاف اس کے غریب لوگوں کو نہ دن کو چین ہے

اور نہ رات کو آرام! اکثر صورتوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ ایک خاص وقفہ کی نیند صحت کو حالت اعتدال پر رکھتی ہے دماغی کام کے لئے صرف چند گھنٹے کی گہری نیند کافی ہے مختلف طبائع کے لوگوں کیلئے مختلف وقفوں کی نیند درکار ہے انسان پر جب بے خوابی کا حملہ ہوتا ہے تو ذہنی اور جسمانی توانائی میں کمی واقع ہوتی ہے اسکی کافی مدافعت کیجاتی ہے کیونکہ یہ بذات خود کوئی بیماری نہیں ہے بلکہ بیماری کا پیش خیمہ یا علامت ہے اسکی اصل وجہ بدہضمی، بخار، درد، تپ یا بھی ممکن ہے ایسی صورتوں میں ان بیماریوں کو دور کرنیکی کوشش کرنی چاہئے جن سے بے خوابی پیدا ہوئی ہے اس سے کیا فائدہ ایک شخص کو معدہ کی خرابی کی وجہ سے بے خوابی ہے تو اسے تھوڑی سی افیون کھلادی گئی؟ اسمیں شک نہیں کہ اسوقت کچھ فائدہ ضرور محسوس ہوتا ہے لیکن بعد کو اسکے مضر اثرات رونما ہوتے ہیں اگر بے خوابی فی الحقیقت بدہضمی کی وجہ سے ہوئی ہے تو اس کا علاج ہاضمہ کی دوا اور بستر پہ بھوکے پڑا رہنا ہے اگر بعد میں بھوک زیادہ معلوم ہو تو ہلکی سی غذا استعمال کر لیں نہ کہ مرغن غذا۔ نیز اگر کسی شخص کو نیند اس لئے نہیں آرہی ہے کہ وہ تھکا ہوا نہیں ہے تو اس کو چاہئے کہ کچھ کام کرے۔

اکثر صورتوں میں یہ ہوتا ہے کہ سونے سے قبل جب کوئی اشتعال انگیز خیال ذہن میں آجاتا ہے تو رات رات بھر نیند نہیں آتی' اس کا علاج صرف تبدیلی خیال ہے' بعض لوگ ذرا ذرا سی بات اور معمولی سے معمولی خیال پر مشتعل ہو جاتے ہیں اس کا علاج صرف یہی ہے کہ وہ اپنے اندر ایک خاموش اور سنجیدہ کردار پیدا کریں۔ اشتعال دل کی حرکت کو بڑھا دیتا ہے اور اس سے دماغ سے بہنے والے خون کا بہاؤ کم ہو جاتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس سے نیند نہیں آتی اشتعال کے علاوہ بعض دفعہ دوران خون کی زیادتی کے باعث نیند نہیں آتی' اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ گرم پانی نہا لیں یا گرم چیز پی کر سو جائیں۔

جب انسان حد درجہ پریشان اور متفکر ہوتا ہے تو اسے نیند نہیں آتی' پریشانی اور فکر ہمارے سامنے ناخوشگوار مناظر پیش کرتے ہیں بعض دفعہ جب کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا تو ہم اکتا کر پریشان ہو جاتے ہیں' یہ ایک لا علاج مرض ہے اس لئے ہماری زندگی میں ہزاروں مسائل ایسے ہیں جن کا حل ہمارے لئے از بس ضروری ہے' اگر ہم ہر بات پر متفکر ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ زندگی تلخ ہو جائیگی اس لئے استقلال ارتکازِ توجہ کی سخت ضرورت ہے' رات کی تاریکی اور خاموشی میں ان تمام خیالات کا تانتا بندھ جاتا ہے جس کا ٹوٹنا مشکل ہے' اس کا کوئی علاج نہیں ہاں صرف یہ ہو سکتا ہے انسان دن کے وقت پریشان کن باتوں کی طرف اپنی زیادہ توجہ نہ دے' ایک اور دلچسپ چیز ہے کہ وہ یہ کہ ہم اپنی پریشان حالی پر بھی پریشان ہو جاتے ہیں جس سے اور بھی نیند نہیں آتی صحت کے لئے بے خوابی مہلک ہے اور بے خوابی پر پریشانی ظاہر ہے۔ اگر نیند نہ آئے تو اپنے بستر پر خاموش پڑا رہنا بدرجہا بہتر ہے بستر پر

تڑپتے اور روتے پڑے رہنے سے اس لئے کہ اس سے پریشانیوں اور فکروں میں اضافہ ہوتا ہے۔

سطور بالا میں ہم نے بے خوابی سے پریشانی اور تفکر کا تعلق بتلادیا ہے لیکن اس سے علیحدہ جب ہم زندگی کے مختلف تاریک پہلوؤں پر غور کرتے ہیں جن کا تعلق غمگین اور جانکاہ واقعات سے ہوتا ہے تو اس سے ہماری اندرونی توانائی میں انحطاط پیدا ہونا شروع ہوتا ہے اور صحت خراب ہوجاتی ہے اس لئے کہ وہی توانائی جو ذی حیات اعضاء کی ملک ہے اس طرح بٹ جاتی ہے جس کی وجہ سے بدہضمی اور دیگر بیماریوں کی علامات شروع ہو جاتی ہیں اس لئے انسان کو چاہئے کہ وہ بالعموم اپنی نظر دنیا کے روشن و درخشان پہلو پر رکھے، پریشانی اور فکر کا دور کرنا زیادہ تر ارادہ کی تربیت پر موقوف ہے جو لوگ کھلی ہوا میں رہتے ہیں اور جن کی صحت بھی اچھی ہوتی ہے ان میں زمانہ کی تکالیف اور مصائب کو دور رکھنے کی قابلیت نسبتاً زیادہ ہوتی ہے، پریشانی ہی پر کیا موقوف ہے تمام ناخوشگوار جذبات صحت کی خرابی کا باعث ہوتے ہیں، غصہ، خوف، نفرت، حسد، اور نا امیدی یہ تمام ذی حیات اعضاء کو خراب کر دیتے ہیں چنانچہ جس شخص پر نا امیدی کی گھنگور گھٹائیں چھائی ہوئی ہوں اس کو بہت کم بھوک لگتی ہے۔ ہمارے ہندوستان میں جس شخص پر چوری کا شبہ کیا جاتا ہے تو ملا لوگ اس کو پڑھے ہوئے چاول چبوا تے ہیں اگر وہ چبا کر کھالے تو وہ چور نہیں ہے ورنہ بلاشبہ اس نے چوری کی ہے۔ بالکل ٹھیک ہے لیکن اس کی توجیہ دوسری ہے۔ پڑھنے پڑھانے سے کچھ نہیں ہوتا، بات یہ ہے کہ جرم کے خوف سے مجرم کا منہ خشک ہو جاتا ہے اور وہ چاول نگل نہیں سکتا۔

اگر یہ سچ ہے کہ ناخوشگوار جذبات، پریشانیوں اور افکار کی وجہ سے انسان کی قوت گھٹ جاتی ہے یا بہ الفاظ دیگر اس کی اسپرٹ مردہ ہو جاتی ہے تو ہم بلا شبہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ خوشی کے جذبات کے تحت اس کا حال بالکل خلاف اور جداگانہ ہونا چاہئے۔

"مژدہ دہ خوش دل کند کار بیش"

ایک عام مثل ہے جو شخص خوش رہتا ہے خوشیاں اس کے استقبال کو آتی ہیں، صحت کے لئے انسان کو مسرت اور خوشی کی ضرورت ہے اور خوشی صحت سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

ذہنی اور دماغی توانائی کی اہمیت

اس میں کوئی شک نہیں کہ توانائی انسان کی صحت کو برقرار رکھتی ہے اور سچ پوچھو تو انسانی زندگی کا دارومدار زیادہ تر توانائی ہی پر ہے لیکن اس توانائی کو اسی وقت کارآمد توانائی کہا جاسکتا ہے جب کہ وہ ذہنی اور دماغی کاموں کو بھی برقرار رکھے وہی توانائی مفید توانائی

کھلائی جا سکتی ہے جس میں عصبی نظام کے فعل کو برقرار رکھنے کی قابلیت موجود ہو کیونکہ عصبی نظام ہی حقیقی معنوں میں انسان ہے یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان کے دیگر اعضاء سے عصبی نظام کو علیحدہ کرلیا جائے تو پھر کوئی ایسی چیز بچ نہیں رہتی ہے جس کو ہم انسان کہہ سکیں۔ توانائی کا اولین مقصد عصبی نظام کے فعل کو برقرار رکھنا ہے اس لئے کہ خیال، احساس، عضلات کی ارادی اور غیر ارادی حرکت سب کا تعلق اعصاب سے ہے اگر اعصاب ہی کام نہ کریں تو پھر نہ تو کوئی احساس پیدا ہوگا اور نہ کسی قسم کی عضلی حرکت ہوگی نیز تنفس اور دوران خون دونوں کا عمل بھی یک لخت بند ہو جائے گا۔ مختصر یہ کہ زندگی کا خاتمہ ہو جائیگا۔

محض توانائی ہی دل و دماغ کو فائدہ نہیں پہونچا سکتی، اس کے علاوہ دل و دماغ کو ایک خاص تربیت کی ضرورت ہے، تعلیم یافتہ دماغ، غیر تعلیم یافتہ دماغ سے بدرجہ اتم کارآمد ہوتا ہے، حالانکہ دونوں ایک ہی قسم کی توانائی حاصل کرتے ہیں مگر فرق صرف تربیت کا ہے، چنانچہ ایک تربیت یافتہ دماغ وہ کام کر سکتا ہے جو ہزار کیا لاکھ حرارے بھی نہیں کر سکتے اس لئے ضروری ہے کہ انسانی دماغ کو اندرونی توانائی کے ساتھ ساتھ تربیت سے بھی متمتع کیا جائے۔ انسان کو اس معاملہ میں کافی دلچسپی لینی چاہئے ورنہ جانور اور انسان میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

سطور بالا میں ہم نے صحت کے چند عام پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، انشاء اللہ کسی دوسری صحبت میں صحت انسانی کے دوسرے پہلوؤں سے بحث کریں گے۔ فی الحال اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

دعائے نوید

از

جناب محمد تہنیت علی خاں صاحب نوید

فضل آصف پہ کبریا رکھے — نظر لطف مصطفیٰ رکھے
بس دعا ہے یہی نوید آمین — تا قیامت انھیں خدا رکھے

جذباتِ اخگر

(از جناب حکیم مرزا قاسم علی بیگ صاحب اخگر حیدرآبادی)

اُٹھ کے میرے پہلو سے ایک آگ لگا بیٹھے
اٹھے بھی تو کیا اٹھے بیٹھے بھی تو کیا بیٹھے

جز یاس نہیں کوئی پاس اپنی تمنا کے
یک دل تھا جو پہلو میں ہم کر کے فدا بیٹھے

یہ میری وفا کا خوں کچھ لطف شہادت ہو
دامن پہ ترے دھبہ قاتل جو ذرا بیٹھے

گو پاس نہ تھا کوئی پر ڈر تھا رقیبوں کا
بیٹھے بھی تو محفل میں وہ ہم سے جدا بیٹھے

تھا درد کوئی دل میں کیوں شیخ بھی آہ بھی
ہاتھ اپنے اٹھا کر یوں پھر بہر دعا بیٹھے

کچھ بھی تو نہیں تھے ہم ہستی کا گماں کیسا
یک نقش توہم تھا جو کچھ کہ مٹا بیٹھے

بے پردہ کیا ان کو اس جوش جوانی نے
شوخی کا تقاضا تھا محفل میں وہ آ بیٹھے

اپنے میں نہ تھا کوئی کل بزم تماشا میں
وہ کھول کے سب اپنے جیب بند قبا بیٹھے

وہ ناز کی شوخی میں یک مست تغافل تھا
ہم جوش جنوں میں کیوں عشق اپنا جتا بیٹھے

ہنگام شباب اور مے چھوٹے گی بھلا یہ کیوں
یک عالم مستی میں جب منہ سے لگا بیٹھے

چھپ سکتے ہیں کیا اخگر وہ اپنے چھپانے سے
پردہ فقط اتنا ہے پردے میں وہ جا بیٹھے

از مولوی سید وزیر حسن صاحب

اس مضمون کے لیے ہم اپنے عنایت فرا مولوی محمد عبدالرحمن صاحب رئیس مدیر "فن" کے ممنون ہیں۔ ابتدا "فن" کے لیے لکھا گیا تھا مگر "اس کے خشک اوراق اس لطیف مضمون کے متحمل اور موزون نہیں نکلے" تو صاحب مضمون کی اجازت سے "مجلۂ مکتبہ" میں اشاعت کے لیے دیدیا گیا۔ (مجلہ مکتبہ)

خدا وکیل بنائے وکیل کی صورت نہ بنائے!

دیکھئے! برا نہ مانئے گا! اس سے یہ مطلب نہیں کہ وکیل بیچارے میں فطرت بھی کسی نمایاں قسم ظریفی کا اضافہ کردیتی ہے' تاکہ دوسرے جانداروں کی ضرب المثل خصوصیات کی طرح یہ بھی بھلائے نہ بھولے! میرا یہ مطلب یہاں وکیل بالجبر کی اس ہیئتِ قانونی سے ہے جو ضابطہ دیوانی کی طرح اجیرن، قانون شہادت کی طرح خشک! مختصر یہ کہ "وکیل محض" کی جامع و مانع تعریف ہو!!

ان مراتب ابتدائی کے بعد بیان آگے بڑھنے سے پہلے لگے ہاتھ یہ توضیح بھی سنتے چلئے کہ "وکیل محض" کیا ہے؟ اور کن حالات میں یہ "وکیل بالجبر" بن جاتا ہے؟! ورنہ یاد رکھئے تعریف "مجہول بالمجہول" کے اصول سے اوپر کی ساری عبارت "قانون انتقال جائداد" کی طرح بے معنی ہوکر رہ جائیگی! اور وکیل کے ساتھ "بالجبر" کا لاحقہ کبھی آپ کی سمجھ میں بھی نہ آئیگا!!

اچھا! عام اس سے کہ مضمون یا سیاق عبارت اس کے خلاف ہو! "وکیل محض" سے مراد ایسا وکیل ہوگا جو چھ یا چھ سے زیادہ بچوں کا باپ ہو! یا جو بے اولاد' بن بیوی کے ایک مایوس الحال فلسفی نظر آئے! یعنی جس کا چلنا پھرنا' اٹھنا بیٹھنا' سونا' جاگنا کھانا' پینا غرض جملہ افعال ارادی وغیرارادی بجائے فلسفہ کے قانون میں رنگ جائیں اور یہ باور کرنیکے وجوہ ہوں کہ قانون کی خشکی دماغ سے متجاوز ہوکر اس کے منہ پر بھی آن پہنچی!

یہی ''ویل'' وکیل بالجبر ہو گا! اگر تنگی معاش یا بے حد لالچ دوسرے پیشوں سے تڑا کر بلا رضامندی اسے پیشہ وکالت کی طرف کھینچ لائے! یا سوء اتفاق سے ایک عفیل بیوی کا شوہر ''بالجبر'' یا دو جورو والا ہو! اور جو خلاف مرضی وکالت کی گڈی جھیلنے پر اسے آمادہ کردیں!!

اس میں یہ خصائص بھی پائی جاتی ہیں کہ باتیں زیادہ بنائے' کام کچھ نہ کرے! کچھ کرے تو اس اہتمام سے کہ خوشامد سے سرمو آگے نہ بڑھے! باتیں ملکائے، تو دفعات تعزیری کے پھول جھڑیں۔ خاموش رہے تو ان کی بھول بھلیوں میں بلا جبر و اکراہ گم ہو جایا کرے! یعنی تنگی معاش غفیل بیوی' یا دو جوروں کی داب ناجائز سے آٹھوں پہر قانون میں اتنا منہمک پایا جائے کہ تن بدن کا ہوش نہ رہے! کلاہ مبارک پر دو دو انگل میل کی گوٹ لگ جائے! اور ''بیچ'' کے لحاظ سے اس کی بقیہ پوشش بھی) ماشاء اللہ ہو! ڈاڑھی منڈاتا ہو تو دنوں استرے سے بے نیازی رہے! خیر سے ڈاڑھی دار ہو تو بال بال سے بدحواسی پڑی ٹپکے! غرض قانون کی حیثیت عرفی کا یہ ازالہ مجسم ہو! جو ایک دوالیہ ''ارواڑی'' ناکام لیڈر، معترض ملازم کی طرح نہ جینے کے لئے کبھی تیار ملے اور نہ اقدام خودکشی کے لئے!

اب سے دور ایک قانون کے طالب سے نیاز حاصل ہوا تھا جو ایک غفیل بیوی کے کمسن دولہا تھے! گویا زوجانی حیثیت سے وکیل بالجبر! قسمت کا مارا ایک کھاتے پیتے گھرانے کا کھولا نواب تھا ... جیسے متاہل زندگی کی بکھیڑے نے بجل ڈالا کچھ یونہی سی آبائی پونجی ورثہ میں ملی تھی۔ اسے اللے تللے سے کھا پی نچنت ہوئے! تو تنگی ترشی سے گزرنے لگی۔ بیوی پہلے ہی بلا کی جھلو واقع ہوئی تھیں۔ ناداری نے ہوا بنا دیا! رات دن میاں جی کی کندی اور آمدنی کی شکایت ہوتی رہتی۔ یہ گھبرائے گھبرائے چوطرف پڑے پھرتے! لیکن کوئی سبیل نظر نہ آتی۔ آخر بیوی صاحب نے ہی یہ مشکل بھی حل کی اور بے چارے کو وکیل بننے کا حکم نادری دے دیا۔ یہ شامت کا مارا ایسے خاندان کا ایک ناتجربہ کار ممبر تھا جو بڑے بوڑھوں کے صدقے کھاتا پیتا یعنی مفت خوری کا عادی ہو اور جہاں جہالت ایک طرح کا استغنا سمجھا جائے۔ بھلا یہ پڑھنا لکھنا کیا جانے۔ ان گنوں کو سے تھے۔ وکالت میں لکھائی پڑھائی حوائج انسانی کی طرح ضروری ٹھیری! لیجئے! بیاہ اور سنڈے بارات دن قانون کی ٹائیں ٹائیں کرتے اور گھر سے کھسکتے اگر تاب سکتے۔ بیوی نے ایک دن دیکھا دو دن دیکھا تیسرے دن نکال باہر

کیا! عبرت کا مقام ہے، ایک بیوی والا یوں بے گھر اور بے در اہو جائے۔ ہر چند عزیز اقارب نے سمجھایا لیکن سنا ہے، وہ اللہ کی بندی نہ مانی۔ وہ نئی روشنی کی لڑکی تھی۔ اپنی ہجولیوں کو سینما تھیٹر، کلب اور جانے کہاں کہاں جاتا آتا دیکھتی اس لئے خود بھی ان کے قدم بہ قدم چلنا چاہتی تھی، بھلا ان نکھٹو کو کس طرح بتیاتی۔ غرض یہ دونوں خانہ بدر رہے اور روز جاتے عدالت کی دور سے صورت دیکھتے چلے آتے! اور ایک دوست کے گھر پڑے رہتے مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ گاتے گاتے انسان کلا نوت ہو جاتا ہے! یہ بھی کچھ کم پنجے جھاڑ کر قانون کے پیچھے نہ پڑے تھے، اس لئے رٹتے رٹتے خاصے قانون بن گئے! اتنے اور خصائص امتیازی بھی رسان رسان رہتی رہیں! مختصر یہ کہ ان تمام مراحل کے بعد کہیں بیچارے کو بہ رضا و رغبت "خلوت بہ خانہ" کی پروانگی ملی! سنا ہے اب خانگی چپقلش کے سوا خاصی اچھی گزر رہی ہے! پیشہ کے لحاظ سے بھی نام خدا دوم درجہ کے "وکلار باجبر" میں شمار ہو گیا!!

قیاس چاہتا ہے (اس نوعیت کے نہ سہی!) اور بھی وکلار باجبر ہوں انکی معاش یلبے جا لالچ والے تو خیر نمایاں طور پر سامنے آجاتے ہیں لیکن زوجانی "باجبر" عموماً خفیہ ہوتے ہیں! یہ شاید ڈھونڈے ہی سے ملیں تو ملیں! احباب طریقت کو کھوج لگانے کی ضرورت نہیں! البتہ نگاہ رکھیں۔ ملتے جلتے اس بات کا خیال رکھ لیا جائے تو کافی ہے کہ حرکات سکنات، رفتار، گفتار کیا کہتی ہے۔ یعنی اس طرف تو اشارہ نہیں کہ "پس پردہ" بھی کوئی قوت کام کر رہی ہے!!

یہاں ذرا نظر اونچی کیجئے تو اور حقیقت کھلے۔ ایک وکیل ہی نہیں اور بھی "باجبر" نظر آتے ہیں! یہ اعتوف نہیں! قانون کی باتیں ہیں۔ ورنہ بتائیے کیا ضرور ہے کہ کارکنانِ "مقنن" اچھے خاصے آزاد ہو کر مجبور بنے جاتے ہیں! پھر یہ نزلہ متعدی ہے۔ خود تو جو کچھ بنے اپنے ماتحت بنے! مضمون نگاروں پر بدا "جبر مہربانہ" ہے کہ "مقنن" کے لئے لکھو جبراً لکھوا لکھنے بیٹھو تو یہ مشکل کہ کیا لکھو! نہ لکھو تو یہ ڈر کہ دیکھئے کب وارنٹ گرفتاری آتا ہے۔ غرض مضمون نگار "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" کا مصداق بنکر رہ جاتا ہے! کچھ اور کرتے دھرتے بن نہیں پڑتی مزہ کی سیر تو یہ کہ حوائج فطری رک جائیں تو رک جائیں لیکن طبیعت میں انقباض کی سند نہیں"

ثبوت لیجئے! پرسوں ایک "دُم" مضمون کی فرمائش ہوئی۔ میں ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا
تھا کہ دو دن کی مہلت بھی تجویز کر دی گئی! آئندہ کی بہت سی توقعات کا بار الگ ہی رہا
جس کے خیال سے جی گھبراتا ہے! بھلا اس زبردستی کا کوئی کیا جواب دیتا پھر معاملہ ٹھیرا
قانون دان حضرات سے، جو ذرا دیر میں عزت بربنا دیں اور رہی مثل ہے کہ رہی سہی بھی جائے
ناچار چپ ہو جانا پڑا۔ دوسرے دن ایک اور حکمنامہ آتا ہے۔

"توقع ہے کہ "وکیل بالجبر" جبراً "مقنن" تک پہنچ جائیگا!"

ایک کرم فرمانے تو سر راہ ہی آن لیا کہ حضرت مضمون؟! حضور طبیعت کا یہاں
ابھی تک یہ عالم تھا کہ دو سطر بن دو نقطہ بھی اس مضمون کے شرمندۂ قلم نہ تھے! اب آپ ہی
فرمائیے تقاضائے بالجبر تقاضائے گزشتہ سے بھی بڑھ گیا یا نہیں!

"مضمون کی شرط بالجبر" سنئے! مقنن کے لئے ہو اور رنگ قافیہ سے میل ہو! دوسرے الفاظ میں
جس کے یہ معنے ہوئے کہ "قانوناً" ہنسئے! طبیعت کو قانون سے مناسبت کیا، کوسوں کی دوری!
بازہم ظرافت کی دیوی نے "وکیل بالجبر" کا پھڑکتا ہوا عنوان سجھا ہی دیا! لیکن آگے آفت تھی!
کچھ لفظ "وکیل" سے طبیعت میں خود بخود روک پیدا ہو گئی۔ کیونکہ خیال تھا مبادا مضمون کی بدولت
عدالت کی شکل دیکھنی پڑے! اور مفت کی انجمن چھوڑ گھسیٹ ہو جائے۔ وجہ صاف تھی مرحوب
ضابطہ ہنس نہیں سکتا۔ یہاں وکیل کے ساتھ "بالجبر" کا معاملہ تھا! جو ناواقفیت کے ہاتھوں قانون
باہر ہوتا یہ ہوتا! نتیجہ ظاہر کہ غریب مضمون نگار کی تکا بوٹی ہو جاتی! چنانچہ اس ذمہ داری کو
بھی بہ لطائف الحیل ٹالا گیا۔ اور اب بذریعہ ہذا اعلان کیا جاتا ہے کہ اس مضمون کی اچھائی، برائی
زیادتی، "تمامی، تحسین، مذمت عرض جملہ مالہ و ما علیہ کے بہ تمام و کمال صاحب "مقنن" ذمہ دار
تھے، ہیں اور ہو گئے۔!!

کارکنان "مقنن" برا نہ مانیں۔ دوسرے پرچے بھی بڑی مزیدار فرمائش کرتے رہتے
ہیں۔ قانونی نہیں تو خیر اتنی مشکل اور لائق بازپرس نہیں جتنی مذہبی منہی مشکل تر اور لائق گردن
زدنی ہو سکتی ہے! تاہم ایک صاحب جو اعلاء کلمۃ الحق کے دعویدار اور ایک مذہبی پرچے کے
مالک ہیں، کسی ملا سے نہیں، مولوی سے نہیں، راقم سے مضمون کے فرمائشی ہیں! پھر لطف خاص یہ کہ
"شگفتہ" ہو! ان بزرگ سے کوئی پوچھے کہ حضرت! آپ کی ستم ظریفی کی بھی انتہا ہو گئی جو

مذہب میں یوں شگفتگی پیدا کر کے بیٹھے بٹھائے ایک بے گناہ کو کافر بنانے پر آمادہ ہیں۔!
نہ جانے کب کی دشمنی ہے جو اس طرح کا مضمون لیکر نکال رہے ہیں! لیکن وہ ہزار تقاضہ کریں، یہاں پہ "ہوش وحواس" تہیہ کر لیا گیا ہے کہ انہیں نہیں تو کم از کم ان کے شگفتہ مضمون کو ضرور دور سے سلام کر دیا جائے!!

بہر حال جبراً یا قہراً وکیل بالجبر کے اصولی خصائص سے یہاں آپ علی الاعلان دوچار ہوگئے۔ اب ایسا بننا یا نہ بننا ظاہر ہے کہ بالکلیہ آپ پر ہی منحصر ہو جاتا ہے۔ "وکیل بالجبر" بننے کا ایسا ہی شوق ہو تو ہرگاہ قرین مصلحت ہوگا کہ آپ شوق فرمائیں! لیکن بلا محنتانہ ایک ناچیز مشورہ میرا بھی ہے!! اتنا ضرور خیال رکھئے گا کہ ایک ہیئت قانونی کم از کم آپ پر نہ چھائے! یعنی للہ
وکیل بنئے وکیل کی صورت نہ بنئے!!

غزل

از جناب سید ابراہیم صاحب خلیل حیدرآبادی

شگفتہ جس سے ہو دل وہ ہوا نہیں آتی
مرے چمن میں کرم کی گھٹا نہیں آتی

ہماری موت کا باعث ہے سہل انگاری
اگر وہ آتے تو اے دل قضا نہیں آتی

ہے دوڑ دھوپ عبث چارہ ساز صبر کریں
مریض ہجر کو راس اب دوا نہیں آتی

شب فراق میں آتی اجل مزا آتا
ہمارے کام یہ کالی بلا نہیں آتی

مجاز آئینہ حق ہے یہ غلط ہے خلیل
بتوں کے عشق میں یاد خدا نہیں آتی

کوہستانی دوشیزہ

از جناب سید علی صاحب متعلم نظام کالج

ذرا دیکھئے! اس کوہستانی دوشیزہ کو، کھیت میں اکیلی فصل کاٹ رہی ہے اور تنہا گا رہی ہے، یہاں ذرا ٹھہر جائیں یا آہستہ آہستہ چلیں، وہ بالکل اکیلی ہے اور تن تنہا فصل کاٹنے اور اکٹھا کرنے میں مشغول ہے ایک درد بھری راگنی گی، سوز سے گا رہی ہے! سنئے وادی کی ساری خاموش فضا اس کی درد انگیز اور پر سوز آواز سے لبریز ہو گئی ہے۔

کیا کوئی ایسی شیریں نوا بلبل بھی ہوگی جس نے اتنے خوش آیند نغمے سنائے ہوں اور عرب کے تپتے ہوئے ریگستان میں تھکے ماندے قافلوں کو نخلستان کے نیچے اپنے ترانوں سے خوش کیا ہو؟ موسم بہار میں کیا کسی نے اس کوئل کو بھی ایسی دل آویز لے میں گاتے ہوئے سنا ہے جو اپنی نوا سنجی سے جھنڈ ہائے ہیبریڈیز کے سمندروں کی سکوت پرور فضا میں تلاطم برپا کر دیتی ہے؟

کیا کوئی مجھے ان نغموں کے مطلب پنہاں سے آگاہ کریگا؟ میں سمجھتا ہوں کہ شاید اس الم انگیز گیت میں کوئی قدیم دکھ بھری کہانی ہے یا ان بھلائی ہوئی عظیم الشان لڑائیوں کا ذکر ہے جو اس دوشیزہ کے ملک میں ہوئی تھیں یا آئے دن کے معمولی حادثات کا مذکور ہے یا کسی ایسے غم، درد، یا مفارقت کی بپتا ہے جو قدرت کی جانب سے گزری ہو اور جو پھر گزر سکتی ہے۔

خیر اس دوشیزہ کی نغمہ سرائی کا جو کچھ بھی مطلب ہو، لیکن اس کی پر سوز لے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے میں نے اس کو درانتی لئے ہوئے مصروف کار اور محو ترنم دیکھا ہے میں بے حس و حرکت اور خاموش کھڑا ہوا سن رہا تھا۔

وہ لطیف ترنم میرے دل کی گہرائیوں میں اب تک دفن ہے اگرچہ اس کو سنے ہوئے طویل مدت گزر گئی۔

(ورڈسورتھ)

*

تخیلاتِ عفو

جناب مولانا سید شاہ ابراہیم صاحب عفو مرحوم

تجھ پہ اے جانِ دل و جان کے قربان ہوں میں — یعنی خمیازہ کشِ کاوشِ پنہاں ہوں میں

دل میں کیا آرزوئے سر ہے پوچھ اے ہمدم — سر بسر پاک ہمہ تن صورِ ارماں ہوں میں

ہے عجب لا پرورش کا اکھاڑہ دل میں — پاک باطن ہوں مگر رشکِ سلیماں ہوں میں

داغ ہائے دلِ پرخوں کی تماشا ہے بہار — گویا اس سیر میں رنگین چمنستاں ہوں میں

ہوں تو قطرۂ ہر گہر آنکھ چرائے مجھ سے — پرورشِ یافتۂ دامنِ مژگاں ہوں میں

بت کافر نظر غیظ سے دیکھیں گے مجھے — جرم بس یہ ہے یعنی مسلماں ہوں میں

حشر میں بیگنہی میری تھی اک جرم عظیم — للہ الحمد کہ آلودۂ عصیاں ہوں میں

کیا مرے مذہب و ملت کا ٹھکانا اے عفو

کافرِ عشق ہوں اور بندۂ ایماں ہوں میں

مولانا شجاع الدین رح

از

جناب مولوی کامل میر مظہر علی صاحب وکیل

مولانا حافظ قاری شجاع الدین حسین قادریؒ، حضرت شاہ رفیع الدین قندہاری قدس سرہٗ کے خلیفہ ہیں۔ حیدرآباد دکن کے مشائخ عظام اور علمائے کرام میں ان دونوں بزرگوں کو ایک خاص امتیاز حاصل رہا ہے۔ مولوی امیر اللہ صاحب قندہاری (برادر حضرت نضیلت جنگؒ) نے "مناقب شجاعیہ" کے نام سے ۱۳۰۸ھ میں مولانائے ممدوح کے حالات لکھے تھے سلسلۂ کلام کے لیے پہلے حصہ میں مولانا رفیع الدینؒ کے حالات بھی بیان کیے ہیں ضرورت تھی کہ ان دونوں حضرات کے مفصل حالات سے قوم اور ملک کو روشناس کرایا جائے۔ مولانا شاہ رفیع الدینؒ کے حالات تو "مکتبۂ ابراہیمیہ" کی مطبوعات کے سلسلہ میں شایع ہو چکے ہیں اب ہمارے فاضل دوست مولوی میر مظہر علی صاحب نے جو اسی خاندان کے ایک رکن ہیں اس کی طرف توجہ کی ہے۔

مولانا شجاع الدینؒ کے تعارف کے لیے ان کی ایک کتاب "کشف الخلاصہ" کا نام لے لینا بہت کافی ہے۔ اس کتاب نے نہ صرف دکن میں مقبولیت حاصل کی بلکہ سارے ہندوستان کے مدارس اسلامی میں بھی اپنی جگہ نکال لی۔ (مجلۂ مکتبہ)

سلسلۂ نسب اور خاندانی حالات میر شجاع الدین حسین ابن سید کریم اللہ ابن میر محمد دائمؒ ابن میر شاہ مرزا، ابن میر کریم اللہ ابن میر عبد اللہ، ابن میر محمد امین، ابن میر جمال الدین، ابن میر اعراق، ابن میر ارتاق، ابن میر شاہ کوچک، ابن خواجہ حسن، ابن خواجہ حسین، ابن خواجہ احمد یسوی، ابن شیخ، ابن محمود شیخ، ابن افتخار شیخ، ابن عمر شیخ، ابن عثمان شیخ، ابن اسمٰعیل شیخ، ابن موسیٰ شیخ ابن یونس شیخ، ابن ہارون شیخ، ابن اسحٰق باب، ابن عبد الرحمن، ابن عبد الفتاح، ابن عبد الجبار، ابن عبد الفتاح ابن الامام محمد بن حنفیہ ابن امیر المومنین

سیدنا علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ شجرہ سے ظاہر ہے کہ آپ محمد بن حنفیہ کی اولاد سے ہیں آپکے اجداد میں حضرت خواجہ احمد یسوی بڑے معروف و مشہور بزرگ ہیں یہ علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے شیخ باب ارسلانؒ نے حسب الارشاد جناب رسالت پناہ آپ کو علوم باطنی کی تعلیم دی شیخ صاحب کے انتقال کے بعد آپ بخارا میں آکر خواجہ یوسف ہمدانیؒ کے مرید ہوئے اور خرقۂ خلافت حاصل کیا اور اپنے مرشد کے انتقال کے بعد خود مسند ارشاد پر تشریف فرما ہوئے۔ اکثر مشائخین ترک آپ ہی سے انتساب رکھتے ہیں ہزاروں طالبان حق نے آپ سے استفادہ کیا آپ نے ۹۶۲ھ میں وفات پائی۔ مزار قصبہ یسی میں ہے۔ مولانا کی ساتویں پشت کے دادا میر جمال الدین عہد اکبری میں وارد ہندوستان ہوئے آپ کا علم وفضل کی وجہ سے صوبۂ مالوہ کی قضائت پر تقرر ہوا آپ کے بعد پانچ پشت تک آپ کی اولاد نے اپنی قابلیت ولیاقت سے اس جلیل القدر عہدہ کے فرائض انجام دیئے۔ مولانا کے دادا میر محمد دائم (ولادت ۱۱۳۱ھ) کو ابتداء سے تحصیل علوم کا بیحد شوق تھا چونکہ اس زمانہ میں دہلی تمام علوم وفنون کا مرکز تھی اس لئے شوق کی تکمیل کے لئے آپ دہلی تشریف لے گئے اور غیر معمولی ذکاوت وذہانت کی وجہ سے چودہ سال کی عمر میں معقول ومنقول کی تحصیل کی۔ اسی تعلیمی سلسلہ میں آپ کو مرزا بیدل سے بھی شرف تلمذ حاصل ہوا اسی زمانہ میں نواب ناصر جنگ بہادر فرزند نواب آصفجاہ بہادر بھی مرزا صاحب کے پاس آیا کرتے تھے یہیں میر محمد دائم کی نواب صاحب موصوف سے ملاقات ہوئی کچھ عرصہ کے بعد آپ کا ربط ضبط محبت کی حد تک بڑھ گیا۔ اسی زمانہ میں آپنے شاہ یار محمد صاحبؒ خلیفہ حضرت نظام الدین ثانیؒ سے علم باطن کی تعلیم پاکر چند طریقوں میں آپ سے خلافت بھی حاصل کی اور علوم ظاہری وباطنی کی تحصیل کے بعد درویشانہ لباس میں اپنے وطن کی جانب مراجعت کی آپ کے والد شاہ مرزا صاحب بقید حیات تھے اپنے فرزند کی فقیرانہ طرز دیکھکر آپ نے فرمایا کہ اگر تم اس درویشانہ لباس میں رہکر فقیری میں اوقات بسر کروگے تو پھر تمہارے خاندان کی پرورش کون کریگا میں تم کو آزردہ کرنا نہیں چاہتا مگر مناسب یہ ہے کہ ظاہرا دنیاوی لباس میں رہکر اپنے آباد اجداد کے طرز طریق کے پابند ہو اور باطناً فقیرانہ مشاغل میں مصروف رہو۔ چنانچہ میر محمد دائم نے اپنے والد بزرگوار کی نصیحت کے موافق ایسی ہی روش اختیار کی حضرت میر شاہ مرزا کے انتقال کے بعد کسی نے محمد شاہ بادشاہ سے یہ عرض کردیا کہ میر محمد دائم کم عمر ہیں یہ عہدۂ قضائت کی انجامدہی کے قابل نہیں بجائے ان کے کسی اور کا تقرر ہو تو بہتر ہے اسکی

غیر پاکر حضرت میر محمد دائم خود محمد شاہ کے دربار میں حاضر ہوئے محمد شاہ نے آپ کے علمی تبحر کی وجہ سے متاثر ہوکر آپ کو اپنی موروثی خدمت پر مستقل کر دیا۔ اسی زمانہ میں نواب آصفجاہ بہادر نے دکن کا رخ کیا برہان پور وحسن پور فتح کرکے اسی نواح میں ایک عرصہ تک اقامت کی۔ میر محمد دائم کے علم وفضل کی عام شہرت تھی جس کی وجہ سے نواب آصفجاہ بہادر نے میر صاحب کا صوبۂ مالوہ سے برہانپور[1] کی قضاوت پر تبادلہ فرمایا اس خدمت کو میر صاحب نے اپنی غیر معمولی قابلیت سے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔

نواب آصفجاہ بہادر اپنے آخر زمانہ میں برہانپور ہی میں مقیم تھے یہیں آپ کا سلسلہ علالت شروع ہوا اور روز بروز ناتوانی بڑھتی گئی یہاں سے آپ زین آباد تشریف لے گئے اور کچھ دنوں یہاں اقامت کی پھر یہاں سے کوچ فرمایا اثنائے سفر میں جب آپ موہن نالہ کے قریب خیمہ زن ہوئے تو مزاج اور بگڑا بالآخر ۴ جمادی الثانی ۱۱۶۱ھ میں آپ نے رحلت فرمائی اور حضرت[2] برہان الدین اولیاؒ کے روضہ میں مدفون ہوئے۔ نواب آصفجاہ بہادر کے انتقال کے بعد جب نواب احمد علی خاں ناصر جنگ بہادر تخت نشین ہوئے تو تمام عہدہ دار نذر جلوس پیش کرنے کے لئے اورنگ آباد آنے لگے اس وقت میر محمد دائم بھی اپنے فرزند سید کریم اللہ کو ہمراہ لے کر اورنگ آباد پہنچے اور حضور میں نذر گذراننے کا شرف حاصل کیا۔ نواب ناصر جنگ بہادر میر صاحب سے اچھی طرح واقف تھے فوراً پہچان گئے مگر امتداد زمانہ کی وجہ سے مقام ملاقات یاد نہیں تھا اس لئے آپ نے استفسار فرمایا۔

"شما را کجا دیدہ ایم"

جواب میں میر صاحب نے عرض کیا کہ:

"بلے حضور در خانۂ مرزا بیدل"

اس کے بعد دریافت فرمایا کہ کتنی اولاد ہے میر صاحب نے کہا کہ ایک لڑکا ہے جو ہمراہ حاضر ہے

---

[1] برہان پور کو نصیر خاں فاروقی نے حضرت برہان الدین اولیا کے نام نامی سے منسوب کرکے سنہ ۸۰۱ھ میں آباد کیا اور اسی کو اپنا پایہ تخت قرار دیا۔

[2] حضرت شیخ برہان الدین غریب عرف برہان الدین اولیا۔ آپ حضرت نظام الدین اولیاء کے خلیفہ تھے اپنے مرشد کے حسب الارشاد چار سو فقیروں کو ہمراہ لیکر سلطان محمد تغلق کے عہد سلطنت میں دولت آباد تشریف لائے اور یہیں آپ نے اقامت کی۔ سنہ ۷۴۱ھ تک آپ بقید حیات تھے۔

چنانچہ سید کریم اللہ نے نذر پیش کی جس کو حضور نے قبول فرما کر دونوں کو دربار میں حاضر رہنے کا حکم دیا۔ میر صاحب کا نواب صاحب پر خاص اثر تھا کوئی کام میر صاحب کے مشورہ کے بغیر انجام نہیں پاتا تھا۔ میر صاحب اپنے زمانہ کے بڑے فاضل اور علامہ تھے بیان کیا گیا ہے کہ آپ کی متعدد تصانیف ہیں مگر افسوس ہے کہ باوجود تلاش و تفحص کوئی تصنیف دستیاب نہ ہو سکی۔

سید کریم اللہ ۱۱۵۹ھ میں تولد ہوئے اور اپنے فاضل باپ کے زیر اثر تربیت پائی یہ بھی بڑے ذکی اور جید عالم تھے نواب ناصر جنگ بہادر نے ان کی خوب قدر کی خاں بہادر کا خطاب مع لوازمہ عطا کر کے پائیگاہ خاص کی خدمت سے سرفراز فرمایا جب ناصر جنگ بہادر نے ۱۱۶۴ھ میں افغانوں کے ہاتھ کرنول کے معرکہ میں شہادت پائی اور سلطنت میں انقلاب پیدا ہوا تو پائیگاہ کی خدمت بھی باقی نہ رہی بجز قلیل معاش کے تمام معاشیں مسدود ہو گئیں تو دونوں برہان پورہ واپس آئے اور تھوڑی سی معاش میں نہایت وضعداری اور ناموری سے بسر کرتے رہے۔ نواب سید کریم اللہ خاں بہادر کا سن ساٹھ سال کا ہو چکا تھا مگر اب تک آپ نے شادی بیاہ نہ کیا تھا ایک روز آپ نے خواب میں دیکھا کہ برہانپور میں دفعتاً تیز ہوا چلی اور شہر کے تمام چراغ گل ہو گئے مگر ایک جامع مسجد کا چراغ روشن رہا اس خواب کی تعبیر یہ تجویز ہوئی کہ آپ کو ایک نیک نہاد فرزند ہوگا جس سے تمام خلائق مستفید ہو گی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی رائے قرار پائی کہ کوئی ایسی لڑکی تلاش کی جائے جس کے خاندان کا تعلق کسی نہ کسی طرح جامع مسجد برہانپور سے ہو۔ اتفاقاً آپ کے ایک عزیز خواجہ محمد صدیق عرف مولوی غلام محی الدین متولی جامع مسجد برہانپور نے اپنی دختر کی جن کی عمر (۲۹) سال کی ہو چکی تھی لیکن کہیں پیام نہیں ہوا تھا آپ ہی سے نسبت ٹھہرائی اور سید کریم اللہ خاں بہادر کی شادی مولوی غلام محی الدین کی دختر نیک اختر مسماۃ عارفہ بیگم سے ہو گئی صاحب مناقب شجاعیہ نے عارفہ بیگم کی عمر شادی کے وقت (۴۰) سال بتلائی مگر صاحب گلزار آصفیہ نے (۲۹) سال کی لکھی ہے اور صحیح یہی ہے کیونکہ آپ کی ولادت ۳ صفر ۱۱۶۱ھ کی ہے اور شادی ۱۱۹۰ھ میں ہوئی اس حساب سے شادی کے وقت آپ کی صحیح عمر (۲۹) سال ہی ہوتی ہے

مولانا شجاع الدین کی ولادت

شادی سے ایک سال بعد بتاریخ ۲۴ محرم ۱۱۹۱ھ روز چہار شنبہ مولانا پیدا ہوئے آپ کی ولادت کا عجیب واقعہ ہے جب آپ کی والدہ حاملہ ہوئیں تو بعض اقارب کو جو درحقیقت عقارب تھے بہت ہی ناگوار گذرا انہوں نے ایک ساحر سے یہ قرارداد کی کہ وہ اپنے عمل کے

زور سے کوشش کرے کہ اولاد ناقص الخلقت اور مردہ پیدا ہو اس کے عوض ایک کثیر رقم اس ساحر کو دینے کا وعدہ کیا چنانچہ جب مولانا تولد ہوئے تو آپ کے ساتھ ایک مردہ توام بھی پیدا ہوا اس پر ان عزیزوں نے اپنی بے حد ناکامی محسوس کی اور ساحر کو برا بھلا کہا لیکن ساحر نے ان کو سمجھایا کہ بچہ عموماً ایک ہی پیدا ہوتا ہے اس خیال سے میں نے ایک ہی پر سحر کا اثر ڈالا تھا یہ مجھکو معلوم نہ تھا کہ مردہ بچے کے ساتھ ایک اور صحیح و سالم بچہ بھی پیدا ہونیوالا ہے۔

مولانا کی ولادت کے دوسرے سال ۱۲ محرم ۱۱۹۳ھ بروز جمعہ کو آپ کے والد نواب سید کریم اللہ خاں بہادر نے (۶۳) سال کی عمر میں رحلت کی۔

مولانا شجاع الدین کی تعلیم و تربیت

جیسا کہ ابھی اوپر بیان کیا گیا ہے صغیر سنی ہی میں مولانا کے سر سے اپنے شفیق باپ کا سایہ اوٹھ چکا تھا اب آپ کے عزیزوں میں آپ کے نانا مولوی غلام محی الدین کے سوا اور کوئی ہستی ایسی نہیں رہی تھی جو خاص توجہ اور ہمدردی کے ساتھ آپ کی تعلیم و تربیت میں حصہ لیتی۔ مولوی غلام محی الدین بڑے عالی خاندان تھے آپ کے دادا حضرت خواجہ ہاشم قدس سرہ مشہور بزرگ ہیں۔ آپ ۱۱۳۶ھ میں پیدا ہوئے بڑے قابل اور جید عالم تھے۔ جامع مسجد برہانپور کی تولیت آپ ہی کے نام تھی۔ مولانا نے اپنے نانا صاحب کے زیر نگرانی تربیت پائی۔ صرف و نحو اور دوسرے علوم مروجہ کی درسی کتابیں بھی آپ ہی سے پڑھیں۔ آپ نے اپنے اکلوتے اور ہونہار نواسے کی تربیت و تعلیم کا خاص اہتمام رکھا خود آپ نے بھی تعلیم اور تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور برہانپور کے علما و فضلا سے بھی تعلیم دلوا کر کم سنی ہی میں مولانا کو لائق و فاضل بنا دیا۔ مولوی غلام محی الدین نے ۱۵ شوال ۱۲۰۰ھ روز یکشنبہ کو وفات پائی۔

مولانا نے قدرتاً بڑی ذکی طبیعت پائی تھی جس کتاب کا مطالعہ فرماتے اس کے معانی و مطالب پر بہت جلد حاوی ہو جاتے۔ اسی زمانہ میں آپ نے قرآن مجید بھی حفظ کر لیا تھا اور فن تجوید کی بھی تکمیل کی تھی۔ اس فن میں آپ کو اتنی دستگاہ حاصل تھی کہ جس قرأت میں قرآن شروع فرماتے آخر تک اسی قرأت میں بلا تکلف پڑھتے صاحب "مناقب شجاعیہ" نے لکھا ہے کہ دلیل خاں صاحب بیان کرتے تھے کہ میں نے قرآن مجید کے متشابہات اور وقف و مد وغیرہ کو خوب یاد کر کے امتحاناً حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کا قرآن سنا مگر آپ کا حفظ اتنا پختہ اور تجوید اتنی صحیح تھی کہ کسی جگہ ذرا بھی فرق نہیں ہوتا تھا۔ عربی زبان پر آپ کو کامل عبور تھا نظم و نثر بے تکلف لکھتے تھے

آپ کے متعدد خطبوں کو جو عربی نظم و نثر دونوں میں ہیں اور آپ کے دیگر عربی قصائد کو دیکھنے سے آپ کی عربی ادبیت کا اندازہ ہو سکتا ہے اسی طرح فارسی میں بھی کامل دستگاہ حاصل تھی۔ اس زبان میں بھی بے تکلف نظم و نثر لکھتے تھے۔ آپ کے متعدد فارسی رسالوں اور خطبوں اور غزلوں کے مطالعہ سے آپ کی فارسی قابلیت کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ اردو تو آپ کی مادری زبان تھی اس میں بھی نظم و نثر خوب لکھتے تھے مختصر یہ کہ قدرت نے آپ کو متعدد زبانوں اور مختلف علوم میں کافی مہارت عطا فرمائی تھی اور ایسا ذوق سلیم اور ذہن رسا دیا تھا جس کی وجہ سے آپ نے ہر فن میں مرتبہ کمال حاصل فرمایا چنانچہ متعدد تصانیف آپ کے غیر معمولی تبحر اور علمی معلومات کے بین ثبوت ہیں۔

آپ کی ہر زبان کی تصنیفات کا آخر میں تفصیل وار ذکر کیا جائیگا جس سے علمی میدان میں آپ کا جو مرتبہ ہے وہ صاف روشن ہو سکیگا۔

مولانا کی شادی

یقینی طور سے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کس عمر میں آپ کی شادی ہوئی صاحب مناقب شجاعیہ لکھتے ہیں کہ جب آپ کی عمر سترہ یا اٹھارہ سال کی ہوئی تو آپ والدہ صاحبہ سے اجازت لیکر اور بیوی سے مہر معاف کروا کر حج کو روانہ ہوئے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حج کو جانے سے پہلے آپ کی شادی ہو چکی تھی لیکن حج کو جاتے وقت آپ کی عمر کیا تھی ؟ اس میں اختلاف ہے۔ صاحب مناقب شجاعیہ نے سترہ یا اٹھارہ سال، اور مورخ تاریخ برہانپور نے بیس سال مولف گلزار آصفیہ نے چھبیس سال کی عمر میں آپ کا حج کو جانا لکھا ہے۔ لیکن یہ اختلاف اس طرح رفع ہو جاتا ہے کہ جیسے اوپر بیان کیا گیا۔ آپ ۱۱۹۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۱۷ھ میں وارد بلدہ ہوئے اس حساب سے جس وقت آپ بلدہ تشریف لائے آپ کی عمر پچیس سال کی تھی یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ حج سے واپس آنے کے بعد ہی آپ بلدہ تشریف لائے ہیں اس لحاظ سے یقینی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے ۱۲۱۵ھ میں حج کا قصد کیا اور اس وقت آپ کی عمر (۲۴) سال کی تھی بہ لحاظ اس کے اغلب قرینہ یہ ہے کہ (۲۱) یا (۲۲) سال کی عمر میں آپ کی شادی ہوئی ہوگی۔ آپ کی اہلیہ محترمہ کا نام انور بیگم نمان کا سنہ پیدائش ۱۱۹۶ھ ہے۔

زیارت حرمین

(۲۴) سال کی عمر میں ایک عزیز کی رفاقت سے مولانا نے حج کا قصد فرمایا اور بندر سورت سے جہاز پر سوار ہو کر راہی حجاز ہوئے۔ اس سفر میں زاد راہ کے سوا کچھ بھی آپ کے پاس نہ تھا یہاں تک کہ ایک لباس کے سوا دوسرا لباس بھی

موجود نہ تھا چنانچہ اثناء راہ میں جب آپ کا پاجامہ بوسیدہ ہوگیا تو دوسرا پاجامہ نہ ہونیکی وجہ سے آپ نے رومال سے پاجامہ کی ایک موزون وضع بنائی تھی اس سفر سے آپ کی انتہائی دینداری اور عقیدت کا پتہ ملتا ہے باوجود تنگدستی کے آپ نے اسلام کے ایک رکن اعظم کی تکمیل کا قصد فرمایا اور شوق و محبت کے جوش میں قلت زاد راہ کی وجہ سے جن سختیوں اور مصیبتوں کا سامنا ہونے والا تھا ان کی کچھ بھی پروانہ کی۔

حیدرآباد کی جانب روانگی

حج سے واپس آنے کے بعد نواب فتح الدولہ جاگیردار چتیاپور و تانڈور نے جو ننہیال کی طرف سے مولانا کے عزیز ہوتے تھے حیدرآباد طلب کیا چونکہ برہانپور میں مولانا کے نانا صاحب کا بھی انتقال ہو چکا تھا اور گذر بسر کے لئے کافی معاش بھی نہ تھی اس لئے آپ نواب صاحب موصوف کی طلبی پر ۱۲۱۶ھ میں فائز بلدہ ہوئے۔

عزت یار خان بہادر صدالصدور سے تلمذ

بلدہ آنے کے بعد مولانا نے نواب فتح الدولہ بہادر کے مکان میں اقامت اختیار کی نواب صاحب اندنوں اپنی جاگیر تانڈور میں تھے ان کے واپس آنے تک آپ نے بیکار رہنا پسند نہیں کیا بلکہ اس مدت میں نواب عزت یار خاں بہادر صدرالصدور سے صحاح ستہ کی سند حاصل کی۔

تقرر معاش

نواب فتح الدولہ بہادر نے نواب فخرالدین خاں شمس الامراء امیر کبیر سے مولانا کی خاندانی شرافت اور آپ کے علمی تبحر کا ذکر کیا نواب امیر کبیر نے

لہ عزت یار خان محی الدولہ صدالصدور کے والد کا نام حکیم الحکما حکیم جعفر خاں تھا آپ غفران مآب کے مقرب اور حکیم خاص تھے حضرت غفران مآب نے علمی تبحر کی وجہ سے آپ کو شہر کا محتسب اور صدر الصدور مقرر فرمایا تھا۔ عزت یار خاں بہادر نے اپنے والد کی زندگی ہی میں علوم نقلی و عقلی، ریاضی، طب وغیرہ کی تحصیل کرلی تھی والد بزرگوار کے انتقال کے بعد علاوہ خدمت احتساب وصدارت پر کارگذار رہنے کے حضرت غفران مآب کے معالج خاص بھی تھے۔ آپ کو فن طب ریاضی میں کمال حاصل تھا۔ حرمین شریفین کے نامور محدثین سے حدیث کی تحقیق کرکے آپ نے اس فن میں بھی کمال حاصل کیا تھا ۱۲۳۹ھ میں مہدوی افغانوں کے ہاتھ آپ نے شہادت پائی۔ مزار دریچہ بودلے صاحب کے باہر صوفی صاحب کے دائرہ میں واقع ہے۔

سلہ ابوالفخر فخرالدین خاں امام جنگ خورشید الدولہ خورشید الملک شمس الامراء شمس الملک ابوالخیر خاں شمس الامراء ثانی امیر کبیر فرزند ابوالفتح خان المخاطب بہ ابوالخیر خاں ثانی تیغ جنگ شمس الدولہ شمس الملک شمس الامراء اول۔ آپ پائیگاہ کے مشہور امیر ہیں۔ ۱۵ رمضان ۱۱۹۵ھ کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے اور یہیں آپ نے تعلیم پائی۔ بڑے خلیق رحمدل، مدبر، علم دوست اور صاحب فن کے قدردان تھے۔ ۱۲۷۰ھ میں انتقال کیا۔

بڑے شوق کے ساتھ آپ سے ملاقات کی اور پچاس روپیہ مشاہرہ آپ کے نام جاری کیا۔ اس معاش کے تقرر کے بعد مولانا نے اپنے اہل وعیال کو برہانپور سے بلدہ طلب فرمالیا لیکن صاحب گلزار آصفیہ کا بیان ہے کہ برہانپور سے بلدہ آتے ہوئے آپ خود اہل وعیال کو اپنے ہمراہ لائے تھے۔

تحصیل علم باطن

مولانا نے علوم ظاہری معقول ومنقول کی پہلے ہی سے تکمیل کرلی تھی اور معاش سے بھی ایک گونہ اطمینان ہوچکا تھا اب آپ کو علم باطن کی تحصیل کا خیال ہوا اس شوق میں آپ حضرت شاہ رفیع الدین[1] قدس سرہ کی خدمت میں قندھار پہنچکر چھ مہینے تک اس علم کی تحصیل میں مصروف رہے۔ صاحب مناقب شجاعیہ نے بیان کیا ہے کہ شاہ صاحب کے بادرچی خانہ سے آپ کو دو دفعہ "جوار کی روٹی اور انبارے کی بھاجی" دیجاتی تھی۔ ساگ آپ لوگوں کو دیدیا کرتے اور روٹی صرف نمک سے تناول فرماتے اس ریاضت شاقہ سے چھ مہینے میں مولانا نے شاہ صاحب سے خرقۂ خلافت حاصل کیا اور قندھار سے رخصت ہوکر بلدہ کو واپس تشریف لائے

جامع مسجد[2] بلدہ کا قیام

یہ مسجد قطب شاہی عہد کی یادگار ہے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے زمانہ میں چار مینار، پرانے پل کے ساتھ

---

[1] حضرت شاہ رفیع الدین قندھاریؒ سیدنا عمر فاروقؓ کی اولاد سے ہیں آپ بروز پنجشنبہ بتاریخ ۱۹ جمادی الثانی ۱۱۶۴ھ بمقام قندھار تولد ہوئے معقول ومنقول میں کمال رکھتے تھے شعر وسخن کا بھی شوق تھا قدرت اللہ لکھنؤی سے آپ نے اصلاح لی ہے۔ حضرت خواجہ رحمت اللہ نائب رسول اللہ صلعم سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ آپ بڑے عابد، زاہد، متقی تھے ثمرات مکیہ وغیرہ اکثر کتابیں آپ نے لکھی ہیں۔ ۱۵ رجب ۱۲۴۳ھ میں رحلت کی مزار تعلقہ قندھار میں ہے۔ آپ کے مفصل حالات مولوی عبدالغفار صاحب عابدی نے مرتب کئے ہیں اس کتاب کا نام شاہ رفیع الدین قندھاری ہے۔ مکتبہ ابراہیمیہ سے مل سکتی ہے۔

[2] جامع مسجد بلدہ چار مینار کے متصل شمالی سمت میں واقع ہے یہ مسجد ۱۰۰۳ھ میں بعہد سلطان محمد قلی قطب شاہ خاص الف خاں بہادر میر جملہ، امین الملک کے اہتمام سے تیار ہوئی اس کی تعمیر میں دولاکھ روپیے خرچ ہوئے۔ مسجد سے ملحق خانقاہ، حمام مدرسہ بھی تھا جواب خراب ہوگیا ہے۔ مسجد پر دو کتبے نصب ہیں۔ پہلا بخط نستعلیق صدر دروازہ پر سنگ سیاہ میں کندہ ہے۔ اس کا طول سات فٹ اور عرض دو فٹ ہے۔ اس پر بادشاہ وقت کا نام محمد مؤمن میر جملہ وزیر کا نام موجود ہے۔ اس کتبہ کا تاریخی مصرع "زہے عالی بنائے خیر گوئی" ہے لیکن اس سے ۱۰۲۲ برآمد ہوتے ہیں۔ دوسرا کتبہ محراب عبادت پر بطرز توقیع نہایت پاکیزہ ثلث خط میں کندہ ہے۔ پہلوؤں کے کتبہ کا طول وعرض ۱۲ × ۱ فٹ ۵ × ۱ انچ عریض ہے اس پر سیقول السفہا، دیکون الرسول علیکم۔ وما کان اللہ سیضیع۔ آیات قرآنی کندہ ہیں۔ جلال الدین حسین بن جلال الدین محمد المعمار الشیرازی اس کا کاتب ہے۔ گلبرگہ کی ناتمام مسجد کے بعد یہ دکن کی قدیم ترین مسجد سمجھی جاتی ہے۔ میر عباس علی خاں اعتصام الملک میر منشی حضرت مغفرت منزل نے اپنے صرفہ سے اسکی از سر نو تعمیر کرا کر سہ طاق در داق میں جو بی کٹہرہ نصب کرایا تھا۔

تعمیر ہوئی۔ اس زمانہ میں مسجد بالکل خستہ حالت میں تھی صوبہ مغل صاحب کا ہاتھی جن کا مکان مسجد کے دروازہ کے روبرو تھا مسجد کے صحن میں باندھا جاتا تھا اور مسجد کے اندرونی حصہ میں میانہ، پالکی عماری رکھی جاتی اور حوض میں ہاتھی کا چارا بھرا جاتا تھا ایسی افتادہ حالت میں مسجد میں نہ تو نماز ہی ہوتی تھی اور نہ اذان۔ مولانا نے ابتداً مسجد کے ایک گوشہ کو صاف کر کے اسی میں نماز پڑھنی شروع کی۔ جب آپ نواب فتح الدولہ کے مکان میں مقیم تھے تو صبح جامع مسجد تشریف لاتے نماز فجر و اشراق سے فارغ ہو کر واپس ہوتے پھر ظہر کو تشریف لا کر عشاء کے بعد مراجعت فرماتے۔ رفتہ رفتہ آپ کے فضل و اتقا کی شہرت ہونے لگی اور عوام و خواص آپ کی بزرگی کا شہرہ سنکر فیض صحبت سے مستفید ہونے کے لئے حاضر ہونے لگے۔ نواب عزیز یار خاں بہادر صدر الصدور نے نواب[۱] میر الملک بہادر اور راجہ چندولال[۲] بہادر سے مولانا کی قابلیت اور بزرگی کا ذکر فرمایا جس پر یہ اصحاب ایک دفعہ ملاقات کے لئے جامع مسجد آئے مسجد کی ناگفتہ بہ حالت دیکھکر صوبہ صاحب کو بہ عجلت ممکنہ ہاتھی اور سامان وغیرہ نکالنے اور مسجد کو صاف کرنے کا حکم دیا چنانچہ بہت جلد مسجد مع حوض و صحن وغیرہ بدعت کے صاف کر دی گئی۔ واپسی کے وقت نواب میر الملک بہادر نے مولانا سے عرض کی کہ اگر ارشاد ہو تو مسجد میں حجرے تیار کرا دئے جاتے ہیں جس کو مولانا نے منظور فرمایا اسی زمانہ میں لکڑ کوٹ تیار ہو رہا تھا اسی کی تعمیر میں سے چوبینہ وغیرہ بھجوا کر نواب صاحب موصوف نے مدرسہ میں حجرے بنوا دیے جس کی وجہ سے طلباء و مدرسین کے قیام

---

[۱] امیر الامراء میر الملک بہادر، نواب منیر جنگ بہادر کے تیسرے فرزند ہیں حضرت غفران مآب کے عہد میں آپ منصب پنجہزاری خدمت بخشی گیری علم نقارہ اور منیر الملک کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ آپ میر عالم بہادر کے داماد تھے حضرت مغفرت منزل کے عہد میں میر عالم بہادر کے انتقال کے بعد خدمت دیوانی پر فائز ہوئے۔ نواب ناصر الدولہ بہادر نے اپنی تخت نشینی کے بعد آپ کو امیر الامراء کا خطاب عطا فرما کر حسب سابق عہدۂ دیوانی پر بحال رکھا۔ آپ بڑے خلیق، ہمدرد، مدبر تھے۔ ۰، رشعبان ۱۲۴۸ھ کو سوہضمی کے عارضہ سے تین روز علیل رہ کر آپ نے رحلت کی۔ مزار میر مومن صاحب کے دائرہ میں ہے۔

[۲] راجہ چندولال راجہ نارائن داس کے بیٹے اور رائے لچھمی رام کے پوتے ہیں۔ ان کا سلسلہ نسب راجہ ٹوڈرمل سے ملتا ہے یہ قوم کے کھتری تھے۔ ۱۲۲۱ھ میں پیشکاری کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ نواب سکندر جاہ بہادر نے ۱۲۳۵ھ میں مہاراجہ کا خطاب مع نوبت و نوازمہ عطا فرمایا۔ پھر نواب ناصر الدولہ بہادر نے ۱۲۴۵ھ میں راجایان راجہ مہاراجہ راجہ چندولال بہادر خطاب مرحمت فرمایا۔ نواب میر الملک کے انتقال کے بعد ۱۲۴۸ھ میں آپ دیوانی کا کام دیکھنے لگے علماء، فقراء، شعراء، مشائخین کے بڑے قدردان تھے۔ شاعری سے گہری دلچسپی تھی شاداں تخلص کرتے تھے۔ ۷، ربیع الثانی ۱۲۶۱ھ کو (۸۶) سال کی عمر میں فوت ہوئے۔

میں بڑی سہولت ہوگئی۔ انہی میں سے مولانا نے بھی ایک حجرہ اپنے قیام و عبادت کے لئے مخصوص فرمالیا وہ مسجد جس کی ویرانی انتہا کو پہنچ چکی تھی وہ خدا کا گھر جو کس مپرسی کے عالم میں پڑا ہوا تھا جہاں بانگ صلوٰۃ کی چہل پہل ہونے کے بجائے جمود و خمود طاری تھا اس کو مولانا نے اپنی خاص توجہ سے آباد و معمور کرکے اپنے سچے اسلامی جذبات اور حقیقی عقیدت کا ثبوت دیا۔ صاحب گلزار آصفیہ لکھتے ہیں کہ مولانا کے والد نواب سید کریم اللہ خاں بہادر نے جو خواب کہ جامع مسجد برہانپور کا چراغ روشن رہنے کا دیکھا تھا حقیقت میں وہ جامع مسجد بلدہ تھی اور وہ چراغ مولانا کی ذات بابرکات۔

نواب عزت یار خاں بہادر صدر الصدور نے جامع مسجد کی تولیت مولانا کے فرزند حاجی عبداللہ صاحب کے نام کردی۔ یہ تولیت اس خاندان میں اب تک ہے جو سجادہ نشین ہو وہی جامع مسجد کا متولی بھی ہوتا ہے۔

خیالات لطیف

از جناب یسین بی۔ اے منتاظہ

۱۔ سمندر کو اپنے بیشمار موتیوں پر ناز ہے، آسمان کو اپنے درخشاں ستاروں پر فخر ہے؛
لیکن میرا دل! میرا دل!! میرا دل!!! محبت میں سرشار ہے۔
آسمان اور سمندر اپنی حیثیت میں عظیم ہیں: لیکن میرا دل ان سے عظیم تر ہے:
گو ستارے اور موتی خوبصورت ہیں لیکن میرے دل کی پر نور شعاعیں ان سے کہیں زیادہ حسین ہیں۔

۲۔ محبت کیا ہے؟ "مشغلہ بیکاری" دانشمندوں کا یہ ناصحانہ جواب ہے۔
کیا میں بھی اسی خیال کی ہمنوائی کروں۔ فطرت صحیح کا جواب ہے "نہیں"
اے دانشمندو! احمقانہ وعظ کو ختم کرو، زمانہ نے تمہارے دلوں کو برف کی طرح شل کر دیا ہے۔
کیا تمہاری نصیحتیں مفید ہو سکتی ہیں؟ فطرت صحیح کا جواب ہے "ہرگز نہیں!"

۳۔ میں نے اپنے محبوب کے دل کا دروازہ کھٹکھٹایا آواز آئی "کون ہے"؟
میں نے جواب دیا "میں ہوں" لیکن دروازہ بند رہا، میں یاس و غم میں تڑپتا رہا۔
میں نے دوبارہ دروازہ پر دستک دی۔
صدا آئی "کون ہے"؟ میں نے کہا "تو ہے" اور دروازہ کھل گیا۔

(ماخوذ)

بادِ دکن

(۲)

میر غلام مصطفیٰ سخنؔ اورنگ آبادی

سخنؔ کے اورنگ آبادی ہونے کی تائید میں سنے ان کا یہ قطعہ لکھا تھا ؎

اے آبروئے خجستہ بنیاد تجھے ! اے رونق شہر حیدرآباد تجھے !

باللہ کہ اے سخن سخن سنج تمام کہتے ہیں وحید عصر و استاد تجھے !

اور اب ان کے اورنگ آبادی ہونے کی ایک حد تک شہادت ان کی مثنوی "صریرِ سخن" سے ملتی ہے۔ یہ ایک سراپا نامۂ شوق ہے۔ "صریرِ سخن" (۱۲۱۰) تاریخی نام ہے۔ اور نام استاد (شفیق اورنگ آبادی) کا عطیہ۔ (عمر یافعی)

صریرِ سخن

(نامۂ شوق)

تجھ کو لازم ہے اے نسیم بہار ! کیجیو اتنا سب کے گوش گذار

ہیں یہاں تک کہ دوستان سخن اور جتنے ہیں قدردان سخن

پہلے ان کو سلام کہدینا بعد اتنا پیام کہدینا

کیا لکھوں شرح داستان شوق کیا لکھوں قصۂ بیان شوق

سوز ہجر اپنا کیا کروں اظہار گردش روزگار نے اک بار

کیا شروع بہار میں مجھ کو نشۂ انتظار میں مجھ کو

دوستان وطن سے دور کیا بوستان وطن سے دور کیا

دلمیں کیا کیا کیا تھا نے خیال کیا کہوں ہے خدا ہی واقف حال

آرزو تھی چمن میں جاویں گے حسب خاطر مزے اٹھاویں گے

ہر روش پہ پھریں گے خرم و شاد ہمرہِ مخلصانِ صاف نہاد

متفق ہو کے صاحبانِ سخن یعنی ہر صدر شہ نشین چمن

غزل تازہ طرح کی دیویں گے کچھ طبیعت سے کام لیویں گے

نشہ پی پی کے مست ہوویں گے اور شاہد پرست ہوویں گے

اور اک تازہ آرزو یہ تھی ایک مدت سے جستجو یہ تھی

گل کا حسن غرور دیکھیں گے بلبلوں کا سرور دیکھیں گے

جلوۂ سرو ناز دیکھیں گے قمریوں کا نیاز دیکھیں گے

رنگ گل اور رنگ روئے یار دیکھ لیتے ملا کے ہم اک بار

نظر آتا سرو کا بھی ناز اور سرفراز یئے قد طناز

دیکھ لیتے تمام غنچہ کا ڈھب اور گل روکا اپنے غنچۂ لب

گل خنداں کی دیکھتے خوبی اور ہنسنے کی اس کے محبوبی

حسن لالہ بھی دیکھتے اکبار اور پان مسی کی اس کے بہار

شبنم و گل کو دیکھتے ہمدوش اور اس مست ناز کا دُر گوش

دیکھیے سنبل چمن کے تئیں
اور اس زلف پرشکن کے تئیں

دیکھیے برگ گل سے کرکے قرین
یار کے اپنے ناخن رنگیں

دیکھیے حسن سیر آب روان
اور وہ خوش خرامی جانان

الغرض کیا کہوں ہوا سے چمن
طول کھینچے ہے مدعا چمن

ہوس دل کا کیا شمار کرون
سب سے بہتر ہے اختصار کرون

شرح کرتا ہے مجھ کو سوز ہجر
اور بیان بلائے روز ہجر

ارے! اس ہجر کا برا ہو جائے
اور جدائی کے دن آفت آئے

کاٹنا دن مجھے قیامت ہے
رات بھی سر پہ سخت آفت ہے

کس بلا کا عذاب رہتا ہے
رات دن اضطراب رہتا ہے

فکر کچھ ہے اگر تو فکر یار
ذکر کچھ ہے اگر تو ذکر یار

یہی بس مجھ کو کام رہتا ہے
صبح سے تا بشام رہتا ہے

غیر غم کے مرا انیس نہیں
اور تصور سوا جلیس نہیں

یون تو صاحب مرا مصاحب ہے
سخن درد و غم کا طالب ہے

بس کہ اس کا ہوں مورد الطاف
میری تقصیر بھی رکھے ہے معاف

اس کی شفقت کو کیا کرون تنمیق
نام ہے اس جناب ہی کا شفیق [۱]

پر کرون کیا جہاں ہو جائے ادب
کام آتا ہے کب سوائے ادب

رتبہ یہاں تک کہ ذوالجلال سخن
پھر سخن کو کہاں مجال سخن

ہمیں پھر کس سے گفت و گو کیجئے؟
شرح غم اپنا مو بمو کیجے

ایک ہمدرد بھی نہیں صد حیف
راز دل جس سے کہتے بے کم و کیف

طرفہ تر اور اک غضب یہ ہے
دل کے رکھ جانیکا سبب یہ ہے

سب سے ملنا مرا رواج نہیں
آہ کیا کیجے وہ مزاج نہیں

تک بھی کو جیک دلی اگر ہوتی
زندگی ہر طرح بسر ہوتی

آہ کیا کیجئے بن نہیں آتا
غیر خود دار من نہیں آتا

جس کا اتنا مزاج عالی ہو
اس کا دل کس طرح سے خالی ہو

کون ایسا ہے درد کا انباز
کیجئے جس کو اپنا محرم راز

ہاں! مگر دل سے گفت و گو کریئے
یا تصور سے اپنے خو کریئے

اس سے بھی جب نہ ہو تسلی دل
بارے پھر کہتے اس سے کیا حاصل؟

دل بہلنے کی کوئی طرح نہیں
غم ہے یہاں تک کہ جسکی شرح نہیں

الغرض زندگی بغیر وصال
امر مشکل ہے۔ اور خیال محال

لیک یہ سب کے تئیں رہے منظور
ہیں سخن دوست جتنے اہل شعور

جو تفنن کی طرح ہو ایجاد
جو تفرج کی شکل ہو روداد

یاد فرمائے مخلصان ہوں
لیک غافل نہوں جہاں ہوں

مجلس نشہ ہو بہم جس دم
اور اسباب عیش سب ہوں بہم

اس میں پھر جو کوئی کہ ساقی ہو
مئے پلانے کا اشتیاق ہو

چاہیئے اس کو یہ شعور رہے
دوستوں پر نظر ضرور رہے

اس میں پھر اس کے ذہن جو آجائے
آپ ہی پیوے یا کسو کو پلائے

پر مرا لیکے نام لیوے
پھر جسے چاہے جام بھر دیوے

لیکن اس دوست کا ہی ہے احسان
لیوے ساقی سے جو کوئی فنجان

ساتھ ہی اس کے مجھ کو یاد کریں
آپ خوش ہو دیں سب کو شاد کریں

پھر وہ یہ ہے غرض شوق تمام
جیئے اشعر ہو یا ئے گل اندام

ہمیں گر راگ کا سماں بن جائے
مجمع رشک بوستان بن جائے

ہے یہ قانون دوستی ہر حال
رہے اس بے نوا کا دل میں خیال

یا کبھو ہوئے رقص کی بنیاد
خود نمائی پہ آویں رہ رہ شرار

بات اتنی ہی سب کے گوش رہے
اس ادا فہم پر ہی ہوش رہے

سوز خوانی کے پھیرے پھر جب سوز
ایک دو سوز پڑھ مرے دل سوز

چاہیے دو ہی اشک بھر لادیں
اس ساز کو یاد فرما دیں

جب چمن میں گزار ہو جائے
دیدۂ دل بہار ہو جائے

چاہیئے اس گھڑی بصد فریاد
بلبل گلشن وفا کی یاد

سیر صحرا کا جب کریں آہنگ
گھر لینے کے لیے اگر دل تنگ

جو وہاں کی بہار یاد آوے
یہ بھی امیدوار یاد آوے

[۱] لطفہ کچھی رائن شفیق صاحب استاد مصنف۔

جب کہ عشق خدا کا ہوئے ذکر | ماسوا اللہ کی دور رہے فکر
کفر ہے پھر تو فکر غیر سخن | مت کر اب تو بھی ذکر غیر سخن
یاد کو بس ہے اس قدر بھی دلیل | ورنہ ہوتا ہے قصہ طول طویل
اس قدر بھی بہلا نہیں ابرام | ختم کر اور دعا وصل مدام
حق تعالیٰ وہ دن شتاب کرے | وصل سے مجھ کو کامیاب کرے
پردۂ ہجر کو اٹھا دیوے | دوستوں سے مجھے ملا دیوے
تا غم دل یہ دور ہو جاوے | وصل سے اک سرور ہو جائے
پھر وہی دن ہیں اور وہی راتیں | وہی چہلیں ہیں اور وہی باتیں
اور وہی مجلس احباب ہے | سب مواد طرب مہیا ہے

اور اب کیا لکھے یہ خامۂ شوق | بس کہ ہے تکمیل نامۂ شوق
فکر تاریخ بھی رہی منظور | تا سنین و شہور ہو مشہور
لیک یہ بھی ہے لازم و ملزوم | نام نامہ بھی اس سے ہو مفہوم
اور مصنف کا نام بھی ہوئے | یعنی خاص و عام بھی ہوئے
تھا میں اس ذکر و فکر میں اک بار | میرے صاحب نے سن کے یہ تکرار
کہا "کیوں اس قدر تامل ہے؟ | یہ تو اک امر جزو ہے گو کل ہے"
اور فرمایا مجھ سے سن اے میر | ہے "صریر سخن" سے کیا بہتر؟
اس میں سب دل کا مدعا ہے تمام | اسم و تاریخ اور نامہ کا نام
دوست آباد و شادمان ہوویں | خوش و خرم رہیں جہاں رہویں

اشعار

کیا ہے نذر تیغ یار ہم نے۔ یار اگردن تک | کہ مثل شمع اپنے تن پہ سر ہے بار گردن تک
برقع نہ منہ پہ اسے مہ یوسف جمال! ڈال | دیکھوں نگاہ بد سے تو آنکھیں نکال ڈال

زلف سے خط مشک فام کو ہم | خوش سمجھتے ہیں شب شام کو ہم
عشق سے باز کس طرح آویں؟ | تا نہ پہنچا دیں انصرام کو ہم

از مکاں تا بہ لامکاں۔ میں ہوں | دیکھئے تو کہاں کہاں۔ میں ہوں؟
دل عالم فقط نہیں مہون سخن! | بل کہ جان جہانیاں۔ میں ہوں

تعذیر کے قابل ہوں۔ تعذیر ہے اور میں ہوں | کیا دیر ہے پھر ظالم؟ شمشیر ہے اور میں ہوں

کچھ فکر بھی تلافیٔ دوراں کی ہے تجھے | غافل! اگرچہ تو خوش خرم بہت ہے یہاں

ادب کرتے نہیں کچھ بے ادب ایسے ہی ہوتے ہیں | جہاں تک شوخ ہیں یہ سر کے سب ایسے ہی ہوتے ہیں

اے یار! پھر وہ بات نہیں رہتی ایک بار | آیا جہاں کہ فرق ذرا اعتبار میں
اہل نظر ادھر بھی کبھو اک نظر کریں | جوں سرمہ ہم بھی خلق کی آنکھوں میں گھر کریں

لگے مضمون دل کش سوجھنے اک دو ہی ساغر میں | سخن! یہ آئے کہاں ہے؟ یہ تو عقل کل ہے شیشہ میں

اور اب دوستی کا جسے حوصلہ نہیں | پھر اس نے جو کہا سو کہا کچھ گلہ نہیں

ایک دل میں سنگ دل کے ہو تو ہو نہ ہو — ورنہ اثر کرے ہے یہ افسانہ سنگ میں

تفکر ہے کہ یارب لعل ہوں یا سنگ ہوں کیا ہوں — کہ میں بھی رنگ کچھ رکھتا ہوں یا بے رنگ ہوں کیا ہوں
اگرچہ کچھ نہیں پر کچھ تو ہوں کچھ ہوں تو پھر کیا ہوں؟ — کہا جاتا نہیں یہ بھی کہ یہ ہوں دنگ ہوں کیا ہوں

فقط ہم ہی نہ تیرے در پہ اے دلدار بیٹھے ہیں — تڑپتے اور کتنے ہی پس دیوار بیٹھے ہیں
یہی اکثر سخن ہے بر سر پرخاش رہتے ہیں — الگ سب جو دم کھینچے ہوئے تیار بیٹھے ہیں

چھپائیں آپ نے بدمستیاں تو فائدہ کیا؟ — ہنوز ہے مئی شب کا خمار آنکھوں میں

جدائی سے تری یہ کچھ تو ہیں آفات آنکھوں پہ — کہ روتے ہی کٹی ہے کئی دنوں سے رات آنکھوں میں
اجی پھر کیوں مکرتے ہو ابھی تو دیکھتے تھے تم — اگر ایسے ہی سچے ہو رکھو نا ہات آنکھوں پر

ایک پروانہ کیا کہ شمع تلک ... — جان و دل سے پتنگ ہے رخ پر

ڈر ہے برادروں سے کہ اخوان عاقبت — لے ہی گئے فریب دے یوسف کو چاہ پر

ملتی کسو طرح نہیں یارب شب فراق — کیسی خوشی کریں جو بڑھے دن [illegible] پر

کچھ ہیں آثار آتے ہیں نظر طوفان کے — خشک ہوتی ہی نہیں چشم تر دو پہر

وقت رخصت مت الگ جا دوڑ کر — آ مری چھاتی سے لگ جا دوڑ کر
اے سخن! تو گرم اتنا یار کو — دیکھتا کیا ہے؟ بلک جا دوڑ کر

خاک تھا خاک ہو گیا آخر — پاک تھا پاک ہو گیا آخر
غنچۂ گل کی طرح پیراہن — چاک تھا چاک ہو گیا آخر

دیکھئے! پھر ہمیں اسے باہم — حق تعالیٰ ملائے گا کس روز
خبر آمد - آمد محبوب — دیکھئے حق سنائے گا کس روز
ایک مدت سے منتظر ہے سخن — یار تشریف لائے گا کس روز؟

حسن تاثیر میں بہم ہے سخن! — نالۂ شام اور دعائے صبح
پھر کہاں دل سوز اس تم جہاں میں اس لیے — شمع کے حق میں دعا کرتی ہے پروانے کی صبح

رشک بہار قامت گل پوش ہو گئی — پھولے سمائے ہے کوئی اب پیرہن میں شاخ؟

اے سخن! کاش کے وہ سر ہو زمیں کا پیوند — داغ سجدہ ہی نہ ہو جس کی جبیں کا پیوند

یہ قد و قامت - اور یہ سن میں نہ ارصید؟ — پھر تو یہ شوخ لائے گا دن ایسا ہزار صید!

ہے دیکھئے تو ایک سے اک اے سخن! لذیذ — لب ہے دہن لذیذ - دہن سے ذقن لذیذ

رسوائے خاص و عام کیا اس ہوس نے بس — یہ ہی اگر ہوس ہے تو اُسے خاک ہوس!

آتش زباں کو گرم کرے ایسے وہ کوئی — منظور ایک بات کی سُنی ہو جس کو دس سُنی

وہ آنکھ ہی نہیں جو کسی کو نظر پڑیں — پنہاں ہیں چشم خلق سے مرد خدا شناس

داغ سے رنگ کو لالہ کے ہوا رنگِ دگر — تیرگی شب ہی کی ہو وجہ بہار آتش

سرد مہروں کو کیا گرمیٔ دل نے ممنون — جیسے سرما زدہ ہوں شکر گزار آتش

بیزار مجھ سے غیر تو ہیں - آشنا خصوص — بے گانے اک طرف ہیں - مرے آشنا خصوص

احوال انبیا ہے بلا دیدہ ہی گواہ — خاصوں ہی کے لئے ہے نزول بلا خصوص

کہتے ہیں ہے یہ بھی - لے لے نا ان اس دل کی عوض — جان ہم دیتے ہیں تجھ کو جاں اس دل کی عوض

گر دل تھا نہ ہو - دلِ ناکام کی عوض — بوسہ تو دیجئے کوئی دشنام کی عوض

لے جا ہے انتظار سخن! اب جو دیکھئے — وہ مل گیا ہے صبح ہی کو شام کی عوض

شوخ - سفاک ہے خدا حافظ... — سخت بے باک ہے خدا حافظ

نے فسون و فسانہ ہے مطبوع — غزل عاشقانہ ہے مطبوع

گرچہ ہے حیلہ جو انس کا — ہر فریب و بہانہ ہے مطبوع

دستوں سے سخن! اگر کرے ہے — گلۂ دوستانہ ہے مطبوع

اک زندہ دل کے فیض سے صد زندہ دل ہوئے — ہوتی ہے ایک شمع سے روشن ہزار شمع

گرمیٔ سوز عشق سے آہ! ہو گیا — ہم سینہ داغ و ہم جگر و ہم دماغ داغ

ہر چند بٹ رہا ہے مرا دھیان چو طرف — لیکن بہ رنگ گل ہے مرا کان چو طرف

اک صدف کا دل اگر ٹوٹا تو آگے گر دو ان دو! — ستو گہر دینے پڑیں گے تجھ کو تاوان صدف

حسن کے بے شمار ہیں عاشق — ایک گل اور ہزار ہیں عاشق

داغوں نے دل کے گلشن جنت دکھا دیا — ہے یہ بھی اک تصرف عشق و عطائے عشق

اتفاقاً ظاہر تو اتنا ہی کہ واقف ہی نہیں — بادۂ انگور تو کیا دانۂ انگور تک

اور باطن پوچھئے ان کا تو ہی ناگفتہ بہ — ہو اگر مردار بھی چھوڑیں نہ یہ مقدور تک

خدا گواہ کہ اندھیر ہی رہے قائم — نہ ہو جو نور ترا شمع دار آنکھوں میں

پھرتی ہے وہ چشم بت خود کام نظر میں — پھرتی ہے کوئی نرگس و یا دام نظر میں؟

ملاحظہ - پہلا آشنا معشوق کے معنوں میں دوسرا ہم آشناؤں کے معنے میں ہے ۱۲

وہ مست کہ اپنی ہی خبر جس کو نہ ہووے — شیشہ کو سنبھالے کہ رہے جام نظر میں۔

یہ آگ لگائی ہے سخن! جس نے کہ باہم — باللہ کہ ہر اپنی وہ تمام نظر ہیں۔

اُدھر مزاج کی وہ استواریاں ہائیں — اِدھر یہ صبر کی سیماب پائیاں دیکھیں

شہید عشق آرائش بطرز تازہ کرتے ہیں — لہو ملتے ہیں منہ کو اور تصور غازہ کرتے ہیں

اِدھر مجنوں کو دیوانے ہزاروں نام رکھتے ہیں — اُدھر یہ مر چکے فرہاد پر آوازہ کرتے ہیں۔

نہ تنہا زخم بسمل اے ستم ایجاد ہنستے ہیں — کف افسوس ملنے پر ترے جلاد ہنستے ہیں

چلے جاتے ہیں یوں ہی کارخانے اہل دنیا کے — کہیں ناشاد روتے ہیں، کہیں دلشاد ہنستے ہیں

گیے وہ دن جوانی کے اگرچہ اے سخن لیکن — وہ باتیں اب بھی آجاتی ہیں جس دم یاد ہنستے ہیں

کوئی سمجھے نہ سمجھے ہم تو فرزانہ سمجھتے ہیں — وہ دیوانے ہیں جو مجنوں کو دیوانہ سمجھتے ہیں

غزلیات

دیکھ باغ و بہار کی صورت — یاد آئی نگار کی صورت

دن میں بدلے ہے سو طرح کے رنگ — ہے عجب روزگار کی صورت

تو نے کچھ غور بھی کیا بارے — اس دل بے قرار کی صورت

جس طرف کیجیے نگاہ اُدھر — نظر آتی ہے یار کی صورت

تو زلف و رخ کو ذرا دکھا کے بآب دل و دم آتش — کہ موج و شعلہ نہ نکلے بآب دل و دم آتش

غضب وہ جوش عرق ہے رسہ کا ہے رنگ تس پہ ستم بھبوکا — بلائے جاں ہے خدا سنبھالے بآب دل و دم آتش

بہت ہے سوج وفا سے یہ ہے بہت سے جل بل چمن میں گئے — الٰہی تقوں سے خدا بچالے بآب دل و دم آتش

قسم ہے ماہی کباب ہوئے۔ دل سمندر بھی آب ہو کے — جو ہوں موثر ہمارے نالے بآب دل و دم آتش

کیا اگرچہ بہت پرکھا یہ سرد و گرم زمانہ دیکھا — خدا کسی سے نہ کام ڈالے بآب دل و دم آتش

ہمارے مشرب میں یکدگر اے افقت ہے مخالف ہے — بھرے ہیں دل کے ہمارے چھالے بآب دل و دم آتش

عجب نہیں میں سخن کے تر ہوں کہ تنگ گل چمن یہ اثر ہوا ہے — غزل لڑاویں جو ہند والے بآب دل و دم آتش

لہ خلیہ ۱۲ صـ ۲ (بطور خاص مصنف کا مزعومہ انتخاب!)

کہتا ہوں جب میں "غش ہوں تری جاں کی قسم" کہتا ہے "میں بھی محو ہوں ایمان کی قسم"
کہتا ہوں جب میں "بندۂ خدمت گزار ہوں" کہتا ہے میں بھی "فدوی ہوں قرآن کی قسم"
کہتا ہوں جب میں "کشتۂ لعل خوش آب ہوں" کہتا ہے "کھا تو چشمۂ حیوان کی قسم"
کہتا ہوں جب میں "شمع ہے تو بزم غیر کا" کہتا ہے "ماہ مصر ہوں کنعان کی قسم"
کہتا ہوں جب میں "خسرو دارا شکوہ ہوں" کہتا ہے میں بھی "جم ہوں سلیمان کی قسم"
کہتا ہوں جب میں "پی کوئی ساغر تو جانِ جان" کہتا ہے "مست ناز ہوں فنجان کی قسم"
کہتا ہوں جب میں "قصۂ حسنِ پری رخاں" کہتا ہے میں بھی "حور ہوں غلمان کی قسم"
کہتا ہوں جب میں "اس سے کہ محسن ہو آپ کا" کہتا ہے "کھاؤ تو مرے احسان کی قسم"
کہتا ہوں جب میں "خلیج ہے تو بحرِ حسن کا" کہتا ہے "یم ہوں گوہر غلطان کی قسم"
کہتا ہوں جب میں "دردِ دل اپنا طبیب سے" کہتا ہے "میں حکیم ہوں لقمان کی قسم"
کہتا ہوں جب میں "لعل بھی دیکھا ہے آپ نے" کہتا ہے "لب ہی لعل ہیں مرجان کی قسم"

کہتا ہوں جب "سخن کی فصاحت پہ غور کر"
کہتا ہے "خود فصیح ہوں سحبان کی قسم"

کیا کروں اے کربلا آ جان! ایسی رائے ہیں ہیں ہے میں واقف نہیں افسوس ہیں آ اوے میں
بھول جانا شرط ہے یہاں اپنا یاد یار میں۔ وہ ہی پھر باقی رہے مجھ سے اگر اٹھ جائیں
صبر ہی کرنا پڑا اے جان! بس اب کیا کروں کس بلا میں پھنس گیا بیٹھے بٹھائے کے لئے ہیں
آمد آمد کی خبر سیدِ رمق کچھ ہو گئی ورنہ کب کا چل بسا تھا آپ کے بن آئے میں
اب تو نظروں میں نہیں پھر باتوں کی پرچھو دل میں رکھتا تھا انہیں سنگیں دلوں کی جائیں

جذبۂ لطفِ الٰہی راہ پر ہے اے سخن
راہ سے بھٹکوں نہ غولوں کے کبھو بھٹکائے میں

کتب خانہ قصر فلک نما
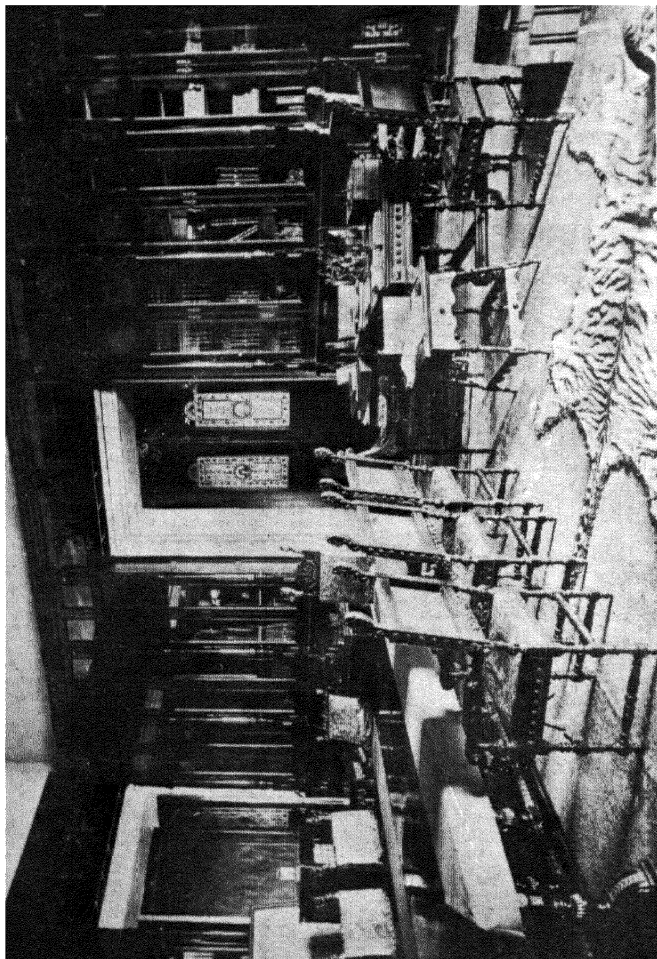
میر عالم کی شاعری

(از جناب سراج الدین صاحب طالب)

میر عالم کو دنیا اس سے بڑھکر نہیں جانتی کہ وہ ریاست آصفیہ کے ایک لائق وزیر اعظم تھے یہاں ہم اُن کو ایک شاعر کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ میر عالم کی عام علمی اور عملی قابلیتوں میں اُن کی شعر گوئی کی قابلیت خاص امتیاز رکھتی ہے۔ اس کا ثبوت اسی سے مل سکتا ہے کہ اُن کی دنیاوی ترقی مدارج کا سنگ بنیاد فی الحقیقت اسی شاعری پر رکھا گیا چنانچہ عنفوان شباب میں میر عالم نے مدارالمہام وقت ارسطوجاہ کی مدح میں اپنا زورِ طبیعت دکھایا جب اُنکا یہ کلام ارسطوجاہ کی نظر سے گزرا تو اُن کی طبیعت اور لیاقت کی بڑی تعریف کی اور اپنے دربار میں حاضر رہنے کا حکم دیا زمانہ کی سہل نگاری پر افسوس ہوتا ہے کہ ایسے قابل فرد کے کلام کو ایک جا جمع نہ کیا اور نہ کسی نے اس طرف توجہ کی کہ کم از کم میر عالم کا وہ قصیدہ جو انہوں نے اعظم الامرا ارسطوجاہ کی مدح میں لکھا تھا کہیں محفوظ کر رکھیں۔ اسی وجہ سے باوجود سعی بلیغ وہ ہمیں ہمدست نہ ہوا۔ اس عہد کے شعرا کے جستہ جستہ کلام اسی عصر کی ایک تصنیف "شعراء بارباب" میں ملجاتے ہیں جس کو منشی اسمٰعیل یار جنگ نے اسی عصر میں جمع کیا ہے (اُسکا ایک نسخہ ہمارے دوست مسٹر تمکین کاظمی کے قبضۂ قدرت میں ہے) لیکن افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس میں بھی میر عالم کا نہ یہ قصیدہ ہے نہ کوئی اور کلام ممکن ہے کہ منشی اسمٰعیل یار جنگ نے قصداً اُن کے کلام کو نظر انداز کر دیا ہو۔ اس واسطے کہ میر عالم سے اُن کے تعلقات خوش گوار نہیں تھے جس کی تفصیل کسی متعلقہ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتی ہے یا ہماری تالیف (میر عالم) سے۔ بعض کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ میر عالم کا فارسی دیوان مرتب و مکمل تھا لیکن اُس کا کہیں پتہ نہیں۔ اُنکا متفرق کلام جو ہمارے دیکھنے میں آیا ہے اس سے یہ تو گمان نہیں ہو سکتا کہ اسقدر پختگی اُن کے کلام میں دفعتاً پیدا ہو گئی۔ اُن کی مشق سخن کی غزلیات یا اور کلام بھی ہو گا جو زمانہ کی دست برد سے یا معاصرین کے عدم اعتنا کے باعث محفوظ نہ رہ سکا۔

ان کا کل کلام غلام حسین خاں جوہر کی "ماہ نامہ" سے اور حکیم غلام حسین خاں کی "گلزار آصفیہ" سے ملتا ہے۔ اور یہ سب ایک مصرع، ایک رباعی، ایک مثنوی اور ایک قطعہ پر مشتمل ہے۔ صاحب گلزار آصفیہ نے

اِن کا وہ قطعہ نقل کیا ہے جو انہوں نے اپنے باغ کے محل کے بالاخانے پر لکھوایا تھا۔ جس کے چار شعر ہیں اور وہ یہ ہیں ؎

مقصد ز کاخ وصفہ و ایوان نگاشتن — کاشانہ ہائے سر بفلک برفراشتن
گلہائے رنگ رنگ و درختان میوہ دار — در باغ و بوستان ز سر شوق کاشتن
دانی کہ چیست تا بمراد دل اندر آن — یک لحظہ دوستے بتوان شاد داشتن
ورنہ چگونہ مردم عاقل بنا کنند — از گل عمارتے کہ ببا ید گزاشتن

اس قطعہ کی روانی کلام وسلاست کو علیحدہ رکھ کر ہم محض تخیل کو لیتے ہیں تو کس قدر نفیس اور سبق آموز معلوم ہوتا ہے۔ اس قطعہ میں علت تعمیر کو کس خوبی سے بیان کیا ہے۔ گویا وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ مٹی کی عمارت جو عقبیٰ میں ساتھ رہ نہیں سکتی بنانے میں کوئی فائدہ نہیں لیکن چونکہ بہت سارے عقلمندوں نے یہ کام کیا ہے اور اُن کے کام بے معنی یا لاحاصل نہیں ہو سکتے اس لئے وہ اُس کی یہ علت قرار دیتے ہیں کہ ہستی چندروزہ کو ہنسی خوشی میں گزارنا ہے اور اُس کی تکمیل میں کوئی پھولوں اور میووں کے باغ لگاتا ہے۔ کوئی سر بفلک محل تعمیر کرتا ہے اسی غرض کے تحت انہوں نے بھی ایک عمارت بنائی یہاں ہم کو اس سے بحث نہیں کہ نظیر یا علت جو پیش کی گئی ہے منطقی طور پر کہاں تک قابل تسلیم ہے۔

صاحب ماہ نامہ کا یہ فرض نہیں تھا کہ وہ میر عالم کا کلام جمع کرتے۔ لیکن چونکہ وہ ماہ لقا بائی کے سورخ ہیں اس لئے اس مقام پر جہاں انہوں نے میر عالم اور ماہ لقا بائی کے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔ وہاں میر عالم کے کلام کو بھی پیش کیا ہے۔ قبل اس کے یہاں ان کے کلام کا کوئی ذکر کیا جائے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن دونوں کے باہمی تعلقات پر ایک نظر ڈالی جائے تاکہ اُن خیالات کی توضیح ہو سکے جو اس عنوان کے سنتے ہی "ماہ لقا بائی اور میر عالم کے تعلقات باہمی" خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔

چندہ جی نظام علی خاں کے دربار کی طوائف تھی اس کا خطاب ماہ لقا بائی تھا۔ یہ اپنے عہد کی ممتاز ترین طوائف سے تھی اور حضوری اور وزیری مجرے میں رہتی اور بڑے انعام پاتی تھی۔ اس کے نام اور فرمائش پر غلام حسین خاں نے تاریخ ماہ نامہ لکھی ہے۔ اس میں ان دونوں کی بناءِ ملاقات یا اُس کے ارتقا پر کوئی تفصیلی نظر نہیں ڈالی گئی ہے۔ کتاب سے صرف اس قدر استنباط ہو سکتا ہے کہ میر عالم اور ماہ لقا میں استادی اور شاگردی کے تعلقات تھے۔ چنانچہ کتاب کے جس جملہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے یہ ہے۔

"میر عالم بہادر اکثری فرمود ند کہ تلمیذے برسائی فہم و زکاوت طبع وجبت مزاج در زمرۂ تلامذۂ خود مثل ماہ لقا ندیدہ ام"

اس تلمذ کی ابتدا یا اور کچھ ارتقا، اس سے معلوم نہیں ہو سکتا ایک امر اس جملے سے مستنبط ہوتا ہے وہ یہ کہ میر عالم شاعر ہونے کے علاوہ شاگرد بھی تھے چنانچہ 'در زمرۂ تلامذۂ خود' سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فن شعر گوئی میں ماہ لقا کے علاوہ میر عالم کے اور شاگرد بھی تھے لیکن افسوس یہ ہے کہ ان کے نام معلوم نہیں ہو سکے اور نہ اصلاح سخن کے طریق روشنی میں آئے۔ ماہ نامہ ہی کے مولف نے میر عالم کی ایک مثنوی اپنی کتاب میں لکھی ہے۔ یہ ماہ لقا کے سراپا میں ہے اس مثنوی کے آغاز سے قبل یہ مصرع 'افسون جنون عالم ست ایں' بطور عنوان لکھا گیا ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عالم تخلص کیا کرتے تھے۔ اور یہ مصرع بطور عنوان انہوں نے ہی لکھا ہے۔ اگرچہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی باہمی تعشق کے واقعہ کی نشانی ہے لیکن ہم اسکا کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکتے کہ مضمون مثنوی میں تجرید و غلو کی وجہ سے اسکے معانی بہت وسیع ہو سکتے ہیں۔ ایک رباعی بھی آغاز مثنوی سے قبل لکھی گئی ہے جو محض عاشقانہ مضمون کی حامل ہے اور وہ یہ ہے۔

تا ہست ترا دماغ کارے بارے　　دل را ندہی بدست دلدارے

بہتر نبود زعشق ہرگز کارے　　گر نیست حقیقتاً تکلف بارے

اس مصرع اور رباعی سے غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ سامع کو اپنی عاشق مزاجی کی طرف رجوع کیا جائے تاکہ مثنوی کے پڑھنے والے کو کوئی سوء ظن پیدا نہ ہو۔

مثنوی بحر ہزج مسدس اخرب یا اخرم مقبوض محذوف میں ہے لیکن صاحب ماہ نامہ نے (جو اپنے نام کے پیچھے تخلص بھی رکھتے ہیں اور اس بنا پر ہم اُن کو شاعر تصور کر سکتے ہیں) اس کی بحر کا ایک نیا نام لکھا ہے جو بحر کے لئے ہم نے نہ کہیں دیکھا نہ سنا۔ اُن کی اصل عبارت یہ ہے "نظم مثنوی در وصف سراپا ئے آن سرو جو ئبار دلبری در بحر مجنون بفصاحت محاورہ تصنیف فرمودہ اند چنانچہ اکثر اشتہار دادہ"

معلوم یہ ہوتا ہے کہ جوہر بیچارے عروض سے ناواقف شاعر تھے اس لئے اس بحر کا ایک سنا سنایا نام بتا دیا۔

اس بحر ہزج مسدس میں بعض مقامات پر خفیف سی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں جن کو عروضی ہی سمجھ سکتے ہیں اور عروض داں شاعر ہی اُن کی صحت وزن کو قائم رکھ سکتا ہے ساری مثنوی میں

یہ اعتبار اوزان کوئی سہو نظری پائی نہیں جاتی۔ مثنوی کے لئے اس بحر کا انتخاب اور پھر اس میں ہر جگہ صحت وزن کا خیال میر عالم کی عروضی قابلیت اور وسعت نظر اور ذوق صحیح کی بیّن دلیل ہے بہ اعتبار زبان و محاورہ کسی جگہ کوئی لغزش نظر نہیں آتی۔ فارسی میر عالم کی خانہ زاد زبان تھی اُن کے والد سید رضی اقدس خاص بلدہ شوستر کے باشندے تھے اور ننہیال بھی ایرانی تھی۔ اور شوستر یا ایران چھوڑے ہوئے اتنا زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اُدھر کی زبان نسیاً منسیا ہو جاتی۔ بہر حال کلام میں روانی سلاست شیرینی ہے اور بڑی خوبی یہ ہے کہ تشبیہات یا استعارات ایسے استعمال کئے ہیں جن پر سامع کا دماغ معاً پہنچ جاتا ہے اور یہی ہے اصل شاعری۔

اول تو میر عالم کا کلام ہی مفقود ہے اور جتنا کچھ ہے ایک مثنوی ہے اور بس اُس کی بھی یہ حالت ہے کہ لوگ اُس سے مطلقاً واقف نہیں۔ عجب نہیں جو اس کے شائع نہ ہونے کے باعث یہ کچھ اور عرصے میں تلف ہو جائے اِن وجوہ کی بنا پر ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ پوری مثنوی کو یہاں ہدیۂ ناظرین کریں۔

اے ماہ سپہر روشنائی — سرتاپائے تو دلربائی
از نقش خرامت آدایا — گل گل بشگفت رنگ حنا

اے مردم دیدۂ محبت — سرتا قدمت طلسم الفت
اے برق خرام تست نیرنگ — آہنگ خرام شعلہ آہنگ

شکل تو بکلک دل مصوّر — جسم تو بآب جان مخمّر
اے آمدنت سیل لذت ایجاد — وے رفتن تو قیامت ایجاد

تصویر تو از فرنگ حسن ست — نقش تو شریک رنگ حسن ست
اے ماہ لقا و ماہ پیکر — وے ماہ جبیں و ماہ منظر

اے حسن تو دلربائی عشق — آئینۂ خودنمائی عشق
از رشک جبین تست یکساں — مہ داغ فروش جہد نقصاں

تا حسن تو تا غمم بدل زد — عشقت رہ عیش متصل زد
از دفتر حسن نازنین ست — یک صفحہ منتخب جبین ست

از شوق تو شد جہان پر شور — از رنگ حسن ہیاں چو طنبور
جز جبین جبیں از آں سفینہ — حرف دگرم نشد خزینہ

شور تو عیاں نہ بر زبانم — سوز تو نہاں بمغز جانم
از چین جبینت اوج حیرت — آب آئینہ موج حیرت

از شعلہ حسنت اے دل آرا — در عشق بسوختم سراپا
اے خود سر و خود پرست و خودکام — اے زلف تو حلقہ حلقہ دام

اے جلوہ فروش جان خریدار — اے غمزہ متاع عشوہ بازار
باشد ز جفا و جور تا چند — پر حلقہ بگردن دلم بند

تا روے ترا بمن نمودند — درہاے بلا بمن کشودند
زلف تو کہ رشتۂ پیچ جانست — وصف پیچیدہ بر زبان ست

تا حد تو شد نہال جانم — ہر شب بفلک رسد فغانم
حرف زلفت کہ تاب دارد — پیچیدگیش کہ تاب دارد

گر قامت تو نہال جان آراست — بر من بچہ رو قیامت آراست
اے برخ ماہ طلعت من — اے طلعت تو صداقت من

اے باغ بہار و ناز انداز — انداز ترا زیانہ ناز
ابروے تو گر ہلال عید ست — بالیدن صد جہان امید ست

گر ریزہ صفا ست موج رفتار — نقش قدم تو آئینہ زار
کاہیدن من ز دیدنت چیست — نو سیدئی من ز آفت کیست

چشم تو بصد هزار نیرنگ   سازد اشکم همیشه گلرنگ
چشم تو گر نمود آبش   تا بر فکنی بجانم آتش۔
چشمت نه تمام قطرهٔ آبست   ای شعله نگاه این چه تابست
آهو نگهت اگر نه وحشیست   از سایهٔ من رمیدنش چیست
سرمایهٔ دل که بود سودم   وقف تاراج او نمودم
هر دم مژگانت ای جفاجو   انگشت زند مرا به پهلو
مژگان تو خار خار اگر نیست   هر لحظه ز خود رمیدنم چیست
تا گوش ترا بمن نمودند   حیرت بر حیرتم فزودند
در گوش تو در حلقهٔ زر   خورشید بود ستاره در بر
وین هر دو ز کاکلت نمودار   خورشید ستاره و شب تار
در هاست ز گوش تو هویدا   چندین مه و یک سپهر پیدا
از حسرت گوش آن بناگوش   آب گوهر زد از صدف جوش
بینی تو با نظر پسندست   در مجمع حسن سربلندست
بینی به نگه نهال بادام   از خوش چشمی بباغ اندام
این تازه نهال در دل زار   خشکی دماغ آورد بار
من سر بهوا شدم ز بینی   دور از ره درسم مشو بینی
از بینی تو سراغ دارم   از حق بگذر دماغ دارم
ای هجر پسند و جور تابان   رخسار تو ماه ماه تابان
از عکس رخ تو ای پریزاد   آئینهٔ چرخ ماه ایجاد
برق رخسارت ای جفاکار   آرام و قرار سوخت یکبار
این طرفه که مهر و مه تنم سوخت   مهتاب بجانم آتش افروخت
من سوخته اخترم ز مهتاب   مهتاب آمد بمن چو سیلاب
تا ماه رخ تو اخترم سوخت   مهتاب ز تاب پیکرم سوخت
ای برده ز من بیک نظر دل   جان بردن ز تست مشکل
تا راه سخن بمن کشودی   رای بخموشیم نمودی۔

گفتار و خموشی تو باهم   در شعله فشانی اند باهم
گز شمع زبان زبانه افروخت   یاقوت لبت بخامشی سوخت
ای مست طرب ز خنده ناز   حسن تو نموده زیر نی ساز
باشند همیشه دزد دندان   در رنگ مسی خزیده پنهان
لب را به فسون چو برگشایند   خندان خندان دلم ربایند
دل را چو برند در شب تار   عیار انند در شب تار
ای ناز طلسم و عشوه اعجاز   بر ناز تو ناز میکند ناز
وصف دهن تو حسرت انشا   حرف سخن تو جرأت افزا
گر نیست دهان سخن دریست   ور هست نهان سخن دریست
برده دهنت ز ساحر بها   نیرنگ گزو ز سامریها
در چاه ذقن بسحر کامل   آتشکده گشت چاه بابل
چاه ذقنت ز جوش مهتاب   از چشمهٔ ماه می برد آب
چاه ذقنت نظر فریبست   دل غرق درو ناشکیبست
دل بوسهٔ آن دهن نیارد   گویا که لب و دهن ندارد
ای یافته از سربلندی   رعنائی حسن خود پسندی
تا گردن دعوی تو شد راست   آمد خونم بگردنم راست
تا گردن تو بلند گردید   هیکل از خون من پسندید
گر خون دلم بگردنت نیست   پنهان پنهان بگیسویت چیست
ای شمع گلوی شعله آغاز   آواز تو برق پردهٔ ساز
آواز تو تا صدا به نی زد   آتش غیرت بجان وی زد
حسرت کف نیستان بسی سود   هر سال بخود بگرد دود
دست قدرت چو صنعت انگیخت   در قالب لطف بازوت ریخت
بازوی تو میکشد کمان عشق   بازوی تو زده بازوی عشق
از دست حنائی شفق پوش   چون گرمی دل ز شیشه بجوش
از رنگ حنای خون دلها   بر رنگ حناست خون دل بار

از جلوۂ آں کف نگاریں — باشد شکمم ہمیشہ رنگیں
در دست تو نیست آبگینہ — خورشید تہی نمود سینہ
از حلقۂ آبگینہ ات داد — کیں طوق جنون بگردن افتاد
سرپنجۂ دست اے پری وش — چوں پنجہ مرا کند مشوش
دل نقش نگیں خاتمی شد — انگشت نمائی عالمی شد
اے ناز تو فتنۂ زمانہ — انداز تو فتنہ را بہانہ
از دست حیا کہ سرخ آری — دل می بری و حجاب میداری
در بردنِ دل حجاب از کیست — در خوردنِ خون من حیا چیست
دلداری و دلبری غیب است — کآں را عالم بگردنت بست
اے روئے تو رشک ماه و خورشید — آغوش تو صبح زار امید
دل موج صفائی آں برو دوش — دل آئینہ زار صبح آغوش
از عکس رخ تو سینہ یکسر — غرق دریائے آب گوہر
از پرتو ماه عارض صاف — آئینہ فروش سینہ تا ناف
آئینۂ سینہ بیقرینہ ست — راز من و تو عیاں ز سینہ ست
نظارہ عیاں بہ بیخودی بند — برشوق چو طرح گرمی افگند
از جوش حیا عیاں شدہ آں نور — بر سینہ حباب قلزم نور
ناف تو چو چشمہ حیا پاک — گرداب نگاہ چشم بے باک
تا کرد نگاہ شوخی ابراز — بر سینہ مرا بے خودی باز
لغزید بناف و شد زخجلت — در چاه حیا غریقِ رحمت
نام کمر تو بے نشان ست — ایں حرف ہمیشہ درمیان ست
جز نام کمر نشانش چو نیست — جز آنکہ بقتل من کمر بست
سرحد حیای دانش آرائے — از ہوسیانِ تست تا پائے
مہتابِ حیات موج اوج — دریائے نشاط موج در موج
راز لیست درین میلہ وبس — محرم نشود بجز حیا کس
واقف نبود ازیں نہاں راز — جز بے خود شوق عاقبت باز

تا راز حیا نگردد افشا — لغزید قلم ز دست تا پا
اے پائے تو دست مایۂ حسن — از پائے تو اوج پائے حسن
نقش کف پایت از صفا زد — بر روئے ستارہ پشت پا زد
تا بر سر دل زدی کف پا — آشفت دماغ ما بسودا
برپاست ز پائے تو جنونم — پامال حوادث ست خونم
اے مہ بسپہر دلربائی — سرتا قدم تو بے وفائی
اے حسن تو در جہاں فسانہ — دل گرمی عشق را بہانہ
حسن تو ہمیں نہ دلربا شد — سرتا پائے بمن بلا شد
خوئے تو بمن جدا جفا کرد — آشوب قیامتم بپا کرد
روئے تو کند جفائے دیگر — خوئے تو بود بلائے دیگر
از گرمی خویت اے پریزاد — افتاد بمن ہر آنچہ افتاد
اے شعلہ مزاج آتشیں خو — از خوئے تو شد فلک جفاجو
از خوے تو گر سخن برانم — آتش افتد نہ بر زبانم
ہر جا غضب تو آتش افروخت — مشت خاشاک من عجب خوش سوخت
با غیر چو غمزہ ات ستیزد — اول دل من ہدر بریزد
گرتاب چو زد زکاکلت تار — پیچید ز زلف تو بمن زار
گرباد گری سر عتاب ست — با من دو ہزار پیچ و تاب ست
اغماض نظر ز دیگران ست — با من چشم تو سرگران ست
بر روئے تو گر من اے جفاجو — گویم بالائے چشمت ابرو
ابروئے تو می کند کمان ساز — چشمت بنگاه ناوک انداز
آں پشت کماں ہمی نماید — ویں غمزہ خدنگ می کشاید
آخر تو نہ کمان ابرو — چوں تیر زدی مرا بپہلو
آخر نہ من جنوں فسانہ — ہستم بہ محبت نشانہ
اے چشم و چراغ بزم الفت — روشن ز تو خانہ محبت

اے مہر تو شہرہ بر زبان ہا   در دوستی تو داستان ہا
لطف تو بلائے بے گمان است   پنہان نگہ تو برق جان است
اے رحم تو تازیانہ جور   آئین تو دلبری بصد طور
اے کردہ جہان بخویشتن رام   کفر و اسلام صید یکدام
اے نازفروش گرم جوشی   تا کے رسم وفا فروشی
در عین وفا تو بے وفائی   در وقت جفا تو دلربائی
اے عہد نہ بستہ در شکستن   پیوند نکردہ در گسستن
اے سست وفا گسستہ پیمان   الطاف تو قہر بر دل و جان
اے دوستی تو دشمن من   راہ کوئے تو رہزن من
اول تو رہ وفا کشادی   در صید دلم قدم نہادی
عمرے بکمین من نشستی   دل با دگری چو من نہ بستی
دزدیدہ نگاہ دلربائی   وحشت پیغام آشنائی
یکچند بکوشش نہانی   میخواند فسون دلستانی
آنگہ ز رہ وفا و یاری   بستی پیمان دوستداری
لب را بفسانہ باز کردی   طومار امل دراز کردی
کردی ز رہ وفا شعاری   ہرگز نہ بود چو من نگاری
گفتی فلک ہزار دیدہ   دلبر بوفائے من ندیدہ
از حسن و وفا بدور من عشق   دریوزہ کند ز طور من عشق
سازد بجفائے من مروت   نازد بوفائے من محبت
روشن کن خاندان حسنم   فخر ہمہ دودمان حسنم
باشد ز من آبروئے الفت   سرسبزی گلشن محبت
در طینت من وفاست مضمر   از آب وفا گلم مخمر
ضرب المثل جہان وفا قسم   شوریست ز حسن التفاقم
پیوستہ خورد بمن نکوئے   سوگند وفا و خوبروئے
برداشتہ چرخ ناتوان ننگ   از داغ وفا پرستیم ننگ

بر ہم نخورد ز چرخ احقر   پیمان من و سد سکندر
گفتی کہ اگر سپہر بدخو   در راہ کند وفا تگاپو
گفتی کہ سپہر ناتوان بین   آید بحسد گراید در کین
رنگے ریزد ز خون ہجران   نقشے آرد بروئے حرمان
من ہم ز رہ وفا در آیم   حسرت بر حسرتش فزایم
داغے بدلش دہم ز حسرت   خون جگرش کنم بغیرت
آئینہ غیرتش نمایم   حیرت بر حیرتش فزایم
با چرخ بجان و دل ستیزم   خاک قدمش بدیدہ ریزم
ہرگز نہ کنم ز تو جدائی   ترک رہ و رسم آشنائی
ہرگز نہ شود بہ بزم وصلم   چشم بد و دور کار محرم
ہجر من و تو محال عقل است   دور از روش خیال عقل است
من از تو بایں فسانہ سازی   خوردم بفسون عقل بازی
افسون جنون چو باورم شد   ایں حرف غلط چو باورم شد
دل دادم و عقل و ہوش یکبار   در دام بلا شدم گرفتار
گفتم کہ کنون بنقد بیدار   دل راندہم بدست دلدار
در راہ محبت تو پویم   از وصل تو کام دل بجویم
اے دادہ بباد دامن ناز   دل مست غبار شوق پرواز
آخر تو چنیں رسیدی از من   دور از برم آرمیدی از من
اے شستہ بآب بیوفائی   از سینہ حروف آشنائی
اے بے خبر از طریق یاری   ایں بود طریق غمگساری؟
ایں بود قرار دلستانی؟   ایں بود بہار مہربانی؟
ایں بود نسیم باغ الفت؟   رنگ و بوئے گل محبت؟
پیمان محبت تو ایں بود؟   بنیان محبت تو ایں بود؟
گاہے بره وفا نپوئی   احوال دلم گہے نجوئی
آرے بمغلطہ نگاہ گاہے   بر عہد و قرار خود نگاہے

من بے تو نزار زار و انگار — در تاب و تب وفا فگار — از برق عنان گسستہ تاخت — جانم ہمہ جسم عافیت باخت

ہر روز چو روز زرد و تب تاب — ہر شب چوں شب تیرہ و بیتاب — صبر و آرام و تاب و طاقت — آئین نشاط و رسم و راحت

از نالۂ من جہاں پر آشوب — آہم بفغاں قیامت آشوب — یکبارہ وداع من نمودند — وحشت بر وحشتم فزودند

اے دادہ بآب بے نیازی — بنیاد بنائے دلنوازی — آنگہ من و دل بفکر رویت — بودیم بہم بگفت و گویت

تا چند بود بلائے ہجراں — تا کے باشد جفائے حرماں — دل شد ز برم بہ ایں بہانہ — کادر سراغ تو نشانہ

در ہجر تو اے مہ شب افروز — شامم چوں صبح اختر روز — آوارہ وش او بکوئے تو شد — من بے دل و دل بسوئے تو شد

دریاد تو لانے ز خود فراموش — شد دیدہ دل بہار صد جوش — تنہا من و صد جفائے ہجراں — از کردۂ خود شوی پشیماں

در دوستی تو اے دل آزار — دل نیست بگفتہ من زار — من جسم و جان من تو باشی — ہم روح و روان من تو باشی

افسون جنون زند چو بر ہوش — دیوانہ کجا سخن کند گوش — از محنت جسم و جان دریغ — دریاب کہ نکتہ است چوں گنج

ہم ہمت و اتفاق ورزید — ہم دیدہ بمن نفاق ورزید — اے باد صبا توئی وفا سنج — آگاہ خبر ز راحت و رنج

چشم چو ترا بمن نمودند — رمز نکہت بدل کشودند — بیماری تو شفائے جانہا — غم خواری تو دوائے جانہا

در خانہ دل ترا نشاندند — مژگان گہر و نم فشاندند — آزادہ وشی ازاں بکیشم — بر می آئی بگرد عالم

آنگہ در گریہ باز کردند — غمازی تازہ ساز کردند — سیاحی و لازمی کنی سیر — اوضاع جہاں ز کعبہ و دیر

اشکم چوں گشت آبرو پاش — رازم ہمہ ز آب دیدہ شد فاش — از فیض تو خاطرے کہ بالید — از سبزۂ چرخ تازگی چید

اے وصل تو دیدہ مایۂ عمر — از ہجر تو بست پایۂ عمر — از تو دلہائے غنچہ سلاں — گلہائے شگفتگی بداماں

در وصل تو خار خار اغیار — ہجر تو بصد جفا دل آزار — سحر است سخن گزاری تو — روشن دل سر راز داری تو

وصل تو سبک عناں تر از خواب — دارد چہ قدر ہلال مہتاب — از راہ وفا دلے گر آری — بر منزل ماہ من گزاری

ہجر تو گران وقار چوں کوہ — باشد قطب سپہر اندوہ — یک رہ ز کرم توائے دل گوش — شرح ہجراں کہ کردہ گوش

وصل تو سراب بود بنمود — تا کے باشد نمود بے بود — رازے کہ بگوش دل شنیدی — رازے کہ عیاں بچشم دیدی

ہجر تو کنوں قیامت ایجاد — طوفان بلا و موج بیداد — پنہاں پنہاں بگوش آں ماہ — القصہ بگو و قصہ کوتاہ

کھچڑ ✝

جناب غلام رسول صاحب (سٹی کالج)

بابو کندن لال کچہری سے لوٹے، تو دیکھا کہ ان کی بیوی ایک کنجڑن سے کچھ ساگ بھاجی لے رہی ہیں۔ کنجڑن پالک ٹکہ سیر کہتی ہے وہ ڈیڑھ پیسہ دے رہی ہیں۔ اس پر کئی منٹ جھگڑا ہوتا رہا۔ آخر کنجڑن ڈیڑھ ہی پیسہ پر راضی ہو گئی۔ اب ترازو اور باٹ کا سوال چھڑا۔ دونوں پلڑے برابر نہ تھے۔ ایک میں پاسنگ تھا۔ باٹ بھی پورے نہ اترتے تھے۔ پڑوسن کے گھر سے سیر آیا۔ ساگ مل جانے کے بعد اب رونگن کا سوال اٹھا۔ بیوی اور مانگتی تھیں کنجڑن کہتی تھی کہ اب کیا سیر دو سیر گھاتے میں ہی لے لوگی بی بی۔ خیر آدھے گھنٹہ میں یہ سودا پورا ہوا۔ اور کنجڑن پھر کبھی نہ آئیگی دھمکی دیکر رخصت ہوئی۔ کندن لال کھڑے کھڑے یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ کنجڑن کے جانے کے بعد بیوی پانی لائی تو آپ نے کہا۔ آج تو تم نے ذرا سا ساگ لینے میں پورا آدھا گھنٹہ لگا دیا۔ اتنی دیر میں تو ہزار پانسو کا سودا ہو جاتا۔ ذرا ذرا سے ساگ کیلئے ٹھائیں ٹھائیں کرتے تمہارا سر بھی نہیں دکھتا؟ رامیشوری نے کچھ شرمندہ ہو کر کہا "پیسے مفت میں تو نہیں آتے!" "یہ ٹھیک ہے لیکن وقت کی بھی تو کچھ قیمت ہے۔ اتنی دیر میں تم نے بڑی مشکل سے ایک دھیلے کی بچت کی کنجڑن نے بھی دل میں کہا ہوگا کہاں کی گنوارن ہے۔ اب شاید بھول کر بھی ادھر نہ آئے۔"

"تو پھر مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ پیسے کی جگہ دھیلے کا سودا لیکر بیٹھ جاؤں؟"

"اتنی دیر میں تو تم نے کم سے کم بیس ورق پڑھے ہوتے۔ کل مہری سے گھنٹوں سر مارا۔ پرسوں دودھ والے کے ساتھ گھنٹوں معاشی بحث کی زندگی کیا انہی باتوں میں صرف کرنے کے لئے عطا ہوئی ہے۔"

کندن لال ہر وقت بیوی کو نصیحت کرتے رہتے تھے یہ ان کا دوسرا بیاہ تھا۔ رامیشوری کو آئے ابھی دو تین ہی مہینے ہوئے تھے۔ اب تک تو بڑی نند اوپر کے کام کیا کرتی تھیں۔ پر رامیشوری کی ان سے نہ نبھ سکی۔ اس کو معلوم ہوتا تھا یہ تو سارا دھن ہی لٹائے دیتی ہیں۔ آخر وہ چلی گئیں۔ تب سے رامیشوری ہی گھر کی مالک ہے۔ وہ بہت چاہتی ہے کہ شوہر کو خوش رکھے ان کے اشاروں پر چلتی ہے ایک بار جو بات سن لیتی ہے گرہ باندھ لیتی ہے۔ پر روز ہی تو کوئی نہ کوئی نئی بات ہو جاتی ہے۔ اور کندن لال کو اسے نصیحت کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

(۲)

✝ فطرت نگار منشی پریم چند کے ایک افسانہ کا ترجمہ

ایک دن بلّی دودھ پی گئی۔ رامیشوری دودھ گرم کرکے لائی۔ اور میاں کے سرہانے رکھ کر پان بنا رہی تھی کہ بلّی نے دودھ پہ اپنا قبضہ جمالیا۔ رامیشوری کو قربانی گوارا نہ ہوسکی۔ رول لے کر بلّی کو اتنے زور سے مارا کہ وہ دو تین لڑکیاں کھا گئی۔

کندن لال لیٹے لیٹے اخبار پڑھ رہے تھے۔ بولے۔ "اور جو مر جاتی"؟

رامیشوری نے ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔ "تو میرا دودھ کیوں پی گئی"؟

"اسے مارنے سے دودھ مل تو نہیں گیا۔"

"جب کوئی نقصان کر دیتا ہے تو اس پر غصہ آتا ہی ہے"!

"نہ آنا چاہئے جانور کے ساتھ آدمی کیوں جانور ہو جائے؟ آدمی اور جانور میں اس کے سوا اور کیا فرق ہے"

کندن لال کئی منٹ تک رحم، حزم اور صبر و تحمل کی تعلیم و تلقین کرتے رہے حتی کہ بچاری رامیشوری مارے پیٹے کے بغیر رو پڑی۔ اسی طرح ایک دن رامیشوری نے ایک بھکاری کو دتکار دیا۔ تو بابو صاحب نے پھر نصیحت کرنی شروع کی۔ بولے تم سے نہ اٹھا جاتا ہو۔ تو لاؤ میں دے آؤں۔ غریب کو یوں نہ دتکارنا چاہئے"۔ رامیشوری نے تیوری چڑھائے ہوئے کہا۔ "دن بھر تو تانتا لگا رہتا ہے۔ کوئی کہاں تک دوڑے سارا دیس بھیک منگوں ہی سے بھر گیا ہے"۔ شاید کندن لال نے تجاہل عارفانہ سے مسکرا کر کہا۔ "اسی دیس میں تم بھی بستی ہو"۔ "اتنے بھیک منگے آ کہاں سے جاتے ہیں؟ یہ سب کام کیوں نہیں کرتے"؟ "کوئی آدمی اتنا کمینہ نہیں ہوتا جو کام ملنے پر بھیک مانگے۔ ہاں شہدے ہو تو دوسری بات ہے۔ شہدوں کا بھیک کے سوا اور کیا سہارا ہو سکتا ہے"۔ "سرکار ان کے لئے یتیم خانے کیوں نہیں کھلواتی؟" "جب سوراج مل جائیگا تب شاید کھل جائیں ابھی تو کوئی توقع نہیں ہے مگر سوراج بھی دھرم ہی سے آئیگا"۔ "لاکھوں سادھو سنیاسی پنڈت پجاری مفت کا مال اڑاتے ہیں کیا اتنا دھرم کافی نہیں ہے؟ اگر اس دھرم سے سوراج ملتا تو کب کا مل چکا ہوتا" "اسی دھرم کی برکت ہے کہ ہندو قوم ابھی تک زندہ ہے ورنہ کب کے تحت الثریٰ پہنچ چکی ہوتی۔ روم، یونان، ایران، سیریا کسی کا اب نشان بھی نہیں ہے۔ یہ ہندو قوم ہی ہے جو ابھی تک زمانہ کی جفا کاریوں کا مقابلہ کرتی چلی جاتی ہے۔" "آپ سمجھے ہونگے ہندو قوم زندہ ہے۔ میں تو اسے اسی دن سے مردہ سمجھتی ہوں جس دن سے وہ محکوم ہوگئی ہے۔ زندگی آزادی کا نام ہے غلامی موت ہے"۔

کندن لال نے نوجوان بیوی کو حیرت زدہ نظروں سے دیکھا ایسے باغیانہ خیالات اس میں کہاں سے آ گئے؟ دیکھنے میں تو وہ بالکل بھولی بھالی تھی۔ سمجھے کہیں سن سنا لیا ہو گا۔ کڑک کر کہا "کیا بے کار جھگڑا کرتی ہو خیر باقی تو نہیں، ہو یہ اور بک بک کرتی ہو"۔ رامیشوری یہ پھٹکار پا کر چپکی ہو گئی۔

یک لمحہ وہاں کھڑی رہی اور پھر آہستہ آہستہ کمرے سے چلی گئی۔

(۳)

ایک دن کندن لال نے کسی دوست کی دعوت کی۔ رامیشوری سویرے سے پکوان میں لگ گئی۔ تو شام تک سر نہ اٹھا سکی۔ اسے یہ بیگار بری معلوم ہو رہی تھی۔ اگر دوست احباب کی ضیافت کرنی تھی تو کھانا پکانے کا کوئی انتظام کیوں نہیں کیا؟ سارا بوجھ اسی کے سر کیوں ڈال دیا؟ اس سے ایک بار پوچھ تو لیا ہوتا کہ دعوت کروں یا نہیں۔ ہوتا تب بھی یہی جواب ہو رہا تھا وہ دعوت کے معاملے کی بڑی خوشی سے تائید کرتی۔ نہیں وہ سمجھتی دعوت میں کر رہی ہوں۔ اب وہ سمجھ رہی تھی مجھ سے بیگار لی جا رہی ہے۔ خیر کھانا تیار ہوا۔ لوگوں نے کھانا کھایا اور چلے گئے۔ مگر منشی جی منہ پھلائے بیٹھے تھے۔ رامیشوری نے کہا۔ "تم کیوں نہیں کھا لیتے یا ابھی سویرا ہے؟"

بابو صاحب نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "کیا کھالوں۔ یہ کھانا ہے یا بیلوں کی غذا ہے"۔

رامیشوری کے سر سے پاؤں تک آگ لگ گئی۔ سارا دن چولھے کے سامنے جلی۔ اس کا یہ صلہ ہے۔ بولی۔ "مجھ سے جیسا ہو سکا پکایا۔ جو بات اپنے بس کی نہیں ہے۔ اس کے لئے کیا کرتی؟"

"پوریاں نمکین ہیں!"

"ہونگی"

"کچوری میں اتنا نمک تھا کہ کسی نے چھوا تک نہیں"۔

"ہوگا"

"حلوہ اچھی طرح بھنا نہیں۔ کچا ہند آرہی تھی۔"

"آتی ہوگی"

"شوربا اتنا پتلا تھا جیسے چائے"

"ہوگا"

"عورت کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ پکوان کے کام میں ہوشیار ہو"

پھر نصیحتوں کا تار باندھا۔ یہاں تک کہ رامیشوری تنگ آکر چلی گئی۔

(۴)

پانچ چھ مہینے گذر گئے۔ ایک دن کندن لال کے ایک دور کے رشتہ دار ملنے آئے۔ رامیشوری کو جونہی اس کی خبر ملی ناشتہ کے لئے مٹھائی بھیجی، اور مہری سے کہلا بھیجا۔ آج یہیں کھانا تناول فرمایئے گا۔

وہ صاحب پھولے نہ سمائے۔ بوریا بدھنا لے کر پہنچ گئے اور ڈیرا ڈال دیا۔ ایک ہفتہ گذر گیا۔ مگر آپ ٹلنے کا نام نہیں لیتے۔ آؤ بھگت میں کوئی کمی ہوتی تو شاید انہیں کچھ فکر ہوتی۔ پر رامیشوری ان کی خاطر تواضع میں جی جان سے لگی ہوئی تھی۔ پھر وہ بھلا کیوں ہٹنے لگے۔ ایک دن کندن لال نے کہا "تم نے یہ برا روگ پالا"۔ رامیشوری نے چونک کر پوچھا۔ کیسا روگ؟

"انہیں ٹلا کیوں نہیں دیتیں؟" "میرا کیا بگاڑ رہے ہیں؟"

"کم سے کم روزانہ ایک روپیہ کی چپت دے رہے ہیں اور اگر یہی خاطر داری رہی تو شاید جیتے جی ٹلیں گے یا نہیں"

"مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی دو چار دن کے لئے آ جائے تو اس کے سر ہو جاؤں۔ جب تک اس کی خواہش ہو رہے۔"

"ایسے مفت خوروں کی خاطرداری کرنی پاپ ہے۔ اگر تم نے اسے اتنا سر نہ چڑھایا ہوتا۔ تو اب تک لمبا ہوا ہوتا۔ جب دن میں تین دفعہ ناشتہ۔ تین مرتبہ کھانا اور پچاسوں بار پان ملتے ہیں تو اسے کتے نے کاٹا ہے' جو اپنے گھر جائے۔" "روٹی کا چور بنا تو اچھا نہیں ا"

"لائق اور نالائق کا خیال تو کر لینا چاہئے۔ ایسے احدیوں کو کھلانا پلانا دراصل انہیں زہر دینا ہے۔ زہر سے تو جان جاتی ہے یہ خاطرداری تو آتما کی ستیاناس کر دیتی ہے۔ اگر یہ حضرت مہینے بھر بھی یہاں رہ گئے تو پھر زندگی بھر کے لئے بیکار ہو جائیں گے پھر ان سے کچھ نہ ہو سکیگا۔ اور اس کا سارا الزام تمہارے سر رہیگا۔" دلائل کا سلسلہ بندھ گیا۔ نظائر کی جھڑی لگ گئی۔ رامیشوری کھسیا کر چلی گئی۔ کندن لال کو اس سے کب صبر آ سکتا ہے۔ ان کے نصائح کی بارش کبھی بند بھی ہو سکتی ہے۔ یہ سوال اس کے دل میں بار بار اٹھنے لگا۔

(۵)

ایک دن دیہات سے بھینس کا تازہ گھی آیا۔ ادھر مہینوں سے بازار کا گھی کھاتے کھاتے ناک میں دم ہو رہا تھا۔ رامیشوری نے اسے کھولایا۔ اس میں لونگ ڈالی اور کڑاہی سے نکال کر ایک مٹکی میں رکھ دیا اس کی سوندھی سوندھی خوشبو سے سارا گھر مہک رہا تھا۔ مہری چوکا برتن کرنے آئی' تو اس نے چاہا کہ مٹکی کو چولے سے اتار کر چھینکے یا آلے پر رکھ دے۔ یہ اتفاق کی بات اس نے مٹکی اٹھائی تو وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی' سارا گھی بہ گیا۔ دھما کا سن کر رامیشوری دوڑی' تو مہری کھڑی رو رہی تھی اور مٹکی چور چور ہو گئی تھی تڑپ کر بولی "مٹکی کیسے ٹوٹ گئی؟ ہائے تیری طلب سے کاٹ لونگی رام رام! سارا گھی مٹی میں ملا دیا! تیری آنکھیں پھوٹ گئی تھیں یا ہاتھوں میں دم نہیں تھا؟ اتنی دور سے منگایا' اتنی محنت سے گرم کیا' مگر ایک بوند بھی حلق کے اندر نہ گئی۔ اب کھڑی

کیا قصور رہی ہے۔ جا اپنا کام کر۔" مہری نے آنسو پونچھ کر کہا۔ "بی بی اب تو غلطی ہوگئی۔ چاہے طلب کاٹو چاہے جان مارو۔ میں نے تو سوچا۔ اوٹھا کر آلے پر رکھ دوں تو چوکا لگاؤں۔ کیا جانتی تھی کہ قسمت میں یہ لکھا ہے۔ نہ جانے کس کمبخت کا منہ دیکھ کر اوٹھی تھی۔"

رامیشوری "میں کچھ نہیں جانتی سب روپے تیرے طلب سے وصول کرونگی ایک روپیہ جرمانہ نہ کیا تو کہنا۔"

مہری "مر جاؤنگی سرکار لیکن ایک پیسہ کا ٹھکانہ نہیں ہے۔

رامیشوری "مرجا! جی جا میں کچھ نہیں جانتی"۔

مہری نے ایک منٹ تک کچھ سوچا اور بولی۔ اچھا کاٹ لیجئے گا۔ سرکار۔ آپ سے صبر نہیں ہوتا میں صبر کرلونگی۔ یہی نہ ہوگا بھوکوں مرجاؤنگی۔ جی کر کون سا سکھ بھوگ رہی ہوں کہ مرنے کو ڈروں۔ سمجھ لونگی ایک مہینہ کوئی کام نہیں کیا۔ آدمی سے بڑا بڑا نقصان ہو جاتا ہے۔ یہ تو گھی ہی تھا۔"

رامیشوری کو ایک ہی لمحہ میں مہری پر رحم آگیا۔ بولی "تو بھوکوں مرجائیگی تو میرا کام کون کریگا"۔

مہری "کام کرنا ہوگا کھلائیگا نہ کام کرنا ہوگا بھوکوں ماریگا۔ آج سے آکر آپ ہی کے در پر سویا کرونگی۔"

رامیشوری "سچ کہتی ہوں۔ آج تونے بڑا نقصان کرڈالا۔"

مہری "میں تو آپ ہی پچھتا رہی ہوں سرکار"

رامیشوری "جا گوبر سے چوکا لیپ دے۔ مٹکی کے ٹکڑے دور پھینک دے اور بازار سے گھی لیتی آ۔"

مہری نے خوش ہوکر چوکا گوبر سے لیپا اور مٹکی کے ٹکڑے بٹور رہی تھی کہ کندن لال آگئے۔ او ہانڈی ٹوٹی دیکھ کر بولے "یہ ہانڈی کیسے ٹوٹ گئی؟"

رامیشوری نے کہا "مہری اوٹھا کر اوپر رکھ رہی تھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ پڑی"۔

کندن لال نے چلا کر کہا "تو سب گھی بہ گیا؟

"اور کیا کچھ بچ بھی رہا"

"تم نے مہری سے کچھ کہا نہیں؟"

"کیا کہتی۔ اس نے جان بوجھ کر تو گرا نہیں دیا"

"یہ نقصان کون اٹھائیگا"؟

"ہم اٹھائیں گے اور کون اوٹھائیگا۔ اگر میرے ہی ہاتھ سے چھوٹ پڑتی تو کیا ہاتھ کاٹ لیتی"؟
کندن لال نے ہونٹ چبا کر کہا "تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آتی جس نے نقصان کیا ہے اس سے وصول ہونا چاہیئے۔ یہی خدائی قانون ہے آنکھ کے بدلے آنکھ۔ جان کے بدلے جان یہ عیسیٰ مسیح جیسے رحم دل بزرگ کا کہنا ہے۔ اگر تاوان کا دستور دنیا سے اٹھ جائے تو یہاں رہنے کون؟ ساری زمین خون سے سرخ ہو جائے۔ قاتل دن دھاڑے لوگوں کا گلا کاٹنے لگیں۔ تاوان ہی سے سماج کی آبرو قائم ہے۔ جس دن ونڈ نہ رہیگا۔ دنیا نہ رہے گی۔ منو قدیم سمرتی کے مصنف بیوقوف نہیں تھے جو تاوان کے قانون کو اتنی اہمیت دے گئے۔ اور کسی خیال سے نہیں تو تحفظ عزت کے خاطر ہی تاوان ضرور دینا چاہیئے۔ یہ روپیے مہری کو دینے پڑیں گے اس کی مزدوری کاٹنی پڑیگی۔ نہیں تو آج اس نے گمی کا گھڑا لڑکا دیا ہے۔ کل کو کوئی اور نقصان کر دیگی"۔

رامیشوری نے ڈرتے ڈرتے کہا "میں نے اسے معاف کر دیا ہے"۔

کندن لال نے آنکھیں نکال کر کہا "لیکن میں نہیں معاف کر سکتا"۔

مہری دروازہ پر کھڑی یہ قصہ سن رہی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ کندن لال کا غصہ بڑھتا ہی جاتا ہے اور میری وجہ سے رامیشوری کو گھرکیاں سننی ہی پڑ رہی ہیں تو وہ سامنے جاکر بولی۔ "بابوجی اب تو قصور ہو گیا۔ آپ سب روپیے میری طلب سے کاٹ لیجئے۔ روپیے نہیں ہیں ورنہ ابھی لاکر آپ کے ہاتھ میں رکھ دیتی"۔

رامیشوری نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ "جا بھاگ یہاں سے۔ تو کیا کرنے آئی ہے؟ بڑی روپیے والی بنی ہے۔!"

کندن لال نے بیوی کی طرف غیظ آلود نظروں سے دیکھکر کہا۔ تم کیوں اس کی وکالت کر رہی ہو؟ یہ موٹی سی بات ہے اور اسے ایک بچہ بھی سمجھتا ہے کہ جو نقصان کرتا ہے اسے اس کا ڈنڈ بھگتنا پڑتا ہے۔ میں کیوں پانچ روپیے کا نقصان اٹھاؤں؟ وجہ؟ کیوں نہیں اس نے مٹکے کو سنبھال کر پکڑا کیوں اتنی جلدبازی کی۔ کیوں تمہیں بلاکر مدد نہیں لی۔ یہ صاف اسکی لاپرواہی ہے"۔
یہ کہتے ہوئے کندن لال باہر چلے گئے۔

(۶)

رامیشوری اس بے غیرتی سے رنجیدہ ہو گئی۔ ڈانٹنا ہی تھا تو کمرے میں بلاکر تنہائی میں ڈانٹتے۔ مہری کے

سامنے اسے روئی کی طرح توم ڈالا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا یہ کس قماش کے آدمی ہیں۔ آج ایک بات کہتے ہیں کل اس کو کاٹتے ہیں جیسے کوئی مشلون مزاج آدمی ہو۔ کہاں تو رحم اور کرم کے اوتار بنتے تھے کہاں آج پانچ روپیے کے لئے جان دینے لگے۔ بڑا مزہ آجائے۔ جو کل مہری بیٹھ رہے۔ کبھی تو ان کے منہ سے تعریف کا ایک کلمہ نکلا ہوتا! اب مجھے بھی اپنی عادت بدلنی پڑیگی۔ یہ سب میری سادگی کا نتیجہ ہے جوں جوں میں طرح دیتی ہوں آپ جامہ سے باہر ہوتے ہیں۔ اس کا علاج یہی ہے کہ ایک کہیں تو دو سناؤں۔ آخر کب تک اور کہاں تک سہوں! کوئی حد بھی ہے! جب دیکھو ڈانٹ رہے ہیں۔ جس کے مزاج کا پتہ ہی نہیں ہوا سے کون خوش رکھ سکتا ہے۔ اس دن ذرا سا بلی کو مار دیا تو آپ دیا کا اپدیش کرنے لگے۔ آج وہ رحم کہاں گیا ان کو ٹھیک کرنے کی تدبیر یہی ہے کہ سمجھ لوں۔ کوئی کتا بھونک رہا ہے نہیں ایسا کیوں کروں۔ اپنے دل سے کوئی کام ہی نہ کروں۔ جو یہ کہیں وہی کروں نہ جو بھر کم نہ جو بھر زیادہ جب انہیں میرا کوئی کام پسند ہی نہیں آتا تو مجھے کیا کتے نے کاٹا ہے جو خواہ مخواہ اپنی ٹانگ اڑاؤں یہ بس یہی ٹھیک ہے۔ وہ رات بھر اسی ادھیڑ بن میں پڑی رہی۔ سویرے کندن لال ندی کو اشنان کرنے گئے۔ لوٹے تو نو بج گئے تھے۔ گھر میں جا کر دیکھا تو چوکا برتن نہ ہوا تھا۔ پریشان ہو گئے پوچھا کیا مہری نہیں آئی؟"

رامیشوری۔ "نہیں"

کندن لال۔ "تو پھر"

رامیشوری۔ جو آپ کا حکم۔

کندن لال۔ "یہ تو بڑی مشکل ہے۔"

رامیشوری۔ "ہاں ہے تو"

کندن لال۔ "پڑوس کی مہری کو کیوں نہ بلا لیا؟"

رامیشوری۔ "کس کے حکم سے بلاتی۔ اب حکم ہوا ہے بلائے لیتی ہوں۔"

کندن لال۔ "اب بلاؤگی تو کھانا کب پکیگا! نو بج گئے ہیں اتنا تو تمہیں اپنی عقل سے کام لینا چاہئے تھا کہ مہری نہیں آئی تو پڑوس والی کو بلا لیتیں۔"

رامیشوری۔ "اگر اس وقت سرکار پوچھتے کیوں دوسری مہری بلائی تو کیا جواب دیتی! اپنی عقل سے کام لینا چھوڑ دیا اب تمہاری عقل ہی سے کام لونگی۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ کوئی مجھے آنکھیں دکھائے۔"

کندن لال۔ "اچھا تو اس وقت کیا ہوتا ہے"؟

رامیشوری "جو حضور کا حکم ہو۔"

کندن لال "تم مجھے بناتی ہو"؟

رامیشوری "میری اتنی مجال کہ آپ کو بناؤں۔ میں تو حضور کی لونڈی ہوں۔ جو کہئے وہ کروں۔"

کندن لال "میں تو جاتا ہوں تمہارا جو جی چاہے کرو۔"

رامیشوری "جائیے میرا جی کچھ نہیں چاہے گا اور نہ کچھ کرونگی۔"

کندن لال "آخر تم کیا کھاؤ گی؟"

رامیشوری "جو آپ دے دیں گے وہ کھاؤنگی۔"

کندن لال "لاؤ بازار سے پوریاں لا دوں۔"

رامیشوری روپیہ نکال لائی کندن لال پوریاں لائے اس وقت کا کام چلا۔ دفتر گئے۔ لوٹے تو دیر ہوگئی تھی آتے ہی آتے پوچھا۔ "مہری آئی؟"

رامیشوری "نہیں۔"

کندن لال "میں نے تو کہا تھا پڑوس والی کو بلا لینا۔"

رامیشوری "بلایا تھا۔ وہ پانچ روپے مانگتی ہے۔"

کندن لال "تو ایک ہی روپیہ کا فرق تھا کیوں نہیں رکھ لیا؟"

رامیشوری "مجھے یہ حکم نہیں ملا تھا۔ مجھ سے جواب طلب ہوتا کہ ایک روپیہ زیادہ کیوں دے دیا۔ خرچ کی کفایت پر نصیحت ہونے لگتی تو کیا کرتی؟"

کندن لال "تم بالکل مورکھ ہو۔"

رامیشوری "بالکل۔"

کندن لال "تو اس وقت بھی بھوجن نہ بنے گا؟"

رامیشوری "مجبوری ہے۔"

کندن لال سر پکڑ کر چارپائی پر بیٹھ گئے۔ یہ تو نئی آفت گلے پڑی۔ پوریاں انہیں پسند نہیں تھیں دل میں بہت جھنجھلائے۔ رامیشوری کو دو چار الٹی سیدھی سنائی لیکن اس نے سنا ہی نہیں۔ کچھ بس نہ چلا تو مہری کی تلاش میں نکلے۔ مگر جس کے ہاں گئے معلوم ہوا مہری کام کر کے چلی گئی۔ آخر ایک کہار ملا اُسے بلا لائے کہار نے دو آنے لئے اور برتن دھوکر چلتا بنا۔

رامیشوری نے کہا "بھوجن کیا بنے گا؟"

کندن لال "روٹی ترکاری بنا لو۔ یا اس میں بھی کچھ مصیبت ہے"۔

رامیشوری "ترکاری گھر میں نہیں"۔

کندن لال "دن بھر بیٹھی رہی ترکاری بھی نہ لیتے بنی؟ اب اتنی رات گئے ترکاری کہاں ملیگی"۔

رامیشوری "مجھے ترکاری رکھنے کا حکم نہ ملا تھا۔ میں پیسہ دھیلا زیادہ دے دیتی تو؟"

کندن لال نے غصہ سے دانت پیس کر کہا "آخر تم کیا چاہتی ہو؟"

رامیشوری نے آہستہ سے جواب دیا "کچھ نہیں فقط بے عزتی منظور نہیں"۔

کندن لال "تمہاری بے عزتی کون کرتا ہے؟"

رامیشوری "آپ کرتے ہیں"۔

کندن لال "تو میں گھر کے معاملے میں کچھ نہیں بولوں؟"

رامیشوری "آپ نہ بولیں گے تو کون بولیگا۔ میں تو صرف حکم کی تابعدار ہوں۔ رات روٹی دال پر کٹی دونوں آدمی لیٹے۔ رامیشوری کو تو فوراً نیند آگئی۔ کندن لال بڑی دیر تک کروٹیں بدلتے رہے اگر رامیشوری اسی طرح ہٹ کریگی تو ایک دن بھی کام نہ چلیگا۔ آج ہی بڑی مشکل سے کھانا ملا۔ اس کی سمجھ ہی الٹی ہے میں کچھ سمجھاتا ہوں تو کچھ سمجھتی ہے' ڈانٹ رہا ہوں۔ مجھ سے بغیر بولے ابھی نہیں جاتا لیکن اگر بولنے کا یہ نتیجہ ہے تو پھر بولنا فضول ہے۔ نقصان ہوگا بلا سے۔ یہ تو نہ ہوگا کہ دفتر سے آکر بازار بھاگوں۔ مہری سے روپیے وصول کرنیکی بات اسے بری لگی اور تھی بھی۔ بیچارا روپیے تو نہ ملے الٹے مہری نے کام چھوڑ دیا۔ رامیشوری کو جگا کر بولے کتنا سوتی ہو تم؟

رامیشوری "مزدوروں کو اچھی نیند آتی ہے"۔ کندن لال "پھر لاؤ مہری سے روپیے نہ وصول کرنا"۔

رامیشوری "وہ تو بے کھڑی ہے شاید"۔ کندن لال "اسے معلوم ہو جائیگا تو کام کرنے آئیگی"۔

رامیشوری "اچھی بات کہا ہو گئی"۔ کندن لال "آج سے میں کان پکڑتا ہوں تمہارے بیچ میں نہ بولونگا

رامیشوری "اور جو میں گھر لٹا دوں تو؟" کندن لال "لٹا دو، شاہد کروخوست۔ اگر تم کسی بات میں میری صلاح پوچھو گی تو دے دونگا ورنہ منہ نہ کھولونگا"۔

رامیشوری "میں بے عزتی نہیں سہہ سکتی"۔

کندن لال "اس غلطی کو معاف کرو"۔

رامیشوری "سچے دل سے کہتے ہو نا؟"

کندن لال "سچے دل سے"۔

رنگِ تغزل

از جناب سید عابد علی صاحب عابدؔ بی اے ایل ایل بی وکیل گجرات

مرجھائے جلوۂ امین کہاں　اب وہ عشقِ زندگی دشمن کہاں

غم کی تاریکی غریقِ نور ہو　ساقیا وہ بادۂ روشن کہاں

مسکرا دیتے ہو اب شکووں پہ تم　اب وہ اندازِ خمِ گردن کہاں

پی چکے صہبائے رنگین پی چکے　کیفہائے چشمِ جادو فن کہاں

چشمِ پُرنم کی بہاریں ہو چکیں　حسرتِ رنگینیٔ دامن کہاں

یوں تو گلشن بھی ہے فردوس شمیم　آپ کی خوشبوئے پیراہن کہاں

اس گلِ خوبی سے تھی ساری بہار　اب فروغِ نزہتِ گلشن کہاں

اب کہاں مہکے ہوئے پھولوں کے ہار　وصل و عشرت کی شبِ روشن کہاں

رحم شیوں پہ انہیں آتا مگر　دل حریفِ ذلتِ شیون کہاں

ہائے وہ عہدِ محبت کی غزل　آہ وہ اندازِ آتش زن کہاں

بجلیوں سے عشق ہے عابدؔ مجھے
اب غمِ بربادیٔ خرمن کہاں

قرض خواہ

مترجمہ جناب محشر عابدی صاحب

(۱)

دیوناٹ دس برس سے ایک بنک میں قرض وصول کرنیکی خدمت پر متعین تھا۔ وہ ایمانداری اور خدمت گذاری کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا۔ ملازمت کے طویل عرصہ میں کبھی کوئی عیب اس میں نہیں پایا گیا اور اس کے بہی کھاتے میں کبھی ایک پیسے کی غلطی درج نہ ہوئی تھی۔

وہ تنہا تھا بہت خوش تھا اور اپنی قسمت پر بھروسہ کئے بیٹھا تھا۔ نئے دوستوں سے راہ و رسم پیدا کرنا اس نے بالکل ترک کر دیا تھا۔ وہ عشق و محبت کے معاملات سے بھی بالکل انجان اور آزاد تھا۔ اگر کبھی کوئی اس سے دریافت کرتا کہ بڑی رقمیں قرض لینے میں کیا ہرج ہے؟ تو وہ جواب دیتا۔

"کیوں! روپیہ جو تمہارا نہیں وہ درحقیقت روپیہ نہیں" جس محلہ میں وہ رہتا تھا لوگ اُسے ایک قابل شخصیت تصور کرتے تھے اور اکثر اس سے صلاح و مشورہ کیا کرتے تھے۔

ایک روز شام کو وہ قرض وصول کرنے کے بعد واپس نہ آیا۔ اس کے متعلق کبھی کسی کو بے ایمانی کا خیال نہ گذرا تھا تاہم یہ ممکن تھا کہ اس دن اس نے کوئی جرم کیا ہو پولیس کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ تمام بل وقت مقررہ پر وصول کر کے سات بجے شام کو اس نے مونٹ روڈ گیٹ کے قریب آخری رقم وصول کی تھی اس وقت اس کے پاس دو لاکھ فرانک (فرانسیسی سکہ) سے زیادہ تھے اس کے بعد پھر اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ لوگوں نے قلعہ کے اطراف ویران پڑے ہوئے کھنڈروں اور فوجی کوارٹروں میں تلاش کیا لیکن وہ نہ ملنے والا تھا نہ ملا۔ انہوں نے سرحدی اسٹیشنوں کو بھی تار دیا لیکن بنک کے ڈائرکٹر اور پولیس کو یقین ہوگیا کہ اسے ڈاکوں نے لوٹ کر دریا میں پھینک دیا ہوگا۔ اور یہ کہ ہمیشہ دروغ گو وں نے پہلے ہی سے اس قسم کی سازش کر رکھی ہوگی۔

جب پولیس تحقیقات میں مصروف تھی تو دیوناٹ دریائے سین کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس نے دو لاکھ فرانک اپنے جیب میں رکھ لئے۔ دریا کے پل کی ایک کمان کے نیچے اس نے بنک کی وردی اتار ڈالی۔ اسے ایک گٹھڑی بنا کر ایک وزنی پتھر سے باندھ دیا اور دریا میں ڈبو دیا۔ اب وہ نہایت مطمئن انداز سے پیرس کی طرف روانہ ہوا۔ رات کو وہ ایک ہوٹل میں بہت گہری اور سکون کی نیند سویا۔

چند گھنٹوں میں وہ ایک پکا چور بن گیا تھا۔

(۲)

صبح کو اس نے دو لاکھ فرانک ایک لفافہ میں رکھے اس پر پانچ مہریں لگائیں اور ایک وکیل کے پاس جا پہنچا۔ "جناب میں ایک ضرورت سے آپ کے پاس آیا ہوں اس لفافہ میں کچھ ایسے ضروری کاغذات ہیں جنہیں میں حفاظت سے رکھنا چاہتا ہوں میں ایک دور دراز سفر پر جا رہا ہوں اور یہ نہیں کہہ سکتا کہ کب واپس آؤنگا۔ میں یہ لفافہ آپ کے پاس بطور امانت رکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اس میں آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا" "نہیں کوئی اعتراض نہیں۔ میں اس کی رسید بھی دونگا"

اس نے منظور کر لیا اور سوچنے لگا۔ "رسید؟" وہ کہاں رکھیگا۔ کس پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ اگر وہ اپنا اصلی نام لکھائیگا تو اسے یقیناً یہ رقم کھو دینی پڑیگی۔ وہ اس خیال سے ہچکچایا کہ اس نے پہلے ہی اس کے متعلق کیوں نہ کوئی تدبیر سوچ لی آخرکار اس نے اطمینان سے کہا۔

میں دنیا میں تن تنہا ہوں۔ میرے کوئی عزیز اور دوست نہیں ہیں۔ جو سفر میں کرنا چاہتا ہوں وہ یقیناً خطرات سے خالی نہیں کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ یہ لفافہ اپنے کاغذات میں حفاظت سے رکھ لیں اور جب میں واپس آؤں تو اپنا نام بتا کر اسے واپس لے لوں؟"

"لیکن اگر میں ایسا کر دوں ——"

"آپ رسید پر صرف میرا نام لکھ لیجئے اور اپنے پاس ہی رکھ لیجئے۔ اگر میں دس برس تک واپس نہ آؤں تو یہ لفافہ آپ کی ملکیت میں شمار کیا جائے گا"

"مجھے منظور ہے —————— آپ کا نام؟

اس نے نہایت متانت سے جواب دیا۔ "ڈیورجر۔ ہنری ڈیورجر" جب وہ دوبارہ سڑک پر آیا تو اس نے اطمینان کی سانس لی۔ اس کے پیش نامہ (پروگرام) کا پہلا باب ختم ہو چکا تھا۔ اب خواہ لوگ اس کیلئے کتنا ہی کف افسوس کیوں نہ ملیں۔ مگر چوری کا مال ہر شخص کی دسترس سے باہر ہو گیا تھا۔

(۳)

وہ اب اس قسم کے خیالی پلاؤ پکا رہا تھا کہ قید سے رہا ہونے کے بعد وہ اپنی امانت وصول کر لیگا اور کوئی دوسرا شخص اس کے لئے مداخلت نہ کر سکیگا اور اس کی زندگی اس زندگی سے بہتر ہو جائیگی کہ جب وہ در در قرض مانگتا پھرتا تھا۔ ہر شخص اُسے مسٹر ڈیورجر کہے گا اور وہ سکون اور چین سے اپنی زندگی بسر کریگا۔ اور بوڑھا ہو جائے گا۔ لوگ اسے ایک ایماندار اور سخی کی نگاہ سے دیکھیں گے

کیونکہ وہ کچھ روپیہ سے دوسروں کی امداد بھی کریگا۔

وہ چوبیس گھنٹے اس امر پہ غور وخوض کرنے کے لئے اور ٹھہرا رہا کہ آیا ان نوٹوں کے نمبر تو کسی کو معلوم نہیں ہا ور جب اس کی طرف سے بھی اطمینان ہو گیا تو اس نے ایک سگریٹ جلایا اور پینے لگا۔

چند گھنٹوں کے بعد وہ گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن مقدمہ کے وقت یہ معلوم کرنا بالکل ناممکن ہو گیا کہ اس نے دو لاکھ فرانک کہا کئے۔ وہ صرف اتنا جواب دیتا تھا "میں نہیں جانتا میں ایک بنچ پر سو گیا اور میرا خیال ہے مجھے ڈاکوؤں نے لوٹ لیا۔"

اسے پانچ سال کی قید کا حکم ہو گیا۔

اس نے حکم سنا مگر اس کی پیشانی پر بل نہ آئے اس نے خیال کیا کہ ابھی اس کی عمر (۳۵) سال کی ہے (۴۰) برس میں وہ آزاد ہو جائیگا اور امیر بھی۔ اس نے اس قید کو ایک معمولی مگر ضروری قربانی سمجھا تھا۔

وہ صبر اور استقلال سے دن کاٹ رہا تھا اُسے کوئی فکر اور پریشانی نہ تھی۔ ہاں صحت کا خیال ضرور تھا مدت قید ختم ہوگئی اور وہ جیل خانے سے رہا کر دیا گیا۔ وہ وہاں سے روانہ ہوا۔ اس وقت وہ دنیا کو بھولا ہوا تھا۔ اور صرف وکیل سے ملنے کے خیال میں ہمہ تن مصروف تھا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ وہ وکیل کے پاس پہنچیگا۔ اوخود دفتر میں بلایا جائے گا۔ کیا وکیل اسے پہچان لیگا؟ — وہ آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا یقیناً وہ زیادہ عمر ہو گیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس کے چہرہ سے تجربہ کاری کے آثار بھی نمایاں ہیں —— نہیں وکیل اسے ہرگز نہ پہچانیگا۔ ہا — ہا — ہا کیسی ہنسی کی بات ہوگی اس وقت

(۴)

"جناب میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" "میں اپنی امانت واپس لینے کی غرض سے آیا ہوں جو میں نے پانچ سال ہوئے آپ کے پاس رکھی تھی۔"

کونسی امانت —— ؟ کب ؟ —— کس کے نام سے ؟

کس کے نام سے ؟ —————— مسٹر ——————"

ڈیونالٹ یہ کہتے کہتے رک گیا۔ اور اپنے آپ گن گنانے لگا۔ "کیسے تعجب کی بات ہے مجھے نام یاد نہیں جو میں نے لکھایا تھا" وہ اپنے دماغ پر پتھر مارنے لگا۔ اور ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ وہ بہت بے چین ہو نے لگا اور خود سے اس کا سبب دریافت کرنے لگا۔ وکیل نے کاغذات الٹتے ہوئے کہا۔

"آئیے، آئیے جناب ! ان کس حرف سے نام شروع ہوتا ہے ؟"

ایک گھنٹہ تک وہ خیالات میں سرگرداں بیٹھا رہا اور رہ رہ کر خیال دوڑتا رہا تھا کہ نام یاد آجائے لیکن وقت بیکار گذر رہا تھا۔ نام اس کے سامنے رقص کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے اطراف پھر رہا تھا اس نے حروف چمکتے ہوئے دیکھے لیکن لفظ غائب ہو جاتا تھا۔ ہر لمحہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نام یاد آگیا۔ وہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ اس کے ہونٹوں پر ہے۔

اب وہ بہت زیادہ پریشان ہوگیا اور اُسے معلوم ہونے لگا کہ وہ فراموش کردہ لفظ تیر بنکر اس کے قلب وجگر کو زخمی کر رہا ہے۔ خون اس کی رگوں میں کھولنے لگا اور گرم پانی کی طرح ابلنے لگا۔ اس کے اعضاء میں اینٹھن پیدا ہوگئی۔ اب خاموش اور ساکت بیٹھے رہنا اس کے لئے ناممکن ہوگیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ہرانے لگے۔ وہ دانتوں سے ہونٹ چبانے لگا۔ وہ اب دو مختلف کیفیات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کبھی رونے کا خیال کرتا اور کبھی لڑنے کا لیکن جوں جوں وہ زیادہ غور اور سمجھ سے کام لیتا ویسے ہی نام اور زیادہ موہوم نظر آنے لگتا۔ اس نے بیساختہ زمین پہ پاؤں دے مارے۔ اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور زور سے چلایا۔ اس پریشانی سے کیا فائدہ اس سے سوائے برے نتائج کے اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر میں سوچنا چھوڑ دوں تو وہ خود ہی یاد آجائیگا۔ لیکن ایک قلب سوز اور غالب خیال اس آسانی سے مٹایا نہیں جاسکتا۔ وہ راہروؤں کو دیکھکر کوئی نتیجہ نکالنے کی کوشش کرتا لیکن سب بے سود۔ وہ دوکانوں کی کھڑکیوں کے سامنے کھڑا ہو جاتا۔ سڑک کا شور و غل سنتا۔ مگر سنائی نہ دیتا۔ دیکھتا لیکن دکھائی نہ دیتا اس کے کانوں میں صرف ایک لفظ مستفسرانہ لہجہ میں گونج رہا تھا۔ "مسٹر ـــ ؟ مسٹر ؟"

(۵)

رات ہوگئی سڑکیں سنسان ہوگئیں۔ تھکا ماندہ وہ ایک ہوٹل پہنچا ایک کمرہ کرایہ پر لے کر اسی حالت میں کپڑے پہنے ہوئے سوگیا۔ چار گھنٹے مسلسل وہ دماغ لڑاتا رہا اور صبح تڑکا ہوتے گہری نیند میں غرق ہوگیا۔

وہ اٹھا تو صبح ہو چکی تھی اور دھوپ نکلی ہوئی تھی وہ بہت اطمینان سے جمائیاں لیتا ہوا اٹھا اس وقت گو دماغ کو سکون تھا مگر جسم کے ہر عضو سے رہ رہ کر یہ سوال پیدا ہو رہا تھا مسٹر ؟۔ مسٹر ؟"

ایک نئی خلش اس کے سکون دماغ کو پھر منتشر کرنے لگی ایک خوف کہ تمام عمر وہ نام یاد نہ آئیگا کبھی نہیں۔ وہ اٹھ بیٹھا باہر آیا اور کئی گھنٹہ تک وکیل کے دفتر کے اطراف پریشانی سے چکر لگاتا رہا۔ دوسری رات بھی آگئی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ اور زور سے ہلاتے ہوئے غم و غصہ کے لہجہ میں چلانے لگا " آہ میں دیوانہ ہو جاؤں گا"

اب ایک زیادہ وحشت ناک انجام اس کے دماغ مضطرب میں جاگزین ہو گیا۔ اس کے پاس دو لاکھ فرانک تھے جو در اصل اس نے بے ایمانی سے حاصل کیئے تھے۔ تاہم اس کے تھے مگر اب اس کے قبضہ سے باہر تھے انہیں حاصل کرنے کے لئے اس نے پانچ سال کی قید بھی برداشت کی تھی اور اب وہ انہیں دیکھ بھی نہ سکتا تھا نوٹ اس کا انتظار کر رہے تھے اور ایک نقطہ ـــــ صرف ایک نقطہ اسے یاد نہ آتا تھا جو اس کے اور نوٹوں کے درمیان سدراہ ہو رہا تھا اس نے غصہ میں آکر اپنے سر پر گھونسے مارے تاکہ بھولا ہوا نام یاد آ جائے لیکن سب لاحاصل تھا۔ وہ ایک شرابی کی طرح لالٹینوں کے کھمبوں سے ٹکراتا پھر رہا تھا۔ اب یہ فراموشی صرف ایک خیال ہی نہ تھی۔ بلکہ اس کا تمام جسم اور اس کا دماغ ایک ناقابل برداشت سوزش سے تپنے لگا تھا اور اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ بھولا ہوا نام تمام عمر نہ یاد کر سکیگا۔ اس کا تصور ایک وحشت ناک جسم کی آواز میں اس کے کانوں میں سما گیا جب وہ سڑک پر سے گذر رہا تھا تو اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ لوگ اس کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور اس پر انگلیاں اٹھا رہے ہیں۔ اس کی رفتار زیادہ تیز ہو گئی۔ اور وہ سیدھا دوڑنے لگا۔ وہ سڑک کی آمد و رفت سے بالکل بے پرواہ لوگوں سے ٹکراتا چلا جا رہا تھا وہ چاہتا تھا کہ وہ کسی چیز سے ٹکرا جائے۔ لوگ اسے پیروں میں روند ڈالیں اور وہ کچل کر مر جائے۔

"مسٹر ـــــ ؟ مسٹر ـــــ ؟"

(۶)

اب اسکے قدموں کے نیچے دریائے سین تیزی سے لہریں مار رہا تھا۔ وہ فرط غم سے روتا ہوا چلایا "مسٹر آہ ـــ وہ نام ـــ وہ نام" وہ آہستہ آہستہ آگے کی طرف بڑھا۔ اسکا چہرہ غمگین تھا۔ وہ دریا کے کنارے پہنچ گیا کہ پانی سے ہاتھ منہ دھوئے۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ پانی اُسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ اسکو۔ اسکی سرخ آنکھوں کو اس کے اعضا کو اس کے تمام جسم کو، اُسے محسوس ہونے لگا کہ اس کا پیر پھسل رہا ہے اور اب اس کے نیچے دریا کے پایاب کنارے پر نہیں جمتے۔ وہ گر پڑا۔ ٹھنڈے پانی کی ایک زور دار لہر نے اس کے جسم کی رگ رگ میں ایک اضطراب کی رو دوڑا دی۔ وہ کش مکش عذاب میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو پھیلا دیا۔ سر اوپر اٹھایا نیچے غائب ہو گیا۔ پھر سطح پر نمودار ہوا۔ اور یکایک وہ نہایت کوشش اور ڈراؤنی آواز میں چلا اٹھا اسکی آنکھیں باہر نکلی پڑتی تھیں۔ "مجھے یاد آ گیا ـــ مدد ـــ ڈیو برا ـــ" "ڈیو......" دریا کا کنارہ ویران ہو گیا۔ موجیں پل کے کھمبوں سے سر ٹکرانے اور ایک معنی خیز گونج پیدا کرنے لگیں۔ ایک بہت بڑی لہر جہاز کی زنجیروں سے سر ٹکراتی ہوئی بہت دور تک خشکی پر چلی آئی ـــ اور اب بالکل خاموشی تھی۔

از جناب سید قادر حسین صاحب قادر حیدرآبادی

ڈھلی جو عمر کہاں گرمیاں جوانی کی ۔۔۔ بنی چراغ سحر شمع زندگانی کی

غرور حسن سے یہ شان ہے جوانی کی ۔۔۔ وہ ظلم کر کے سمجھتے ہیں مہربانی کی

دبا کے رکھینگی ہنگامہ ہائے محشر کو ۔۔۔ یہ شوخیاں تری اٹھتی ہوئی جوانی کی

نہ اب ہے دل کی امنگیں نہ اب ہے جوش طرب ۔۔۔ وہ ڈھلتی پھرتی ہوئی چھاؤں تھی جوانی کی

قرار حسن کو نہ ہوا اعتبار کیا اس کا ۔۔۔ قسم نہ کھاؤ دم وعدہ تم جوانی کی

اٹھاتے جاتے ہیں ہر ہر قدم پہ وہ فتنہ ۔۔۔ ابھارے پھرتی ہے شوخی انہیں جوانی کی

جمائیاں سی کچھ آجاتی ہیں ضعیفی میں ۔۔۔ جو یاد آتی ہیں بدمستیاں جوانی کی

وہ فیض عشق زلیخا کا خاص تھا ورنہ ۔۔۔ دوبارہ ملتی ہے دولت کہیں جوانی کی

ابھی تو توبہ سے قادر حجاب آتا ہے

ابھی نظر میں ہیں بدعہدیاں جوانی کی

یورپ کی موجودہ ترقی میں مسلمانوں کا حصہ

از جناب خواجہ ظہور الدین صاحب سکندرآباد دکن

انگلستان کے ایک مشہور فلسفی ہربرٹ اسپنسر کے قول کے مطابق "قوم مجموعہ ہے افراد کا" جس طرح افراد اپنی زندگی میں مختلف حالتوں سے گذرتے ہیں اسی طرح ایک قوم کو بھی مختلف منازل طے کرنے پڑتے ہیں جس طرح افراد پر طفولیت و جہالت، شباب و قوت اور پیری و انحطاط کا زمانہ آتا ہے بالکل اسی طرح قوموں پر بھی وحشت و جہالت، عروج تہذیب و تمدن اور پھر انحطاط و زوال کا زمانہ آتا ہے، یہ ایک دستور فطرت ہے جو کسی ایک قوم، فرد یا ملک کے ساتھ مخصوص نہیں رہا، بلکہ دنیا کے تمام افراد اور کل ممالک اور تمام اقوام پر یہ اصول محیط ہے۔ یونان قدیم تاریخ میں وہی مرتبہ رکھتا تھا جو آج مغرب کو حاصل ہے لیکن کسی وقت یہ بھی تاریکی اور جہالت میں مبتلا تھا۔ رومی قوم جو یونان کے بعد سطح ارض کی سب سے بڑی متمدن قوم بن گئی تھی۔ یونان کے عروج و اقتدار کے زمانہ میں کہنا چاہئے کہ جہالت کی تاریکی میں مبتلا تھی۔ ہندوستان، آریاؤں سے قبل جاہل و غیر متمدن اقوام کا مسکن تھا لیکن اسی ہندوستان کی قدیم روایات اس کے عظیم الشان عروج و ترقی اور حیرت انگیز تہذیب و تمدن کو ظاہر کرتی ہیں اور تو اور خود عرب پر اسلام سے قبل ایک ایسا زمانہ گذرا ہے جو اپنی نظیر آپ ہے۔ چنانچہ "جاہلیت عرب" تاریخ کی ایک اصطلاح قرار پائی ہے۔ عرب کی تاریخ طلوع اسلام سے پہلے وحشت و بربریت کی جو مثالیں پیش کرتی ہیں اس کی نظیر دوسری اقوام کی تواریخ میں بے حد تلاش کے بعد مشکل سے مل سکیگی۔ اس اصول فطرت کا ایک زندہ نمونہ موجودہ زمانہ میں آفریقہ خاصکر وسط آفریقہ کی حبشی اور وحشی قوم ہے کیا عجب ہے کہ یہی وحشی قوم رفتہ رفتہ ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے کسی زمانہ میں تہذیب و تمدن کی معراج کمال پر پہونچ جائے جس طرح ہر فرد اپنی ترقی و تربیت کے لئے اپنی سوسائٹی اپنے استاد اپنے عزیزوں اپنے رفیقوں وغیرہ کا ممنون ہوتا ہے بالکل اسی طرح قومیں بھی اپنے عروج و ترقی تہذیب و تمدن کمال و شائستگی کے لئے اپنے ہمسایہ اقوام کی رہین منت ہوکر رہتی ہیں جس طرح ایک فرد اپنی ترقی کے لئے اپنے سے زیادہ تعلیم یافتہ اپنے سے زیادہ عقلمند اور اپنے سے زیادہ تجربہ کار شخص سے استفادہ کرنے پر قدرتاً مجبور ہے۔ اسی طرح قومیں بھی اپنی پست حالت سے نکلنے کیلئے اور تہذیب و شائستگی حاصل کرنے کے لئے اپنے زمانہ کی ترقی یافتہ اقوام سے شرف تلمذ اختیار

کرنے پر مجبور ہیں۔ جاپان جو آج اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کے لحاظ سے دنیا کی ترقی یافتہ اقوام میں ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ نصف صدی ادھر بالکل پست حالت میں تھا۔ اسی یورپ کی شاگردی اور جاپانی قوم کی غیرت اور خودداری نے آج اس کو اس مرتبہ پر پہونچا دیا چین جس کا قدیم تمدن آج بھی اپنی عظمت و شان کے لیے مشہور ہے بہت بڑی حد تک ترقی یافتہ مغربی اقوام کا ممنون احسان ہے۔ ہندوستان جو کسی زمانہ میں روم و یونان کا ہمسر تھا۔ تہذیب و تمدن کے معاملہ میں مغرب کی خوشہ چینی کر رہا ہے۔

ع "دیپے سے دیا یوں ہی جلتا رہا ہے"

کچھ ایسا ہی اٹھنا یا اس سے بڑھ کر ایک زمانہ یورپ پر آچکا ہے۔ تاریکی، جہالت اور ناشائستگی اس وقت نہ صرف یورپ ہی میں پھیلی ہوئی تھی بلکہ دنیا کے اکثر و بیشتر حصے ان کا شکار رہتے۔ علم سے وہ بالکل نا آشنا تھے معاشرت کا یہ حال تھا کہ لکڑی کے مکانات میں رہا کرتے تھے جن کو ڈربہ کہنا زیادہ موزون ہوگا وہ بہت غلیظ ہوتے تھے۔ ان کی زبان ابھی بنی نہیں تھی۔ غسل کرنا ایک گناہ سمجھا جاتا تھا چنانچہ ایک عیسائی راہب نہایت فخر کے ساتھ اپنا حال بیان کرتا ہے کہ ساٹھ سال تک اس نے اپنے جسم کا کوئی حصہ نہیں دھویا سوائے اپنی انگلیوں کے جب اس طرح عیسائی گندگی و جہالت میں پڑے ہوئے تھے مسلمان حد درجہ پاک و صاف رہا کرتے تھے۔ جب ہسپانیہ عیسائیوں کے ہاتھ لگا تو شاہ فلپ دوم نے تمام حماموں کو مسمار کروا دیا۔ برخلاف اس کے مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ وہ نہایت پاک و صاف ستھرے اور پاکیزہ مکانوں میں رہا کرتے تھے۔ تصنیف و تالیف کی گرم بازاری تھی۔ شعر گوئی تو ہر ادنیٰ و اعلیٰ کا مشغلہ تھا۔ صرف قرطبہ کے اندر امیروں کے مکانات پچاس ہزار غربا کے مکانات ایک لاکھ سے زائد اور سات سو مساجد نو سو حمام تھے۔ مسلمانوں کے ذہن بھی ان کے جسموں کی طرح پاک و صاف تھے۔ مسلمان علماء نے ہسپانیہ کو یورپ کا علمی مرکز بنا دیا تھا۔ اور یورپ کے ہر حصہ سے طالبان علم مسلمانوں کے ہاں علم حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔ علم کے ہر شعبہ میں نہایت سنجیدگی و مستعدی سے ترقی کی جاتی۔ اور علم طب کو انہوں نے بہت ترقی دی۔ ابوالقاسم گیارھویں صدی کا مشہور طبیب مانا جاتا ہے۔ عمل جراحی میں اس کو خاص کمال حاصل تھا۔ ابن زہر نے فن جراحی و طب میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے۔ ابن بیطار ماہر نباتیات تھا جس نے تمام مشرق کا سفر کیا ہے اور نباتیات پر ایک نہایت بلند پایہ کتاب بھی لکھی ہے۔ ابن رشد نے فلسفہ روم و یونان کو فلسفہ ازمنہ متوسط سے ملا دیا ہیئت جغرافیہ، کیمیا، سائنس وغیرہ غرض تمام علوم کی مسلمانوں کے ہاں اس وقت پرورش ہو رہی تھی جب کہ اہل یورپ جہالت تعصب اور رسم و رواج کی کڑی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے صرف مسلمان

ہی تھے جنہوں نے تہذیب وتمدن اور علم کی شمع کو بجھنے سے بچا لیا۔ قرطبہ میں زنانہ طبابت بہت عام تھی۔ ریاضیات ہیئت حیاتیات تاریخ فلسفہ اور قانون صرف مسلمانوں ہی کے پاس سیکھے جا سکتے تھے فنون جنگ ابرسانی۔ فن تعمیر فن جہازرانی میں مسلمانوں کو خاص کمال حاصل تھا اور سونے چاندی کے برتن اور چینی کا کام مسلمانوں کے ہاں تو بالکل معمولی چیز تھی ان کے جہاز دنیا کے تمام سمندروں میں پھر رہے تھے۔ یہ تھے مسلمان مگر دنیا کا قاعدہ ہے کہ بعض دفعہ قومیں ان سے سبق سیکھنے کا اعتراف نہیں کرتیں۔ ایسا ہی سلوک مسلمانوں کے ساتھ کیا گیا۔ خلفا نے اہل علم وفضل کو جو عزت دی اپنے ہاتھ سے جو مستند کتابیں لکھوائیں اور جو بڑی بڑی یونیورسیٹیاں کالج انہوں نے کھولے جن کی شاندار عمارتوں کا نہ صرف ہم بلکہ بعض انصاف پسند وحق گو اہل یورپ بھی ماتم کر رہے ہیں۔ اور جن میں انہوں نے فلسفہ، ریاضیات، طب، ہیئت، ادب غرض ہر اس علم کی جس کو آج یورپ نہایت فخر سے اپنا کہہ رہا ہے تعلیم ہوتی تھی۔ اسکی نسبت انگریز مورخ ہرفی (مصنف ہسٹری آف دی محمڈن امپیرانِ اسپین) کہتا ہے کہ میں مسلمانوں کو رومیوں اور یونانیوں سے کسی طرح پیچھے نہیں سمجھتا" اس نے اپنی تاریخ میں اہل اسلام کے وہ احسانات جو انہوں نے یورپ پر کئے ہیں بالتفصیل گنوائے ہیں۔ جس کا کچھ حصہ اور دیگر مورخین کی اسناد ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔

وہ کہتا ہے کہ موجودہ یورپ کے نہ صرف علوم بلکہ فنون بھی عربوں ہی کی شاگردی کا صلہ ہیں جس زمانہ میں مسلمان ہسپانیہ، سسلی اور صقلیہ میں علوم وفنون کے دریا بہا رہے تھے اس زمانہ میں یورپ جہالت کے ذخار سمندروں میں ڈوبا ہوا تھا یونانی اپنے علوم بھول چکے تھے اور رومی عیسائی مذہب قبول کرکے بے علمی کا طوق اپنے گلے میں ڈال چکے تھے نہ صرف مسلمان بلکہ عیسائی مورخین بھی اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ کوئی علم مسلمانوں نے ایسا نہیں چھوڑا جس میں انہوں نے کچھ نہ کچھ ترقی کی ہو اور ان کو اہل یورپ کے سینوں میں نہ بھر دیا ہو جب مسلمان ہسپانیہ، اٹلی، صقلیہ پر قابض ہو گئے تو انہوں نے وہاں کے باشندوں کو مجبور کیا کہ وہ ان کے ساتھ علوم وفنون سیکھیں یہاں تک کہ الوارو نے لاطینی زبان کو فنا ہوتے دیکھ کر عربی زبان میں انجیل وغیرہ کا ترجمہ کر ڈالا۔ عربی زبان اس قدر عام ہو گئی تھی کہ ان ممالک کے تمام باشندے بے تکلف عربی بولا کرتے تھے۔ اور اس طرح سے عربوں کی اعلیٰ تہذیب اور ان کے علوم کا سکہ یورپ پر بیٹھ چکا تھا جس کو موجودہ یورپ کی ترقی کا ابتدائی مرحلہ سمجھنا چاہئے دسویں صدی میں جب کہ یورپ تاریکی میں پڑا ہوا تھا اسپین بیشمار اہل علم کا مسکن بنا ہوا تھا ان میں سے چند لوگوں کے نام یہ ہیں:-

ایتون، اسقف اسونیہ وک، قطلونیہ میں، لوفی طو، برشلونہ میں جو علم ہیئت کا مشہور عالم سمجھا جاتا ہے یوسف عیسائی جو علم حساب میں مستند مانا گیا ہے وغیرہ کا اس قدر شہرہ تھا کہ طالبان علم جرمنی، اطالیہ، انگلستان، فرانس سے جوق جوق ان کے پاس آتے اور عربی زبان کے ذریعہ سے علوم کی تحصیل کرتے۔ چنانچہ جن لوگوں نے اس طرح پہونچکر علم حاصل کیا تھا ان میں سب سے مشہور جربرٹ فلسفی تھا جو بعد میں چلکر اعلی قابلیتوں کے باعث پاپائے روم بن گیا اور اس کے بعد شہنشاہ اس شخص نے جامعہ قرطبہ میں مدت مدید تک مسلمان علماء و فضلا کے آگے زانوئے ادب تہ کیا ہے اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس نے دو کالج کھولے۔ ایک بوبیو ملک اطالیہ میں دوسرا شہر ریم ملک فرانس میں وہ عربی علم ہندسہ کا یورپ میں سب سے پہلا ماہر تھا۔ ان دونوں کالجوں میں ذریعہ تعلیم عربی زبان تھی۔ اور مورخین کا بیان ہے کہ ان علمی سرچشموں سے بے شمار تشنگان علم نے اپنی پیاس بجھائی۔

فلبرٹ اسقف شارترس جربرٹ کا شاگرد تھا۔ جربرٹ نے فلبرٹ کی مدد سے پوپ کا عہدہ حاصل کیا اور بعد میں شہنشاہ سلوسٹر دوم کے نام سے مشہور ہوا۔ شہنشاہ اوتو سوم اور شہنشاہ سلوسٹر دوم نے علوم و فنون کی تبلیغ میں بہت حصہ لیا ہے اس شخص نے بہت سے مدارس کھولدیئے اور عربوں کی کتابوں کو چن چن کر جمع کیا اور ان کا ترجمہ کروایا لوگ اس کو فوق الانسان سمجھتے تھے۔ جربرٹ کی مثال سے لاتعداد انسانوں کے دلوں میں علم کا شوق پیدا کر دیا۔ اور بے شمار لوگ قرطبہ بغداد اور دوسرے اسلامی مرکزوں میں پہونچکر علوم حاصل کرنے لگے اور جو لوگ اپنے کو شریف کہلانا پسند کرتے تھے۔ ان کے لئے لازمی امر تھا کہ وہ عربی زبان سیکھیں اور عربی کتابوں کا ترجمہ کریں۔

مانٹکلا کہتا ہے کہ جو لوگ ریاضی اور سائنس میں شہرت رکھتے تھے وہ سب مسلمانوں کے شاگرد تھے۔ جرارڈ و وائی کریمونا اطالیوں میں سے فلسفہ، طب اور ہیئت کو شہر طلیطلہ کے عربی مدرسہ میں حاصل کیا اور ہیئت کی عربی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ سب سے مشہور انگریز جس نے ہسپانیہ میں مسلمانوں کی شاگردی کی وہ ایڈیلارڈ تھا اس نے طبیعات اور ریاضیات کو عربوں سے سیکھا، اقلیدس اور دوسرے مشہور ریاضی تصانیف کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا بارھویں صدی میں دانیال مارلے ایک انگریز نے ریاضیات کو طلیطلہ میں حاصل کیا۔ جرمنی میں شاہ اوتو اور شہنشاہ فریڈرک ثانی نے اطالوی میں خود کئی کتابوں کا ترجمہ کیا اور لاکھوں روپیہ صرف کر کے مشہور عربی کتابوں کا ترجمہ کروایا۔ یورپ کے زمانہ تاریکی یعنی ازمنہ متوسطہ میں سب سے پہلا

طبی کالج شہر سیلرنو واقع نیپلس میں کھولا گیا اور اس مدرسہ میں عربی تعلیم ہوتی تھی۔ ان کے پاس سوائے عرب ڈاکٹروں کی کتابوں کے دوسری کتاب موجود ہی نہ تھی۔ یونانی اپنے علوم بھول چکے تھے اور یہودی عربوں کی شاگردی کر کے بہت نام پیدا کر رہے تھے۔ علم ہیئت پر عربوں نے بہت سے احسانات کئے اور بیلی صاحب کہتے ہیں کہ محمد کی کتابوں نے اس فن پر خاص احسان کیا ہے۔ الفانسو دہم شاہ قسطلہ نے جو علماء ہیئت میں خاص مرتبہ رکھتا ہے اس علم کے حاصل کرنے کے لئے طلیطلہ میں سکونت اختیار کی اس نے جو جدول ہیئت کی ترتیب دی ہے اس سے اس علم میں بہت آسانی پیدا ہوگئی مشہور انگریز فلسفی روجر بیکن نے عربی زبان میں فلسفہ، ریاضیات طبیعات، ہیئت، طب وغیرہ کی تعلیم حاصل کی اور اس کی تصانیف میں الخازن کا نام مختلف جگہ ملتا ہے جس نے تصریحات علم میں بہت نام حاصل کیا ہے اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس نے الخازن کی کتابوں کا ترجمہ کر کے ان پر حواشی لکھے ہیں جو شہر پیشہ کا باشندہ تھا۔ جبر و مقابلہ اور علم حساب کو جو اس نے عربوں سے حاصل کیا تھا اٹلی میں فروغ دینے لگا۔ ارنالڈ جو ویلانوا کا باشندہ تھا عربوں سے ان تمام علوم کو حاصل کیا جن کے لئے وہ مشہور ہے خصوصاً طبیعات ہیئت اور طب اور رفیرشش جس نے اس کے بہت زمانہ بعد اٹلی میں نام پیدا کیا۔ اپنی تصانیف میں لکھتا ہے کہ میں عربوں کا شاگرد ہوں خصوصاً ابوالقاسم اور اس کی تصانیف میں رطب اللسان ہے۔

ہورٹ بڑے دعوی سے کہتا ہے کہ فلسفی ڈیکارٹ اپنے مشہور قانون و آئین .... کے لئے عربوں کا ممنون ہے۔ بیلی دعوی کرتا ہے کہ نورالدین بتروشی درحقیقت کیپلر کے قانون ہیئت کا مکشف ہے، غرض ہم بلا کسی مبالغہ کے کہہ سکتے ہیں کہ یورپ عربوں کا بہت ممنون احسان ہے اور انہی کی وجہ سے عیسائیوں نے اپنے دینیاتی مسائل کو علم دینیات کہلانیکا مستحق ٹھیرایا اگرچہ مذاہب فلسفہ دوسری صدی عیسوی میں بھی موجود تھے مگر جب تک کہ مسلمانوں نے یورپ پر فلسفہ ارسطو و دیگر فلاسفہ پر اپنے اعتراضات کر کے ان کے مذاہب کو اہل یورپ تک نہیں پہونچایا اس وقت تک ان کا علم دینیات کوئی چیز ہی نہ تھا۔ نویں صدی میں حکومت ارگان نے اپنا قانون تیار کیا مگر عربوں ہی کی مدد سے برشیلونہ اور قسطلہ والوں نے عربوں کی مدد سے اپنا قانون تیار کیا مرفی اپنی تاریخ (ہسٹری آف دی محمڈن امپائر ان اسپین) میں اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ شاعری کے عروض و قوافی بھی عربوں کی ایجاد ہے۔ ہم اس جگہ پر ان کے خیالات نہیں لکھ سکتے کیونکہ مضمون طویل ہو جائیگا۔ اس زمانہ میں مسلمان علوم و فنون کے لئے بہت مشہور ہو چکے تھے

ادب و دیگر فضلا مسلمانوں کے درباروں میں رہکر عیسائی شہزادوں کے ہاں چلے جاتے جہاں ان کی بہت عزت ہوتی اور اس طرح مسلمانوں کی لطافت پسندی اور تہذیب وغیرہ عیسائیوں میں پھیلتی جاتی تھی۔ انڈریس کہتا ہے کہ نیوٹن کا قانون کشش نقل محمد بن موسی الخوارزمی ماہر ریاضیات کا دریافت کیا ہوا ہے۔ گر مورخ موصوف کہتا ہے کہ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ نیوٹن نے محمد بن موسی کی کتاب سے اخذ کیا بلکہ یہ بہت ممکن ہے کہ اس نے محمد بن موسی کی تصانیف کا مطالعہ ہی نہ کیا ہو۔ کیا ہم ان تمام واقعات کی موجودگی میں یہ کہنے کے مجاز نہیں ہیں کہ موجودہ یورپ درحقیقت عربوں کا شاگرد ہے اور اس شاگردی کو کسی زمانہ میں باعث فخر و ناز سمجھا کرتا تھا۔

ازمنہ متوسط میں یورپ میں نہایت چھوٹے اور غلیظ شہر ہوتے تھے اور کوئی شخص سفر کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا کیونکہ چوری وغیرہ کا خوف لگا رہتا تھا مگر مشرق میں قاہرہ، بغداد، دمشق، وغیرہ مشہور شہر تھے جن میں سنگ مرمر کے محلات بڑی بڑی تجارتی منڈیاں، بڑی بڑی یونیورسٹیاں کالج اور وسیع و خوبصورت بازار اور باغات تھے۔ ملک میں آبرسانی کا بہت اچھا انتظام ہوتا تھا اور لوگ شائستہ و خوش حال تھے۔ دنیا کے دور دراز ملکوں کے ساتھ تجارت کی جاتی تھی۔ عیسائیوں کو خود اس بات کا احساس تھا کہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں نہایت وحشی و حقیر ہیں۔ اور وہ اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ مسلمانوں کے برابر ہو جائیں۔ گیارھویں صدی میں مشرق و مغرب ایک دوسرے سے واقف ہونے لگے، اور وحشی عیسائی مہذب مسلمانوں کے ملکوں میں گھسنے لگے اور وہ دو طریقوں سے جنگ اور تجارت۔ جب عیسائیوں کو حروب صلیبیہ یعنی صلیبی جنگوں میں مسلمانوں سے ناکامیابی ہوئی تو یہ استفادہ کا خیال تجارت کی خواہش کی صورت میں رونما ہوا (یہ اہل یورپ کا ہمیشہ سے قاعدہ رہا ہے کہ پہلے پہل کسی ملک میں نشان تجارت بلند کئے ہوئے داخل ہوتے ہیں) وہ ان ممالک سے کئی قسم کے مصالحے، کھانے، پینے کی اشیاء، سونے، چاندی کی چیزیں، کپڑے، مخمل، شکر، کاغذ، ہاتھی دانت، ریشم وغیرہ جو وہاں مل سکتے ہیں، اپنے ملکوں کو تجارت کے بہانے لیجانے لگے اور یہ چیزیں یورپ میں بہت مقبول ہوئیں۔ اطالوی تو ان چیزوں کی تجارت میں بہت پیش پیش تھے اور اسی وجہ سے وہ بے حد دولت مند بھی بن گئے تھے۔ وینس، جینوا، پانزا وغیرہ ان تاجروں کے مرکز تھے۔ اور رونق میں یورپ کا کوئی شہر ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ عیسائیوں نے مسلمان بادشاہوں کے دربار میں رسوخ حاصل کئے اور ان سے تجارتی فرامین حاصل کر کے بہت دولت مند ہونے لگے۔ اس طرح سے جو لوگ لوٹنے کی خاطر سے گئے تھے وہ تاجر ہو گئے اور تمام یورپ کے لئے اطالیہ ایک تجارتی منڈی کا کام دینے لگا

وہ لوگ جو نشاۃ جدید کی تاریخ سے واقف ہیں جانتے ہیں کہ نشاۃ جدید یورپ کا آغاز اطالیہ سے ہوا سینو باس مورخ کا خیال ہے کہ اس طرح سے مشرقی تہذیب مغرب میں منتقل ہو رہی تھی اور یورپ مہذب ہوتا جا رہا تھا

ایجادات

بارود کی ایجاد چینیوں میں پہلے ہی ہو چکی تھی مگر وہ زیادہ تر آتشبازی کیلئے استعمال ہوتی تھی۔ مگر مسلمانوں نے اصلی بارود بنائی اور اس ایجاد سے انہوں نے نلکیوں میں سے وزنی اشیاء پھینکنے کا کام لیا۔ اہل یورپ نے ۱۳۲۵ء میں اس کی نقل تاری اور شہر فلارنس میں لوہے کی توپ کے گولے بنائے گئے اور یہ ایجاد تمام یورپ میں پھیل گئی قطب نما یا مار نیبرس کمپاس کا اصول عربوں نے ہی دریافت کیا اس سے فن جہاز رانی میں جان پڑ گئی یہاں یہ بات توجہ کے قابل ہے کہ اہل یورپ جو سمندروں سے بہت ڈرا کرتے تھے جب ان کو قطب نما کا اصول معلوم ہو گیا تو پہلے پہل پرتگالیوں و لندیزوں اور فرانسیسیوں نے سمندروں میں سفر کرنا شروع کیا اور یہ معلوم کرکے ان کو بڑا تعجب ہوا کہ عربوں کے قدم مالابار، سیلون (لنکا) جاوا بورنیو، سیلوبس، ملاکس وغیرہ ممالک میں ان سے بہت پہلے پہونچ چکے ہیں نہ صرف پہونچ چکے، بلکہ وہاں کے اکثر باشندوں کو مسلمان بنا چکے ہیں۔

کاغذ کی ایجاد

یورپ میں عربوں نے کاغذ سازی کو ترقی دی جس کو انہوں نے دریافت کیا تھا۔ کاغذ کی ایجاد نے بھی یورپ کی ترقی میں جو حصہ لیا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

ممالک کی دریافت

ازمنۂ متوسطہ میں یورپ کے تاجر مصر، شام، ایشائے کوچک وغیرہ سے اپنی تجارت کیا کرتے تھے مگر جب ان ممالک پر سے عربوں کا اقتدار اٹھ گیا اور ترک قابض ہو گئے تو اہل یورپ ان کو اپنے راستہ میں حائل اور نفع کا شریک سمجھنے لگے اور اور اس وجہ سے ان کو اپنی نفع بخش تجارت کے ضایع ہونیکا بہت شبہ ہونے لگا اسی لئے انہوں نے کوئی نیا راستہ ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کی جس سے وہ ہندوستان اور دیگر مشرقی ممالک تک پہونچکر تجارت کر سکتے تھے۔ چنانچہ کولمبس، واسکوڈی گاما، جان لیبوٹ وغیرہ نے اسی دھن میں مدتوں سمندر کا سفر کیا اور آخر کار جنوبی آفریقہ کے راس امید تک پہونچ گئے۔ ادھر کولمبس نے امریکہ اور جزائر غرب دریافت کئے۔ اگر ترکوں ان ممالک پر قبضہ نہ کیا ہوتا اور اہل یورپ کی تجارت نہ رکتی تو آج یورپ کو یہ برتری کیسے حاصل ہو سکتی؟ یہ بھی ان پر اسلام کا ایک احسان ہے گو بلا واسطہ ہی ہے کیونکہ

وہ ہندوستان پر قابض ہونے کے قابل ہو سکے اور جزائر شرق الہند، برما، چین اور خود چین کو اپنا غلام بنا لیا۔ کون نہیں جانتا کہ یہ ممالک یورپ کو ہر لحظہ مالا مال کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر آج یورپ کے قبضے سے یہ ممالک اور مقبوضات نکل جائیں تو وہ پھر یہ یورپ نہ رہے۔ ایک کا نقصان دوسرے کا فائدہ ہے۔ انگلستان کی عظمت، فرانس کی شوکت، امریکہ کی تجارت سب کچھ انہیں مقبوضات کے غناؤ پر مبنی ہیں۔ غرض مسلمانوں نے مست خواب یورپ کو ہر طریقہ سے جگایا یا علمی فتوحاتی، تجارتی، صنعتی، ذہنی سبق پڑھائے اور ان کو جہالت وحشت کے تاریک گڑھے سے نکال کر تہذیب و شائستگی کی شاہراہ پر چھوڑا۔ ممکن ہے کہ مسلمان اہل یورپ کے دانا دشمن رہے ہوں۔ مگر ہم جب تک نتائج کو دیکھ کر رائے دیتے رہیں گے اس وقت تک ہم کو یہی کہنا پڑیگا کہ یورپ مسلمانوں کا بے حد ممنون ہے اس میں شک نہیں کہ یورپ نے اپنی جدت طبع سے بعض خصوصیات عجیب و غریب اور ما بہ الامتیاز پیدا کر لی ہیں لیکن خود ان کے غیر متعصب علماء کو اقرار ہے کہ وہ مسلمانوں کے بڑی حد تک منت پذیر ہیں۔ یہ سب کچھ نتیجہ ہے نشاۃ ثانیہ کا اور یہ نشاۃ ثانیہ جس کے پیدا کرنے والے زیادہ تر مسلمان ہی تھے اور جس کے نتائج ایسے چلکر نکلے جس کی وجہ سے آج یورپ دنیا کے بڑے حصہ پر قابض ہے۔

کلام اعظم

جناب ڈاکٹر اعظم کریوی صاحب سابق ایڈیٹر اکبر الہ آباد

راز قدرت کا جو میں جاننے والا ہوتا — تو مسجد کہیں ہوتی نہ شوالا ہوتا

وہ بھی روتے مرے احباب بھی روتے سنکر — اتنا پُر درد شب غم کہیں نالا ہوتا

ہائے یہ موسم گل، عارض گل، جلوۂ گل — کاش ایسے میں مرا گیسوؤں والا ہوتا

کوئی ملتا جو مجھے دشت وفا کا ساتھی — آبلہ پا وہ مرے پاؤں کا چھالا ہوتا

ہر جگہ تو ہے کہیں بھی تری تخصیص نہیں — تجھ کو پاتا جو کہیں ڈھونڈنے والا ہوتا

سیکڑوں دل میں ہیں ارمان نکلنے کے لئے — کوئی ارمان مرا تم نے نکالا ہوتا

شاعری میں تری آتا نہ مزا اے اعظم
تو نے الفت کا اگر روگ نہ پالا ہوتا

(۱)

پردہ

(از جناب آبرو بیگم صاحبہ سکریٹری لیڈیز کلب بھوپال)

یہ مضمون گزشتہ آل انڈیا مسلم لیڈیز ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ حیدرآباد دکن میں پڑھا گیا تھا۔ مسلمان عورتوں سے متعلق ایک مسئلہ پر خود انہیں میں سے ایک قابل بی بی کی یہ رائے ہے جس پر نہایت فصاحت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ کانفرنس کی سکریٹری صاحبہ نے براہ مہربانی یہ مضمون "مکتبہ" میں شائع کرنے کے لئے ارسال فرمایا ہے (مجلہ مکتبہ)

اس وقت نمبر (۵۱) کا رزولیوشن متعلق پردہ پیش ہے اور یہ مطبوعہ رزولیوشن مجھے حیدرآباد پہنچنے پر عین اجلاسوں میں ملے ورنہ میں اس پر بہت کچھ مدلل اظہار خیالات کرتی کیونکہ یہ ایک ایسا پیچیدہ مسئلہ ہندستان میں پیش ہے کہ مخالفین پردہ نے مغربی تقلید کا نام بھی شرعی پردہ رکھا ہے اور حامیان پردہ بھی اپنے رائج پردہ کو شرعی پردہ کہتے ہیں یہ تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے جہالت سے اس مذہبی پاک اور جائز آزادی پر جو سختی رائج کی وہ صریحاً مذہب پر افترا ہے اور حد شرعی سے تجاوز کسی مسئلہ میں بھی کرنا جرم اور قابل نفرت حرکت ہے۔ لیکن مذہبی حدود سے آگے قدم رکھنا بھی اسی طرح گناہ ہے۔

اگر ہندوستان کی وہ جماعت جس نے پردہ کو حدود شرعی سے بھی مزید تر سخت کر رکھا تھا۔ ضلالت پر تھی اور ہم ان کے ستم کے نالاں رہے تو اب یہ جدید فرقہ بھی صریح غلطی پر ہے جو حدود شرعی کی جائز آزادی سے کہیں بڑھ کر گامزن ہے تو پہلے سے زیادہ ہم اتم کناں ہیں کہ ہم کو مذہب کے تحت سے بھی باہر کر کے ذلیل اور تباہ عقبےٰ کرنے کا ہمارے حامیوں کا ارادہ ہے۔

خواتین! خال کو شاعران نازک خیال ہمیشہ حسن محبوب میں تشبیہ دانہ مرغ دل سے تعبیر کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب خال بڑھ جاتا ہے تو مسّہ کہلاتا ہے کہ۔

جو کوئی حد سے بڑھا اُسکی خرابی آئی   خاک پر لوٹتے ہیں یار کے گیسو بڑھ کر

جب تک ہمارا نشان قومی اسلام ہے اور آپ ہم مسلمان کہلاتے ہیں تو قرآن حکیم کی آیات اور احادیث ہمارا ایمان ہے۔

مخالفین پردہ بآواز بلند اعلان کر رہے ہیں کہ قرآن حکیم میں صرف ایک آیت پردہ کے متعلق ہے۔ جس کو ہمارے علمائے سلف نے اپنے مفہوم کی غلطی سے غریب صنف نازک پر سخت کر دیا۔ ورنہ

اسلام نے عورتوں کو ویسی ہی متجاوز آزادی بے پردگی جنس مذکور سے اختلاط اور میل جول کا حکم دیا ہے جیسا کہ غیر قوم میں مستحسن ہے اور مغربی خواتین کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش جاری ہے۔

اس لئے میرا یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ قرآن میں متعدد مقام پر ہمارے پردہ کا ذکر ہے اور میری مسلمان بہنیں اور بھائی کسی طرح بھی کلام ربانی سے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ پردہ کی اسلامی حقیقت کیا ہے اور پردہ کے شرعی حدود واضح کیا ہیں تا کہ یہ نافہمی دور ہو جائے کہ قرآن حکیم میں صرف ایک آیت ہے حالانکہ متعدد آیتیں ہمارے لئے شمع ہدایت ہیں۔

خواہران عظام!

پردہ یا حجاب ایک قرآنی قانون ہے جو امت اسلامیہ کے طبقہ نسوان کو حق تعالیٰ جل شانہٗ کی طرف سے اس لئے سپرد کیا گیا ہے کہ ایک قانون کے ذریعہ سے وہ اپنی قدرتی عزت اور وقار کی ذاتی قدر و قیمت اور ان اعلیٰ خصوصیات و کمالات اور قیمتی جذبات و سعادات کی حفاظت و تعظیم کر سکیں جو بطور پیدائشی حقوق کے اُن کو خدا کی جانب سے ملے ہیں۔ آج اسلامی گھرانوں میں زوجین کے باہمی تعلقات تعمیر اعتماد و اطمینان کے جن مضبوط چٹانوں پر قائم ہیں ایسا اعتماد و اطمینان جو ہر قسم کے آلائشوں اور بدگمانیوں سے مصفا اور پاک ہے زیادہ تر وہ اسی الٰہی قانون کے پاکیزہ نتائج ہیں الحاصل چند در چند روحانی۔ اخلاقی۔ معاشرتی بلکہ جسمانی و طبعی اغراض و مقاصد کو سامنے رکھکر کسی مرد و عورت نے نہیں بلکہ عورتوں اور مردوں کے خالق اور بنانے والے نے قوانین کا ایک مجموعہ عورتوں کو عطا فرمایا ہے جس کی اجمالی تعبیر پردہ یا حجاب سے کیجاتی ہے۔ اس وقت یہ موقع نہیں ہے کہ قانون کے عقلی پہلوؤں سے بحث کیجائے اس لئے اُن اغراض کی تفصیل سے قطع نظر کرتے ہوئے اس وقت صرف ترتیب کے ساتھ ان قوانین و احکام کو بیان کرتی ہوں جو براہ راست اسلامی مستند کتابوں قرآن و حدیث و فقہ سے حاصل کئے گئے ہیں۔

میں عورتوں کو صرف بتانا چاہتی ہوں کہ پردہ اور اس قسم کے جتنے اسلامی قوانین ہیں یہ مردوں نے عورتوں پر زبردستی یا ان کو کمزور پاکر عائد نہیں کئے ہیں۔ میں اس کو نسوانی عقل و حمیت۔ شرافت و بزرگی پر بدترین حملہ سمجھتی ہوں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ جس طرح الٰہی احکام و فرامین کے براہ راست خطاب کے مستحق اپنے کو مرد سمجھتے ہیں کوئی وجہ نہیں کہ خطاب کے اس شرف و امتیاز سے عورتوں کو محروم کیا جائے۔ مرد اگر خدا کے بندے ہیں تو ٹھیک اسی طرح عورتیں بھی خدا کی بندیاں ہیں اور مذاہب میں کچھ تفریق و امتیاز کیا گیا ہو تو کیا گیا ہو لیکن قرآن عظیم کا اعلان عام ہے۔

اِنِّی لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی بَعْضُکُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ

یعنی میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل اور کام کو برباد نہ کروں گا وہ مرد ہوں یا عورت۔ تم میں سے بعض بعض سے پیدا ہوئے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّهٗ حَیٰوةً طَیِّبَةً وَلَنَجْزِیَنَّھُمْ اَجْرَھُمْ بِاَحْسَنِ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۚ

جو نیک کام کریگا مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان والے ہوں تو میں انہیں پاکیزہ زندگی کے ساتھ زندہ رکھونگا اور ان کے کاموں کی اجرت عطا کرونگا۔

قرآن عظیم اس قسم کے آیات سے معمور ہے بہر حال اب میں اس مسئلہ کی طرف آپ کو متوجہ کرتی ہوں۔ بات یہ ہے کہ انسانی زندگی کے اور بہت سے شعبے ہیں اور ہر شعبہ کے متعلق اسلام میں مختلف مسائل ہیں ان میں چند مسائل یہ بھی ہیں۔

(۱) انسانوں کے باہمی میل جول یا سوسائٹی کا کیا اصول ہونا چاہیئے۔

(۲) مردوں اور عورتوں کے لباس کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے۔

(۳) گھر میں رہنے اور باہر نکلنے میں کن ضوابط کی پابندی کرنی چاہیئے۔

ان مسائل یا سوالات کا تعلق صرف عورتوں سے نہیں ہے بلکہ مردوں سے بھی ہے ان کے متعلق تفصیلی احکام شریعت میں موجود ہیں البتہ ان ہی مسائل کے وہ دفعات جنکا تعلق عورتوں سے ہے ان کی اجمالی تعبیر ادب میں لفظ پردہ یا حجاب سے کیجاتی ہے۔ لوگ عموماً پردہ کے ان تفصیلی اجزاء و قوانین سے کسی ایک جزو یا قانون کو لے کر الجھ پڑتے ہیں ہر ایک کے سامنے چونکہ ناقص مواد ہوتا ہے۔ اس لئے صحیح نتیجہ تک پہنچنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ ہر دفعہ کے متعلق اسلامی تصریحات کو جدا جدا عنوان میں آپ کے سامنے پیش کرتی ہوں۔

فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ (قرآنی آیت)

یعنی جس کا دل چاہے یقین کرے اور جسکا دل چاہے انکار کرے

(۱) میل جول یا سوسائٹی کا مسئلہ۔

سوال یہ ہے کہ جس طرح مرد مرد سے اور عورتیں عورتوں سے ملتی جلتی ہیں کیا ٹھیک اسی طرح ان ہی آداب و مراسم کے ضوابط کے تحت عورتوں کو اجنبی مردوں سے ملنے کی اجازت ہے یہ سوال یوں بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایک ماں جس طرح اپنے بیٹے سے اور ایک بیٹی اپنے باپ سے

ایک بہن اپنے بھائی سے یا ایک بیوی اپنے شوہر سے جسطرح ملتی ہے کیا اسی طرح وہ ہر غیر محرم اجنبی مرد سے مل سکتی ہے۔ کسی متعصب تنگ نظر۔ ظالم مرد کا نہیں بلکہ عورتوں کے خالق رحمٰن و رحیم کے ارشادات و ہدایات کا شرف جس طرح مردوں کو حاصل ہے اسی طرح عورتوں کو بھی ہے۔

اُن احکام کے تصریحات ملاحظہ فرمائیے۔

اول۔ حکم ہے کہ مردوں کی نگاہ عورتوں سے اور عورتوں کی نگاہ مردوں سے علیحدہ رہے قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوا مِنْ اَبْصَارِهِمْ — ایمان والے مردوں سے کہو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں
وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ — اور ایمان والی عورتوں سے کہو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔

بینائی کے احساس کو باہم ایک دوسرے سے جدا رکھنے کی شرح اس حدیث میں ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المومنین۔ ام سلمہ اور میمونہ رضی اللہ عنہا کو ایک نابینا سے اپنی نگاہ کو جدا رکھنے کا حکم دیا ہے۔ ابوداؤد و ترمذی میں اس حدیث کا مشہور جملہ یہ ہے کہ حضور نے عورتوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔

اَفَعَمْيَاوَانِ اَنْتُمَا اَلَسْتُمَا تُبْصِرَانِهٖ — کیا تم دونو عورتیں بھی اندھی ہو۔ کیا تم اُسے نہیں دیکھتی ہو

یہ ارشاد نبوی اس موقع پر ہوا تھا جبکہ ام مکتوم صحابی نابینا حضور کے پاس حاضر ہوئے۔ اپنی بیویوں سے فرمایا تم ہٹ جاؤ۔ بیویوں نے کہا کہ یہ تو اندھا ہے ہم کو کیا دیکھیگا۔ تو آپ نے فرمایا تم تو اندھی نہیں ہو۔

(۲) نہ صرف نگاہ کے واسطے بلکہ قرآن پاک میں یہ بھی حکم ہے کہ اپنے زیورات کے آواز کو بھی مردوں کے کانوں سے بچاؤ۔ ارشاد ہے۔

وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ — یعنی عورتیں اپنے پاؤں زور سے نہ رکھیں جس سے زینت ظاہر نہ ہو جائے یعنی ان کے پازیب وغیرہ کی آواز مردوں کے کان میں نہ پہنچے۔

(۳) صرف بینائی اور شنوائی کے ہی احساسات نہیں بلکہ حدیث صحیح میں بتصریح موجود ہے کہ عورتیں اپنی خوشبو کو بھی مردوں کی ناک سے جدا رکھیں۔

حدیث شریف میں ہے کہ

اَيُّمَا امْرَاَةٍ اسْتَعْطَرَتْ فَمَرَّتْ — یعنی ہر وہ عورت جس نے عطر لگا ہو وہ مردوں کے

عَلٰی قَوْمٍ لِیَجِدُوْا رِیْحَهَا فَهِیَ زَانِیَةٌ — پاس سے گزرے تاکہ اُس کی خوشبو وہ لوگ محسوس کریں تو ایسی عورت زانیہ ہے۔

(۴) جب دور کے احساسات و تاثیرات کے متعلق اتنے احکام ہیں تو اُن سے سمجھا جا سکتا ہے کہ باہم اجنبیوں کا ایک دوسرے سے مصافحہ کرنا اور اُن کے چھونے کی اسلام نے کیسی سخت ممانعت کی ہو گی حدیث پاک میں صاف موجود ہے۔ آپ نے فرمایا کہ۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاَنْ يُّطْعَنَ فِيْ رَأْسِ اَحَدِكُمْ بِمِخْيَطٍ مِّنْ حَدِيْدٍ خَيْرٌ لَّهٗ مِنْ اَنْ يَّمَسَّ امْرَأَةً لَا تَحِلُّ لَهٗ رواہ الطبرانی و بیہقی یعنی تم میں سے کسی کے سر میں سوئی چبوئی جائے تو بہتر ہے اس سے وہ کسی ایسی عورت کو چھوئے جو اس کے لئے حلال نہیں ہے۔ الغرض ان نصوص کا صاف و صریح اقتضا یہ ہے کہ اجنبی عورتیں غیر محرم مردوں سے جس حد تک جدا رہ سکتی ہیں اُن کو جدا رہنا چاہئے اُسکا خلاصہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی اس روایت میں ہے جو حضرت علیؓ سے مروی ہے۔

عَنْ عَلِيٍّ اَنَّهٗ كَانَ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَيُّ شَيْءٍ خَيْرٌ لِّلْمَرْاَةِ فَسَكَتُوْا قَالَ فَلَمَّا رَجَعْتُ قُلْتُ لِفَاطِمَةَ اَيُّ شَيْءٍ خَيْرٌ لِّلنِّسَاءِ قَالَتْ لَا يَرَيْنَ الرِّجَالَ وَلَا يَرَوْنَهُنَّ فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِّنِّيْ۔

حضرت علی سے مروی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے۔ حضور نے پوچھا کہ عورت کے لئے سب سے اچھی بات کونسی ہے۔ لوگ چپ رہے۔ حضرت علی فرماتے ہیں کہ جب میں گھر آیا حضرت فاطمہ سے اس سوال کا ذکر کیا آپ نے فرمایا کہ عورتوں کے لئے سب سے بہتر یہ ہے کہ نہ مرد عورتوں کو دیکھیں نہ عورتیں مردوں کو دیکھیں۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ حضرت علیؓ نے حضور سرور کائنات سے ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا کہ فاطمہ میرے بدن کا ایک حصہ ہے۔

بہر حال اجنبی عورتوں اور مردوں کے باہمی میل جول کے اصل احکام یہی ہیں اور مسلمانوں کی شریف عورتیں جو اسلامی احکام اور قرآنی قوانین کی پابند ہیں ان کا ابتداء اسلام سے اس وقت تک ان ہی احکام پر عمل رہا ہے جس کی بنیاد نہ کسی ملک کے رواج نہ کسی غیر قوم کی تقلید پر قایم ہے بلکہ قرآن و حدیث کے بالکل کھلے ہوئے الفاظ کی اطاعت ہے۔ مثلاً اگر کسی اجنبی مرد کو کسی اجنبی عورت سے کوئی چیز مانگنی ہو یا لین دین کا معاملہ ہو تو حکم ہے۔

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَاسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ — جب تم عورتوں سے کوئی چیز مانگو تو پردہ کے نیچے سے مانگو۔ تمہارے اور اُن کے لئے

وَ قُلُوْ بِھِنَّ

پاک طریقہ ہے۔

عورت کو بضرورت مردوں سے گفتگو کرنے کی اجازت ہے لیکن قرآن پاک نے اس میں شدید ترما لگا دی ہے کہ انہیں مردوں سے نرم اور شیریں لہجہ میں گفتگو نہ کرو بلکہ اس میں سختی ہونی چاہیئے۔ وہ آیات یہ ہیں۔

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ — یعنی بات کرنے میں نرمی نہ کرو ورنہ جس کے دل میں بیماری ہے وہ لالچ کرے گا۔

علاج و معالجہ کے موقع پر اجازت ہے کہ طبیب عورت کے اُس مقام کو دیکھ اور چھو سکتا ہے جہاں مرض ہو۔ مثلاً ہڈی ٹوٹ گئی ہو یا پھوڑا نکلا ہو۔ اسی طرح دینی ضروریات کے لئے اس قانون میں نرمی پیدا کی گئی ہے۔

مثلاً حج کے موقع پر عورتوں کو اجازت ہے کہ مردوں کے ساتھ طواف وسعی و وقوف کریں تاہم جہاں تک ہوسکے عورتوں کے مجمع کو مردوں سے دور اور الگ رکھا جائے۔

مساجد اور عیدگاہ کی جماعت میں حاضر ہونے کی اجازت تھی اس کے ساتھ حکم تھا کہ عورتیں بچوں کی صف سے بھی پیچھے رہیں کہ اَخِّرُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَخَّرَهُنَّ اللّٰهُ

یعنی عورتوں کو پیچھے رکھو جب کہ خدا نے ان کو پیچھے رکھا۔ مگر یہ حکم بضرورت تھا اس لئے کہ نماز کے متعلق اصل حکم عورتوں کے واسطے سرورِ کائنات کا یہ تھا کہ اَلصَّلٰوةُ الْمَرْأَةِ فِي بَيْتِهَا اَفْضَلُ مِنْ صَلٰوتِهَا فِي حُجْرَتِهَا وَصَلٰوتُهَا فِي مَخْدَعِهَا اَفْضَلُ مِنْ صَلٰوتِهَا فِي بَيْتِهَا۔ رواہ الطبرانی

یعنی عورت کی نماز کوٹھری میں بہتر بہ نسبت گھر کے صحن کے اور کوٹھری در کوٹھری کی نماز بہتر ہے کوٹھری کی نماز سے۔ اس لئے قرنِ اول ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ لَوْ رَاَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اَحْدَثَ النِّسَاءُ لَمَنَعَهُنَّ عَنِ الْمَسَاجِدِ۔ (رواہ مسلم) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملاحظہ فرماتے ان باتوں کو جو عورتوں نے پیدا کی ہیں تو اُن کو مسجد میں آنے سے روک دیتے۔

لہٰذا جوان عورتوں کو مسجد میں آنے سے روک دیا گیا۔ بہرحال جو کچھ ہوا ابتداء اسلام میں ہوا عرب میں ہوا قرنِ اول میں ہوا۔

عورت اگر جوان ہے تو اس کو چاہئے کہ اپنے گریباں کو اوڑھنی سے اچھی طرح ڈھانک لے اور اپنے بناؤ سنگار زیب و زینت کی چیزوں کو ظاہر نہ کرے۔ قرآن پاک میں ہے۔

(۱) وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ ۔ عورتیں اپنا بناؤ سنگھار ظاہر نہ کریں۔ اپنے گریبانوں

(۲) وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ کو اوڑھنی سے ڈھانک لیں۔

کس چیز سے۔ اس کی تصریح بھی قرآن پاک نے کر دی ہے کہ جلباب (بڑی چادر سلی ہو یا بے سلی) اپنے اوپر ڈال لے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ اے نبی اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مومنین کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر چادر ڈال لیا کریں۔

قرآن کا جلباب یہی ہے جو سل کر اس زمانہ میں برقعہ ہو گیا ہے۔ اور یہ سلی چادر (برقعہ) کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اس کا رواج عہد رسالت میں بھی تھا۔ ابو داؤد میں ہے کہ "ام خلاد" ایک عورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نقاب ڈال کر آئی۔ اس کا لڑکا شہید ہو گیا تھا۔ لوگوں کو تعجب ہوا کہ اس کا بیٹا مارا گیا لیکن اسے اپنی نقاب کی پڑی ہوئی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ "اگر مجھ پر بچہ کی مصیبت آئی ہے تو میری حیا و شرم پر تو مصیبت نہیں آئی ہے"۔

حدیث میں ایسے آثار بہ کثرت مل سکتے ہیں جن سے عہد نبوت میں نقاب اور برقعہ کا رواج ہونا ثابت ہو سکتا ہے۔

یہ تو جوان عورتوں کے بیرونی لباس کا اصل حکم تھا۔ عورت اس لباس پر کس حد تک اضافہ کر سکتی ہے۔ اس اضافہ کی اسلام نے کوئی حد مقرر نہیں کی ہے جیسا کہ صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ "عورت چھپانے کی چیز ہے۔" عورت جس قدر بھی چھپا سکتی ہو اپنے آپ کو چھپائے۔ لیکن ضرورت پر نظر کرتے ہوئے خدائے تعالیٰ نے اس قانون کو نرم کر دیا ہے۔

اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا ؕ لیکن سنگھار میں سے جو خود کھل جائے۔

مطلب یہ ہے کہ عورت زیب و زینت کو جہاں تک ممکن ہو چھپائے لیکن اگر زینت کا کوئی حصہ خود بخود کھل جائے تو مضائقہ نہیں۔ "خود بخود کھل جانا" ایسی چیز ہے جس کی بنیاد ان مشاغل کی نوعیت پر ہے جن میں عورت مصروف ہو۔ مثلاً ایک امیر عورت گھر سے صرف اس لئے نکلتی ہے کہ ایک مکان سے دوسرے مکان میں چلی جائے اس وقت وہ زیادہ سے زیادہ جس چیز کے کھولنے پر مجبور ہے وہ محض آنکھ ہو سکتی ہے تاکہ راستہ دیکھتی جائے۔ اسی طرح ایک مزدور عورت بازار سے سودا اناج یا کنوئیں سے پانی لانے کو گھر سے نکلتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کاموں کو صرف آنکھ کھولنے سے وہ انجام

نہیں رہ سکتی لہٰذا بعض صحابہ مثلاً عبداللہ بن مسعود۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور فقہائے حنفیہ نے بیرونی لباس کی حد یہ مقرر کی ہے کہ ان حالتوں میں عورت چہرہ اور ہتھیلیوں کو کھلا رکھ سکتی ہے۔ امام ابوحنیفہ نے اس میں "دونوں پاؤں" کو بھی شریک کر لیا ہے۔ اور قاضی ابو یوسف نے بازو کے نیچے ہاتھ کا جو حصہ ہے اس کے کھولنے کی بھی اجازت دی ہے۔ یہ تمام باتیں فقہ کی عام کتابوں میں موجود ہیں جو مختلف مشاغل کے لحاظ سے اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں۔

لیکن اس حد تک عورتوں کو اجازت کی نوعیت بالکل ایسی ہے جیسا کہ مردوں کے لباس کی کم از کم حد "ناف سے گھٹنوں تک" مقرر کی گئی ہے۔ یعنی ہر حالت میں کم از کم اتنے حصہ جسم کا چھپا رہنا ضروری ہے۔ عجیب بات ہے کہ عورتوں کے اس کم از کم لباس کو (جس کی اجازت مجبوری اور ضرورت کی بناء پر ہے) بعض لوگ شرعی لباس قرار دیتے ہیں اور اس پر اضافہ کو "غیر مشروع" کہتے ہیں۔ گویا اس سے زیادہ لباس پہننا عورتوں کو شرعاً ممنوع ہے۔ میں ان حضرات سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ اگر عورتوں کے لئے شرعی لباس کی حد یہی ہے تو کیا مردوں کا اسلامی اور شرعی لباس "ناف سے گھٹنوں تک" صرف ایک اونچی دھوتی یا صرف ایک نیکر ہے۔

مشاغل کے لحاظ سے ظہور کی حد عورتوں کے لئے جو آخری ہو سکتی تھی فقہا نے صرف اس کو متعین کر دیا ہے۔ اور چونکہ لباس کا یہ کم از کم درجہ ہے اس لئے اس کی پہننے والیاں (جو عموماً غیر متطیع طبقہ کی ہوتی ہیں) کمتر درجہ کی عورتیں سمجھی گئی ہیں بلکہ عہد نبوت کے بعد تقویٰ اور پارسائی کی بتدریج کمی کو محسوس کر کے متاخرین فقہا نے اس میں تنگی پیدا کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

وَتُمْنَعُ الشَّابَّةُ وُجُوْبًا عَنْ كَشْفِ الْوَجْهِ بَيْنَ الرِّجَالِ ۔ جوان عورت لازمی طور پر مردوں کے سامنے چہرہ کھولنے سے روکی جائے۔

یہ تو نوجوان عورتوں کے بیرونی لباس کی حد تھی سن رسیدہ عورتوں کے لباس میں قرآن پاک نے وسعت کر دی ہے۔

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ ۔ جو عورتیں (نسوانی فرائض سے) تھک چکی ہیں اور اب نکاح کی امید نہیں رکھتیں تو ان کے لئے مضائقہ نہیں اگر وہ (بیرونی) لباس اتار دیں۔

اس سے برقعہ یا چادر بغیر نکلنے کی اجازت نکلتی ہے مگر ساتھ ہی لباس میں بناؤ سنگھار اور زیب و زینت سے احتراز کی سخت تاکید بھی کی گئی ہے۔ اس حکم بالا کے بعد یہ الفاظ ہیں غَيْرَ

مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِيْنَةٍ یا سنگھار کرکے اور بن ٹھن کر باہر نہ نکلیں۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ بوڑھی عورتوں کو بھی خدا کا مشورہ یہ ہے کہ برقعہ یا چادر نہ اتاریں تو بہتر ہے۔ وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ (اور اگر وہ عفت اختیار کریں تو اُن کے لئے بہتر ہے)۔

تیسرا سوال۔ گھر سے آمد و رفت کا ہے۔ اس سوال کا تعلق عورتوں اور مردوں سے ہے۔ گھر میں انسان بے تکلفی کے ساتھ امن اور راحت کی زندگی بسر کرتا ہے جس آزادی سے وہ گھر میں رہ سکتا ہے باہر نہیں رہ سکتا۔ اس لئے گھر میں آنے والوں پر خاص قسم کے قیود عائد کرنے ضروری ہیں۔

"لباس" کے ذیل میں کہا جا چکا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے عورتوں کے لباس کی دو قسمیں ہیں خانگی اور بیرونی۔ خانگی لباس میں چونکہ عورتوں کو وسعت دی گئی ہے اس لئے گھر کا وہ حصہ جہاں عورتیں اپنے اس لباس میں آزادی کے ساتھ رہتی ہوں۔ سوائے محرم مردوں کے اور کسی کو اس میں جانے کی اجازت نہیں۔ قرآن پاک میں صاف طور پر یہ تصریح موجود ہے کہ۔

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ	اور اپنی زینت نہ ظاہر کریں مگر صرف اپنے شوہروں
اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ	اپنے باپ اور اپنے شوہروں کے باپ بیٹوں
اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ ۔	اور شوہروں کے بیٹوں پر۔

اور قرآن ہی نہیں بلکہ احادیث میں بھی اس کی تفصیل موجود ہے۔ بخاری میں حضرت عقبہ ابن عامر سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "خبردار عورتوں میں نہ گھسا کرو"

یہ تو گھروں میں آنے کے متعلق تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلام نے گھر سے نکلنے کے لئے بھی عورتوں پر کچھ قیود عائد کئے ہیں یا جس طرح مرد بے روک ٹوک گھر سے باہر جا سکتا ہے اسی طرح عورت کو بھی اجازت ہے۔

جہاں تک اسلامی تصریحات کا تعلق ہے عورت کا تعلق گھر سے بہ نسبت مرد کے زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی بنا پر عورت کو "اہل البیت" گھر والی کہا جاتا ہے۔ گویا گھر کی مالکہ وہی ہے۔ گھر کے اس خصوصی انتساب کو اس زمانہ میں "قید" اور گھر کو عورت کا "زندان" یا "قفس" کہا جاتا ہے۔ بہرحال عورتوں کے متعلق یہ صاف حدیث طبرانی میں موجود ہے کہ لَيْسَ لِلنِّسَاءِ نَصِيْبٌ فِي الْخُرُوْجِ اِلَّا مُضْطَرَّةً (عورتوں کو گھر سے باہر نکلنے میں کوئی حصہ نہیں ہے بجز اس کے کہ مجبور ہوں) اسی کے طرف دوسری حدیث میں اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اَلْمَرْأَةُ عَوْرَةٌ اِذَا خَرَجَتْ اِسْتَشْرَفَهَا الشَّيْطَانُ (عورت چھپانے کی چیز ہے۔ جب وہ نکلتی ہے تو شیطان اُسے

جھانکتا ہے۔

قرآن پاک میں اس قانون کا جہاں ذکر ہے وہاں بجائے عام عورتوں کے امہات المومنین کو براہ راست مخاطب فرمایا گیا ہے اور اس لئے بعض لوگ اس قرآنی حکم کو صرف اُمہات المومنین کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ جن الفاظ میں خدائے تعالیٰ نے اس حکم کو بیان فرمایا ہے اُن سے اس خصوصیت کا پتہ نہیں چلتا۔ وہ الفاظ یہ ہیں۔

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ

گھروں میں ٹھہری رہو اور پہلی جاہلیت کی رواج کے مطابق بن ٹھن کر نہ نکلا کرو۔ نماز پڑھو زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔

اس آیت میں چند باتوں کا حکم ہے۔

(۱) گھر میں ٹھہرے رہنا۔ (۲) جاہلیت اولیٰ کے سے بناؤ سنگھار نہ کرنا۔ (۳) نماز قائم کرنا۔ (۴) زکوٰۃ دینا۔ (۵) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنا۔

ان میں سے آخری چار باتیں "امہات" کے ساتھ قطعاً مخصوص نہیں کیا زینتِ جاہلیت سے احتراز۔ نماز و زکوٰۃ کی ادا۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیا جملہ مسلمان عورتوں پر اس کی تعمیل واجب نہیں۔ اور جب ایسا نہیں ہے تو ایک ہی سلسلہ کے صرف ایک حکم کو محض "امہات" کے ساتھ مخصوص کر لینے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ خصوصاً جبکہ حدیثوں سے عورتوں کے گھر سے بے ضرورت نکلنے کی ممانعت عام معلوم ہوتی ہے۔ آخر کس بنیاد پر اس حکم کو ازواج مطہرات کے ساتھ مخصوص کیا جاتا ہے۔ البتہ قرآن ہی سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ احکام ان اعلیٰ اور بلند خیال عورتوں کے لئے دئے جاتے ہیں جو اپنی زندگی کو تقویٰ اور پرہیزگاری کے ساتھ گزارنے کا ارادہ رکھتی ہیں جیسا کہ اس آیت کے ابتدائی الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔

يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ إِنِ اتَّقَيْتُنَّ ۔

اے نبی کی بیویو تم معمولی عورتوں کے مانند نہیں ہو اگر تقوے کے ساتھ رہنا چاہتی ہو۔

خواتین عظام!

کیا تقوے کی ضرورت امہات المومنین کو تھی۔ جملہ مسلم خواتین کو نہیں ہاں زینت جاہلیت سے احتراز یعنی جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں بناؤ سنگھار کے ساتھ خواتین میلوں تماشوں میں شریک

ہوتی تھیں اس سے ممانعت خاص ازواج مطہرات کی ہے جن کے مطہر ہونے کی سند قرآن حکیم میں موجود ہے۔ اُن کو وسوسۂ شیطان یا اتہام مخالفین کا اندیشہ معاذ اللہ تھا اور ہم لوگ اس سے پاک ہیں ہم کو کوئی خطرہ نہیں ہم کو ضرورت احتراز نہیں باقیام نماز اور ادائی زکوٰۃ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت یہ سب حکم ہمارے لئے نہیں بلکہ امہات المومنین کے لئے تھے۔

کس قدر تعجب کی بات ہے کہ اب مسلمان بھی مقدس قرآن کی ویسی تاویلیں کر رہے ہیں جیساکہ غیر اقوام نے تورات اور انجیل کے کلموں کو بدل ڈالا۔

لیکن جس طرح پردہ کے تمام واقعات میں استثنار ہے اسی طرح اس قانون میں ضرورت و حاجت کے لحاظ سے استثناء کیا گیا ہے۔ بخاری شریف میں ہے۔

اُذِنَ لَكُنَّ اَنْ تَخْرُجْنَ لِحَوَائِجِكُنَّ ۰ تم عورتوں کو اجازت دیگئی ہے کہ ضرورتوں کے لئے باہر نکل سکتی ہو۔

اور ضرورت کے وقت مسلمان عورتوں کا یہ طریقہ ہمیشہ باہر نکلتا رہا ہے۔ حج کے لئے تیرہ سو سال سے اچھی گھرانوں کی عورتیں ہر سال وادی عرب میں جاتی ہیں۔ جب کبھی ضرورت پیش آئی ہے اُن عورتوں نے جنگ کے موقعوں پر مردوں کے علاج معالجہ اور سپاہیوں کی خدمت انجام دی ہے اور جب ضرورت پیش آئے گی ہمیشہ کریں گی۔ لہذا گھر سے نکلنے کے لئے ہر حال میں ہم پر اپنے جسم کو چھپانے کی ضرورت مذہباً فرض ہے۔ اب رہا سواری کا مسئلہ تو وہ استطاعت پر موقوف ہے جب مستطیع مرد بھی گھروں سے کسی نہ کسی سواری پر نکلتے ہیں تو عورتوں کو باوجود استطاعت کے محض پردہ کی ضد میں بغیر سواری نکلنے پر اصرار کرنا ایک عجیب سی بات ہے۔ یہ ضرور ہے کہ عورتوں کا گھر سے نکلنا چونکہ صرف ضرورت اور مجبوری پر مبنی ہے جس کی تصریح احادیث سے کی گئی ہے۔ اور عورت اپنے تمام اعضا کے لحاظ سے چھپانے کی چیز ہے جیساکہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول بیان ہوا۔ سواری کا رواج بھی کوئی نیا رواج نہیں۔ عرب میں اسلام سے پیشتر بھی کپڑے منڈھے ہوئے ہودجوں کا جن کو محل کہتے ہیں رواج تھا۔ اسلام نے بھی اس رواج کو قائم رکھا احادیث میں کثرت سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ ازواج مطہرات اور دوسری عورتیں محلوں میں سفر کرتی تھیں پردہ کا قانون اپنے مختلف دفعات کے لحاظ سے اسوقت مسلمانوں میں مروج ہے۔ وہ قرآن، حدیث اور فقہ کے ذور سے مختلف طبقات اور حالات کے لحاظ سے اسلامی پردہ کہلاتا ہے۔ اور اس پردہ کو ہمارے جدید روشن خیال بھائی بطرح تعلیم و مانع ترقی خیال کرتے ہیں اور اُن کی

یہ آواز ہندوستان کے ہر گوشہ میں گونج رہی ہے کہ مسلمانوں کے زوال کا بڑا سبب عورتوں کا پردہ ہے۔

خواتین! ہماری قوم کے اسباب زوال ایسے نہیں ہیں جن کے مفہوم میں اتنی صریح غلطی کے ہم معترف ہوسکیں۔ ظاہر ہے کہ ہماری قوم صدیوں تعیر جہالت میں گرفتار رہی مذہب جس کی پرستش سے مسلمانان سلف عروج کمال کو پہنچے تھے اسے ہم نے پس پشت ڈال دیا ذخیرۂ علوم و فنون تجارت زراعت سب کچھ کھو دیا۔ کیا اب یہ سب گم شدہ نعمتیں ہمارے قومی بھائیوں کو ہمارے صرف نقاب چاک کر دینے سے حاصل ہو جائیں گی جن قومی بہنوں نے پردہ قطعی ترک کر دیا اپنی قومی اور ملی کونسی خدمات انجام دیتی اور مثل خواتین سلف کس کو درس فقہ حدیث دے رہی ہیں کیونکہ ایک سخت مشکل جس نے مسلمانوں کو پردہ کی طرف راغب رکھا ہے قانون حکومت میں عورت کے کامل وقار کا فقدان ہے سوسائٹی اور تمدن و معاشرت کا زیادہ تر حصہ اس کے مناسب حال نہیں۔ تھیٹر، سینما۔ رقص و سرور تمدن کا جزو ہے۔ بے عصمتی کا ارتکاب کوئی جرم نہیں ہے۔ بے حجابی کے مرکز ہر شہر اور قصبہ میں قائم ہیں افواج حکومت کے لئے ان مراکز کا خاص اہتمام و انتظام ہے اور سول میرج ایکٹ جس کی رو سے ایک مومن اور مشرک یا مشرکہ اور مومنہ کا ازدواج بہ آسانی ہوسکتا ہے جو مسلمانوں کے لئے قطعی حرام ہے جس کی تازہ مثالیں دہلی۔ پنجاب۔ مدراس میں موجود ہیں۔ خواتین کیا ایک مسلمان کی حمیت مذہبی اس کو روا رکھ سکتی ہے کہ ایسے ملک اور ماحول میں رہ کر اپنی شرفا خواتین کو ان سوسائٹیوں میں شریک کرے جو اسلامی حیا کے خلاف ہیں۔

اسلام نے اس بے حیائی سے عورت کو بچا کر کامل آزادی عطا کی ہے اور ایک مسلمان عورت مواضع زینت کو مستورات کر کے اپنے کاروبار اور ضرورتوں کے لئے نکل سکتی ہے اور ہر قسم کے تمدنی و معاشرتی کاموں میں شریک ہوسکتی ہے۔ لیکن اس کو یہ اجازت نہیں کہ وہ غیر محرموں کے ساتھ آزادانہ میل جول رکھے۔ صاحب مقدور خواتین کو قطع نظر کر کے غیر مستطیع خواتین اگر نقاب برقعہ کے ساتھ مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے پیادہ بھی جائیں تو اسلامی پردہ کے ہرگز خلاف نہیں جو گروہ جاہل مسلمانوں کا اس طریقہ کے خلاف ہے اور مانع تعلیم و ہنر ہے اس پردے کو اسلام کی توہین اور مردوں کی زیادتی سے تعبیر کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا ہر طبقہ خواہ وہ امراء ہوں یا غرباء تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہر طرح مذہباً آزاد ہے اور مسلمان عورتوں کو شرعی پردہ کے ساتھ زیور علم و ہنر سے اپنے کو ایسا مزین کر لینا فرض ہے کہ وہ بوقت ضرورت شرافت و

عصمت کے ساتھ اپنی اور اپنے بچوں کی پرورش کرسکتی ہیں اس کے تسلیم کرنے سے قاصر ہوں کہ پردہ
ہارج تعلیم ہے کیونکہ تجربہ اور مشاہدہ بالکل اس کے خلاف ہے۔ ہم پردہ کے ساتھ دائرہ نسوانیت کے
اندر شوہر کی ہر معاونت اور قومی بلکہ ملکی خدمت بھی انجام دے سکتی ہیں۔ اس کی تائید ہی مثال
میں علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کی ذات بھی موجود ہے۔ پردہ اگر مانع تعلیم ہوتا تو آج کے جلسہ میں
ہماری صدر صاحبہ کی مایا ہستی کرسی صدارت کو کیسے مزین کرسکتی اور اس وقت بکثرت پردہ نشین
تعلیم یافتہ خواتین کا جو مجمع پیش نظر ہے وہ کیسے میسر ہوتا۔

ضرورت البتہ اس کی ہے کہ ہماری صاحب مقدور بہنیں اُن مسلمان خواتین کو جو بوجہ
کم استطاعت ہونے کے برقعہ کے ساتھ تحصیل علم کریں یا وہ مصیبت زدہ خاندان جن کا کوئی کفیل
یا ذریعہ معاش نہیں یا وہ ستم رسیدہ قابل رحم ہستیاں جن کے شوہر نان و نفقہ نہیں دیتے اگر
پردہ کے ساتھ محنت مشقت کریں تو ان کو ہماری صنف کی سوسائٹی نگاہ تذلیل سے نہ دیکھے
بلکہ اپنے مذہبی احکام کے بموجب اپنی مجالسوں میں انکا احترام رکھا جائے کیونکہ مستورات اسلام کا
اصلی پردہ مواضع زینت کو مستور رکھنا ہے۔ ڈولی۔ موٹر گاڑی بگھی لازمات سے نہیں ہے۔
اس کی پابندی استطاعت اور حالت کی ضرورت پر مبنی ہے۔

خواتین!

میری اس طول طویل تقریر سے غالباً پردہ کی حقیقت اور احکام کی نصوصات نیز جہالت
کی غلط فہمی کی تفصیل آپ کے ذہن نشین ہوگئی ہوگی اور اس تجویز سے کہ پردہ شرعی ہر مسلمان خاتون
کے لئے ضروری ہے آپ اتفاق کریں گی۔

خواتین! جن مذہبی آیات اور جن عقلی دلائل سے مذہبی احکام کے تحت میں ضرورت شرعی
پردہ کو میں نے پیش کیا ہے اگر پردہ کی اسلامی حقیقت اور اس کے واقعی شرعی حدود یہ نہیں ہیں
تو مہربانی اسٹیج پر میری تردید کیجئے۔ میں دلائل تردید کو جو مذہب کے بھی ماتحت ہوں سننے کے
لئے تیار ہوں۔

زہے نصیب جو دنیا بشر کو جنت ہو۔ زہے نصیب جو ہو ساتھ نیک بیوی کا
وہ زن علوم کے شوقی ہو جسکے دامن میں وہ زن پسند ہو جس کو علوم کا گہنا
رخ صبیح پر جس کے ہو غازۂ اخلاص سیاہ آنکھوں میں جس کے ہو شرم کا سرما
اگرچہ لاکھ مخالف ہوا ہو طوفانی چراغ عفت و عصمت کبھی نہ ہو ٹھنڈا

کبھی کسی کی برائی کی آرزو نہ کرے　　حسد کے زنگ سے ہو صاف آئینۂ دل کا
خدا بڑھائے جو دولت گئے غرور اس کا　　خدا بڑھائے جو کلفت کرے وہ شکر خدا
شگفتہ دیکھ کے شوہر کو باغ باغ رہے　　ملول دیکھ کے شوہر کو ہو ملال سوا
اگر ہو صاحب اولاد تو یہ لازم ہے　　خیال بچوں کی تعلیم کا ہو حد سے سوا
جو درسگاہ کو جائیں تو پہنیں کپڑے صاف　　جب آئیں گھر میں تو پائیں غذا بھی پاکیزا

غزل

از

مولوی مودود احمد صاحب تشنہ حیدرآبادی

اُس کو مجھ پر ترس نہیں ہے　　کوئی فریاد رس نہیں ہے
ویرانے کو دیکھ چشم عبرت　　گلشن ہے یہ خار و خس نہیں ہے
جس پر ہے نگاہِ لطفِ صیاد　　تنگ اُس کے لئے قفس نہیں ہے
ہو قتل پہ مستعد اگر...... تم　　کچھ ہم کو بھی پیش و پس نہیں ہے
ہمت کرو پا ہی لوگے اُس کو　　کیوں کہتے ہو دسترس نہیں ہے
جب تک ہے تری امید مجھ کو　　دل میں مرے کچھ ہوس نہیں ہے
ہے توسنِ عمر تیز رفتار　　بس میں مرے یہ فرس نہیں ہے
جاتے ہیں خموش سب عدم کو　　اِس قافلے میں جرس نہیں ہے

کیا حال کہوں ہوس کا تشنہ
سب بس میں ہے پھر بھی بس نہیں ہے

ترجمہ گلدستۂ بیجاپور

خواجہ میر احمد علیخاں احمد نے نواب دلیر خاں بہادر دلیر جنگ حاکم بلدۂ شاہ نور (بیجاپور دکن) کی فرمائش پر ۱۲۸۶ھ میں گلدستۂ بیجاپور کے نام سے فارسی زبان میں "شاہان عادل شاہی" (۸۹۵ھ تا ۱۰۹۷ھ) کی تاریخ لکھی تھی۔ غالباً گلدستۂ بیجاپور طبع ہونے کے باوجود کم یاب ہے، دلیر جنگ کے خلف الصدق نواب ابوالقاسم خان نے ۱۲۹۵ھ میں خود مولف سے اس کا اردو ترجمہ کرایا۔ اس کے چھپنے کا کوئی حال معلوم نہ ہو سکا اور یہ ایک کم یاب چیز ہے۔ عادل شاہیوں میں علی عادل شاہ ثانی کا زمانہ ہر اعتبار سے قابل غور سمجھا جاتا ہے اس میں عادل شاہی اردو شعراء کا دور بھی ایک نمایاں خصوصیت رکھتا ہے۔ ملا نصرتی اور ہاشمی اسی دور کی یادگار ہیں نصرتی اور ہاشمی کے علاوہ آتشی، مرزا مقیم اور دولت شاہ فارسی کے ساتھ ہندی (دکنی) بھی کہتے تھے، ہاشمی کی ریختی کے ساتھ یوسف زلیخا کا قصہ بھی بعض کتابوں میں پڑھنے کا موقع ملا تھا، لیکن علی عادل شاہ ثانی کے حال میں جہاں ہاشمی کا ذکر آیا ہے وہاں اسکی احسن القصص اور نجات نامہ دو تصانیف کا بھی ذکر آگیا ہے۔ جسکا "اردوئے قدیم" اور "دکن میں اردو" جیسی محققانہ تالیفات میں بھی پتہ نہیں چلتا۔ ترجمہ گلدستۂ بیجاپور کی ترتیب سلاطین کے عہد وار ہے اور ہر ایک عہد کو مجلس کے نام سے موسوم کیا گیا ہے بعض تاریخی اختلافات بھی ہیں جن سے ہمیں سردست کوئی بحث نہیں اس وقت ہم "ترجمہ گلدستۂ بیجاپور" میں سے علی عادل شاہ ثانی کا حال مترجم کی زبان سے نقل کر دیتے ہیں۔ (ع۔ ی)

مجلس ساتوین ذکر میں علی عادل شاہ ثانی بن سلطان محمد عادل شاہ نور اللہ مرقدہ کے

ظاہر ہوئے کہ بلقیس زمانی پناہ جہان بانی بادشاہ بیگم صاحبہ دختر بادشاہ جم جاہ قطب شاہ زوجہ جنت مکان فردوس آشیان سلطان محمد عادل شاہ نور اللہ مرقدہ علی عادل شاہ کو خورد سالی سے پرورش کرنے سعی وافر مبذول رکھکر جمیع فنون سے آراستہ و پیراستہ کی تھی بعد از رحلت سلطان محمد عادل شاہ کے اعیان و ارکان اور حضوریوں کو جمع کر کے وقت نیک اور ساعت سعید اختیار کر تاریخ چھبیسوین ماہ محرم روز سہ شنبہ ۱۰۶۷ھ ایکہزار سڑسٹھ ہجری مطابق ۱۶۵۶ء سولہ سو چھپن عیسوی میں کہ عمر علی عادل شاہ کی انیس سال کی تھی دار السلطنت بیجاپور میں تخت سلطنت پر جلوس فرمائے شبیہ[1] اس بادشاہ گیتی پناہ کی واسطے ملاحظہ ناظرین کی منقوش ہوئی اور قطعہ تاریخ جلوس علی عادل شاہ ثانی کا یہ ہے:۔

بہر سال جلوس شاہ دکھن   گفت ہاتف سحر بصوت جلی
نیست آخر درین سخن حرفے   جانشین محمد است علی
۱۰۶۷

[1] اصل کتاب میں قلمی تصویر بھی چسپیدہ ہے۔

اور عبدالنبی تاریخ میں اس جلوس کے یہ مصرعہ کہا ؎

نوبت شاہی زدہ بعد محمد علی۔ اور محمد قلی یہ قطعہ کہا۔

منت ایزد کہ بر تخت خلافت جلوہ گر — آفتابے کز طلوعش گشت عالم منجلی

در میان شہریاران افتخار او راسزد — زانکہ شد ہمچون علی ملک محمد را ولی

سال تاریخ جلوسش خواستم از عقل کل — گفت امیر المومنین بعد از محمد شد علی

علی عادل شاہ ثانی بادشاہ رنگین مزاج تھا اور اکثر اشعار آبدار و مضامین تازہ بہار طبع رنگین سے اسکی سرزد ہوتے تھے اور شاعران لطیفہ گو کی بزم محک تاثیر میں اس کے قدر تمام تھی اور شعر گویان تازہ خیال اس بادشاہ نکتہ سنج کے دربار فیض بار میں حاضر رہا کرتے تھے چنانچہ میاں نصرتی کہ خیالات رنگین و اشعار تازہ مضامین اس کے مقبول خاص و عام ہیں اور شعرائے زمان میں ملک الشعراء سے مشہور ہے اور طبع زاد سے اپنی کتاب گلشن عشق اور علی نامہ نام سے اُس شہر یار عالی وقار کے تصنیف کیا ہے جو کوئی نسخہ زبان ہندی میں اس خوبی اور تازہ مضمونی سے نہیں بنا ہوگا۔ دوسرے عمدہ اکابران دہر استاد زمان سید نور اللہ خلف استاد العلما حضرت سید محمد علی جو باوجود تحصیلات علوم معقول و منقول کے حقیقت سے اہل سخن کے بھی کما حقہ آگہی رکھتے تھے اور اشعار آبدار بھی گاہ گاہ فرمایا کرتے تھے جو نتائج طبع سے ان کے تاریخ عادل شاہی ہے زبان فارسی سے تاریخ اس شہر یار علی تبار کی لکھے ہیں۔ تیسرے حکیم آتشی کہ فکر بلند اس کی رتبہ سنج طارم اعلی کی تھی۔ چوتھا مرزا مقیم کہ معنی طرازی و لفظ پردازی میں عدیل و سہیم نہیں رکھتا تھا۔ پانچواں دولت شاہ جو اورنگ نشین کشور سخنوری کا تھا۔ اور ملا نصرتی شاعر ہندی گو تھا و شاہ نور اللہ و مرزا مقیم و مرزا دولت شاہ و حکیم آتشی اکثر فارسی گو تھے اور ہندی شعر بھی کہتے تھے۔ اور سوائے انہوں کے بہت شعرا فارسی گو اور ہندی بھی تھے۔ چنانچہ ایک ان میں سے ہاشمی تھا کہ احسن القصص کو زبان ہندی سے شعر پردازی کرکے داد سخن کا دیا ہے۔ اور رسالہ نجات نامہ بھی نتائج طبع سے اس کے ہے۔ اور عبداللطیف و عبدالنبی اکثر قصائد بفصاحت و بلاغت تمام زبان فارسی سے کہے ہیں۔ الغرض اسی شہر یار عالی تبار کے عصر میں بیجاپور معمور تھا۔ اور شعرا و فضلا و زہاد و صلحا و اولیا و جمیع اہل فنون بارگاہ سلطنت میں اس کے حاضر تھے۔ اور وزرا و امرا و مقربان سلطنت سے اس کے خان محمد و سید ابوالحسن ملکونہ۔ و رندولہ خان و بہلول خان۔ و عبدالمحمد ارسطوئے زمان۔ و ملا محمد۔ و افضل خان و محمد یعقوب۔ و عزیز خان۔ و ملک صبا و ملک آقا خسرو۔ و عبداللہ خان و ہیبت خان و ناصر محمد۔ و یوسف خان و داؤد خان۔ و ملک جبشی۔ و محمد علی۔ و خانگی ملک۔ و سیدی الماس۔ و شاہ نواز خان۔ و میر نعمت اللہ۔ و فرزہ خان۔ و کمال خان

وسدھی جوہر۔ وصلابت خاں۔ ومنجلی شاہ وشاہ جے راجہ۔ ویمناجی بھونسلے۔ وشرزہ راؤ۔ ووسواس راؤ
وباجی گھوڑپڑہ اور قضات وعلما سے سید علی محمد۔ وقاضی حبیب اللہ۔ وشاہ نور اللہ۔ و
ابراہیم خاں۔ وشاہ ابو المعالی اور سنہ ۱۰۶۷ یکہزار سینٹھ ہجری مطابق سنہ ۱۶۵۶ سولا سو چھپن
عیسوی لکھیں کہ سنہ جلوس اس شہریار کا ہے۔ سرِ وزیر خاں محمد تھا۔ اور اسی سنہ میں
علی عادل شاہ ثانی حسینی محل بنا فرمایا۔ اور سنہ ۱۰۶۸ ایکہزار اڑسٹھ ہجری مطابق سنہ ۱۶۵۷ سولہ سو
ستاون عیسوی میں خان محمد وزیر کو قتل کروایا تاریخ اس کے قتل کی یہ ہے۔ آہ خان محمد شہید ایضاً
دعا دادند۔ اور اسی سنہ میں ایک مسجد بنا کیا۔ اور سنہ ۱۰۶۹ یکہزار انہتر ہجری مطابق سنہ ۱۶۵۸ سولہ سو
اٹھاون عیسوی میں علی عادل شاہ میزبانی کر کے تمام بیجاپور کے لوگوں کو کھانا کھلایا۔ اور اسی سنہ میں
عبد المحمد کو وزارت کی خدمت عطا کیا۔ تاریخ اس کی یہ ہے۔ وایں سرنوبتی بعبد الحق بسزد۔ اور اسی
سنہ میں حصار بیجاپور کے برجیں تیار کروایا۔ پھر اسی سنہ مذکور میں ملک الماس کو سرلشکر کیا اور جنیجاور کے
قلعہ پر قابض و متصرف ہوا تاریخ اس کی یہ ہے۔ صاحب عالم سلامت۔ وہی چنجاور آیا۔ اور سنہ ۱۰۷۰ ایکہزار
ستر ہجری مطابق سنہ ۱۶۵۹ سولہ سو انسٹھ عیسوی میں علی محل تیار کیا تاریخ اس کی یہ ہے۔ علی محل نو مینو گشت
اور علی عادل شاہ ثانی اسی سنہ مذکور میں سفر گودہ اور محمود بندر کا کیا اور اسی سنہ میں افضل خاں مارا گیا
تاریخ اس کے قتل کی یہ ہے۔ زجان افضل حیف۔ اور سنہ ۱۰۷۱ یکہزار یکہتر ہجری مطابق سنہ ۱۶۶۰ سولہ سو
ساٹھ عیسوی میں علی عادل شاہ ثانی چالکہ اور لورگل پر سواری کیا اور اسی سنہ میں جوہر کو خطاب
صلابت خانی دے کر سیوا کے مقابلہ پر کہ اس نے قلعہ پرنالے کا دغا سے لیا تھا روانہ کیا۔ جوہر مذکور نے
لشکر جرار اور ساز و سامان جنگی لیکر بڑی محنت و جانبازی کیا لیکن اس نے اس قلعہ پر قابض نہ ہوا
آخر الامر بادشاہ خود متوجہ اس مہم کا ہو کر قلعہ پرنالہ کا لیا۔ تاریخ اس کے فتح کی یہ ہے۔ آمد قلعہ پنالہ
و کلے سوارے عادل شہ ما و نصرتی کہا سو تاریخ یہ ہے۔ علی نے پل میں پنالا لیا صلابت سوں۔ اور سنہ ۱۰۷۲
یکہزار بہتر ہجری مطابق سنہ ۱۶۶۱ سولہ سو یکسٹھ عیسوی میں جوہر صلابت خاں علی عادل شاہ ثانی سے
بغاوت کیا بادشاہ اس کو تنبیہ پہنچا کر سر اس کا کاٹا۔ تاریخ اس کی یہ ہے۔ بمرد آں جوہر از مہابت عادل ؎
اور تاریخ جوہر صلابت خاں مارا جانیکی میاں نصرتی کہا سو یہ ہے ؎ باغی ہوا سو موا ؎ اور سنہ ۱۰۷۳
یکہزار تریاہتر ہجری مطابق سنہ ۱۶۶۲ سولہ سو باسٹھ عیسوی میں تیسری تاریخ کو رجب کے علی عادل شاہ
ثانی رونق بخش سواد بنکاپور و کہیری و بدنور ہو کر تاریخ انتیس ماہ جمادالاول سنہ ۱۰۷۴
یکہزار چوہتر ہجری مطابق سنہ ۱۶۶۳ سولہ سو ترسٹھ عیسوی کو مراجعت فرما کر داخل پایہ تخت

بیجاپور کے ہوا۔ اور وہی سنہ میں شاپیٹھ کے آبادی کی بنا ڈالا۔ اور علی عادل شاہ ثانی کو
ایک فرزند اور ایک دختر تھی فرزند کا نام سکندر عادل شاہ اور دختر کا نام بادشاہ بی بی تھا۔
اور سنہ ۱۰۸۳ھ یکہزار تراسی ہجری مطابق سنہ ۱۶۷۲ء سولہ سو بہتر عیسوی میں علی عادل شاہ ثانی
عارضۂ فالج کے بیمار ہوا۔ حقیقت اس کی یوں ہے کہ بادشاہ ادویات حارا مسک کے استعمال
فرما کر حرارت سے ادویات کے آب سرد پیا تھا اور وقت اول صبح کے چوتھی ربیع الاول کی تھی واسطے
استقبال مظفر خاں کے خدیجہ پور تک سواری کرکے راستے میں ہوازدگی سے گرانی بدن کی ہوکر بجلدی
تمام مراجعت کیا۔ جب کہ دولت خانہ میں داخل ہوا چھپے طاس کے وقت پر اسی تاریخ کو مفلوج
ہوکر دو دن ورات بے ہوش اور مطلق بے حرکت رہا دوسرے روز تھوڑا کچھ ہوش میں آیا آدھا
بدن بے حس ہوا تھا۔ عبدالمحمد و خواص خاں واسطے دیکھنے بادشاہ کے جاکر پھر اپنے گھروں کو آئے۔
مظفر خاں و مرزا یوسف خاں و علی محب خاں و دھرماجی پنت دبیر اتنے لوگ قرب تمام پاکر انیس
خلوت سرائے خاص ہوئے تھے اور دروازے تمام بند کرکے آمد و رفت کے لئے دریچے کھلے رکھے
تھے۔ اور بادشاہ کا معالجہ کرنے میں مشغول تھے۔ حکیم شمشاد اور دوسرے اطبا بھی معالجہ کرتے
تھے۔ بادشاہ تین روز بیہوش مطلق رہا چوتھے روز تھوڑا ہوش میں آیا اگرچہ صحت کلی نہیں ہوئی
اور مرض روز بروز افزوں تر تھا ویسی حالت میں بھی حکمرانی کرتا تھا۔ اور عبدالمحمد تین چار
بار واسطے دیکھنے بادشاہ کے آتا تھا۔ اور خواص خاں یکروز دو روز کو آمد و رفت رکھا تھا اور
حضوریان و خدام لوگ جب بادشاہ یاد فرماتا تھا حاضر ہوتے تھے اور دیانت راؤ و عبدالمحمد کے
جانب سے سابق کے دستور موافق حضور میں بادشاہ کے آمد و رفت رکھا تھا اور عبدالمحمد مستقل تھا
کسی کو چون و چرا کا مجال نہ تھا۔ اور بادشاہ کے دم حیات تک کچھ خلل ارکان سلطنت میں راہ
نہیں پایا۔ اور دیانت راؤ ظاہر و باطن میں عبدالمحمد سے رابطہ رکھتا تھا اور مرزا یوسف خاں
خواص خاں کے جانب تھا۔ اور دھرماجی پنت عبدالمحمد و دیانت راؤ کا دشمن تھا واسطے
سلامتی اپنے مظفر خاں کے استحکام کے لئے سعی بلیغ کرتا تھا۔ اور بادشاہ جانتا تھا کہ خواص خاں
اور مظفر خاں یہ دونوں حوصلہ کامرانی و حفظ سلطنت کا نہیں رکھتے تھے اور عبدالمحمد بارہ
سال سے کاروبار امور ریاست کا کرکے واقف امور جہانبانی کا ہوا تھا۔ سیواجی بھونسلہ و عبدالکریم
بہلول خانی اور دوسرے امرا عبدالمحمد کے محکوم تھے۔ بادشاہ کو یہ منظور تھا کہ شہزادہ والاتبار کو
سپرد اس کے کرکے معاملات بادشاہی اختیار میں اُس کے دیوے تاکہ خود زندہ ہی اس کو

مستقل کرے لیکن عبد المحمد یوں تصور کیا تھا کہ سلطنت عادل شاہیہ کی اگر میں مختاری کروں تو عنقریب مارا جاوں گا - اور ماں بھی اس کی مانع ہو کر قسم دی تھی کہ یہ کام اختیار مت کر اس لئے خوف سے جان کی اندیشہ مند تھا - ایک روز بادشاہ عبد المحمد کو فرمایا کہ میں جانتا ہوں اس مرض سے رہائی ممکن نہیں اور مغل نزدیک ہیں اور سیواجی دشمن قابو طلب ہے خدا جانے کہ بعد از میرے کیا صورت ہوئے اور کس طور کا منصوبہ آگے آوے بہتر یہی ہے کہ روبرو میرے شاہزادہ کو سریر خلافت پر اجلاس کر کے سلطنت کی بندوبستی کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے کر بادشاہی کی حفاظت کرتا کہ بعد از میرے کسی کو تجھ سے مجال منازعت کا نہ ہے - عبد المحمد یہ بات قبول نا کر کے عذر کیا دیانت راؤ اور کتنے خیر خواہان سلطنت بہت طور سے خاطر داری اس کی کر کے کہے کہ بادشاہ چاہتا ہے کہ شہزادے کو تیرے سپرد کر کے اپنے روبرو تجھکو مستقل کرے کچھ اندیشہ اپنے خاطر پر نہ لا اور اپنے کو اس کام سے باز مت رکھ کہ معاملہ برہم ہو جاوے گا - لیکن اس نے نہ مانا یہ بات خاطر پر بادشاہ کے نہایت گراں ہوئی لیکن اپنے حال میں حیراں تھا کچھ چارہ نہیں چلا - اور عبد المحمد کا اقبال روبزوال تھا بہت سے امور ریاست خلاف مصلحت کے کرتا تھا چنانچہ خود بخود اقرار کیا کہ خواص خاں شاہزادہ کو تخت خلافت پر اجلاس کر کے دار الخلافت میں انتظام امور سلطنت میں رہے - اور اپنے کو لشکر دیکر قلعہ شاہ درگ و گلبرگہ کی حفاظت پر رکھے - اور قلعہ مرچ و پرنالہ جو عبد الکریم بہلول خاں کی تحویل تھا مغل کے مقابلہ پر چھوڑے - اور مظفر خاں بدنور کی جانب سیواجی کے منہ پر رہے - اور سب امرا خواص خاں کے حکم میں رہ کر جو کہ خواص خاں فرماوے بجا لاوے - خواص خاں اس بات کو غنیمت جان کر قبول کیا اور آپس میں عہد و پیماں قسم کھا کر مضبوط کئے کہ بعد از بادشاہ کے دوسرے روز اپنے عہد کو وفا کرے - پھر رفتہ رفتہ مرض بادشاہ کا غالب ہوا اور قوائی جسمانی حرکت سے باز رہا اس وقت ہر کوئی اپنی تدبیر میں مصروف ہوے - چنانچہ دیانت راؤ خواص خاں سے موافقت کیا - اور دھرماجی مظفر خاں سے آمیزش کر کے اس کی استحکامی میں سعی وافر کرتا تھا - لیکن عبد المحمد و دیانت راؤ مظفر خاں کو قوت پکڑنے نہیں دیتے تھے اور بادشاہ کو کچھ نوع سے سمجھا کر اس کو حضوری سے نکال کر موافق اقرار اس کے بدنور کو روانہ کئے - اس عرصے میں بادشاہ کی بیماری پھر عود کی دھرماجی بادشاہ کو یاد دلا کر مظفر خاں کو یادواڑ سے واپس طلب کیا - اس نے لشکر اپنا یادواڑ میں چھوڑ کر شتابی اپنے کو حضور میں پہنچا کر بادشاہ کی خدمت عالی میں حاضر ہوا - اور خواص خاں ہمو جب معمول کے سپاہ لوگ ہمراہ اپنے لیکر آیا کرتا تھا - اس کو منع کیا کہ سپاہ لوگ ہمراہ نہ لے آوے اور تنہا آمد و رفت

رکھے اس لئے درمیان میں اس کے اور خواص خاں کے ناخوشی پیدا ہوئی۔ مظفر خاں ملک معنور کے
ہمراہ عبدالمحمد کو کچھ خفیہ کہلا بھیجا عبدالمحمد جواب دیا کہ خواص خاں عہدہ وزارت پر ہے اور باپ
اس کا اس خدمت میں جاں نثاری کیا ہے اب جو کہ خواص خاں مناسب جانے کرے تم اور ہم
اس کے محکوم رہکر جو وہ فرمائے بجا لاویں مرزا یوسف خاں بادشاہ کے شروع بیماری سے دم
آخریں تک یک لحظ خدمت سے جدا نہیں ہوا تھا اور ہر ایک نوع سے موافقت کرکے خیرخواہی
میں خواص خاں کی تھا اور بادشاہ وفات پانیکے پندرہ روز آگے عالم بے ہوشی میں تھا۔ مرزا
یوسف خاں دانائی اور آہستگی سے معاملات ملکی خواص خاں سے رجوع کرکے حکم پر اس کے
عمل کرتا تھا۔ جبکہ بادشاہ رحلت فرمانے کا وقت قریب پہنچا خواص خاں محلات بادشاہی
میں آکر مرزا یوسف خاں کی صلاح و تدبیر سے ضبط و نسق دربار اور قلعہ کے اندر کا کیا
اور علی عادل شاہ ثانی پانچ طاس کے وقت یکشنبہ کے روز تیرھویں تاریخ کو ماہ شعبان کے
سنہ ۱۰۸۳ یکہزار تراسی ہجری مطابق سنہ ۱۶۷۲ سولہ سو بہتر عیسوی میں تختہ تابوت
کو تخت سلطنت پر اختیار کیا۔ قاضی نور اللہ و شاہ ابراہیم و علی محب خاں و میر نعمت اللہ
اور ملک مسعود اور علما و فضلا تجہیز و تکفین کرکے شہ پیٹ میں جو گنبد نیم کلہ کہ اسی کی تعمیر کی
ہوئی تھی۔ اس میں مدفون کئے اور عمر اس کی پینتیس سال تھی اور سولہ برس سات مہینے
سلطنت کیا تاریخ اس کی رحلت کی یہ ہے۔ قطعہ

بادشاہ دیں پناہ خسرو عادل علی	تخت نشیں جہاں گشت ز تخت جہاں
جان و دل ہر دو سنان ز آتش ہجرش سوخت	در دہن مرد و زن شعلہ صفت شد زباں
سال وفاتش آں دلبس گفت ز الہام غیب	بادشاہ دیں علی کرد وطن در جناں
	۱۰۸۳

تنقیدیں

دیوان اُردو خواجہ میر دردؔ مرتبہ مولوی عبدالباری صاحب آسی۔ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ۔ قیمت درج نہیں۔

خواجہ میر دردؔ اُردو کے شعرائے قدیم میں اپنی شاعری کی بعض خاص خصوصیات کی وجہ سے ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا آپ کے کلام کا ایک مجموعہ نظامی پریس بدایون نے مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کی ادارت سے شائع کیا تھا۔ یہ دوسرا نسخہ جو نول کشور پریس کی طرف سے شائع ہوا ہے مولوی عبدالباری صاحب آسی لکھنوی کا مرتبہ ہے۔ اس نسخہ میں مرتب کا بیان ہے کہ ایک قلمی اور ایک اچھے مطبوعہ نسخے سے تصحیح کی گئی ہے اور شروانی صاحب کے مرتبہ نسخے سے بھی جگہ جگہ مقابلہ کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ نسخہ زیادہ معتبر اور صحیح ہے۔ ابتدا میں آسی صاحب نے ایک مقدمہ لکھا ہے جو خواجہ میر درد کی لائف، اُن کے شاگردوں کے ذکر اور اُن کی شاعری پر تنقید کیا بلکہ تقریظ پر مشتمل ہے۔ شاعر کی لائف میں تو کوئی بات ایسی نہیں البتہ تنقید یا تقریظ والے حصہ میں آسی صاحب نے بہت سی ایسی باتیں لکھدی ہیں جو بمشکل قابل قبول ہو سکتی ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں "میر صاحب یا میر حسن وغیرہ کے بیانات سے قطع نظر کرکے جب ایک بصیر اور نقاد میر درد رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کا مطالعہ کرتا ہے۔ تو بیساختہ اس کی زبان سے یہ کلمات نکل جاتے ہیں کہ خواجہ میر درد کے برابر کوئی شاعر سرزمین ہند میں پیدا نہیں ہوا۔" ایک جگہ خواجہ میر درد کے ہاں قصائد نہ ہونے پر انہیں قصیدہ گوئی کا مرد میدان یا اس کا اہل نہ سمجھنے کو خطرناک غلطی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کسی کام کا نہ کرنا اس کے اہل نہ ہونے کی کسی طرح دلیل نہیں ہو سکتی۔" سب اصناف شاعری میں بڑی اور مشکل چیز غزل ہے....... اس میں کمال ہونا دوسری چیزوں کو بالکل مکمل کر دیتا ہے۔ رباعی ہو یا قصیدہ، مثنوی ہو یا قطعہ، ایک ماہر فن غزل گو ان تمام اصناف میں تھوڑی سی توجہ اور استغراق سے بہت کچھ کر سکتا ہے۔"

ایسی ہی رایوں سے آسی صاحب کی تنقید تنقید نہیں رہی بلکہ سراسر تقریظ اور مبالغہ آمیز محاسن نگاری بن گئی ہے نظامی پریس کے نسخہ کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ شاعر کی حیات اور اُس کے کلام کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کرنے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے اور محاسن بیان کرنے میں جوش شیفتگی کو زیادہ کام میں لیا گیا ہے۔ تاہم اصل کلام کے بخوبی ترتیب دینے اور صحت کی کوشش کے لحاظ سے یہ نسخہ بہت ہی قابل قدر ہے اور عام شائقین کلام و متعلمین ادب کیلئے جو نظامی پریس والے نسخے کی غلطیوں کے تماشا کی سے تھے یہ نعم البدل ہے۔ نول کشور پریس کی مطبوعات کی طرح غالباً اس کی قیمت بھی بہت ہی کم ہوگی۔

دی ڈی چینگ آف انگلش اِن انڈین اسکولز از جناب کے۔ نارائن ماؤ صاحب بی اے مدوگھالا نگر یونیا

مدرسہ فوقانیہ میدک ۔ قیمت ۱۲؍ ۔

ہندوستانی مدارس میں انگریزی زبان کی تعلیم کس اصول پر دینی چاہیئے اور ہندوستانی طلبہ کو جو مشکلات انگریزی زبان کی تحصیل میں پیش آتی ہیں اُن کو دور کرنے کی کیا تدابیر کی جانی چاہئیں، یہ اس انگریزی کتاب کا موضوع ہے۔ مصنف نے جو ایک تجربہ کار مدرس ہیں اور برسوں سے مختلف مدارس میں انگریزی زبان سکھانے کا مشکل کام انجام دیا ہے۔ اور اب بھی دے رہے ہیں، اپنے تجربات تعلیمی کی بنا پر ایسی مفید تدبیریں اور تجویزیں اس کتاب میں بیان کی ہیں جن کے اختیار کرنے سے بہت بڑی حد تک تحصیل زبان انگریزی میں سہولت پیدا ہوسکتی ہے۔ وسطانی اور ثانوی اور فوقانی جماعتوں میں کن طریقوں کی ضرورت ہے ان پر جدا جدا بحث کی ہے۔

عام طور پر مدارس میں انگریزی سکھانے کے جو فرسودہ طریقے رائج ہیں اُن کو پیش کرکے مصنف نے ان میں ایسی مفید اصلاحیں تجویز کی ہیں جو بہت سہولت سے طالب علم کو انگریزی پر عبور پیدا کرا سکتی ہیں اور موجودہ صورت میں جو کیفیت برسوں انگریزی پڑھنے کے بعد بھی بمشکل معلوم ہوتی ہے وہ اس کتاب کے مجوزہ طریقوں سے بہت ہی کم مدت میں پیدا ہوسکتی ہے۔ مدارس میں انگریزی کی تعلیم دینے والے مدرسین اور عام شائقین جنہیں انگریزی کے درس و تدریس سے دلچسپی ہو ضرور اس کو مطالعہ کریں اور اس کے "راست اصول" پر عمل پیرا ہوں۔

دی اینجلس ایڈریس | از جناب محمد عبدالرحمٰن صاحب مددگار۔ مدرسہ فوقانیہ میدک۔ حجم (۴۶) صفحات۔

یہ ایک انگریزی نظم ہے جس میں قرآنی تعلیم اور احادیث نبوی پیش کی گئی ہیں یہ نظم باوجود ایک ہندوستانی شاعر کے قلم کی ہونے کے زبان و بیان کے لحاظ سے نہایت عمدہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مصنف کو انگریزی زبان سے خاص لگاؤ ہے۔ وہ نہایت سلاست اور صفائی سے اشعار میں اپنا مطلب ظاہر کرسکتے ہیں مسلسل کئی سو شعر ہیں لیکن ربط کہیں ٹوٹنے نہیں پاتا۔ ایک ہندوستانی میں یہ خوبی قابل ستائش ہے۔ کتاب کی قیمت اور پتہ درج نہیں۔ شاید مصنف سے مل سکتی ہے۔

سیر گل | ضخامت　　تقطیع　　مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس قیمت ۹؍ ملنے کا پتہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ یا "کاشانہ" اناد

افسانہ نویسی، مشرقی ممالک خصوصاً ہندوستان کا جس قدر قدیم فن ہے، اسی قدر یہ اردو کیلئے جدید۔ عجیب قانون فطرت ہے کہ کل جو ہنوز ایک قوم اپنے سے زیادہ شائستہ اقوام سے سیکھتی ہے، آج انہیں کو سبق سکھانے کے قابل ہوجاتی ہے۔ جس زمانے میں مغربی ممالک تمدن کے ابتدائی مدارج میں

تھے، بیدپائے کے قصے دنیا کی ساری قوموں کے افسانوں کا ماخذ بنے ہوئے تھے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ قصہ گوئی (اور بعد میں قصہ نگاری) کے فن کو ہر قوم دوسری سے اکتساب کرتی ہے۔ بلکہ یہ ہر قوم کا اپنا فطری جذبہ ہے، خارجی چیزیں صرف نمونہ کا درجہ رکھتی ہیں۔ عربی ادب ہندی قصوں سے متاثر ہوا، اور پھر خود عربوں نے اپنی نوبت پر بہت سے لازوال افسانوی کارنامے اطراف عالم میں بھیج دئیے۔ ان ہی میں "الف لیلہ" بھی ہے۔ اس وقت مغربی اقوام نے، جو مہذب دنیا کا مطمح نظر بنی ہوئی ہیں، قصوں کو بھی ضروریات زمانہ کے مطابق ترقی دیکر اعلیٰ مرتبہ پر پہنچا دیا ہے۔ انہیں کے قصوں کا تتبع آج ساری علمی دنیا کر رہی ہے۔ اس تقلید میں درحقیقت اقوام عالم کے مذاق کا ایک نقطہ پر سمٹنے کا احساس پنہاں ہے۔

چنانچہ ہم بھی اسی قانون فطرت کے ماتحت عمل کر رہے ہیں۔ ہم نے اپنی قدیم ہندی داستان گوئی ترک کر دی ہے اور مغربی خصوصاً انگریزی قصوں کی تقلید کر رہے ہیں۔ پہلے پہل تو ہم اپنی زبانوں میں اکثر مغربی قصوں کو بجنسہٖ منتقل کرتے رہے لیکن چونکہ یہ ہماری ادبیات کا جزو نہیں بن سکتے تھے، اس لئے ہم نے غیر شعوری طور پر اُن کے اتباع میں اپنے ذاتی اور ملکی و قومی قصے لکھنے شروع کئے۔

"پیر گل" بھی انہیں دو قسموں کے قصوں کا ایک اچھا مجموعہ ہے۔ اس میں کل تیرہ قصے ہیں، جن میں سے چھ روسی قصہ نگار انتونی چیخوف کے ترجمے ہیں، ایک، ابسان کے قصہ کا ترجمہ ہے اور باقی چھ مولوی جلیل احمد صاحب قدوائی بی۔اے کے لکھے ہوئے ہیں۔

چیخوف کی قصہ نگاری کے متعلق کچھ زیادہ لکھنا نہیں ہے کیونکہ یہ مترجمین کا مطمح نظر ہوں تو ہوں، لیکن اردو ادب اور خود ہندی قوم کا مطمح نظر نہیں بن سکتے۔ چیخوف مختصر قصے لکھتا ہے، مختصر قصے اور طویل ناول کا فرق صرف یہ ہے کہ اول الذکر میں صرف ایک واقعہ یا کسی خاص حالت، کیفیت، حیات کے کسی پہلو پر روشنی ڈالنی مقصود ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف طویل قصے یعنی ناول کئی مختلف واقعات پر مبنی ہوتے ہیں، جو ایک واحد مقصد کی طرف رہبری کریں۔ چیخوف روزمرہ کے سادے سیدھے واقعات کو اپنے قصوں کا موضوع بناتا ہے اور اُن کو اپنے ذاتی رنگ میں رنگ کر پیش کرتا ہے۔ طرز تحریر میں بھی، وہ شگفتہ اور پرمعنی ہے، الفاظ کے استعمال میں ایک مستحسن کفایت شعاری کا پابند ہے۔ جس کی وجہ سے کم سے کم الفاظ میں ایک وسیع مفہوم کو ادا کر سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ادبیات کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ تاہم قدوائی صاحب نے چیخوف کے قصوں کو بے تکلفی سادگی اور خوبصورتی کے ساتھ اُردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہیں کہیں روسی خیالات اور اسلوب کی اجنبیت کا باقی رہ جانا ناگزیر بلکہ ایک حد تک مناسب ہے۔

مصنف کے طبعزاد قصوں کو پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مغربی قصوں کے فن سے مانوس ہیں اور اسکے رموز سے استفادہ کرنے کی جا بجا کوشش کرتے ہیں۔ تمام طبعزاد قصے مغربی فن مختصر قصہ نگاری کی

مطابقت کرتے ہیں "دو آنسو" والے قصے میں ایک جدید تعلیم یافتہ نوجوان کی ٹھیٹ مشرقی فضا میں رہنے کے بعد جو کس مپرسی کی حالت ہو جاتی ہے، اس کا اچھا نقشہ کھینچا ہے جس کی فطرت بھی تعلیم کے ساتھ بدل گئی ہو، لیکن جو مشرقی فضا میں چلنے پھرنے پر مجبور ہو۔ عام انسانوں کے خاص خاص نفسیاتی فرق کو بھی مصنف نے اکثر قصوں میں ملحوظ رکھا ہے "فریب خیال" میں ایک ناتجربہ کار کا بعض معاملات میں اپنے حسب خواہش نتائج نکالنے کی عادت کو عمدہ پیرایہ میں ظاہر کیا ہے۔ بعض کوتاہ حوصلہ لوگوں کے ترقی کر لینے پر جو حالت ہو جاتی ہے، اور اپنے قدیم رفیقوں کے ساتھ ان کا جس قسم کا برتاؤ ہو جاتا ہے، اس کا ایک خاکہ "مایوسی" میں کھینچا ہے۔

اکثر ضمنی واقعات سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ مصنف کو اپنے خارجی حالات پر غائر نظر ڈالنے کی مشق ہے۔ اور وہ اُن سے ایسے نتیجے اخذ کر سکتا ہے، جو پڑھنے والوں کی ذہنی جد و جہد کے لئے ایک وسیع فضا مہیا کر دیتے ہیں۔ "زوال حسن" میں ایک جگہ مصنف اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتا ہے — "دنیا ایک بڑا بازار ہے۔ جہاں سودے کی بکری ہوتی ہے، باہمی رواداری اور خلوص، کہنے کی باتیں ہیں" — وغیرہ (صفحہ ۱۷۴) یہ خیال غور و فکر کا محتاج ہے۔

بعض قصوں میں چند ضمنی امور ایسے بھی ہیں، جن کی طرف مصنف کی توجہ زیادہ منعطف ہونی چاہیئے تھی "نقش موہوم" میں مصنف نے مایوس محبت کی تصویر کھینچی ہے۔ اس میں قصے کے دو مختلف عنصر ہو گئے ہیں، ایک قاسم کی داستان محبت، دوسرا قاسم کی ایک عزیز کمسن لڑکی تمیز اور خود مصنف (مصنف اس میں ایک شخص قصہ ہے) کا تعلق۔ دو مختلف واقعات کا اشتمال قصے میں نامناسب نہیں۔ لیکن ان میں ایک واقعہ دوسرے کا تابع ہو، اور دوسرا مرکزی واقعہ کے ارتقا کا معاون۔ "نقش موہوم" کے دونوں واقعات علیحدہ ہیں۔ ان میں سے ایک کو دوسرے کے ساتھ کسی قسم کا ربط عنصر نہیں۔ نیز قصہ نگار اور تمیز کے تعلقات ایسے ناقابل اعتماد ہیں کہ کہیں ان پر جوان الفتی کا دھوکہ ہوتا ہے، اور کہیں معصوم انست کا باوجود تمیز کی شائستگی اور پختہ نمائی کے یہ مسلم ہے کہ اس کی عمر نو دس سال کی تھی پھر مصنف کو اس کے ساتھ ملنے میں ایسا تکلف نہ ہونا چاہیئے تھا، جو محض ایک نوجوان عورت کے شایان ہے

امید ہے کہ مصنف کی کوششیں جاری رہیں تو اُن کے کارناموں سے اُردو افسانوی ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہو سکے گا۔ ہر زبان کو اپنے ابتدائی دور نشو نما میں ہمیشہ اور اُس کے بعد بھی کبھی کبھی دوسری زبانوں سے مدد لینی پڑتی ہے۔ ترجمہ کئے ہوئے خیالات سے اُس کے مختلف شعبوں میں

اضافہ ہوتا ہے اور جیسے ہم نے ابھی ابھی کسی مقام پر لکھا ہے، کہ ادبیات میں جب تک "مقامی رنگ" قومی اور ملکی خصوصیات داخل نہو جائیں، وہ ایک اجنبی شئے رہیگی اس لئے جہاں چند قصہ نگار ترجموں کا کام کر رہے ہیں، دوسروں کو چاہئے کہ وہ مغربی قصوں کو اپنانے کا کام انجام دیں

مخزن نکات صفحات ۱۰۵ تقطیع $\frac{۲۴ \times ۳۶}{۱۶}$ قیمت فی جلد عہ سکہ انگریزی۔ مطبوعہ انجمن ترقی اُردو۔ اورنگ آباد دکن۔

"مخزن نکات" اُردو کے اولین تذکروں میں سے ہے۔ یہ میر اور گردیزی کے تذکروں کے بعد لکھا گیا تھا۔ اس کے مصنف قیام الدین قائم چاندپوری ہیں۔ جو اُردو کے شاعر اور میر اور سودا کے معاصر اور آخرالذکر کے شاگرد بھی تھے۔ یہ تذکرہ اب تک شائع نہیں ہوا تھا۔ انجمن ترقی اُردو نے اس کو فراہم کرکے، مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے معتمد انجمن کے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

تذکرہ نویسی اُردو اور فارسی ادبیات کا ایک اہم جزو ہے۔ تاریخ اور شاعری کے ساتھ ساتھ تذکرہ نویسی بھی نشو ونما پاتی رہی تذکرے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو مشاہیر کے تذکرے۔ دوسرے شعرا کے تذکرے ان میں سے پہلی قسم کے تذکرے تاریخ اور دوسری قسم کے تاریخ ادبیات کے قائم مقام ہیں۔ تذکرہ شعرا کی ابتدا درحقیقت ان بیاضوں سے ہوتی ہے، جو شعرا یا اصحاب ذوق زمانہ قدیم میں اپنی یادداشت کے طور پر لکھکر رکھا کرتے تھے۔ ان ہی میں کبھی کبھی ان شعرا کا حال بھی ہوتا تھا، جن کا کلام انتخاب کیا جاتا۔ بعض وقت تذکرہ نویسوں نے شعرا کے متعلق اپنی رائیں بھی ظاہر کی ہیں۔ گویا اس طرح تذکرہ شعرا کی اہمیت کے دو پہلو ہو جاتے ہیں ایک طرف تو وہ تاریخ ادبیات کے بیشتر سواد کے حامل ہوتے ہیں۔ دوسری طرف، وہ تنقید کی اہمیت بھی رکھتے ہیں۔

"مخزن نکات" قدیم شعرا کا ایک مختصر سا تذکرہ ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اکثر شمالی ہند کے تذکروں کے برخلاف، اس میں دکھنی ریختہ گویوں کے حالات اور کلام کے اندراج کا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے۔ تقریباً ایکسو شاعروں کا حال اس میں درج ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عام مشرقی ادیبوں خصوصاً تذکرہ نویسوں کا اسراف الفاظ اس میں بھی پایا جاتا ہے۔ تاہم بعض مشہور شعرا مثلاً میر تقی میر، سودا، سوز، درد وغیرہ کے متعلق قائم کی رائے قابل توجہ ہے۔ جن میں اکثروں کے ساتھ مصنف کو ذاتی تعلق رہ چکا ہے۔

تذکرہ بعض ایسے واقعات سے بھی پاک نہیں ہے، جو قدیم زمانے میں مسلمات سمجھے جاتے تھے۔ لیکن اب جدید تحقیقات کی رو سے غلط ثابت ہو رہے ہیں۔ مثلاً سعدی شیرازی کو سعدی ہندی کے ساتھ خلط ملط کرکے، اس کا ذکر پہلے اردو شاعر کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ ولی کو گجرات کا متوطن سمجھا اور

اس کی شاعری کی ابتدا دہلی میں پہنچنے کے بعد سے شمار کی ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے کے مقدمہ سے تذکرہ کے متن اور قائم کی حیات پر روشنی پڑتی ہے۔ تذکرہ کی اہمیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ بعض امور پر جدید معلومات کی رہبری میں تنقید بھی کی گئی ہے جس سے تذکرے کے بعض غلط اندراجات کی تصحیح ہو جاتی ہے۔

یہ کام انجمن ترقی اردو کے مفید کارناموں میں سے ہے۔ اردو زبان کا قدیم مواد فی الوقت زیادہ تر اسی قسم کے تذکروں میں مدفون ہے۔ اس لئے قدیم شعرا سے متعلق جس قدر تذکرے شائع ہوتے جائیں، اس سے اردو ریسرچ میں سہولتیں پیدا ہوتی جائیں گی۔

تذکرۃ الخواتین | مرتبہ مولوی عبدالباری صاحب آسی۔ ضخامت ۲۸۸ صفحات مطبوعہ نول کشور پریس لکھنو قیمت درج نہیں۔

یہ سو سے زاید اردو فارسی شاعر خواتین کا تذکرہ ہے۔ مولوی عبدالباری صاحب آسی نے جگہ جگہ سے شاعر عورتوں کے حالات اور نمونہ کلام فراہم کرکے ردیف دار اس تذکرہ کو ترتیب دیا ہے۔ ابتدا میں (۷) صفحات کا مقدمہ یا دیباچہ ہے جس میں مولف نے عورتوں کی شاعری پر دلچسپ بحث کی ہے اور اُن کے محاسن شاعری گنائے ہیں۔

پہلا حصہ جو (۱۸۰) صفحوں پر ختم ہوتا ہے صرف اُردو گو شاعرات کے لئے وقف ہیں۔ باقی میں فارسی گو خواتین کا ذکر ہے۔ جیساکہ مولف نے بتایا ہے۔ شعر گوئی ایک وہبی فن اور عطیہ قدرت ہے اور ہر قوم اور ہر فرقہ کے آدمی اس کے حامل ہیں۔ چنانچہ اس تذکرہ کے متعدد شاعر۔ خواتین بلحاظ پیشہ طوایف ہیں۔ مولف اُن کے بیان میں مجبور رہے لیکن ایسی عورتوں کے نام کے آگے (ط) کی علامت لگا دی ہے۔ اس تذکرہ سے شاعر عورتوں کی نسبت اچھی معلومات ایک جگہ جمع ہو گئی۔ مؤلف کی سعی قابل قدر اٹھائی ہے۔ فارسی کے نمونہ کلام کا اُردو میں ترجمہ بھی کیا گیا ہے جس سے کم استطاعت قارئین آسانی سے اشعار کا مطلب سمجھ سکتے ہیں۔

"س" "وودھ"

ہندوستان بھر کا واحد تعلیمی ہفتہ وار

اخبار تعلیم لاہور

یہ بات مسلمہ ہے کہ کسی ملک کی زندگی اور موت کا انحصار محض اس کی تعلیم پر ہوتا ہے لیکن افسوس ہے کہ ہمارے ملک کی تعلیمی حالت نہایت گری ہوئی ہے۔ چنانچہ تعلیم سے بے اعتنائی کا یہ بھی ایک ثبوت ہے کہ ملک بھر میں اخبار ہذا کے اجرا سے پہلے کوئی بھی خالص تعلیمی اخبار نہ تھا پس یہ ہفتہ وار اخبار سنہ ۱۹۲۳ء سے محض تعلیمی معاملات پر بحث اور رائے زنی کرنے اشاعت تعلیم کی تجاویز سوچنے۔ سررشتہ تعلیم کے جملہ اہلکاران اور بالخصوص کم مشاہرہ مدرسین کی زبردست وکالت اور ترجمانی کرنے اور ہر قسم کے علمی۔ عملی اور اخلاقی مضامین اور نیز تازہ بتازہ معلومات اور خبروں کے شائع کرنے کے لئے جاری کیا گیا ہے۔ اور اس اخبار میں چار صفحات رفیق الاطفال کے نام سے علیحدہ علیحدہ موٹے خط سے چھوٹے بچوں کے لئے بھی چھاپے جاتے ہیں۔ جو بچوں کے ہاتھوں میں علیحدہ کے علیحدہ دیئے جا سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں رفیق نسواں کے عنوان سے دو صفحے لڑکیوں اور عورتوں کے لئے ہوتے ہیں۔ الغرض یہ اخبار تعلیمی خبروں اور مضامین کی اشاعت کے علاوہ ہر قسم کی دلچسپیوں کا بینظیر مجموعہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اخبار نہایت مقبول ہوا ہے۔ اور سرکاری اور غیر سرکاری طور پر بکثرت سکولوں میں بہم پہنچایا گیا ہے چنانچہ اسوقت ہندوستان بھر کے قریباً سب اردو ہفتہ وار اخباروں سے زیادہ چھپتا ہے۔ پس ہر مدرس طالبعلم اور ہر خیرخواہ ملک و قوم کو اس کا خریدار بنکر خود مستفید ہونے کے علاوہ اپنے ملک و قوم کو بھی بام عروج پر پہنچانا چاہیئے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ دیدہ زیب ہیں اور اپنی سب خوبیوں کے باوجود قیمت سالانہ صرف للعہ ششماہی ۳ روپے اور سہ ماہی عہ/ ۱ روپے لی جاتی ہے۔ نمونہ مفت ارسال ہوتا ہے۔ اس اخبار کو ڈائرکٹر صاحب بہادر سررشتہ تعلیم ریاست حیدرآباد دکن نے اپنی چٹھی نمبر ۱۹۹ مورخہ ۱۳ ڈسمبر سنہ ۱۹۲۴ء کے ذریعہ تمام مدارس تحتانیہ وسطانیہ اور فوقانیہ کے لئے منظور کیا ہے۔ اور اسے اکثر مہتمم صاحبان تعلیمات اور صدر مدرسین صاحبان سرکاری روپیہ سے اپنے مدارس کے لئے خرید رہے ہیں۔

المشتہر — منیجر اخبار تعلیم۔ لاہور۔ موہنی روڈ

جسکو باشندگان حیدرآباد کے علاوہ معززین کا، اور ڈاکٹروں نے صدہا مریضوں پر امتحان کر کے سینکڑوں سرٹیفکٹ عطا کئے۔ زندہ طلسمات ملکی ہونے کے علاوہ رجسٹرڈ اور پیٹنٹ شدہ ہے۔ حسب ذیل امراض پر آناً فاناً میں طلسمی اثر دکھانا اُس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ مثلاً ہیضہ، پلیگ۔ بخار۔ پیچش۔ متلی۔ کھانسی۔ دمہ۔ بواسیر۔ خارش۔ سانپ۔ بچھو کے زہر اور ہمہ اقسام کے درد کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے آزمائیے ایک بار ضرور آزمائیے۔ پبلک کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے۔ شیشی نمبر (۱) عہ نمبر (۲) ۸ر نمبر (۳) ۴ر ایک درجن کے خریدار کو خرچہ وی۔ پی۔ معاف ہوگا۔

پتہ خط اور تار کا ”زندہ طلسمات حیدرآباد دکن“

وچیٹال بام

بیرونی استعمال کی پرتاثیر اور لاجواب دوا

یہ دوا بیرونی استعمال کے لئے آپ اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزا سے مرکب اور بالکل بے ضرر ثابت ہو چکی ہے۔ جو اقسام کے اعصابی و اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس کو سالہا سال کے تجربہ اور عرق ریزی کے بعد اعلیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے۔ اور متعدد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اسکو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں اس سے زیادہ پر اثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے۔ کوئی گھر اور خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہئے۔ استعمال کے ساتھ ہی اپنا برقی اثر دکھلاتی ہے۔ اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہو جاتا ہے علی الخصوص نقرس وجع مفاصل دمہ۔ درد سر۔ درد سول۔ بچھو کے زہر کے لئے زخم کے لئے اور جلے ہوئے جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال۔ تھوڑی دوا ایکدن میں تین چار وقت مقام ماؤف پر ملیں اور اگر افاقہ نہ ہو تو دوا کے استعمال سے پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر اچھی طرح اعصاب کو بھاپ دیں اور سینکا کریں جو اصحاب بغرض امتحان دوا طلب فرماویں بخوشی تعمیل کیجائیگی۔

نوٹ۔ ہمارے دواخانہ میں ہر قسم کی تازہ ادویات کا ذخیرہ ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اور نسخہ جات نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کئے جاتے ہیں۔

المشتہر جمیل اینڈ کمپنی ڈسپنسنگ کیمسٹ اسٹیشن روڈ قریب محکمہ مالگذاری حیدرآباد دکن ستھا

مطبوعاتِ مکتبہ

دکن میں اردو ۔ مولفہ مولوی محمد نصیر الدین ہاشمی صاحب منشی فاضل ۔ جنوبی ہند میں اردو کی ابتدائی تاریخ قطب شاہی عادل شاہی اور آصف جاہی دور ان میں اردو نظم و نثر کی حالات اور شعرائے اردو کا تذکرہ معہ نمونۂ کلام ضخامت ۴۸۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا بار دوم قیمت للعہ

بیابانِ اردو ۔ مرتبہ جناب محمد عارف صاحب حیدرآبادی ہندوستان کے ممتاز اردو انشا پردازوں اور نامی گرامی شعرا کے نظم و نثر کا بہترین انتخاب جو مدارس کے تعلیمی نصاب کیلئے نہایت موزوں ہے ضخامت تقریباً ۴۲۵ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد سادہ للعہ

روحِ تنقید ۔ مصنفہ مولوی ابو الحسنات سید غلام محی الدین قادری زور ایم اے ۔ فن تنقید کے متعلق اردو زبان میں پہلی کتاب ہے جس میں ماضی و حال کے علمائے یورپ کی تنقیدی اصول بیان کیے گئے ہیں اور ان اصولوں کی روشنی میں مثنوی سحر البیان پر ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے ضخامت ۲۵۵ سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ بار دوم قیمت عہ

تنقیدی مقالات ۔ مصنفہ زور صاحب ۔ یہ روح تنقید کا دوسرا حصہ ہے جس میں مصنف نے روح تنقید کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں انگریزی، فارسی اور اردو زبانوں کے مشہور اہل قلم کی قلمکاریوں پر تنقید کر کے اصولوں کا استعمال دکھلایا ہے اور نیز بعض مشہور اردو انشا پردازوں کے طرز تحریر پر تبصرہ کرنے کے خاص خاص اصول بیان کئے گئے ہیں ضخامت ۲۵۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی وغیرہ عمدہ مجلد سادہ ہے

اردو کے اسالیبِ بیان ۔ مصنفہ زور صاحب ۔ نثر نگاری کی ابتدائی کیفیت ۔ ابتدا سے لیکر آج تک کے نثر نگاروں کے طرز تحریر و انداز بیان کا تذکرہ ۔ خاص طرز تحریر کے اردو انشا پردازوں کے اسالیب بیان پر تبصرہ ضخامت ۴۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد سادہ عہ

سلطان محمود غزنوی کی بزمِ ادب ۔ مصنفہ زور صاحب ۔ سلطان محمود غزنوی سے پہلے اور بعد کے علم و ادب کے حالات سلطان محمود غزنوی کے علمی و ادبی کارنامے ترتیب کتاب میں پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران سے استفادہ کیا گیا ہے ضخامت ۱۲۰ صفحے ۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۱۲ر

دنیا کے افسانے ۔ مصنفہ مولوی محمد عبد القادر سروری ایم اے ایل ایل بی ۔ افسانہ نگاری کی ابتدائی تاریخ ۔ اور افسانہ نویسی کے اصول دکھلائے گئے ۔ اردو زبان میں اپنے مضمون کی پہلی کتاب ہے ضخامت ۲۱۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی بہترین قیمت عہ

مبادی فلسفہ ۔ مولفہ مولوی میر حسن الدین صاحب بی اے ایل ایل بی ۔ ڈاکٹر اے ایس راپورٹ پی ایچ ڈی کی پرائمر آف فلاسفی کا ملخص با محاورہ اور عام فہم اردو ترجمہ ضخامت ۱۳۶ صفحے ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن ۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۱۲ر

اربابِ نثرِ اردو ۔ مصنفہ مولوی سید محمد صاحب قادری ایم اے ۔ فورٹ ولیم کالج کے اردو اہل قلم کے تحقیقی حالات اور ان کے مصنفات پر تنقید و تبصرہ ۔ انیسویں صدی عیسوی کی اردو نثر نگاری کی تاریخ ضخامت ۲۴۴ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت عالع

آثار الکرام جلد اول ۔ مصنفہ شمس المورخین جناب حکیم سید شمس اللہ قادری ایم آر اے ایس ۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے علمی و ادبی کارناموں کی محققانہ تاریخ ضخامت ۲۴۴ صفحے ۔ سائز ۲۰×۲۶/۱۶ کاغذ چکنا ۔ لکھائی چھپائی خاصی قیمت ۲ر

جواہرِ کلیاتِ نظیر ۔ منتخبہ جناب مولانا ذہین و سید مختار احمد ۔ نظیر اکبرآبادی کے کلیات سے اخلاقی ۔ ادبی ۔ نصیحت آموز ظرافت آمیز اور دلنواز نظموں کا مجموعہ ضخامت ۲۸۰ صفحے ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن ۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی خاصی قیمت عہ

عقائدِ امام ۔ مترجمہ مولوی محمد عبد الغفور عابدی صاحب فقہ اکبر کا عام فہم اور با محاورہ اردو ترجمہ ۔ قیمت ۴ر

اسوۂ حسنہ ۔ مصنفہ مولوی احمد عبد اللہ مسدوسی بی اے ۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کے سامنے کیسی زندگی پیش کی تھی ضخامت (۸۰) صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۸ر

دکنی لغت ۔ مولفہ مولوی سید شعار احمد شعار ہاشمی ۔ اردوئے قدیم یعنے دکھنیات کا لغت جس میں دکنی زبان کے الفاظ و محاورات کی تشریح کی گئی ہے ضخامت ۱۲۱ صفحے ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن ۔ کاغذ چکنا ۔ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ۸ر

شاہ رفیع الدین قندھاری ۔ مرتبہ مولوی محمد عبد الغفور صاحب عابدی ۔ دکن کے ایک مشہور صاحب دل صوفی عالم کے دلچسپ حالات ضخامت ۴۸ صفحے ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن ۔ کاغذ چکنا ۔ لکھائی چھپائی قیمت ۵ر

خزینۂ اخلاق ۔ مصنفہ مولوی سید عبد العزیز صاحب عزیز اخلاقی و ادبی نظم و نثر کا مجموعہ ۔ ضخامت ۶۴ صفحے ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۱ر

سیرتِ خیر البشر و سیرت مبارک مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالے جس میں آنحضرت صلعم کے مکارم اخلاق بیان کیے گئے ہیں ۔ قیمت ۱ر

نیک بی بی ۔ مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالہ جس میں بتلایا گیا ہے ۔ نیک خو بی بی کس طرح اپنے بدخو شوہر کو ٹھیک کر سکتی ہے ۔ قیمت ۲ر

چھوٹا شیطان ۔ مصنفہ مولانا ذہین ۔ منظوم اخلاقی رسالہ قیمت ۱ر

ملنے کا پتہ ۔ انجمن امداد باہمی مکتبۂ ابراہیمیہ روبروئے محکمۂ مالگذاری اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

مطبوعہ مطبع مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن باہتمام رام کشن لیتھوگرافر مہتمم مطبع

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ

مدیر

محمد عبدالقادر سروری

ایم اے، ال ال بی

۱- یہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا ماہوار رسالہ ہے۔
۲- یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جسمیں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔
۳- بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالۂ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔
۴- قیمت سالانہ (للعہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عمار) فی پرچہ ۶
۵- اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (صہ) نصف کے لئے (سے) اور چوتھائی کے لئے عہ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲ ½ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

مجلہ مکتبہ کی خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے انکے نام رسالہ سال بھر کیلئے بلا قیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خریدیں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ مکتبہ بلا قیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے ان کو ایک رسید دیجائے گی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبوں کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحت بالا رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں منتظم مجلہ مکتبہ کے پاس بھیجدیں رسالہ انکے نام جاری کر دیا جائیگا یہ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ترسیل زر، مضامین اور جملہ خط و کتابت بتوسط "منتظم مجلہ مکتبہ" مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ہونی چاہیئے۔

رجسٹری نشان نمبر سرکار آصفیہ (٦٥)

رجسٹری نشان پٹہ سرکار انگلشیہ (۰۰۰۰۰)

مجلہ مکتبہ

جلد (۳) بابتہ ماہ شہریور ۱۳۳۸ف مطابق جولائی ۱۹۲۹ء شمارہ (۴)

تصاویر

(۱) ڈاکٹر سید غلام محی الدین صاحب قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی

(۲) ابن نشاطی

فہرست

شذرات

پچھلے مہینے کی آخری تاریخوں میں اساتذہ حیدرآباد کی تیسری سالانہ کانفرنس سررشتہ تعلیمات
کے فاضل ناظم مولوی خان فضل محمد خان صاحب کے زیر صدارت منعقد ہوئی یوں تو آج کل کی کانفرنس بازی
مرض متعدی کی طرح عام ہوگئی ہے اور ہر طبقہ اور پیشہ کے لوگ کانفرنسیں منعقد کرتے رہتے ہیں لیکن اس
سے قطعی انکار نہیں ہوسکتا کہ اساتذہ کے معزز گروہ کا ایسا سالانہ اجتماع اور باہمی تبادلہ خیالات کا موقع
مفید ثمرات مترتب کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ فاضل صدر نے اپنے خطبہ کی بنیاد ادبی حرکتوں اور فلسفیانہ بلند
خیالیوں کی بجائے عمل اور صرف عمل پر رکھ کر اساتذہ کو وہ تجربہ کارانہ نصائح کی ہیں اور ایسی ہدایات
عمل دی ہیں کہ اگر عہدہ داران سررشتہ و اساتذہ ان کی طرف خاطر خواہ توجہ کریں تو یقیناً ہمارے
سررشتہ تعلیمات کا مستقبل نہایت شاندار ہوجائیگا۔

یہ واقعہ ہے کہ ہمارے مدارس میں ذہنی تعلیم کی طرف خاص توجہ کی جاتی ہے اور عام رجحان
یہی ہے کہ جہاں تک بن پڑے اس میں کوتاہی نہ کی جائے۔ یہ بجائے خود کتنا ہی لائق ستائش کیوں
نہ ہو لیکن جیسا کہ فاضل صدر نے اپنے خطبے میں بتایا ہے جسمانی تربیت اور کردار سازی کی طرف سے
بے توجہی روا رکھتے ہوئے محض ذہن کی نشوونما اور پالش پر ساری قوت صرف کردینا کسی طرح صحیح نہیں
ہوسکتا۔ اس فروگذاشت نے ہماری ذہنی تعلیم کی متوقعہ افادیت میں بڑی کمی کردی ہے اور اب تو
یہ نقص ناقابل برداشت ہوتا جارہا ہے۔

ہمارے نظام تعلیم کا ایک اور بڑا نقص صنعت و حرفت اور دستکاری کا نصاب تعلیم
میں فقدان ہے جو روز افزوں بے روزگاری کے مدنظر فوری اور کافی توجہ کا مستحق ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ کانفرنس
کے فاضل صدر جو سررشتہ تعلیمات کے تجربہ کار افسر اعلیٰ ہیں اس کے خوفناک عواقب و نتائج سے بخوبی
واقف ہوں گے۔ موجودہ ذہنی تعلیم بجائے خود نہایت مفید ہے مگر یہ بدیہی حقیقت ہے کہ محض ذہنی تعلیم
سے ملک کی ضروریات پوری نہیں ہوسکتیں۔ صرف اس تعلیم کو پاکر توقع نہیں کی جاسکتی کہ آئندہ نسلیں
پرامن شہریوں اور خوشحال و شاد کام رعایا کی حیثیت سے زندگی بسر کریں گی اور اپنے ملک کی فلاح و بہبود
میں حصہ لے سکیں گی۔

موجودہ ذہنی تعلیم کا لازمی یہ اقتضا ہے اور جب تک ہمارے نظام تعلیم میں تبدیلی نہ ہوگی ہمیں

ہو گیا کہ تعلیم یافتہ سرکاری ملازمتوں کی طرف مائل ہو گئے۔ ہم موجودہ ذہنی تعلیم سے جس کو تعلیم یافتوں کی روز افزوں بے روزگاری اور بے کاری کو دیکھتے ہوئے مجبوراً ناقص کہا جا رہا ہے۔ اور جس کی بدولت تعلیم یافتہ سوائے چاکری کے کسی اور مصرف کے بن نہیں سکے۔ کیسے یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ آزاد پیشوں اور حرفت وزراعت کے میلانات پیدا کرے گی۔ ہمارا نظام تعلیم کیا شہری مدارس، کیا دیہاتی مدارس اور کیا نسوانی مدارس سب جگہ یکساں ہے۔ تجربات یہ بتا رہے ہیں کہ اس نظام تعلیم کی وجہ سے زراعت پیشہ اور تاجر کی اولاد بھی تعلیم کے ساتھ ہی اپنے آبائی پیشوں سے نفرت کرنے لگتی ہے۔ اور ملازمت ہی کو بالطبع پسند کر رہی ہے۔

اس خرابی کا اندفاع جیسا کہ فاضل صدر نے اپنے خطبہ میں اشارہ کیا ہے شہری مدارس میں حرفتی تعلیم کے رواج اور نفاذ پر منحصر ہے۔ نیز دیہاتی مدارس میں صرف زراعت یا دیہاتی معلومات کی چند سرسری کتابوں کے بجائے ایسا مختص نصاب ہونا چاہیئے جو ان مدارس کے طلبہ میں زراعت سے کسی قسم کی برگشتگی و بیزاری پیدا ہونے نہ دے اور یہ طلبہ اپنا نصاب ختم کرتے ہی ملازمت کو ایک آنکھ دیکھنے کی زحمت بھی گوارا کئے بغیر پورے ذوق وشوق سے زراعت میں لگ جائیں

اسی طرح زنانہ مدارس میں معاشیات خانہ داری کی جو اس وقت برائے نام ہے زیادہ نہیں، وسیع رواج اور فروغ کی ضرورت ہے کیونکہ بغیر اس کے جس طرح تعلیم یافتہ ملازمت کے لئے در در حیران و پریشان ہیں، تعلیم یافتہ عورتیں بھی اپنے فرائض و وظائف کی ادائی سے متنفر ہو کر ملازمت ہی کی خواہاں ہوں گی۔ اگرچہ ابھی ہمارے ملک میں خواتین میں بے روزگاری نہیں پائی جاتی لیکن دور کیوں جائیے میسور ہی میں جہاں تعلیم نسواں نے کافی ترقی کی ہے اس کی واضح اور بین مثال موجود ہے۔ چند روز پہلے خواتین کے ایک وفد نے دیوان ریاست کے ہاں باریاب ہو کر خواہش کی کہ انہیں بھی ملازمتیں دی جائیں۔ ابھی وقت ہے کہ ہم پڑوس کے تجربات اور قریب کی مثال سے فائدہ اٹھا کر اپنے زنانہ نصاب تعلیم میں ایسی تبدیلی کر دیں کہ مدارس کی لڑکیاں بجائے بہتر سرکاری ملازم بننے کے بہتر اور قابل مائیں بننے لگیں اور ملک کی آئندہ نسلیں ان تعلیم یافتہ ماؤں کی گودوں میں پل کر حقیقی معنوں میں ترقی یافتہ و شائستہ انسان بن سکیں۔

جامعہ عثمانیہ کے جو طلبہ اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ روانہ کئے گئے ہیں ان کی شاندار کامیابیوں نے ہماری ملکی جامعہ کا مستقبل نہایت خوش آئند بنا دیا ہے اور یہ حقیقت روز بروز زیادہ مدلل طریقہ پر ثابت ہوتی جا رہی ہے کہ اردو نہایت کامیابی کے ساتھ ذریعۂ تعلیم بن سکتی ہے اور ہندوستان

کے تابناک مستقبل کے خواب کی اگر کوئی تعبیر ہوسکتی ہے تو یہی جامعہ عثمانیہ ہے۔ اسی مہینے جامعہ کے دو ہونہار سپوتوں کی یورپ میں امتیاز و اعزاز کے ساتھ کامیابی نے اس حقیقت کے اثبات کی ایک اور دلیل پیدا کر دی مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری ایم، اے نے انجنیری کا امتحان بی ایس سی جامعہ مانچسٹر سے بدرجہ اعلیٰ پاس کیا اور مولوی سید غلام محی الدین صاحب قادری زورؔ ایم، اے نے آریائی لسانیات وصوتیات میں جامعہ لندن کے فقید العصر اساتذہ کے زیر تربیت پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ دونوں امتحان اس قدر مشکل ہیں کہ شاذ ہی ہندوستانی طلبہ نے اس اعزاز کے ساتھ انہیں کامیاب کیا ہو۔

ہمارے ان دونوں احباب نے میٹرک سے لے کر ایم اے تک جامعہ عثمانیہ ہی میں تعلیم پائی اور ان کے ذہنی نشو و نما اور شاندار کامیابیوں کا سہرا سراسر جامعہ عثمانیہ کے سر ہے۔

اس نمبر میں ایک تصویر ابن نشاطی قطب شاہی عہد کے مشہور شاعر کی شائع کی جارہی ہے۔ یہ بالکل نیا اور نادر الوجود ہے۔ ہمارے مکرم مولوی زورؔ صاحب نے جن کا اس اشاعت میں ایک مضمون "ابن نشاطی اور پھول بن" کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے، برٹش میوزیم کے ایک مخطوطے سے بدآمد کر کے خاص مجلۂ مکتبہ کے لئے عنایت کی ہے۔ دوسری تصویر صاحب مضمون کی ہے جو بار بار کے تقاضہ کے بعد عنایت ہوئی ہے۔

تعطیلات سے فائدہ اٹھا کر مولوی زورؔ صاحب جو پہلے جرمنی وغیرہ کی سیاحت کا ارادہ کر چکے تھے، اپنے والد محترم کے یاد کرنے اور بلوانے پر حیدرآباد تشریف لائے ہیں۔ آپ لسانیات میں ڈی لٹ یا ڈی ایس سی کی ڈگری کیلئے ختم تعطیلات پر پھر یورپ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

سلطان علاء الدین حسن بہمنی

از

مولوی محمد احمد صاحب انصاری۔ بی۔ اے۔ ایل ایل بی

ذیل کا فاضلانہ مقالہ ہمارے مکرم دوست انصاری صاحب کا وہ اہم مضمون ہے جو جامعہ عثمانیہ کی بزم تاریخ میں ممتاز مورخین اور طلبائے تاریخ کے آگے پڑھا گیا اور جو بے حد مقبول ہوا مضمون کافی طویل ہے۔ اس کی پہلی قسط اس نمبر میں پیش کیجاتی ہے آئندہ ماہ میں اس کا دوسرا حصہ شائع کرکے مضمون کو مکمل کردیا جائیگا۔ (مکتبہ)

تمہید "سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی کی شخصیت اپنے زمانہ کی پیداوار تھی"۔ وہ اُس زمانہ میں پیدا ہوا جبکہ اوقات اس کے منتظر تھے اور اُس کی ضرورت دنیا میں محسوس کیجارہی تھی۔ جس ملک کو اور جس زمانہ کو اسکی شخصیت کی حاجت تھی۔ اسی ملک میں اور اسی زمانہ میں اُس نے نہایت ہمارگی اور سنجیدگی سے اپنے مفوضہ فرض کو ادا کیا اور تاریخ عالم کے اسٹیج پر جو حصہ اس کے سپرد کیا گیا تھا نہایت ہی جرات اور بیباکی سے اس کو پورا کیا۔ بعض مورخین کا زمانہ حال تک یہ خیال تھا کہ بہمنی سلطنت ایک بلائے ناگہانی کی طرح اچانک عالم وجود میں آگئی اور چوروں کی طرح کچھ دنوں تک دنیا میں لوٹ مار مچا کر چل بسی بعض مورخ لکھتے ہیں کہ بہمنی خاندان کی تاریخ ایک روکھی پھیکی داستان ہے جس کو تاریخ عالم سے کوئی سروکار نہیں۔

لیکن یہ دونوں خیال بالکل غلط ہیں اگر مورخین اپنے بعض تعصبات مذہبی و قومی کو کچھ دیر کے لئے اپنے پیش نظر نہ رکھکر تاریخ کا ان قوتوں کی روشنی میں مطالعہ کریں جو انسان کی زندگی اور اس کے افعال و احساسات کو متحرک کرتی ہیں اور اس کے افعال اور زندگی پر حاوی ہیں تو ظاہر ہو جائے گا کہ دنیا کا کوئی واقعہ جو حیات انسانی سے متعلق ہو بذات خود اکیلا نہیں ہوسکتا۔ اس قسم کے جتنے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ اپنے واقعات ماسبق سے بطور نتیجہ کے برآمد ہوتے ہیں اور ان دونوں میں علت و معلول کا تعلق ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایک واقعہ کو دنیا کے کسی دوسرے واقعہ سے تعلق نہیں ہے تو یہ بالکل غلط ہوگا۔ کیونکہ تاریخی واقعات سے مراد وہ واقعات ہیں جو انسانی

معاشرہ میں بحیثیت مجموعی ظاہر ہوتے ہیں اور انسان کے باہمی تعلقات سے مترتب ہو کر انسانی معاشرہ کو متاثر کرتے ہیں۔

یہ واقعات انسانی زندگی میں ہر لمحہ پیدا ہوتے اور اُن کے اثرات ایک دوسرے پر پڑتے رہتے ہیں اور پھر یہی موجودہ واقعات اپنے بعد آنے والے واقعات کی علت یا وجہ ہوتے ہیں۔

گو بنی نوع انسان میں رنگ قوم مذہب وزبان وغیرہ کے لحاظ سے ظاہرا بہت فرق معلوم ہوتا ہے۔ لیکن در اصل انسان کا دماغ اور انسان کی نشو ونما اور اُس کی فطرت ہر جگہ اور ہر وقت ایک ہی رہی ہے۔ ظاہری اور مصنوعی اختلافات جس کی وجہ سے ہم خاص حصول میں بسنے والے لوگوں کو خاص ناموں سے موسوم کرتے ہیں یا خاص خیالات رکھنے کی وجہ سے اُن کو خاص فرقوں یا گروہ میں تقسیم کر دیتے ہیں اُس کی فطرت کو نہیں بدل سکتے۔

ایک گورے رنگ کا انسان، یا عیسائی مذہب کا پیرو ایسا ہی انسان ہے جیسا کہ ایک کالے رنگ والا آدمی یا زرد رنگ رکھنے والا چینی اور بدھ مت کا پیرو انسان کہلانے کا مستحق ہے۔ اگر انسان کی جسمانی حالت میں کوئی ارتقا ہو تو اس سے گورے، کالے، عیسائی، مسلمان سب متاثر ہوں گے اور اب تک جو کچھ ارتقا اُس کی جسمانی حالت میں ہوا ہے اس سے ظاہر ہے کہ موجودہ گروہ انسانی پوری طرح متاثر ہے۔ ممکن ہے کہ زیادہ مہذب اور گورے رنگ والا انسان اپنی حیرت انگیز ایجاد و کل اور برق کے استعمال کی وجہ سے اپنے جسمانی نشو ونما میں نمایاں ترقی کرے اور یہ بھی ممکن ہو کہ اس کے ہاتھ پیر بیکار ہو کر جھڑ پڑیں لیکن یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ اُس سے کالے رنگ والے متاثر نہ ہوں گے کم از کم موجودہ زمانہ کی رفتار اور اُس کے حالات پر غور کرنے کے بعد ہم یہ نہایت عمدگی سے تصور کر سکتے ہیں کہ اگر گورے رنگ والے ہم سے کچھ پیشتر بیکار ہو جائیں گے تو اُن کے بعد پھر ہماری باری ہے۔ اگر برق اور کل کی قوت سے آج یورپ خدائی کر رہا ہے تو ہندوستان یا دکن یا آفریقہ ان چیزوں سے بالکل ناواقف نہیں ہے اور نہ اُن کو نہایت ہی لاپروائی سے دیکھ رہا ہے۔

اسی طرح اُس کی فطرت اور دماغی حالت یکساں واقع ہوئی ہے۔ یعنی اگر کوئی انسان اُس کی قابلیت رکھتا ہے کہ ہوائی جہاز یا لاسلکی پیام رسانی والا سکی مصوری کا موجد ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ دوسرے انسان کا دماغ سرے سے اُس کی قابلیت ہی نہیں رکھتا بلکہ ہر ایک انسان کا دماغ اتنی ہی قابلیت اور قوت رکھتا

ہے جتنا دوسرے انسان کا۔ اگر کوئی خاص شخص کسی چیز کا موجد ہے اور دوسرا نہیں ہے تو یہ اس کے دماغ کی فطرتی اور پیدائشی قابلیت کا قصور نہیں بلکہ بیرونی اثرات کی وجہ ہے۔ ایک شخص اپنے دماغ کی قوت کو ترقی دیتا ہے اور دوسرا اس کو زائل کر دیتا ہے یا اس کا استعمال نہیں کرتا۔ اسی وجہ سے انسانوں میں فرق پیدا ہوتا ہے لیکن یہ فرق ظاہری اور مصنوعی ہے اگر بیرونی اثر اور ماحول کی وجہ سے کسی شخص کا دماغ کوئی کام نہیں کرتا تو اس کو انسان کے دماغ کی قابلیت یا ناقابلیت پر محمول نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کی دوسری وجوہات ہیں جن کو ہم طوالت کے خیال اور غیر متعلق ہونے کی وجہ سے نظر انداز کر دیتے ہیں۔

جب ہم یہ نظریہ قائم کر چکے کہ انسان کی طبیعت اور اس کی فطرت اور دماغی حالت ایک سی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کی ترقی اور تنزل ایک سا ہونا چاہئے۔ انسان کی زندگی ایکساں ہی ہے۔ اور جو فرق نظر آتا ہے وہ مصنوعی ہے۔ یہاں جو اصول کام کرتا ہے وہ "وقت اور مقام" کا فرق ہے۔

مثلاً اہل انگلستان نہایت ترقی یافتہ اور بہت مہذب ہیں اور اس کے برخلاف افریقہ کے صحرائی وحشی اور انتہا درجہ کے غیر مہذب ہیں تو یہ فرق اُن کی فطرت کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے بلکہ انگلستان اور افریقہ کے صحرا میں مقام اور وقت کا جو فرق ہے وہ اس کا باعث ہے۔ یعنے ایک واقعہ ایک خاص وقت میں ایک خاص جگہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس کا اثر اس مقام پر اسی وقت ہو جاتا ہے اور پھر وہ دوسرے مقام کو حالات اور دوسرے موجودہ واقعات کو متاثر کرتا ہے۔ اور اس کے لئے مدت کی ضرورت ہے۔ جیسے سمندر کے کسی حصہ میں طوفانی ہوائیں ظاہر ہوتی ہیں تو اس وقت اتنا ہی حصہ متاثر ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہاں ایک طلاطم پیدا ہو جاتا ہے۔ اور بڑی بڑی موجیں اُٹھنے لگتی ہیں۔ پھر وہ ہوائیں وہاں سے گزر کر دوسرے حصہ پر وارد ہوتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ امواج کے تھپیڑے اپنے قریب کے پانی کو متحرک کرتے ہیں اور اسی طرح ایک سلسلۂ علت و معلول کا قائم ہو جاتا ہے۔ مگر پورا سمندر ایک ہی وقت میں طوفانی حالت میں نہیں رہتا بلکہ ہر حصہ کی طوفانی حالت میں وقت اور مقام کا فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح خاص وجوہات کے تحت انگلستان اگر انتہائی ترقی پر ہے تو افریقہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک وجہ اس کی یہ ہے کہ عالمگیر واقعات مثل طوفانی ہواؤں کے ہر حصہ دنیا کو متاثر کر رہے ہیں اور کرینگے دوسرے خود وہی واقعات

ایک خاص مقام میں ظاہر ہو جاتے ہیں تو پھر وہ امواج کی طرح آس پاس کے علاقوں پر اپنے اثرات ڈالے بغیر نہیں رہ سکتے اگر زمانہ گذشتہ بس صدیاں درکار تھیں تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں سال اور ماہ کا فرق رہ گیا ہے اور ممکن ہے کہ مستقبل اس سے زیادہ خوش آئند ہو اور صرف منٹوں اور لمحوں کا فرق رہجائے لیکن یہ فرق مٹ نہیں سکتا۔ وقت اور مقام کا فرق ایک مسلمہ اصول ہے جو ہمیشہ رہیگا۔

دوسرا اصول خود نظریہ ارتقاء کا ہے جو اسی طرح انسان کے مترتبہ افعال میں متحرک ہے۔ جس طرح اس کے جسم کی نشو ونما میں اس کے روحانی اور وجدانی تخیلات میں اور دوسرے طبعی مظاہر و موجودات خارجہ میں ظاہر ہے۔ موجودہ زمانہ میں علم تاریخ نے جو اس نظریہ کے تحت ترقی کی ہے اور جو روشنی تاریخی واقعات کے سمجھنے میں اس کی وجہ سے پڑی ہے وہ حیرتناک ہے۔ اب ہم اسکندر اعظم کی فتح ہند یا رومی سلطنت کا جمہوریہ سے شہنشاہی میں بدل جانے کو کوئی عجیب وغریب واقعات جو کسی درخت خودرو کی طرح پیدا ہو گئے ہوں نہیں سمجھتے اور موجودہ زمانہ کی اعلیٰ ترین ترقی کو کوئی اعجوبۂ روزگار واقعہ نہیں تصور کرتے بلکہ ہم تاریخ میں ایک تسلسل اور تدریجی ترقی اور اس کے ہر واقعہ میں علت و معلول کا تعلق پاتے ہیں ہر واقعہ اس کے بیشتر کے واقعات سے بطور نتیجہ پیدا ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

اس انکشاف سے ہم نہ صرف صحیح تاریخی نتائج نکالنے کے قابل ہو گئے ہیں بلکہ یعنی موجودہ طرز روش کو اس کی روشنی میں منتظم کرنے کے لائق بن گئے ہیں تاکہ زمانہ مستقبل میں اچھے نتائج برآمد ہوں (اور ہماری غلطیوں سے آنے والی نسلیں پریشان نہ ہونے پائیں)

یہ اصول جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں ہر منفرد ہستی سے گزر کر سارے عالم پر محیط ہیں اور اُن عالمگیر واقعات کو جو اُن کے زیر اثر پیدا ہوتے ہیں گھیرے ہوئے ہیں اور اپنا اثر منفرد اقوام پر انسانی معاشرہ کے ہر جزو اور ہر حصہ پر ڈالتے ہیں اور ایک دوسرے سے متاثر ہوتے رہتے ہیں۔

جغرافیہ اب اگر اسی کے تحت غور کیا جائے تو کوئی شخص ملک دکن کو دنیا سے علیحدہ کسی اور کرہ میں تو نہیں رکھیگا اور جب وہ اسی کرۂ ارضی میں موجود ہے تو پھر وہ اس کے مسلمہ اور عام اصول سے باہر نہیں۔ اس کا بھی اس میں ویسا ہی حصہ

ہے جیسے کسی اور ملک کا۔ ملک دکن و اقلیم ہند کے وسط میں واقع ہوا ہے۔ قدیم سے ہند کو مختلف حصص میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہنادؤں نے بھی ہندوستان اور دکن کی تقسیم کو تسلیم کیا ہے چنانچہ زمانہ قدیم میں بھی اس حصہ ملک کو جو وندھیاچل کے شمال میں واقع ہوا ہے اُدتر آپتا کہا جاتا تھا اور اُس پہاڑ کے جنوب میں جو ممالک واقع ہوئے ہیں اُن سب کو بحیثیت مجموعی دکھشنا پتا کہتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ وندھیاچل کے جنوب کے حصہ ارض سے لوگ اس زمانہ میں بہت کم واقف تھے اور اس کے جغرافیہ اور جغرافی حالت سے بالکل نابلد تھے اسی لئے ایک عام نام انہوں نے اُس کے لئے تجویز کر دیا۔ لیکن مہابھارت کی تدوین کے زمانہ تک دکھشناپتا سے اسی ملک سے مراد لی گئی ہے جسے ہم دکن کہتے ہیں اور موجودہ مہابھارت میں اس کا ذکر صاف طور سے آگیا ہے" سہا دیو نے: اپنے جنوبی حملہ کے وقت اس کے بڑے بھائی کے راجہ سویا کی قربانی ادا کرنے سے پہلے بولنداس کو فتح کرلیا اور وہاں سے جنوب کی طرف روانہ ہوکر پانڈیا کے ملک میں وارد ہوا جہاں سے ...... پانڈیا کے خلاف ایک زبردست لڑائی میں فتح حاصل کرنے کے بعد اس نے شمال کے طرف دکھشناپتا (دکن) کا رخ کیا۔

اسی طرح سے رامائن میں بھی ملک کی اس تقسیم کی تائید کی گئی ہے اور ایک جگہ تو وندھیاچل کے جنوب میں تین حصہ بتلائے گئے ہیں ایک پہاڑ سے لے کر دریائے گوداوری تک اور دوسرے گوداوری سے کرشنا تک اور تیسرا کرشنا کے جنوب میں۔

رامائن کی تقسیم موجودہ زمانہ کی تقسیم سے زیادہ قریب ہے کیونکہ زمانہ حال میں ہندوستان کی جغرافی تحقیقات اپنے کمال کو پہنچ چکی ہے۔ اور اب اس میں مزید گنجائش نہیں رہی سائنٹیفک طریقہ پر ایک ایک گوشہ کا معائنہ کرکے تحقیق کے ساتھ اس کا جغرافیہ لکھا جا چکا ہے۔ اقلیم ہند کو چار بڑے مفصلہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی وہ چٹیل اور سرسبز میدان جن کو گنگا اور دریائے سندھ اور برہم پوترا اپنے پانی سے شاداب کرتے ہیں اور جنہیں "ہندوستان کہا جاتا ہے اس ملک کے جنوب میں کوہ وندھیاچل ہیں جو سطح مرتفع کی شمالی سرحد ہیں۔ یہ حصۂ ملک برخلاف ہندوستان کے پہاڑی ہے اور ۱۵۰۰ سے ۳۰۰۰ فٹ تک اونچا ہے۔ حقیقت میں کوہ نیلگری تک کا حصہ سطح مرتفع کہا جاسکتا ہے۔ لیکن بعض اور جغرافی حالات کے لحاظ سے اس

کچھ شمال ہی میں سطح مرتفع کو ختم کر کے تیسرے حصہ کو جنوب بعید کہتے ہیں اور چوتھا حصہ سواحل ہند کہلاتا ہے۔

اس جگہ اس تقسیم کے وجوہات جغرافی بیان کرنا اور انہیں ثابت کرنا تضیع اوقات ہے۔ کیونکہ ایسے بین اور مسلمہ ہیں کہ ان سے ہر ایک مدرسہ کا لڑکا واقف ہے۔ صرف بتلانا یہ ہے کہ جس طرح ہندوستان کے سب میدان اپنے عام خصوصیات میں یکساں ہیں۔ لیکن تفصیلی اور ذیلی خصوصیات میں ہر ایک حصہ جدا جدا ہے۔ اسی طرح سطح مرتفع کی بھی جزئی خصوصیات علحدہ علحدہ ہیں چنانچہ وہ حصہ جو سطح مرتفع وسط ہند کہلاتا ہے وہ سطح مرتفع دکن سے کچھ اپنے بعض جزئیات میں علحدہ ہے۔ لہذا ہم دکن کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں ایک دکن خاص اور دوسرا دکن اعظم۔ دکن خاص وہ حصہ زمین ہے جو مغربی گھاٹ کے مغربی اتار سے لے کر شرقی گھاٹ تک اور دریائے گوداوری اور دریائے کرشنا کے درمیان واقع ہے اور دکن اعظم وہ دکن ہے جس میں وہ تمام حصص سطح مرتفع جو دکن خاص میں شامل نہیں داخل ہیں۔

رامائن میں بھی دکن کی تقسیم اسی طرح کی گئی ہے اور اس کی تاریخ کی نسبت اجمالی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تقسیم چوتھی صدی قبل مسیح میں عام طور پر مانی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ پاتانجلی کے زمانہ میں جو قریب ۱۵۰ برس قبل مسیح کے ہے دندھیاچل کے جنوب سے عام طور پر لوگ واقف تھے اس کے بعد میگاستھینس اور چناکیا کی تحریرات سے جو قریب قریب ایک دوسرے کے ہمعصر تھے اور اس کے بعد اشوک کے زمانہ میں دکھنی جغرافیہ کا ہم کو کافی سواد ملتا ہے۔ اس سے میری یہ مراد نہیں کہ خواہ مخواہ قدیم کی تقسیم پر زور دیکر ملک کی تقسیم کو جو میں نے اوپر کی ہے سنوانے کی کوشش کروں لیکن میرا مطلب اس سے صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ ملک کی تقسیم جو ایک عام جغرافی اصول پر کی جاتی ہے اس سے عموماً لوگ ہر وقت واقف رہے ہیں قطع نظر اس سے کہ ان کی تقسیم میں موجودہ سہولتیں نہ ہونے کی وجہ کوئی تقسیم یا غلطی رہ گئی ہو۔

تاریخ دکن کا تعلق تاریخ عالم کیساتھ

دنیا میں جو عام اصول کام کرتے رہتے ہیں وہ ہر وقت موجود ہیں اور جغرافیہ کا جو اثر ملک کی تاریخ پر پڑتا ہے وہ بھی ظاہر ہے مگر اس سے یہ مراد نہیں کہ عالمگیر اصول اور عالمگیر واقعات اپنا اثر کسی جگہ کرتے ہیں اور کسی جگہ نہیں کرتے بلکہ اس کے

برخلاف ہم یہ کہینگے کہ وہ ہر جگہ اور ہر وقت پر محیط ہیں اور برابر اپنا اثر کرتے رہتے ہیں چونکہ مختلف حصص دنیا میں ظہور پذیر ہونے میں مقام اور جگہ کا فرق ہوتا ہے اس لئے وہ کہیں آگے کہیں پیچھے اور ہر حصہ اور مقام کے مقامی ضروریات اور ماحول کے موافق اسی کے سانچے میں ڈھلے ہوئے نمودار ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا چاہئے کہ واقعات کی ظاہری صورت کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہو اگر ظاہری لباس نکال کر انہیں دیکھا جائیگا توسب کی تہ میں ایک ہی چیز نکلیگی اور انہی اساسی یا بنیادی واقعات کو ہم عالمگیر واقعات کہتے ہیں۔

چنانچہ اس حصہ ملک کی تاریخ جس کو مذکورہ بالا جغرافیہ حیثیت سے تعین کرکے دکن کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کی تاریخ گو ظاہرا ایک علمحدہ حیثیت رکھتی ہے اور جو خاص ظاہری واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں وہ اسی سے متعلق ہیں اور ان پر اس کے جغرافیہ کا اثر اسی طرح پڑا جس طرح اور اقوام یا ممالک کی تاریخ پر وہاں کے جغرافیہ کا پڑا ہے۔ لیکن اگر تاریخ عالم میں ہر ملک اور ہر حصہ اور ہر قوم کے تمام واقعات کو جمع کیا جائے اور اُن کو مناسبت کے لحاظ سے تقسیم کرکے غور سے اگر دیکھا جائے۔ تو اصلی حقیقت ظاہر ہو جائے گی یعنی ہر واقعہ میں خواہ وہ کسی ملک یا قوم سے متعلق ہو اور خواہ اُس کی ظاہری صورتیں کتنی ہی جدا ہوں ایک ہی بنیادی اصول نظر آئیگا۔

بہمنی سلطنت کی نسبت جو مختلف مورخین کے خیالات ہم نے اوپر بیان کئے ہیں وہ اسی اصول کے تحت با معنی معلوم ہوتے ہیں اور ہمارا یہ کہنا کہ علاء الدین حسن گنگو بہمنی اپنے زمانہ کی پیداوار تھا۔ بالکل صحیح ثابت ہوتا ہے۔ اس کو واضح کرنے کے لئے ہمیں چاہئے کہ تاریخ عالم کے وہ واقعات جو عالمگیر یا اساسی ہونے کے قابل ہیں انہیں علمحدہ چن لیں اور پھر مختلف ممالک کی تاریخوں کا مطالعہ کرکے وہاں کے مقامی واقعات کو اُن سے مطابق کرکے نتیجہ برآمد کریں۔ اس کے لئے ہم کو سب سے پہلے تاریخ دکن پر شروع سے ایک سرسری نظر ڈالنی چاہئے تاکہ واقعات کا تسلسل ہمارے دماغ میں جاگزیں ہو جائے۔ اور پھر اس کے بعد بیرونی دنیا کی تاریخ کی مدد سے سلطان علاء الدین بہمنی کے زمانہ پر تبصرہ کرکے اس کی شخصیت اور کارناموں کا اندازہ کیا جائے۔

مختصر تاریخ قدیم

جب انسان اپنی ابتدائی وحشت سے باہر ہو کر اجتماعی زندگی بسر کرنے لگتا ہے توسب سے پہلے خاندانی اکائی کا پتہ چلتا ہے اور پھر

اس خاندان سے وہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر قبیلہ اور قبیلہ سے قوم کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اور بجائے واحد گھر کے ملک سیاسی یکائی مقرر ہوتا ہے۔ علم سیاسیات کے مقرر کردہ اصول کی روشنی میں ہم جب تاریخ دکن کا صفحہ الٹتے ہیں تو ہم بالکل حال کے زمانہ سے اس کو باقاعدہ اور مسلمہ طور سے شروع ہوتا ہوا دیکھتے ہیں۔ اس کے پہلے کے حالات ابھی تک تاریکی میں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مدراس اور میسور میں بہت سے کام کرنے والے میدان میں نکل آئے ہیں مگر افسوس اس کا ہے کہ خاص دکن میں ابھی تک ایسی کوئی باقاعدہ کوشش نہیں کی گئی۔ جامعہ عثمانیہ سے جہاں ملک کو بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں وہاں ملک کو اس ملکی جامعہ سے ملک کی تاریخ کی نسبت سب سے بڑھکر اور سب سے پہلے توجہ کی اُمید کرنی چاہئے۔ اگر تاریخ روما اور یونان کو ہماری جامعہ میں جگہ مل سکتی ہے تو تاریخ دکن کو بدرجہ اولیٰ نہ صرف انٹرمیڈیٹ اور بی۔اے بلکہ ام۔اے اور اس سے بھی گزر کر (ریسرچ کلاس) کی حد تک اسکی سرپرستی کرنا عین ملک پرستی اور قومی خدمت ہے۔

زمانہ قبل از تاریخ

مہابھارت اور رامائن کی کتابیں تاریخ دکن کے لئے بھی مستند ہیں اور جو کچھ ان مقدس کتابوں کے خزانہ میں دکن کا حصہ ہے گو وہ بہت کم ہے۔ لیکن وہی غنیمت ہے وہ مثل شب چراغ کے ہے جس کی روشنی میں ہم ہاتھ پیر مار سکتے ہیں اور تحقیقی کام کر کے مردہ دفینوں کو نکال سکتے ہیں چونکہ ان کتابوں کا تعلق زیادہ تر شمالی ہند سے ہے اسی لئے دکن کی نسبت ان میں بہت مختصر واقعات درج ہیں جو اصل واقعات متعلقہ سے ذیلی طور پر متعلق ہے ظاہر کیا گیا ہے ان مقدس کتابوں کے علاوہ میگاستھنیس کے سفرنامہ سے ابتدائی تاریخ پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ گو اس کے پہلے اشوک کے کتبے اور دوسرے نوشتہ بھی موجود ہیں جو تاریخی واقعات جمع کرنے میں آج کل بہت مدد دے رہے ہیں۔

آندھرا سلطنت

۲۶۰ قم میں دکن اشوک کی سلطنت کا ایک صوبہ تھا جو در اصل بالکل مطلق العنان اور آزاد تھا مگر اس کی اطاعت کا دم بھرتا تھا ۱۸۵ قم میں موریا سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور ڈیڑھ سو برس تک سنگا خاندان بڑی شان و شوکت سے تمام ہندوستان پر دریا نربدا کے کناروں تک حکمراں رہا۔

اوائل سنہ مسیحی میں اس زبردست سلطنت کا بھی خاتمہ ہو گیا اور دکن کی آندھرا سلطنت اقلیم ہند کی سب سے بڑی سلطنت بنگئی یہ سلطنت دریائے گوداوری اور کرشنا کے دہانوں کے بیچ میں ساحل تک قائم

تھی اس نے بہت جلد اپنی عزت اور قوت بڑھا کر موریا سلطنت کی رقابت شروع کردی اور برابری کا دم بھرنے لگی۔ اپنے زمانہ میں آندھرا سلطنت اقلیم ہند کی سب سے زبردست سلطنت تھی۔ میگیاستھنز اپنے سفرنامہ میں اس کے حالات بہت جوش کے ساتھ لکھے ہیں اور آندھرا راجاؤں کی قوت اور طاقت کی بہت تعریف کی ہے اُن کی دولت کی نسبت بھی وہ حیرتناک واقعات لکھتا ہے۔ آندھرا سلطنت کے تعلقات یونانی اور رومی تاجروں اور عربی ملاحوں سے بہت گہرے تھے اور اس زمانہ میں دریائی تجارت دکن اور یورپ کے درمیان قایم تھی۔

۲۱۸ء میں اس خاندان کا خاتمہ ہو گیا اور اس کے بعد پھر تین صدیوں تک کی تاریخ بھی خاموش ہے۔ لیکن اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ ابھیرا خاندان نے ستر برس تک اقتدار حاصل کرلیا تھا جس کے بعد راشٹر کوٹ کا ایک قبیلہ اُس کو مغلوب کر کے ۵۰۰ء تک خود قابض و حکمراں رہا۔

جنوب بعید دریائے کرشنا کے جنوب میں تین سلطنتیں قایم تھیں۔ چولا۔ چیرا اور پانڈیا یہ سب بہت زبردست دراوڑی حکومتیں تھیں۔ جو بالکلیہ آریائی اثر سے محفوظ تھیں۔ جب آریہ قوم نے اُن کی حکومت کو زیر وزبر کیا تو اُس وقت یہ قوم اپنے تمدن و تہذیب کے لحاظ سے انتہائی عروج پر تھی۔ مگر آریہ اُن کی قومیت اور تہذیب کو نہ بگاڑ سکے اور سوائے اس کے کہ آریہ مذہب انہوں نے قبول کرلیا ہو اور کوئی اثر انکی زبان یا ادب یا تہذیب پر نہ پڑ سکا اور جونہی آریہ غلامی کا جوا ان کے کندھوں پر ہلکا ہوا انہوں نے اسے اُتار پھینکا اور آزادانہ زندگی بسر کرنے لگیں۔ یہ سلطنتیں ہمیشہ آپس میں برسرپیکار رہتی تھیں۔ انہوں نے خصوصاً موریا سلطنت کے خلاف آندھرا قوم کی سرگروگی و سیادت قائم کرنے میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان سب میں چولا سلطنت زیادہ زبردست تھی لیکن دوسری صدی عیسوی کے آخری حصہ میں چیرا قوم کو غلبہ حاصل ہو گیا۔ اس کے بعد پھر ۵۵۰ء میں جب تاریخی تاریکی کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے۔ تو دکن میں چلوکیا خاندان حکمران نظر آتا ہے اور جنوب بعید میں ایک چوتھی قوت ظاہر ہوتی ہے جو پالوا کے نام سے مشہور ہے۔ یہ لوگ پہلے پہل کاویری اور جنوبی پینار کے درمیانی جنوب مشرقی ساحل پر آباد تھے انہوں نے پھر آہستہ آہستہ۔ اپنے حدود سے پاؤں پھیلانے شروع کئے اور پینار کے اُس پار کانچی ورم کو اپنا دارالسلطنت بنالیا۔ چند سال بعد انہیں پھر ایک تحریک پیدا ہوئی جس نے اُن کو دریائے کرشنا کے جنوبی ساحل تک پہنچا دیا۔ اس پیشقدمی نے پالوا قوم کو چلوکیا سلطنت کی سرحد تک پہنچا دیا جس کی وجہ سے ایک جنگ عظیم کی ابتدا ہوئی جو زمانہ دراز تک جاری رہی اور باوجود متعدد

لڑائیوں کے کوئی تشفی بخش فیصلہ کن نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

پہلی چلوکیا سلطنت دکن

چلوکیا خاندان کا بانی جیا سمہا ایک شمالی قسمت آزما سپاہی تھا۔ اُس کا نام ہمیں ایک کتبہ سے معلوم ہوا ہے وہ راشٹر کوٹ موروثی راجاؤں کا قلع قمع کر کے خود بادشاہ بن بیٹھا اُس کے بیٹے پلا کیسی اول نے واتاپی پوری یعنی موجودہ بادامی کو اپنا پایۂ تخت بنایا اور سلطنت کی قوت کو بڑھانے میں بڑی کوشش کی اپنی دولت اور طاقت کے زعم میں پلاکیسی نے اپنے نام کے ساتھ بہت سے خطابات بڑھا دئے تھے اس کا بیٹا کرتی وامن بہت قابل شخص تھا جس نے شمالی کونکن کو اپنی سلطنت میں داخل کر لیا حال میں بادامی میں ایک کتبہ برآمد ہوا ہے جس کی مدد سے ڈاکٹر بھنڈارکر صاحب نے کرتی وامن کی تاریخ جلوس سنہ ۵۶۶-۵۶۷ء میں قرار دی ہے چوبیس سال سلطنت کرنے کے بعد اُس نے وفات پائی اُس کے بعد اس کے بھائی منگالیسا نے اپنے اور اپنے بیٹے کے لئے متوفی راجہ کا بیٹا اور جائز وارث پولاکسی دوم کے ہوتے ہوئے تاج و تخت حاصل کرنے کی کوشش کی مگر پولاکسی دوم نے جو بڑا نامور سپاہی اور قابل بادشاہ تھا سنہ ۶۱۱ء میں انہیں اور ان کے معاونین کو شکست دیکر بھگا دیا۔ منگالیا اور اُس کا بیٹا لڑائی میں مارے گئے اور نمک حرامی کی سزا پائی بُحران خانہ جنگیوں نے بدخواہان ملک میں بغاوت و سرکشی کی جرأت پیدا کر دی اور ایک گروہ کثیر نے گوندا کے ساتھ راشٹر کوٹ میں علم بغاوت بلند کر دیا پولاکسی نے باغیوں کی سرکوبی کر کے گوندا کی قوت توڑ ڈالی اور بہت سے باغی گوندا کا ساتھ چھوڑ کر راجہ سے آملے اور اُس کی اطاعت قبول کر لی۔ پولاکسی اصول حکمرانی و سیاسی حکمت عملی سے واقف تھا اُس نے باغیوں کو معاف کر کے اُس کے ساتھ نہایت ہی عمدہ اور شریفانہ برتاؤ کیا جس کی وجہ سے وہی لوگ اُس کے بہترین بہی خواہ ہو گئے دوسرا اہم واقعہ جو ہمارے اغراض کے لئے مفید ہے اور جس کو ہمارے نظریوں کے ثبوت میں ہم پیش کر سکتے ہیں وہ شمالی بادشاہ کا حملہ ہے۔ جس کا پلاکسی نے نہایت ہی بہادری اور ہمت کے ساتھ سنہ ۶۳۴ء میں مقابلہ کیا اور اُس کے زبردست حملہ کو دفع کر کے نہ صرف اپنی سلطنت بچالی بلکہ اس کی زبردست قوت اور اقتدار کو وہ صدمہ پہنچایا کہ دوبارہ اس نے دکن کا نام لیا۔

مسئلہ جنوبی

تاریخ ہند میں مسئلہ جنوبی ہمیشہ ایک معرکۃ الآرا مسئلہ رہا ہے اور کبھی اس کا تشفی بخش تصفیہ نہیں ہوا۔ ہمیشہ شمالی حکمرانوں کی یہ کوشش رہی ہے کہ دکن کو اپنا غلام بنائیں اور اکثر دفعہ انہیں کامیابی بھی حاصل ہوئی چنانچہ موریا سلطنت نے خواہ وہ برائے نام ہی کیوں نہ ہو دکن کو عرصہ تک اپنے زیر نگیں رکھا جس کے انتقام میں آندھرا خاندان کے راجہ کچھ دنوں تک شمال کے اکثر ممالک

پر قبضہ کرکے حکمرانی کرتے رہے۔ بادشاہ کے حملہ نے تیسری دفعہ کے لئے پھر اسی سوال کو تازہ کیا اور زمانہ حال تک بھی اس کشمکش کا نتیجہ اکثر دفعہ دونوں کے لئے ضرر رساں ثابت ہوا ہے چنانچہ اورنگ زیب کی خواہش نے مغلیہ سلطنت کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینکدیا اس مسئلہ پر روشنی ڈالنے کے لئے ایک بسیط مضمون کی ضرورت ہے جس کو انشاء اللہ کسی اور وقت پیش کیا جائیگا یہاں اس کی زیادہ تفصیل میں پڑنا غیر ضروری ہے۔

پلاکسی میں سلطنت کی عظمت

پلاکسی کے زمانہ کی جیتی جاگتی تصویر اجنٹا کے غار ہیں جس سے تاریخ دکن کی وہ عظیم الشان یادگار اب تک قائم ہے جبکہ پلاکسی سلطنت اپنے پورے عروج پر تھی اور اس کے سفیر شاہ ایران کے پاس بھیجے گئے تھے اور اسکے جواب میں ایرانی سفیر دکنی راجہ کے دربار میں تحفہ تحائف لیکر حاضر ہوئے یہ واقعہ ۶۲۵ء کا ہے جبکہ ایران میں خسرو دوم سریر آرائے سلطنت کیانی تھا۔

اس واقعہ سے ملک دکن کی عظمت اور اس کے تعلقات بیرونی دنیا سے ظاہر ہوتے ہیں اور جو وقعت اور عزت ملک دکن کو اپنے ہمعصر سلطنتوں میں حاصل تھی اس پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

ہیون ٹی سانگ کا سفرنامہ

ملک کی عام حالت باشندوں کی خوشحالی اور ان کی طبیعت کا اندازہ ہیون ٹی سانگ کے سفرنامے کے اس حصہ سے ہو سکتا ہے جو دکن سے متعلق ہے۔ یہ باریک بین و وسیع النظر زائر اسی زمانہ میں دکن آیا اور اپنے مشاہدات کو قلمبند کیا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "موہولاچاکا (مہاراشٹر جس سے مراد سلطنت چلوکیا ہے جو خاص دکن میں واقع ہے) اوس کا احاطہ چھ ہزار (لی) ہے۔ زمین زرخیز و شاداب ہے آب و ہوا خوشگوار اور غلہ افراط سے پیدا ہوتا ہے پایۂ تخت کے مغرب میں ایک دریا بہتا ہے"۔ اس کے بعد وہ باشندوں کی طبیعت اور ان کی خصائل کی نسبت لکھتا ہے "قد کے اونچے پورے مغرور اور خوددار ہیں اور علم دوست۔ اگر کوئی احسان ان پر کیا جائے تو وہ اس کے شکر گزار رہتے ہیں لیکن جو شخص ان کو نقصان پہنچاتا ہے وہ ان کے انتقام سے نہیں بچ سکتا۔ اگر کوئی انہیں ذلیل کرے اور ان کی عزت کے درپے ہو تو وہ اس کے لئے اپنی جان پر کھیل جاتے ہیں مصیبت زدوں کی امداد میں اپنی جان کی پرواہ نہیں کرتے اور اپنے دشمن سے انتقام لینے سے پیشتر اس کو آگاہ کردیتے ہیں جس کے بعد اسلحہ سے تیار ہو کر اس سے نیزہ بازی کرتے ہیں ہزیمت خوردہ فوج کا پیچھا کرتے ہیں مگر جو امان طلب کرے اس کی جان بخشی کردیتے ہیں۔ اپنے فوجی افسر کو جنگ ہارنے کی وجہ سے جسمانی سزا نہیں دیتے بلکہ اسے زنانی کپڑے پہناتے ہیں تاکہ وہ اس ذلت کے بعد پھر جینا گوارہ نہ کرے اور خودکشی کرلے۔

حکومت کی جانب سے ایک خاص دستہ سورما سپاہیوں کا مقرر ہے جو بہادری میں اپنا آپ نظیر ہے۔ یہ سپاہی جب شراب پی کر جنگ آزمائی کے لئے نکلتے ہیں تو ان میں کا ہر ایک فرد اپنے کو ہزار کا مدمقابل تصور کرتا ہے۔ اور ہزار آدمیوں کو اپنے سے لڑنے کے لئے طلب کرتا ہے۔ یہ دستہ ہمیشہ جنگ میں دوسری فوج کے آگے ہوتا ہے میدان جنگ کو باجے بجاتے ہوئے جاتے ہیں اور راستہ میں اگر کوئی سپاہی کسی شخص کو مار ڈالے تو اس پر کوئی جرم عائد نہیں کیا جاتا اس فوج کے علاوہ ان کے پاس سینکڑوں مہیب اور جنگجو ہاتھی ہیں جنہیں جنگ شروع ہوتے ہی ایک قسم کی تیز شراب پلا کر دشمن کی صفیں روندنے کے لئے میدان جنگ میں چھوڑ دیا جاتا ہے"

یہ بیان اپنے مختصر الفاظ میں ایک داستان پنہاں رکھتا ہے اس سے نہ صرف تہذیب و تمدن اور حالات جنگ و ایام امن پر روشنی پڑتی ہے بلکہ ایک صریح تصویر اس زمانہ کے عام حالات کی ہماری نظروں کے سامنے کھنچ جاتی ہے ہیون ٹی سانگ پلاکسی اور بادشاہ کی جنگ و معرکہ آرائی کے وقت ہندوستان میں موجود تھا اور اس سلسلہ میں رقمطراز ہے کہ "بادشاہ کا نام پلاکسی ہے اور وہ ذات کا چھتری ہے۔ اپنے بہادر سپاہیوں اور ہاتھیوں پر اس کو بڑا گھمنڈ ہے اور انہیں کے بھروسہ پر وہ اپنے ہمسایہ اقوام اور راجاؤں کو ذلیل و خوار سمجھکر ہمیشہ ان کی ہتک کرتا رہتا ہے۔ اس کے خیالات وسیع ارادے بلند اور رائے صائب ہے۔ دنیا کے دور دراز حصوں تک اس کا شہرہ اور اس کی مہربانیوں کا چرچا پھیلا ہوا ہے۔ رعایا وفاداری اور جاں نثاری کے ساتھ اس کی اطاعت کرتی ہے۔ اسی زمانہ میں بادشاہ کی تلوار کا لوہا بھی مشرق و مغرب میں مانا جاتا ہے اور ہمسایہ سلطنتیں اس کے خوف سے لرزتی ہیں لیکن پلاکسی ہی کی رعایا اور اقوام ایسی ہے جو اس کی پرواہ نہیں کرتی اور آج تک انہوں نے بادشاہی غلامی کا ننگ گوارہ نہیں کیا۔ متعدد دفعہ ان پر فوج کشی کی گئی اور پنجاب کی افواج ہندوستان کے بہترین افسروں کے تحت تیار کرا کے بادشاہ خود میدان کارزار کو گیا لیکن اس کی ساری کوششیں اور طاقت اُن کی مدافعانہ مخالفت کو نہ توڑ سکیں۔ اسی ایک واقعہ سے اُن کی علو ہمت، غیور طبیعت اور جری و جنگجو خصلت اور آزادمنش عادت کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے ابتک سارے ممالک ہند کی (جو بادشاہ کے زیر نگیں) قوت کے خلاف اپنی اور اپنے ملک کی آزادی کو برقرار رکھا۔"

پہلی سلطنت چلوکیا کا خاتمہ

لیکن پلاکسی کی قسمت میں باوجود اس عظیم کامیابی و نیک نامی کے آخری عمر میں ہزیمت اٹھانی تھی پالوا قوم سے چلوکیا سلطنت کو جو رقابت تھی اس نے آخر کار نرسنہا وامن کے زمانہ میں جو پالوا اقوام کا بہترین راجہ تھا ثمر لایا اور جنگ کی صورت اختیار کی جس میں چلوکیا افواج کو شکست ہوئی اور نرسنہا وامن نے دریائے کرشنا کو عبور کر کے بادامی کو مسخر کر لیا پلاکسی اس جنگ میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ اور اس کا بڑا بیٹا چندرادتیا ونگی کی طرف بھاگ گیا۔

راشٹرکا خاندان

تیرہ برس تک چلوکیا سلطنت تباہ و برباد رہی جس کے بعد وکرما دتیا اول سنہ ۶۵۳ء میں بڑی کشمکش کے بعد پھر چلوکیا خاندان کے وقار کو قائم کرنے میں کامیاب ہوا اور اس کی وفات کے بعد ستر برس تک چلوکیا سلطنت قائم رہی جس کے بعد سنہ ۷۵۳ء میں قدیم راشٹرکوٹ کو دو شہزادے یعنی دانتی درگا اور کرشنا راجہ نے اس کا خاتمہ ہمیشہ کے لئے کر دیا۔ راشٹرکوٹ سب سے قدیم دکنی تھے جنہوں نے چلوکیا سے پیشتر مدت تک سلطنت کی تھی پلاکیسی کے زمانہ میں انہوں نے چلوکیا کے خلاف بغاوت بھی کی تھی لیکن جو خواب اس وقت پلاکیسی کی ذاتی قوت اور مال اندیشی و حکمت عملی کی وجہ سے پورا نہ ہو سکا وہ آٹھویں صدی میں ممکن ہو گیا۔

یاد ہوگا کہ پلاکیسی دوم کے زمانہ میں جو بغاوت ہوئی تھی اس کا سرغنہ گووندا تھا جس کو پلاکیسی نے دور اندیشی سے نہ صرف معاف کر دیا بلکہ اس کی جاگیریں بھی بحال کر دیں اور خاندان شاہی سے اس خاندان کے نسبتی تعلقات بھی قائم کئے چنانچہ ایک شہزادی گووندا کے بیٹے سے بیاہی گئی اور اس کا بیٹا اندرا نے جو اپنی ماں کی طرف سے چلوکیا شہزادہ یا راج کنور تھا پھر ایک شہزادی سے شادی کی۔ ان دونوں کا بیٹا دانتی درگا تھا یہ ایک طرف تو قدیم ملکی خاندان شاہی سے تعلق رکھتا تھا جس کی وجہ سے راشٹرکوٹ اس کے حلیف و مددگار تھے اور دوسری طرف اس کو موجودہ خاندان شاہی سے قریبی رشتہ تھا چنانچہ اس نے جائز وارث تخت و تاج دکن کرتی وامن دوم کے خلاف بغاوت کی اور میدان جنگ میں شاہی فوج کو شکست دے کر راجہ بن بیٹھا۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ علاوہ دانتی درگا کی ذاتی قابلیت کے اس کی شخصیت بھی ہو کیونکہ راشٹرکوٹ قوم تو اسی کی ہی تھی اور دوسرے فرقے بھی اگر اس کے موافق نہیں تو زیادہ مخالف بھی نہیں تھے کیونکہ یہ خود اسی خاندان کا ایک شہزادہ تھا اور اس میں شک نہیں کہ اس کی حیثیت مشترکہ ملک کے لئے بہت مفید تھی۔

چونکہ اس کے کوئی اولاد نہیں تھی اس کے بعد اس کا چچا کرشنا راجہ سنہ ۷۵۳ء میں تخت نشین ہوا۔ تخت پر متمکن ہوتے ہی اس نے سب سے پہلے چلوکیا راجاؤں کے خاندان کو ملیامیٹ کر دیا اور ان کی ساری قوت اور عظمت جو ملک میں تھی برباد کر دی یہ وہی مہتم بالشان راجہ ہے جو دنیا کی حیرتناک یادگار جسے آج تک لوگ دیکھ کر انگشت بدنداں ہو جاتے ہیں ہمیشہ کے لئے کیلاس کے مندر کی شکل میں ایلورا کے غاروں میں ترشوا کر چھوڑ گیا۔ اس کے ایام حکمرانی سنہ ۷۵۳ء تا ۷۷۵ء کے درمیان کسی وقت ہے جس کی تحقیق ابھی پوری طرح نہیں ہوئی ہے۔

کرشنا راجہ کے بعد گوونداسوم تخت نشین ہوا۔ اس کے چھوٹے بھائی دُھرڈوا نے اس کے خلاف بغاوت کی اور بھائی کو ہٹا کر خود تخت پر بیٹھ گیا دھرڈوا نے پالوا سلطنت پر جو تین حصوں میں منقسم ہو گئی تھی اور جس کی حالت بہت کمزور تھی حملہ کر کے اس کے راجہ کو قید کر لیا جس سے سالانہ خراج میں کئی ہاتھی لیتا رہا۔

اس راجہ کے بعد جو مشہور شخص ہے وہ کرشنا سوم دھرڈوا کے بعد سے دسواں راجہ ہے اس نے ۹۴۷ء میں پروماننڈی چلوکیا کی مدد کے لئے گنگا سلطنت میں جا کر ٹاک کولم میں راجہ دتیا چولا کو شکست دی بہت سے چولا راجاؤں کی کوششوں نے چولا سلطنت کے حدود کو راشٹر کوٹ راجدھانی کی سرحد سے ملا دیا تھا۔ پروماننڈی کو جو چلوکیا خاندان کا ایک شہزادہ تھا اور گنگا علاقہ پر قابض ہو کر حکمرانی کر رہا تھا۔ اپنے مقبوضہ علاقہ سے نکالنے کے لئے راجہ دتیا حملہ آور ہوا۔ اس کی امداد کے لئے جا کر کرشنا سوم نے فتح حاصل کی اور تانجور کا محاصرہ کر لیا راجہ کرشنا نے اس فتح سے پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی اور بہت ممکن تھا کہ کامیاب ہو جاتا۔ اور راجہ دتیا میدان جنگ ہی میں مارا جاتا۔ مگر اس کے بھائی کندارادتن نے اپنی بہادری اور حکمت عملی سے چولا سلطنت کو کامل تباہی سے بچا لیا۔

راشٹر کوٹ کا آخری راجہ کاکالا ہے جو کرشنا راجہ کے بھائی کا پڑوتا تھا اُس راجہ کے زمانہ میں ملک مالوہ کے پرمارا خاندان کے دو شہزادے ہارشا اور مونجا نے دکن پر حملہ کیا اور ملکھیر اُن کے دارالسلطنت تک پہنچ گئے۔ گو یہ حملہ موقتی و عارضی تھا لیکن اس کی وجہ سے جو کمزوری حکومت میں پیدا ہو گئی اور جو عام بربادی اور افلاس ملک میں پھیل گیا اُس نے پھر چلوکیا خاندان کی امید بندھائی۔ چنانچہ ۹۷۳ء میں تی لپا چلوکیا نے کاکالا کو تخت سے ہٹا دیا اور خود راجہ بن گیا۔ قریب دو سو سال سلطنت کرنے کے بعد راشٹر کوٹ خاندان کا خاتمہ ہمیشہ کے لئے ہو گیا۔

بعد کے چلوکیا

تی لپا نے فوراً کاکالا کی بیٹی سے شادی کر لی جس کی وجہ سے عام لوگوں کے خیالات اُس کے موافق ہو گئے اور رعایا کو پوری طرح اپنا طرفدار بنا سکا۔ دکھنی قوم کی طبیعت قدامت پسند اور پادشاہ پرست واقع ہوئی ہے۔ ان کی نظروں میں اس سے بڑھکر اور کوئی گناہ نہیں کہ حکمراں خاندان کے خلاف کسی کی انگلی اُٹھے۔ اس میں شک نہیں کہ زمانہ قدیم میں بہت سے انقلاب ہوئے جن کو ہم نے خود ابھی اوپر لکھا ہے لیکن ہمیشہ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ کسی طریقہ سے حکمراں خاندان سے تعلق پیدا کر کے ایک ظاہری حق قائم کیا جائے تاکہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کی عصبیت قائم رہے۔ اس میں

شک نہیں کہ اگر کوئی زبردست شخص بزور شمشیر بغیر اس قسم کے حق پر بھروسہ کئے مالک ملک بنجاتا تو قوم مجبوراً اُس کی اطاعت کرلیتی لیکن ہر شخص اس کو اپنے دل میں باغی اور غاصب تصور کرتا اور ایسے شخص کو ہمیشہ بغاوت کا خوف لگا رہتا ایسے بہت کم واقعات ہیں جہاں غاصبین کو اطمینان سے سلطنت کرنے کا موقع ملا ہو اور اُن کی حکومت دیر پا ہوئی ہو۔ چنانچہ آجتک بھی دکھنیوں کی وفاداری اور بادشاہ پرستی اور حکمران خاندان پر جان نثاری زبان خلق ہے۔ ہر روز ہم خود اپنی زندگی میں سینکڑوں واقعات دیکھتے اور سنتے ہیں اور خود اپنے دل میں ہم اس مقدس خیال کی عزت و آبرو کرتے ہیں جو ہمیں اپنے بادشاہ ذیجاہ اور خانوادۂ آصفیہ کی محبت اور وفاداری کی طرف مائل کرتا ہے اور دن ورات اس کے اقبال و دولت کی افزونی و ترقی کے لئے دست بدعا رکھتا ہے اور اُس کے بدخواہوں اور نمک حراموں سے دلی نفرت و عداوت پیدا کرتا ہے۔

الغرض تی لپا اس حکمت عملی سے رعایا کو وفادار بنالیا اور اپنی فوج تیار کرنی شروع کردی اس کا پہلا فرض اپنی شمالی سرحد کو مستحکم اور مضبوط قلعوں سے محفوظ کرنا تھا جس کے بعد ہی اُس نے مالوہ پر بدلہ لینے کے لئے حملہ کردیا اس قومی خدمت سے اُس کی رعایا اور بھی خوش ہوئی اور جوق جوق لوگ لڑائی میں شریک ہوتے گئے ایک مدت تک لڑائی ہوتی رہی ۹۹۵ء میں مونجا نے سرحد پر حملہ آور ہونے کی غرض سے دریائے گوداوری کو ابھی عبور ہی کیا تھا کہ دکنیوں نے حملہ کردیا اور اسی حالت میں انہیں شکست دی کہ دریا اُن کے پیچھے اور دشمن اُن کے آگے تھے۔ بیچارے سب کے سب مارے گئے مونجا حراست میں چند روز رکھے جانے کے بعد قتل کردیا گیا۔

۹۹۷ء میں ستیاس رایا تی لپا کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ اس وقت شمالی سرحد مستحکم ہوچکی تھی لیکن اب دوسری طرف سے اس سے بڑھکر خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ جنوب میں چولا قوم پھر قوی ہوگئی اور تمام جنوب بعید کو اپنا محکوم کرلینے کے بعد اس نے مصمم ارادہ کرلیا کہ راجہ دتیا کی پالیسی کی مطابقت کی جائے اور گنگا علاقہ سے پرومانندی کا اخراج کیا جائے ستیاس رائے کے مصالح ملکی کے خلاف تھا کہ وہ اس درمیانی قوت کو جو دو زبردست طاقتوں کو جدا کئے ہوئے تھی اپنے رقیب کی حلیف بنائے چنانچہ حسب سابق ستیاسی رائے نے پرومانندی کی امداد کے لئے فوجیں روانہ کیں ۱۰۰۰ء میں راجہ راجہ اعظم (راجہ چولا) نے چلو کیا افواج کو کامل شکست دیکر سارے ملک کو قتل و غارت سے برباد کردیا۔ ہزاروں برہمن عورتیں بچے اور بوڑھے تہ تیغ کردئے گئے اور گنگا وادی سلطنت چولا میں داخل

ہو کر دریائے کرشنا کی شمالی سرحد مقرر ہوئی۔

کرشنا و گوداوری کے دہانوں کے درمیانی حصۂ ساحل پر مشرقی چلوکیا کی سلطنت تھی اُن کا پایۂ تخت ونگی تھا جہاں ویمالا دتیا راجہ حکومت کر رہا تھا اس نے اپنی بیٹی کو راجہ سے بیاہ دیکر جبراً اُس کو اپنا باجگذار بنا لیا اور مہاندی تک شمالی علاقہ اپنے قبضہ میں لاکر لنکا دیپ اور مالدیپ کے جزائر کو بھی اپنی سلطنت میں داخل کر لیا۔ اسکے بیٹے راجندرا نے اڑیسہ کو فتح کیا اور وہاں کے راجہ اور اُس کے بھائی کو قید کر لیا اور گنگا تک اپنے سلسلۂ فتوحات کو بڑھاتا چلا گیا۔ چلوکیا خاندان کا چوتھا بادشاہ جیا سنہا سنہ ۱۰۴۲ء میں مرا اور اُس کا بیٹا سومیشورا النخاطب بہ آہاو مالا تخت نشین ہوا یہ بہت بہادر اور جنگجو شخص تھا جب اس نے دیکھا کہ ملک کے تینوں طرف چولا سلطنت احاطہ کی ہوئی ہے اور اس کا پلہ بھاری ہے تو فوراً اُس نے اپنا پایۂ تخت کلیانی میں منتقل کر کے چولا راجہ کی چیرہ دستیوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ سنہ ۱۰۵۲ء میں راجندرا کے ولیعہد راجہ دھیراج کے مقابلہ میں بمقام کپم ایک عظیم الشان معرکہ ہوا جس میں ولیعہد مارا گیا اور گنگا بن و گنگا وادی کے دو صوبہ چولا سلطنت سے چھین لئے گئے۔

چولا اور چلوکیا سلطنتوں میں رقابت کی آگ بھڑکتی رہی اور کچھ ہی دنوں بعد ایک تخت نشینی کے سلسلہ میں پھر جنگ چھڑ گئی۔

کندورا کر نے جو راجہ راجہ اعظم کا نواسہ اور ویمالا دتیا چلوکیا کا بیٹا تھا راجندرا اول کی بیٹی امنگا دیوی سے شادی کی تھی اُس کا بیٹا کلوتنگا تھا جو اپنے باپ کے تخت کا دعویدار تھا۔ لیکن چولا بادشاہ راجندرا نے جو اس کا رئیس الرؤسا اور ماموں تھا سلطنت کی عام اغراض کو مدنظر رکھتے ہوئے کلوتنگا کے چچا دیجایا دتیا کو گدی پر بٹھلایا شہزادے نے مایوس ہو کر سومیشورا اول سے امداد و اعانت کی استدعا کی۔ دبے ہوئے جذبات اور رقابتیں پھر تازہ ہو گئیں اور بجواڑہ و کول سنگم کے دو بڑے معرکوں میں دونوں سلطنتیں ٹکرا کر رہ گئیں اور کوئی تصفیہ نہیں ہوا سومیشورا نے ان لڑائیوں کو فیصلہ کن تسلیم نہ کر کے اعلان جنگ بھیجا کہ پھر سنگم کے پاس ہمارا تمہارا مقابلہ ہو گا لیکن خود بیمار ہو جانے کی وجہ سے لڑ نہ سکا اور شرم کے مارے دریا میں دونوں فوجوں کے روبرو جبکہ چلوکیا افواج کے باجے جوش اور امنگ سے بجائے جا رہے تھے ڈوب مرا۔

سومیشورا اول کے بعد اس کا بڑا بیٹا سومیشورا دوم تخت نشین ہوا لیکن اس کے چھوٹے بھائی وکرما دتیا نے جس کی قابلیت کی وجہ سے راجہ کا ارادہ اسی کو ولی عہد نامزد کرنے کا تھا فوراً چولا کمپ میں جا کر اپنے بھائی کے خلاف مدد طلب کی۔ ویرا راجندرا نے اپنی بیٹی کی شادی وکرما دتیا سے کردی اور ساتھ ہی سومیشورا دوم کی سرحد پر چڑھائی کی۔ بدقسمتی سے جنگ کا کوئی تصفیہ نہ ہونے پایا تھا کہ ویرا راجندرا مر گیا اور اس کا بیٹا ادھی راجہ تخت نشین ہوا۔

وکرما دتیا اپنے ارادے میں کامیاب ہونے کے لئے ادھی راجہ پر بھروسہ کئے ہوئے تھا لیکن کلوتنگا جو اپنی وراثت کے معاملہ میں راجندرا دوم کے تصفیہ کی وجہ سے بیٹھا تھا اب چولا سلطنت کا دعوی دار بن گیا۔ ادھی راجہ اس کا ماموں زاد بھائی تھا اور وکرما دتیا علاوہ اس کا ددھیالی رشتہ دار ہونے کے ماموں زاد بہنوئی بھی تھا مگر باوجود ان سب رشتہ ناطوں کے اس نے اپنی فوج لے کر چڑھائی کردی اور ادھی راجہ کو تخت سے اتار کر اپنے چچا ویجادتیا چلوکیا کو بھی علٰحدہ کردیا اور خود چولا اور مشرقی چلوکیا کا بادشاہ بن بیٹھا۔

بیچارہ وکرما دتیا اپنی قسمت پر شاکر ہو کر بھائی سے جا ملا لیکن موقع کا منتظر رہا اور روز بروز اپنی ہر دلعزیزی بڑھاتا گیا۔ سومیشورا دوم اپنی نا اہلی اور بیوقوفی کی وجہ سے لوگوں کی نظروں سے گرنے لگا آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ بڑے بڑے صوبہ دار بغاوت پر آمادہ ہوگئے جن میں سیونا چندرا یادوا شمالی مغربی صوبہ دار اچوگی دوم سندا ترسین ٹلبرگہ اور اری ینگا ہوئیسالہ اس کے خلاف ہوگئے ۱۰۷۶ء میں کلوتنگا نے چلوکیا سلطنت کے خلاف اعلان جنگ کردیا عین مقابلہ کے وقت سومیشورا دوم کی فوجوں نے بغاوت کرکے وکرما دتیا دوم کو راجہ بنا لیا۔ چار سال تک لڑائی جاری رہی اور دونوں فریق برابر لڑتے رہے لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا آخر ۱۰۸۰ء میں صلح ہوگئی۔

۱۱۱۶ء میں چلوکیا صوبہ دار گنگا وردی دیوا ہوئیسالہ نے ایک تصفیہ کن لڑائی میں چولا افواج کو شکست دے کر کاویری کے مشرق میں ہٹا دیا۔ اس حصہ میں چولا حکومت اپنی جڑیں مضبوط کر رہی تھی۔ اس شکست کا صدمہ کلوتنگا کو بہت ہوا اور وہ ۱۱۱۸ء میں مر گیا اس کے بعد وکرما دتیا نہایت ہی عظیم الشان دبدبہ اور شان و شوکت سے سارے ملک پر جس میں ایک ظاہری جھلک اور آن بان پیدا ہو چکی تھی حکومت کرکے ۱۱۲۶ء میں مر گیا وکرما دتیا کی موت چلوکیا سلطنت کی تباہی کا باعث نہیں ہوئی بلکہ اس کی بغاوت نے نہ صرف اس کے

چھوٹے بھائی جیا سینہا کو اس کی زندگی میں بغاوت کرنا سکھلایا بلکہ فوج کی بغاوت سے تخت پر بیٹھ کر اس نے بادشاہ شکن بننے کا سبق دیا۔ نمک حرامی اور ناشکری سکھلا کر نہ صرف اپنے خاندان بلکہ ملک پر ظلم کیا۔

چنانچہ اس کا بیٹا سومیشور اسوم ۱۱۳۸ء تک حکومت کرتا رہا لیکن جب تک برسر تخت رہا باپ کی حرکت کی سزا بھگتتا رہا علم و ہنر کی سرپرستی میں یہ راجہ مشہور ہے ظاہرا چلوکیا سلطنت اپنے عروج پر نظر آتی ہے لیکن اندر سے اس کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ مواد تیار تھا صرف بھاپ دینے کی دیر تھی تہذیب و تمدن میں انتہا درجہ کی ترقی اسی زمانہ کے لحاظ سے ہو سکتی تھی......
ہو چکی تھی۔ علوم و فنون میں نجوم۔ فلکیات — بلاغت معماری مصوری۔ شاعری آذری اپنے عروج پر پہنچ چکے تھے۔

چلوکیا سلطنت کا خاتمہ ۱۱۳۸ء میں جگادیکا مالا تخت نشین ہو کر بارہ سال تک سلطنت کرتا رہا ۱۱۵۰ء میں تلپا دوم تخت نشین ہوا۔ وکرمادتیا کا مرنا ہی تھا کہ بادشاہ گر صوبہ دار اپنی حیثیت بھول گئے اور ہر ایک بجائے خود اپنا دم بھرنے لگا برائے نام راجہ کی اطاعت تھی دراصل سارے ملک کے مالک حقیقی بھی صوبہ دار ہو چکے تھے ہر ایک موقع کا منتظر تھا وجالا نے کاکاتیا قوم پر فتح حاصل کر کے اپنا مطلب حاصل کیا اس نے اپنے آپ کو وزیر فوج مقرر کر کے اپنے بادشاہ کو قید کر ڈالا اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا ۱۱۵۶ء تلپا سندا کے پاس جا کر چھپ گیا۔ وجالا کو اپنی نمک حرامی کا بدلہ اسی وقت مل گیا۔ اس کے وزیر بسوا نے لنگایت مذہب کی بنیاد ڈال کر اپنے آقا کو ناخوش کیا جس کی وجہ سے وہ برطرف کر دیا گیا۔ بسوا نے فوراً بغاوت کر دی اور ملک میں ایک مذہبی انقلاب پیدا ہو گیا۔ وجالہ مارا گیا لیکن اس کے بیٹے سومیدوا نے باپ کا بدلہ لیا بسوا کو شکست دے کر لیبار تک اس کا پیچھا کیا جہاں اس نے خودکشی کر لی اور چنا بسادا نے اس کے بھتیجے سومیدوا سے صلح کر لی۔

مگر اس انقلاب نے چلوکیا خاندان کے چراغ کو بجھنے سے پہلے ایک دفعہ پھر بھڑکنے کی مہلت دی اور سومیشور چہارم بوماجزل کی مدد سے جنوبی حصہ ملک پر قابض ہو کر ۱۱۸۹ء تک حکومت کرتا رہا۔ اسی سال پھر ایک انقلاب رونما ہوا جس نے ہمیشہ کے لئے چلوکیا خاندان کا خاتمہ کر دیا سومیشور اسرحد کے باہر کہیں چلا گیا جس کے بعد اس کا پتہ پھر کہیں نہیں لگا۔ یہ انقلاب اور بغاوتیں سب ایک اندرونی تحریک کا پتہ دیتی ہیں جس نے باسٹھ برس کے اندر ایسی عظیم الشان

اور قدیم سلطنت کو جو سات سو برس خاص دکن پر حکومت کرتی رہی آخر کار ریزہ ریزہ کرکے اڑا دیا۔
اب اس کی لاش کو مردار خوار جانوروں کی طرح حریص و طامع دشمن چاروں طرف سے آکر نوچنے لگے۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے اپنی قومی اور موروثی سلطنت کو برباد کرنے میں خود ہی کوشش کی تھی۔ یہ وہ ناعاقبت اندیش صوبہ دار اور امراء تھے جنہوں نے اپنی ذاتی اغراض کے لیئے ملک کی عام بہبودی اور فلاح کو پس پشت ڈال کر اپنے ہاتھوں اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی گو ان خود غرض امراء کو آزادی حاصل ہوگئی لیکن ایک دن بھی ان کی زندگی آرام سے بسر نہ ہوئی آپس کی جنگ و جدال نے تمام ملک میں فتنہ و فساد قتل و غارت مچا دی جس کی وجہ سے ساری تہذیب و تمدن کی اعلیٰ عمارت گر پڑی اور بد تہذیبی ملک میں پھیل گئی چھوٹے چھوٹے جاگیردار اب ان صوبوں میں ہر وقت بغاوت پر آمادہ رہے۔ اور ہر ایک اپنی آزادی اور خود مختاری کا دم بھرتا یہی حالت کم و بیش سو سال تک قایم رہی جس کے بعد تاریخ دکن نے ایک نیا ورق الٹا۔ ان حالات کا اندازہ کرنے سے پیشتر ہم کو اپنے ہمسایہ ملک یعنی جنوب بعید کی تاریخ پر بھی ایک سرسری نظر ڈالنی چاہئے تاکہ واقعات کا تسلسل اور تعلق ذہن نشیں رہے اور جو نتایج دو رقدیم کے اختتام پر بر آمد ہوتے ہیں ان کا اندازہ صحیح کرنے میں غلطی نہ ہونے پائے (باقی)

رباعی

از

مولوی مودود احمد صاحب تشنہ حیدرآبادی

ہے ایک ہی شکل دوست اور دشمن کی ۔ یہ چنیں تو ہم نے خوب پرکھی برتی
محشر کی وہ دیکھ لینگے آپا دھاپی ۔ دنیا ہی میں ہو رہی ہے نفسی نفسی

ترانۂ ناظم

از نواب میر محمد علی خاں بہادر ناظم حیدرآبادی

خواہم آن چشمے کہ ہر دم جا بجا بینم ترا
بے حجابانہ بروئے انتہا بینم ترا

گر وزد باد بہاری در ہوا بینم ترا
در بیار د ابر اندر قطرہا بینم ترا

جانب گلشن چوں آیم رنگ و بینم بہ گل
چوں روم در بوستاں در نخلہا بینم ترا

جلوۂ ذاتِ تو یابم یارب اندر ریگ دشت
سیر دریا چوں کنم در موج ہا بینم ترا

جلوہ فرما زیر و بالا راست چپ پیش و پس
در زمیں بینم ترا فوق السما بینم ترا

ہمچو ناظم بگزرم من از خودیٔ خویشتن
تا نباشد اے خدا گر خود جدا بینم ترا

غزل

از

حضرت آنگر حیدرآبادی

نالۂ بلبل نے کچھ ایسا اثر دکھلا دیا
گل نے اپنا رازِ دل وقتِ سحر دکھلا دیا

وہ کہیں جائیں خود آجائینگے جذبِ شوق میں
پہلی ہی الفت نے اونکو دل کا گھر دکھلا دیا

شوخیِ انکار اون کی امتحاں آمادہ تھی
سینہ اپنا چیر کر دردِ جگر دکھلا دیا

دل تھا بازارِ محبت میں متاعِ بیخودی
کیا ہوا اچھا کہ اوس کو یک نظر دکھلا دیا

شمع محفل غیر کے تھے خود ہی جلکر آگئے
آہِ آتشبار کا ہم نے اثر دکھلا دیا

طول تھا نامہ میں ایک داستانِ دردِ غم
پڑھ کے اوس کو نامہ بر نے مختصر دکھلا دیا

ہو گئی ہنگامہ آرا شوخیِ اندازِ حسن
کسنے آئینہ تجھے ای فتنہ گر دکھلا دیا

بدگمانی تھی کہ کوئی دوسرا تو یاں نہیں
چیر کر سینہ دل اپنا کاٹ کر دکھلا دیا

شیخ کے کہنے پہ آنگر تم سنجانا چاہیے
کسطرف تھا راستہ اسنے کدھر دکھلا دیا

مرزا غالب کا فارسی کلام

از

مولوی مودود احمد صاحب تشنہ حیدرآبادی

مرزا غالب کی فارسی شاعری جو ان کی اردو شاعری سے کہیں بلند پایہ و اعلیٰ مرتبہ ہے اور جس پر مرزا غالب کو وہ فخر و ناز تھا کہ اپنے حریف مقابل سے فرماتے ہیں ع فارسی بیں تابہ بینی نقش ہائے رنگ برنگ، بگزر از اردو کہ رنگ من است، ابھی تک کس مپرسی کی حالت میں ہے حالانکہ اہل علم و ادب میں غالب سے جو شیفتگی ہے اس کا اقتضا یہ تھا اس وقت تک غالب کے فارسی کلام اور بالخصوص فارسی غزلوں کے دو تین ایڈیشن شائع ہو جاتے اور ایک دو شرحیں بھی لکھی جاتیں۔ لیکن بے توجہی کا بڑا سبب خود فارسی زبان سے عام بے توجہی اور فارسی ادبیات کے صحیح ذوق کی زوال پذیری ہے غالب پرست بھی جو ان کے ہر اردو شعر پر خواہ وہ معنی آفرینی سے معمور ہو یا محض لفظی آب و تاب والا بے معنی اور چیستان، سر دھنتے ہیں، ان کے فارسی اشعار کی طرف سرے سے متوجہ نہیں۔ مولوی مودود احمد صاحب تشنہ کی یہ توجہ دہانی خدا کرے سعی مشکور ہو۔ اور ہماری جامعات کے طیلسانین ادبیات دیکھیں کہ فارسی سی اجنبی زبان میں مرزا غالب غریب چہ سخن ہائے گفتنی دارد۔

(مجلۂ مکتبہ)

یوں تو ہماری قوم کا جمود و خمول ایک کھلا ہوا راز ہے جس کے لئے کسی مزید ثبوت کی ضرورت نہیں۔ وہ لوگ جو اسٹیج پر آکے درد انگیز نالے کھینچ کر حاضرین کو تڑپا دینے میں غضب کا کمال رکھتے ہیں۔ اور جن کے دامن عملیت کے موتیوں سے خالی ہیں، ان کے دلوں کو ٹٹولئے تو لِمَا تَقُولُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی تفسیر نظر آئیں گے۔ ایسی صورت میں سننے والے خواہ وہ اپنے ہوں یا بیگانے اسی اثر میں ڈوبے ہوئے ہوں گے جو ان پر ان کی سحر آفریں پرسوز تقریر نے کیا ہوگا۔

یہی نہیں کہ عوام یا معمولی شد بد کے لوگ اس جادو سے مسحور ہوئے ہوں۔ بلکہ وہ بھی جو اپنے دائرہ امکان میں بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اسباب مہیا۔ سرمایہ فراہم۔ اور کافی مہلت بھی نصیب ہے

اگر آپ انہیں دیکھیں گے اور بغور دیکھیں گے تو یہی پائیں گا۔ نہ کچھ خیال ہے نہ کچھ فکر ایک سمجھ اور بے عمل سوچ بہوت ہیں جس کے تعلق کی باگ معلم الملکوت کے عقل فساد کے ہاتھ میں ہے۔ لاحول نہ بھیجئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون تلاوت فرمائیے۔

یوں تو زمانے نے بے حد پلٹے کھائے۔ اور بہت سے اہل زمانہ انقلاب کے بھنور میں پڑ کر فنا کے گھاٹ اتر چکے۔ لیکن ایک متلاشی کو اگر وہ ہمت نہ ہارے تو اب بھی مایوس ہونے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ صرف دل پر لینا ہے اور بس مراد حاصل ہے۔ تاہم سوال یہ ہے کہ کرے کون؟ کیوں کہ کرنے والوں کو کچھ بھی میسر نہیں۔ اور جن کو کرنا چاہیئے تھا ان کے خزانے میں سب کچھ ہے۔

کسی نئے نظریے کا قایم کرنا۔ یا کسی نئے انکشاف کی تکمیل میں منہمک ہونا کچھ ضرور نہیں۔ محض توجہ کو یکسو کر کے ٹھنڈے دل سے اگر دیکھیں تو صاف نظر آئے گا کہ کسی نامور مصنف کی طرز فکر کو جس نے خون دل پی پی کر تخیلات عالیہ کے نقوش صفحات کاغذ پر مرتسم کیئے تھے۔ اور جو حوادث روزگار سے پراگندہ۔ ابنائے زمانہ کی غفلت سے منتشر ہو گئے ہیں سمیٹ کر یک جا اور مکمل کر لیتا ہے۔

گو بہت سے کتب خانے یا تو برباد ہو گئے۔ یا دیمک اور کیڑوں کے عنایت سے تودۂ خاک بن گئے یا کسی پنساری کی دوکان میں سوئے سلف کی پڑیوں کے کام آ گئے۔ تو بھی ابھی ایسے چند کتب خانے باقی ہیں کہ اگر تھوڑی سی تکلیف گوارا کر لیں اور اوقات فرصت کا کچھ حصہ جو محض برباد ہو رہا ہے اسی کام میں لگا دیں تو ایک یادگار مٹنے سے بچ جاتی ہے۔

دہلی، پانی پت، لاہور، علی گڈھ، اعظم گڑھ، لکھنؤ، رامپور، لوہارو، النواب احمد سعید خاں طالب دہلوی کے کتب خانے سے کچھ بھی امید نہ رکھئے، یہ ایسے مقامات ہیں۔ جہاں نہایت آسانی کے ساتھ اپنا منشا پورا ہو سکتا ہے۔ اور نہایت سہولت سے کام بن جاتا ہے۔ اتنا ہونے پر بھی افسوس ہے کہ ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری اب کہاں سے پیدا ہوں گے۔ خدا اُن کو بخشے انھوں نے موقع ملتے ہی غالب کے اردو کلام کو مکمل کر دیا اور رخصت ہو گئے۔ بدقسمتی سے ملک میں اب کوئی ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری ہے ہی نہیں۔ اور اگر ہو بھی تو ایک ایسی زبان کے کلیات پر جو فارسی میں ہے۔ اور جو ہندوستان میں تقریباً مر چکی ہے کون توجہ دینے لگا۔

انصاف شرط ہے۔ بُرا نہ مانئے۔ یہ بحث اس لئے نہیں چھیڑی گئی کہ نزاع لفظی بیدا کی جا کر کسی کی ذات آماجگاہ ملاعن بنائی جائے۔ اگر ہمارے عوض آپ ہی کو یہ خیال آتا تو بے کم و کاست آپ بھی یہی لکھتے جو اس وقت پڑھ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ۔ یقین جانئے کہ ہم کو غالب کے ساتھ

(بجز اخوت اسلامی) اور رشتہ ہے اور نہ شاگردی کا واسطہ محض خدا پر نظر کر کے چند سطریں لکھ (تو) رہے ہیں۔ مگر اُسی کو خبر ہے کہ تا دم تحریر دل میں کیا کیا موج زن ہے۔

وہ شعرا جن کے نام اب زبانوں پر نہیں۔ یا اُن کی طرف سے پیروی کرنے والے مغفور ہو گئے ہیں۔ ان کو چھوڑ دیجئے۔ لیکن جو مشہور ہیں۔ کلام موجود ہے۔ اور ان کے تلامذہ کا سلسلہ آج بھی قایم ہے۔ انھیں کو لیجئے۔ بتلائیے۔ کہ آپ نے ان کے ساتھ کس قدر اعتنا کی۔ دل پر ہاتھ رکھکر فرمائیے

آہ!!! بے فکری کا آخری دور ہے۔ غلامی کی زنجیریں پیر پڑنے کو آگے بڑھ رہی ہیں۔ مولوی سید شاہ محمد ابراہیم صاحب (عفوا مغفور) کے دیوان خانے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور ایک کتاب کا مطالعہ ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ گل رعنا۔ سید حسین بھی مجلد ہیں۔ اتفاق اس کو کہتے ہیں کہ۔ مطبع نولکشور کا چھپا ہوا کلیات فارسی بھی ساتھ ہے۔ دیکھتے ہیں تو اُس میں کچھ قصیدے۔ غزلیں قطعات رباعیات سبھی ہیں۔ اور یہ ایسے ہیں کہ جو مطبوعہ کلیات میں درج نہیں ہیں۔ بس پھر کیا تھا مصداق ع دیوانے کو ایک ہو بہت ہے۔ نقل کر لی اور کلیات میں اُس کے موقع سے چسپاں کر دیا۔ یہی نہیں اور جہاں جہاں سے یہ بکھرے ہوئے موتی ملے مالا پرو دی۔ اب ہماری پاس جس قدر بھی ہے وہ ہماری ذاتی کدو کاوش کا نتیجہ ہے۔ ہماری گردن زیر بار احسان نہیں ہے

اِس وقت جو نسخہ ہمارے زیر مطالعہ ہے۔ ایک مدت سے چاہتے تھے کہ۔ اس پر مضمون لکھیں اور کوئی وسیع النظر مطبع ملجائے تو یہ امانت اُس کے حوالے کر دیں۔ الحمد للہ کہ اب دن پلٹے۔ مکتبہ ابراہیمیہ نے انجمن نامی کی صورت اختیار کر لی۔ اور اپنا ایک مطبع بھی جاری کر لیا۔ اور سب سے بڑی خوبی کی بات تو یہ ہے کہ اسی کے اہتمام سے سلم النبوت اہل قلم کے زیر ادارت ایک مجلہ بھی شائع ہو رہا ہے۔ بدقسمتی سے اتفاقاً تھوڑی سی فرصت بھی ہاتھ آگئی۔ خیال آیا کہ اپنے دل میں ایک عرصے سے جو پوشیدہ ہے۔ اُسے تجویز کے ذریعے ظاہر کر دیں۔ لہذا موقع کو غنیمت جان کر خدا کا شکر بجا لاتے ہوئے اپنا فرض ادا تو کر دیا آگے اللہ مالک ہے۔

قبل اس کے کہ قلم کو ہاتھ سے رکھ دیں۔ ہم اُن کتابوں کے نام بھی گنا دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔ عود ہندی، اردوئے معلی، یادگار غالب و پنج آہنگ کے علاوہ موقر رسالہ صلائے عام دہلی سے ہفت بند زمذانیہ نقل کر کے شریک کر دئے ہیں۔ کسی دوست نے حضرت غوث علی شاہ صاحب قلندر کا تذکرہ غوثیہ مطالعے کو دیا تھا۔ اس میں شاہ صاحب نے غالب سے اپنی ملاقات کا ذکر کر کے چند اشعار نقل کئے تھے۔ مقابلے کے وقت معلوم ہوا کہ کلیات میں نہیں ہیں۔ اس لئے انھیں

بھی درج کرلیا۔ یہ نہیں کہ شوق کے مارے غلط سلط رطب و یابس جو جی میں آیا۔ غالب کا نام ہوتے سے لکھ لیا ہو۔ نہیں۔ بلکہ بہت تحقیق اور پورا اطمینان ہونے کے بعد۔ آپ واقف ہیں کہ یہ زمانہ انٹ وسنٹ لکھنے کا نہیں ہے۔ ایک بات اور ہے۔ وہ یہ کہ ہماری تلاش میں بجز اس مقطعہ کے جو یادگار غالب میں حالی نے درج کیا ہے ؎

گفتنی نیست کہ برغالب ناکام چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوندہ داشت

مایوس ہوکر اسی مقطعہ کو ہم نے بھی ردیف میں لکھ لیا کہ تکمیل ہو۔ مگر افسوس کہ پوری غزل ہمدست نہ ہوئی۔ جن کے دلوں میں سچا درد ہے۔ اُن پر لازم ہے کہ وہ اس کلیات کی تکمیل کریں اور خود ممنوں ہوں۔

غالب !ہاں ہاں !! غالب !!! ہندوستان کے عوض۔ اگر انگلستان کے کسی شہر میں ہوتا تو۔ آج آپ دیکھتے کہ نہ صرف اس کے مخطوطات ہی تمام وکمال شایع ہوجاتے۔ بلکہ اس کے قلمی مسودات۔ اس کا مکان۔ اور اس مکان کی ساری چیزیں۔ حتیٰ کہ اس کی قبر بھی جس میں کہ وہ اس وقت محوِ استراحت ہے۔ قوم کے لئے قومی سرمائے سے محفوظ کر لی جاتیں۔ جن کو ایک سیاح نہایت شوق اور بے حد دلچسپی کے ساتھ مطالعہ وملاحظہ کیا کرتا۔ چوں کہ یہ بدقسمت ہندوستان میں ہوا۔ اس واسطے میرو سودا وغیرہ کے مزار تو فنا ہو ہی چکے ہیں۔ چند دنوں میں غالب کی لحد کو بھی مٹا ہوا پائیے گا۔

ذیل میں وہ اشعار درج ہیں جن کو ہم نے اپنے ذوق سلیم کی رہنمائی میں منتخب کیا ہے۔

غزل

نقش بر خاتم زحرفِ بے صدا انگیختہ شورہ عالم زحسنِ بے نشان انداختہ
چرخ را در قالبِ ابداع در دار یختہ خاک را بر نطعِ پیدائی ستان انداختہ
عاشقاں را در موقف دار درسن وا داشتہ غازیان در معرض تیغ و ستان انداختہ
زنگہا در طبعِ ارباب قیاس آمیختہ نکتہ ہا در خاطرِ اہلِ بیاں انداختہ
آن چناں شمعے براہِ شب رواں افروختہ این چنین گنجے بجیبِ بے دلان انداختہ
یا چنیں ہنگامہ در وحدت نمی گنجد دُئی مرُدہ را از خوبش دریا برکران انداختہ

آتشے اندر وئے گُل ہائے بہار افروختہ شعلۂ در جانِ مرغِ صبح خوان انداختہ

دجلہ در ساغرِ معنی طرازان ریختہ — رشحہ در کاسۂ دریا وکان انداختہ
سر بہ تیغ از دوشِ جانبازان سبک برداشتہ — بار بر دلہائے نامردان گران انداختہ
جز بدین آب آتشِ از دشت نتوان سرد کرد — کعبہ را جوئے بہشت از ناودان انداختہ
جز بدین الماس نتوان این چنین دُردانہ سفت — رخنہ از اسلام در کیشِ فغان انداختہ

لفظِ کہن و معنئ نو در ورقِ من — گوئی کہ جہانست و بہارست جہان را

آئینہ بہ پیشِ نظر و جلوہ فراوان — دل پُر ہوس و صاحبِ خلوت کدہ تنہا

زحق عطیہ پذیرد چو ماہتاب ز مہر — بخلق بہرہ رساند چو آفتاب بہ ما

در راہِ عشق سینہ زمین سائے دیدہ ام — آن ناقہ را کہ کوہ بکوہان برابر است
با چارہ گر بگوئے کہ تیمارِ ریش کش — دردیست در دلم کہ بدرمان برابر است
نے وعدۂ نہ پرسشِ رازے نہ شکوۂ — دائم ز نامۂ کہ بعنوان برابر است
ذاتِ حق است واحد و ہستیست عینِ ذات — بزمِ جہان بہ مجمعِ اعیان برابر است

دیدہ بر نمطِ سبزہ خطِ جادہ پدید — آسمان است زمین کہکشانے دارد

غزلیات

خاموشی ما گشت بد آموز بتان را — زین پیش وگرنہ اثرے بود فغان را
منت کشی تاثیرِ وفائیم کہ آخر — این شیوہ عیان ساخت عیارِ دگران را
مُوئے کہ بروں نامدہ باشد چہ نماید — بیہودہ در اندامِ تو جستیم میان را

ماہمائے گرم پروازیم نشیمن ہا زما جوئے — سایہ ہمچون دود بالا می رود از بالِ ما

از گداز یک جہان ہستی صبوحی کردہ ایم / آفتاب صبح محشر ساغر سرشار ما
چاک را اندر گریبان جہات افگندہ ایم / بے جہت بیرون خرام از پردہ پندار ما

محو کن نقش دوئی از ورق سینۂ ما / اے نگاہت الف صیقل آئینۂ ما
محتشم زادۂ اطراف بساط عدمیم / گوہر از بیضۂ عنقاست بہ گنجینۂ ما
نیست مستان ترا تفرقہ بدرہ ہلال / بادہ مہتاب بود در شب آدینۂ ما

جوئے از بادہ و جوئے ز عسل دارد خلد / لب لعل تو ہم این ست و ہم آنست مرا

سخن ما ز لطافت نہ پذیرد تحریر / نشود گرد نمایان ز رم توسن ما

غزل

نقشے ز خود براہ گزر بستہ ایم ما / بر دوست راہ ذوق نظر بستہ ایم ما
با بندۂ خود این ہمہ سختی نمی کنند / خود را بزور بر تو مگر بستہ ایم ما
دل شکن و دماغ ز دل خود نگاہ دار / کاین خود طلسم دود و شرر بستہ ایم ما
بر روئے حاسدان در دوزخ کشودہ ایم / از بہر خویش جنت در بستہ ایم ما
سوز ترا روان ہمہ در خویشتن گرفت / از داغ تہمتے بہ جگر بستہ ایم ما
گوئی وفا ندارد و اثر ہم بہ ناگر لے / زین سادگی کہ دل باثر بستہ ایم ما
تا در وداع خویش چہ خون در جگر کنیم / از کوئے دوست رخت سفر بستہ ایم ما
ہر جاست نالہ ہمت ما حق گزار اوست / حرزے ببال مرغ سحر بستہ ایم ما

از خوان نطق غالب شیرین سخن بود
کاین مایہ زلہ ہا ز شکر بستہ ایم ما

در گرد غربت آئینہ دار خودیم ما / بے منّے ز بیکسان دیار خودیم ما
دیگر ز ساز بے خودی ما صدا مجوے / آوازے از گسستن تار خودیم ما

از بسکہ خاطرِ ہوسِ گل عزیز بود — خون گشتہ ایم و باغ و بہارِ خودیم ما
ما جملہ وقفِ خویش و دلِ ما ز ما پر است — گوئی ہجومِ حسرتِ کارِ خودیم ما
از جوشِ قطرہ ہمچو سرشک آب گشتہ ایم — اما ہماں بہ جیب و کنارِ خودیم ما
مشتِ غبارِ ماست پراگندہ سو بہ سو — یا رب بہ دہر در چہ شمارِ خودیم ما
یا چوں توئے معاملہ بر خویش منت است — از شکوۂ تو شکرگزارِ خودیم ما
روئے سیاہِ خویش ز خود ہم نہفتہ ایم — شمعِ خموشِ کلبۂ تارِ خودیم ما
در کارِ ماست نالہ و ما در ہوائے او — پروانۂ چراغِ مزارِ خودیم ما
خاکِ وجودِ ماست بخونِ جگر خمیر — رنگینیٔ قماشِ غبارِ خودیم ما
ہر کس خبر ز حوصلۂ خویش می دہد — بر مستیٔ حریف و خمارِ خودیم ما
تارِ نگاہِ پیرو ما سلکِ گوہر است — رفتارِ پائے آبلہ دارِ خودیم ما

غالب چو شخص و عکس در آئینۂ خیال
با خویشتن یکے و دو چارِ خودیم ما

چہ پرسی وجہِ حیرانی کہ ہنگامِ تماشایت — نگاہ از بیخودی ہا دست و پا گم کردہ مژگاں شد

رفتہ بودی دگر از جا بہ سخن سازیٔ غیر — منت از بخت کہ خاموشیٔ ما یاد آمد
دیدہ پر ریختہ و از قفسم کرد آزاد — رحم در طینتِ ظالم ستم ایجاد آمد

گزشت کارِ من از رشکِ غیر شہرت باد — ببزمِ وصلِ تو خود را ندیدنم بنگر
شنیدہ ام کہ نہ بینی و ناامیدنیم — ندیدنِ تو شنیدم شنیدنم بنگر

خان بہادر

از جناب ڈاکٹر اعظم کریوی

سید فصاحت حسین تھے تو انسپکٹر لیکن درجہ اول کی کوتوالی پر تعیناتی ہونے کی وجہ سے آنزیری ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ بنا دیئے گئے تھے۔ پولیس میں کانسٹبل کی حیثیت سے بھرتی ہوئے لیکن اپنی کارگزاری سے بیس سال کے عرصہ میں اس عہدہ پر پہنچ گئے پڑھے لکھے تو بہت کم تھے لیکن پھر بھی اپنے ماتحتوں پر اپنی علیت کا سکہ بٹھانے کی کوشش کرتے۔ جب سے انگریزی میں "یس"، "نو"، لکھنا اور بولنا سیکھ گئے تھے اس وقت سے تو اور بھی اپنی قابلیت کے آگے کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ وردی پہننے کا آپ کو بہت شوق تھا۔ شاید اس میں ان کی کوئی مصلحت تھی ورنہ بیڈول ہونے کی وجہ سے جب وہ وردی پہن لیتے تو اور بھی برے لگتے کبھی کبھی رشوت بھی لیتے تھے لیکن اس احتیاط سے کہ حکام بالا تک اس کی خبر نہ پہنچنے پائے تحریک عدم تعاون کے زمانے میں آپ نے نہایت استقلال سے کام لیا تھا جس سے ان کی شہرت میں اور چار چاند لگ گئے حکام کی حضوری میں شاید وہ اپنے پیدا کرنے والے کو بھی بھول گئے تھے کیونکہ روزہ نماز سے ان کو کوئی واسطہ نہ تھا لیکن سرکار کی اتنی خیر خواہی پر بھی بدقسمتی سے ان کو کوئی خطاب نہیں ملا تھا جس کا ان کو دلی قلق تھا جب عدم تعاون کی تحریک مردہ ہو گئی تو کوتوال صاحب کو امید ہوئی کہ اب وہ ضرور کوئی خطاب پا جائیں گے جنوری کا مہینہ جوں جوں قریب آتا جاتا تھا ان کی بیتابی بڑھتی جاتی تھی خطاب ملنے کے لالچ میں افسروں کا تو کیا ذکر وہ ان کے خادموں کو بھی ڈالیاں نذر کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔

(۲)

آج نوروز ہے۔ کوتوال صاحب حکام ضلع کی سلامی سے فراغت پاکر اپنے کمرہ میں آرام کرسی پر دراز حقہ پی رہے تھے کہ یکایک کوتوالی کے چودھری یعنی دیوان جی کمرہ میں داخل ہوئے بڑے ادب سے "سلوٹ" کیا اور کہا حضور کو "خان بہادر" کا خطاب مبارک ہو۔ اتنا کہہ کر دیوان جی نے سرکاری گزٹ جس میں خطابات کی فہرست شائع ہوئی تھی کوتوال صاحب کے سامنے رکھدیا۔

کوتوال صاحب خوشی کے مارے پھولے نہ سماتے انہوں نے گزٹ کو بڑی مضبوطی سے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور بولے "کہاں لکھا ہے ــــــ دکھاؤ دکھاؤ، مجھے جلدی دکھاؤ۔ واللہ سرکار نے میرے ساتھ انصاف کیا مگر ٹھیرو۔ خوب یاد آیا میں انگریزی میں اتنا باریک خط نہیں پڑھ سکتا۔ میری عینک اس وقت میرے پاس نہیں ہے خدا جانے میں نے کہاں رکھدی اور تم بھی تو انگریزی نہیں پڑھ سکتے خیر کوئی پرواہ نہیں کسی انگریزی داں داروغہ جی کو فوراً بلاؤ۔" کوتوال صاحب انتہائے مسرت سے پاگل ہو رہے تھے ان کی بدحواسی پر دیوان جی مسکراتے ہوئے انگریزی داں داروغہ کو بلانے کمرہ سے باہر نکلے لیکن ابھی وہ دس قدم ہی گئے ہوں گے کہ کوتوال صاحب یہ کہتے ہوئے کمرہ سے نکل پڑے "دیوان جی ٹھیرو میں گزٹ پڑھانے کے لئے خود جا رہا ہوں کوتوال صاحب دوڑتے ہوئے دیوان جی سے آگے نکل گئے جس عزت اور ادب سے اس وقت وہ گزٹ کو ہاتھ میں لئے ہوئے تھے شاید اس سے زیادہ وقعت سے کوتوال صاحب نے کلام پاک کو بھی نہ اٹھایا ہوگا۔ خدا خدا کر کے انگریزی داں داروغہ جی نے گزٹ پڑھا "خان بہادر" کا خطاب پانے والوں میں سید فصاحت حسین آنریری ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کا بھی نام لکھا ہوا تھا۔ چاروں طرف سے "مبارک باشد" کی صدائیں آنے لگی۔

جب دوستوں سے فرصت ملی تو کوتوال صاحب سیدھے سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر کے بنگلے پر پہنچے کوتوال صاحب ایک مرتبہ صبح کے وقت صاحب سے شہر کی خیر و عافیت کہہ آئے تھے صاحب نے خلاف معمول دوبارہ اپنے بنگلہ پر کوتوال صاحب کو دیکھکر کہا ــــــ

"کوتوال صاحب کیا بات ہے:"

کوتوال صاحب نے تن کر "سلوٹ" کیا اور کہا "کیا حضور نے آج کا گزٹ نہیں ملاحظہ فرمایا۔ جس میں سرکار نے مجھے خان بہادری کا خطاب مرحمت فرمایا ہے۔"

صاحب بہادر۔ "خان بہادر ہو گیا؟ ہم گزٹ نہیں دیکھ سکا ــــــ بڑا خوشی کا بات ہے۔"

کوتوال صاحب۔ یہ سب حضور کی مہربانی اور سفارش کا اثر ہے جس کا میں دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

صاحب بہادر۔ نو۔ نو۔ ہمارا تھینکس کچھ نہیں۔ آپ گورنمنٹ کو تھینکس دیجئے سکتا ہے۔ بہت اچھا خطاب ہے۔ ہم سچ بولتا ہے ہم نے تمہارا سفارش بھی سرکار سے نہیں کیا تھا۔

کوتوال صاحب ہمارے تو سرکار حضور ہی ہیں آپ نہ سفارش کرتے تو مجھے خطاب مل ہی نہیں سکتا تھا۔

صاحب بہادر۔ نہیں! نہیں۔ ہم سچ بولتا ہے ہم نے سفارش نہیں کیا تھا۔

کوتوال صاحب نے یقین نہ کیا انہوں نے سوچا حاکم لوگ ہیں خفیہ باتیں نہیں بتایا کرتے صاحب کو سلام کر کے جب کوتوالی واپس ہوئے اور اپنے گھر میں گئے تو بیگم صاحبہ نے بھی مبارکباد دی۔ کوتوال صاحب نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کڑک کر کہا "سنو بیگم مجھے کوئی معمولی خطاب نہیں ملا میری خواہش ہے کہ میں اس خوشی میں ایک دعوت کروں جس میں اپنے تمام حکام و احباب کو بلاؤں۔

بیگم صاحبہ نے ناک بھوں چڑھا کر جواب دیا۔ اچھے آئے دعوت کرنے والے آپ کے تو دوست احباب سب آئیں لیکن میری سہلیاں کہاں جائیں۔

کوتوال صاحب۔ ارے تو میں نے منع کب کیا ہے اپنی سہلیوں کو شوق سے بلاؤ۔ اب اس سے بڑھ کر خوشی کا اور کون موقع ہو سکتا ہے۔

بیگم صاحبہ، پھر بولیں۔ "اچھا یہ تو بتائیے اس خطاب کے ساتھ سرکار آپ کو کتنا انعام دیگی"

کوتوال صاحب نے کہا "پنشن بڑھیگی۔ کہیں خطاب میں روپیہ بھی ملتا ہے۔"

بیگم صاحبہ۔ "اگر روپیہ نہیں ملتا تو پھر کیا ملتا ہے۔"

کوتوال صاحب۔ "ایک سرٹیفکٹ اور شاید ایک تمغہ۔"

بیگم صاحبہ نے جھنجلا کر کہا۔ "تو میں ایک کاغذ کے لئے اتنا ہلڑ نہ ہونے دوں گی۔ خالی خولی خطاب سے کیا ہوتا ہے۔"

کوتوال صاحب نے مسکرا کر کہا۔ تم ان باتوں کو کیا سمجھو۔ خطاب سے بڑی عزت اور شہرت ہوتی ہے خطاب کے لئے لوگ ہزاروں روپے برباد کر دیتے ہیں خطاب کا ملنا کوئی معمولی بات نہیں ہے اب میری عزت سرکار دربار میں بڑھ جائے گی لاٹ صاحب مجھے کرسی دیں گے۔ یہ کہکر کوتوال صاحب نے بیگم کا ہاتھ پکڑ کر بڑے پیار سے کہا خوشی کرو، خوشی اب تم کو تمام دنیا "خان بہادرن" کہے گی اور مجھ کو خان بہادر۔

(۴)

آج کوتوال صاحب کے یہاں حکام ضلع و رؤسا شہر کی دعوت ہے۔ کوتوالی کے وسیع صحن میں بڑا عالیشان شامیانہ نصب کیا گیا۔ ستونوں پر رنگین ریشمی کپڑا لپٹا گیا اور جھاڑ فانوس سے شامیانہ کو زینت دی گئی۔ صدر دروازہ پر "خوش آمدید" کا سنہری تختہ لٹکایا گیا۔ کوتوال صاحب

خود جلسہ کا انتظام کر رہے تھے ان کے ساتھ ہی خوشی میں ساتھ دینے والے اور مصیبت میں دشمن بن جانے والے کوتوال صاحب کے کچھ خوشامدی اہلکار بھی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بیچارے بیگاروں سے کام لے رہے تھے۔

ہندوستانی کھانوں کے علاوہ انگریزی کھانوں کا بھی خاص اہتمام کیا گیا تھا، "شمپین" "ٹلیکشا نمبرا" کے علاوہ اور بھی کئی اقسام کی نفیس ولایتی شراب صاحب لوگوں کے لئے منگوائی گئی تھی غرضیکہ کوتوال صاحب نے اس دعوت کے لئے اپنا روپیہ پانی کی طرح بہا دیا تھا۔ شام کے وقت دعوت ہونے والی تھی قریباً دو بجے دن کے وقت ہفتہ واری گزٹ آیا اس کو دیکھکر کوتوال صاحب کو خیال گزرا کہ "دیکھوں تو کہیں خطاب کے ساتھ میری ترقی بھی تو نہیں ہو گئی" اس خیال کے آتے ہی کوتوال صاحب نے فوراً انگریزی داں داروغہ جی کو بلانے کا حکم دیا۔

گزٹ اردو میں بھی چھپا ہے لیکن بڑے لوگ اردو کا اخبار پڑھنا اپنی ہتک سمجھتے ہیں شاید اسی خیال کو مد نظر رکھ کر کوتوال صاحب اردو کا گزٹ نہیں منگواتے تھے لیکن ان کے ماتحت اس کی وجہ یہ سمجھتے تھے کہ چونکہ کوتوال صاحب انگریزی نہیں جانتے وہ صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ کوتوال صاحب انگریزی بھی جانتے ہیں انگریزی ہی گزٹ منگاتے تھے۔ بہر حال کوئی وجہ بھی ہو کوتوال صاحب اردو کا گزٹ نہیں منگاتے تھے جب داروغہ جی آگئے تو گزٹ کھول کر پڑھنے لگے پہلی صفحہ پر جلی قلم سے لکھا تھا۔ تصحیح

گزشتہ گزٹ میں سید فصاحت حسین صاحب آنریری ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کا نام غلطی سے "خان بہادر" کا خطاب پانے والوں کی فہرست میں درج ہو گیا تھا لہذا بذریعہ اس حکم کے اطلاع دی جاتی ہے کہ مناسب تصحیح کر لی جائے۔

کوتوال صاحب پر گویا بجلی گر پڑی وہ یہ خبر سن کر بدحواس ہو گئے ان کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ عیش و عشرت کا جلسہ درہم برہم ہو گیا اس گزٹ نے جس نے کبھی کوتوال صاحب کو آرام کرسی سے اٹھا کر عالم خوشی میں آسمان پر پہنچا دیا تھا آج رنج و غم میں کرسی سے نیچے گرا کر سرنگوں کر دیا۔

غزل

از

حضرت صفی اورنگ آبادی

مشورے کر کر کے لوگوں میں مجھے رسوا کیا ۔۔۔ واہ تجھ سے آس کیا تھی اور تو نے کیا کیا

دوسروں سے پوچھ تیرے منھ پہ تو آنکھیں نہیں ۔۔۔ کس نظر سے ہم نے تجھ کو آج تک دیکھا کیا

عشق کی پہچان اگر یہ ہے کہ ہو دونوں طرف ۔۔۔ پھر یہ جو کچھ آج تک ہم نے کیا تو کیا کیا

ہم رہے بھی انکی محفل میں تو بس ایسے رہے ۔۔۔ ضبط نے گونگا بنایا صبر نے اندھا کیا

کچھ پشیمانی ہے کچھ حیرت کہیں تو کیا کہیں ۔۔۔ آپ اُس کے ہو گئے ہم یا اُسے اپنا کیا

دوست کا جلوہ کہاں یہ بدنصیب آنکھیں کہاں ۔۔۔ جو دکھایا میری قسمت نے مجھے دیکھا کیا

اُف رے ضد، اللہ ری ہٹ، یہ طبیعت یہ مزاج ۔۔۔ جو کہا تھا آپ نے آخر اُسے پورا کیا

اک بلا ہے عشق۔ پھر چاہے وہ ہو اولاد کا ۔۔۔ دیکھئے تو! حضرت یعقوب کو اندھا کیا

میں بُرا ہوں غم نہیں لیکن مرے اللہ نے ۔۔۔ آپ کو اچھا بنایا۔ یہ بہت اچھا کیا

اب تمھاری دوستی کو دونوں ہاتھوں سے سلام ۔۔۔ جو ہوا اچھا ہوا۔ جو کچھ کیا، اچھا کیا

اب تو جینے کی دعائیں مانگتا ہوں رات دن

اے صفی اُس کی قسم۔ جس نے مجھے پیدا کیا

عرب اور ان کے میلے

مولوی ابوالمکارم محمد عبدالکریم صاحب نعمانی

تمہید تمدن کی برکتیں ایک قوم دوسری قوم سے حاصل کیا کرتی ہے اور اس طرح تمدن کا چشمۂ فیض ایک ملک سے دوسرے ملک میں ایک قوم سے دوسری قوم میں جاری و ساری ہوجاتا ہے یہاں تک کہ تاریخ متداول و مشترک رسوم میں سے بعض کی ابتدا اس طرح ٹھیک طور پر نہیں بتا سکتی کہ اس رسم کی بنا سب سے پہلے فلاں قوم نے روئے زمین پر ڈالی

تمدن کی سب سے پہلی برکت میلے، بازار یا مجمع ہیں مختلف جگہ کے باشندوں کو جب کبھی مقررہ اوقات میں ایک جگہ جمع ہونے کی ضرورت پیش آتی ہے تو ایسے مجمع، بازار یا میلے کا انعقاد ہوتا جاتا ہے دور دور کے رہنے بسنے والے اپنے متداول مقاصد اور مشترک ضروریات کے پورا کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔

یہ مجمعے تمدن کے ابتدائی دور میں مذہبی رسوم کے ادا کرنے یا تاجرانہ کاروبار چلانے تک محدود تھے ان مجمعوں میں کاریگر کو خریدار اور خریدار کو چیز سہولت سے مل جاتی اسی وجہ سے لوگ باوجود بُعد بعید کے راستے کے شدائد اٹھا کر نہایت شوق ذوق سے ایسے مجمعوں میں شریک ہوتے کیونکہ ایسا مقام ہر جگہ نہیں ہوتا جہاں ہر گوہر کمال کیلئے جوہر شناس اور ہر جوہر شناس کے لئے گوہر کمال میسر آئے۔

ارتقائے تمدن کے ساتھ ساتھ اس قسم کے مجمعوں کی ہیئت و ضرورت میں بھی ترقی ہوتی گئی یہاں تک کہ ان کی ابتدائی ہیئت اور انتہائی حالت میں اس قدر بُعد بڑھا کہ بُعد المشرقین ہوگیا۔

غرض کہ موجودہ سیاسی، مذہبی، علمی معاشی اور دوسرے مجمعوں کا ہیولا یا پیش رو یہی قدیم مجمع ہیں

اس طرح کے بازار کو عرب "سوق" کہتے اور اس سے ایسی جگہ مراد لیتے ہیں جہاں شہری، قصباتی، وطنی آفاقی ہر قسم کے لوگ جمع ہوکر اوقات معینہ میں بیع و شریٰ کریں ایسے بازاروں کا دستور گاؤں اور شہروں میں موجودہ تمدن کے پہلے سے آج تک چلا آتا ہے۔

مختلف ممالک کے مجمع ترکستان[1] میں دستور ہے کہ ہفتے میں دو دفعہ یا ایک دفعہ ہر شہر میں اور اکثر دیہات میں

[1] دربار اکبری صفحہ ۱۵۴

بازار لگتے ہیں اس آبادی کے اور اکثر پانچ پانچ چھ چھ کوس آس پاس کے لوگ پچھلی رات سے گھروں سے نکلتے ہیں دن نکلے اس مقام پر آکر جمع ہوتے ہیں۔ عورتیں برقع سروں پر نقابیں منہ پر ابریشم سوت ٹوپیاں دہاں پھلکاری ضرورت کی ماری جو کچھ ہو بیچنے کو لاتی ہیں مرد ہر قسم کے پیشہ ور اپنے جنس سے بازار کو گرم کرتے ہیں مرغی اور انڈے سے لیکر گراں بہا گھوڑوں تک اور گزی گاڑھے سے لیکر قیمتی قالین تک میوہ جات سے لیکر اقسام غلہ بھس اور گھانس تک تیل۔ گھی۔ مسگری بنجاری۔ لہاری کے کام یہاں تک کہ مٹی کے باسن تک سب موجود ہوتے اور دوپہر میں سب بک جاتے ہیں اکثر لین دین مبادلے میں ہوتے ہیں۔

شہر اشوریہ اور بابل کے مندروں میں سالانہ مقررہ اوقات پر دیوتاؤں کی پرستش کے لئے لوگ جمع ہوتے اسی ضمن میں تاجروں کا بھی مجمع ہو جاتا۔

نواح لندن کے سب سے زیادہ مشہور میلے بارتھولومو۔ گرینیچ۔ کیمبر دل۔ قیر لاپ۔ اور چالٹن کے تھے آخر ان کے نتایج اور ان سے ہونے والی خرابیوں کو دیکھ کر حکومت نے ۱۸۷۱ء میں ان کے خلاف قانون نافذ کر کے ان میں سے اکثر کی ممانعت کر دی۔

شہر آئرلینڈ میں ڈالی بروک کا میلہ ڈبلن سے تین میل کے مسافت پر اگست کے مہینے میں لگا کرتا اور ایک ہفتہ بھر قایم رہتا اتوار کے روز جب میلے کا اصلی کاروبار جاری ہوتا ڈبلن کے ہر طبقہ کے لوگ وہاں جاتے سڑک پر ہر قسم کی اعلیٰ و ادنیٰ گاڑیوں کا تانتا بندھ جاتا یہ میلہ خاص طور پر گھوڑوں کی فروخت کے لئے تھا۔

انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کے بعض گاؤں میں مزدوروں اور خدمت گاروں کے ملنے کے لئے میلے ہوا کرتے جن میں حاجت مند بکثرت شریک ہوتے بعض مقامات میں وہ گاپ کہلاتے اسی طرح کے اکثر بازار روس۔ جرمنی۔ فرانس۔ انگلستان اور امریکہ میں بھی ہوتے تھے۔

روس کے ایک شہر نوفگرد میں ششماہی بازار لگتا جہاں کے تماشائیوں کی تعداد ۱۲۰۰۰ تک ہوتی یہاں تمام روس اور مشرقی یورپ کے باشندے جمع ہوتے بازار روس کی خرید و فروخت اشیاء کا اندازہ ایک کروڑ بیس لاکھ روبل سالانہ ہوتا ہے۔

قاہرہ میں ہفتہ واری بازار لگتے جن میں اطراف و جوانب کے لوگ بیع و شریٰ کے لئے

۱؎ دلگد از تمبر (۷) جلد (۲۵)

۲؎ آداب اللغۃ العربیہ جزاول صفحہ ۱۴۳ مولفہ جرجی زیدان۔

جمع ہوتے اور یہ سوق الثبت، سوق الثلاثا، سوق الاربعا، کہلاتے ان میں بعض ماہوار بعض سالانہ اور بعض پچاس سال میں ایک دفعہ لگتے۔

ہندوستان میں گنگا کنارے سالانہ ہندوؤں کا بازار ہردوار لگتا ہے جس میں تماشائیوں کی تعداد ..... تک پہنچ جاتی اور ہر بارہویں سال یہاں تیرتھ یاترا ہوتی ہے اور اس موسم میں اراوت مندوں کی تعداد ایک ملین تک پہنچ جاتی ہے۔

اس طرح مکہ میں بھی حج کے لئے مسلمانوں کا عظیم الشان مجمع ہر سال ہوا کرتا ہے جس میں دور دور سے کثیر التعداد لوگ جمع ہوتے ہیں۔

ان[5] میلوں کے علاوہ ہندوستان میں عورتوں کے لئے مینا بازار لگا کرتے تھے آئین اکبری میں لکھا ہے کہ ہر مہینے میں معمولی بازار کے تیسرے دن قلعہ میں زنانہ بازار لگتا تھا۔

اکبر کے زمانہ میں ایوان شاہی میں ایک مجمع کا اہتمام ہوتا جس میں محل کی بیگمات آتی تھیں۔ امرا اور شرفا بیویوں کو بھی اجازت تھی جو چاہے آئے اور تماشا دیکھے دکانوں پر تمام عورتیں بیٹھ جاتی تھیں سوداگری اور سود از یادہ تر زنانہ رکھا جاتا تھا خواجہ سرا قلماقنیاں اردابیگنیاں اسلحہ جنگ سجے انتظام کے گھوڑے دوڑاتی پھرتی تھیں عورتیں ہی پہروں پر ہوتی تھیں مالیوں کی جگہ مالنیں چمن آرائی کرتی تھیں اس کا نام خوش روز تھا۔

نیک نیت بادشاہ آپ بھی آتا تھا اور اپنی رعیت کی بہو بیٹیوں کو دیکھ کر ایسا خوش ہوتا تھا کہ ماں باپ بھی اتنا ہی خوش ہوتے ہوں گے جہاں مناسب جگہ دیکھتے تھے بیٹھ جاتے تھے بادشاہ بیگم بہنیں بیٹیاں پاس بیٹھتی تھیں امرا کی بیبیاں آکر سلام کرتیں نذریں دیتیں بچوں کو سامنے حاضر کرتیں ان کی نسبتیں حضور میں قرار پاتی تھیں کبھی بیگم بیاہ کا ذمہ لے لیتیں کبھی بادشاہ لے لیتے اور شادی کا سرانجام اس طرح ہوتا کہ ماں باپ سے بھی نہ ہو سکتا۔

خود حیدرآباد میں اس طرح کے کئی مجمعے ہوا کرتے ہیں۔ ہفتہ واری بازاروں میں زیادہ مشہور جمعرات کا بازار ہے جو تجارتی غرض سے پرانے پل کے قریب لگتا ہے جہاں تڑکے سے لوگ جمع ہو جاتے ہیں اکثر پرانے اور کچھ نئے سامان کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔

جمعہ کے روز نارسنگی کا بازار مویشی کی تجارت کے لئے خاص ہے۔

---

[5] دربار اکبری

سالانہ مجمعوں میں لنگم پلی کا میلہ شہادت کا مجمع اور نال صاحب کا مجمع قابل ذکر ہیں جن میں کثیر التعداد لوگ جمع ہوتے ہیں اس قدر ہجوم اور بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے کہ راستہ چلنا دشوار ہو جاتا ہے۔
ان کے علاوہ کئی عرس میلے مینا بازار ہوتے ہیں جن میں سے کئی موقوف ہو گئے اور بعض اب تک جاری ہیں۔

ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر باغ عامہ کی گزشتہ نمائش ہے جس میں تاجروں کی دوکانیں مصنوعات ملکی تھیٹر سینما چائے خانے ہوٹل قائم کرنے کے علاوہ طرح طرح کی دلچسپیاں پیدا کر کے نمائش کو کامیاب بنایا گیا تھا۔ ان سب دکانوں اور چیزوں کو اس سلیقہ سے ترتیب دیا گیا تھا کہ آرائش زیبائش سارا کمال خرچ کر دیا تھا شام کے وقت بجلی کی روشنی سے مقام منور ہو جاتا اور کل مقام ایک بقعہ نور نظر آتا جہاں کثیر التعداد تماشائی اس دوکان سے اس ہوٹل میں اس چائے خانے سے اس سبزہ زار میں خوش فعلیاں کرتے پھرتے چاندنی کے دنوں میں بانڈ سامعہ نوازی کرتا تاکہ کشتیوں میں بیٹھ کر تالاب کی سیر کرتے سینما تھیٹر اور قمار خانوں میں ایک ہجوم غفیر ہوتا تجار اور کاریگر اپنی اپنی تجارت اور صنعت میں نئی نئی جدتیں پیدا کر کے عوام کو متوجہ کر لیتے۔ اس مجمع میں امیر غریب سب کو عام اجازت تھی جو چاہے آئے اور تماشا دیکھے داخلہ کیلئے دو آنہ کا ٹکٹ درکار تھا کبھی کبھی آقائے ولی نعمت سلطان العلوم ہز ہائینس نواب میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کے قدم میمنت لزوم سے مجمع کی رونق کو چار چاند لگ جاتے۔ نمائش کا آغاز بہ تقریب سالگرہ جہاں پناہ رجب سے ہوتا اور رمضان تک رہتی
قیام نمائش کے زمانہ میں ہر جمعہ کو مینا بازار لگتا اعلیٰ ادنیٰ غریب امیر ہر قسم کی عورتوں کو عام اجازت تھی جو چاہے آئے اور تماشا دیکھے مجمع میں دکانوں اور اور دلچسپیوں کی جگہ بجائے مردوں کے عورتیں دوکانداری اور سوداگری کرتیں اس مجمع میں کوئی بچہ تک داخل نہ ہو سکتا ہر ایک کام عورتوں ہی سے سر انجام پاتا یہاں کا انتظام یورپین عورتوں کے ذمہ ہوتا جو اپنی سفید وردی پہنے ادھر سے ادھر اتراتے انتظامی امور میں سرگرمی دکھاتے پھرتیں۔

موجودہ تمدن کے نتیجہ خیز مجمعوں میں قابل ذکر دہلی کا مجمع جمعیۃ العلما گذشتہ دہلی کی نمائش گذشتہ پونہ کی زراعتی نمائش اور لندن یونیورسٹی کالج کا جشن صد سالہ مجمع ہے جس کا افتتاح ملک معظم اور ملکہ معظمہ نے فرمایا جہاں ماہرین علوم و فنون کا ایک عظیم الشان اجتماع تھا جس میں عالیجناب مولوی محمد عبدالرحمن خان صاحب صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ جامعہ کی طرف سے شریک ہوئے تھے۔ اسی سلسلہ میں عثمانیہ کالج اورنگ آباد کا یوم کلیہ جس میں علمی سرگرمیوں اور علمی دلچسپیوں کی متعدد چیزیں ہوتی ہیں........

قابلِ ذکر ہے۔

عرب کے بازار: بیرونی تجارت کے علاوہ عرب میں متعدد مشہور بازار تھے جہاں خرید و فروخت کی گرم بازاری ہوتی اور اسی کے ساتھ شعر و سخن کا بھی چرچا ہوتا ان بازاروں میں کوئی ماہواری ہوتا کوئی سالانہ تجارت پیشہ لوگ جب ایک بازار سے فارغ ہوتے تو دوسرے میں پہنچتے ....

..........جس طرح المپیا.......... ڈلفائی.......... اور ڈیلاس.......... کے اجتماع یونانیوں کے سیاسی تمدنی معاشرتی اور مذہبی تعلقات برقرار رکھنے کے اعلیٰ ذریعہ تھے جہاں وہ جمع ہو کر کھیل تفریح کے علاوہ سیاسی مذہبی معاشرتی گتھیوں کو سلجھاتے اسی طرح عرب کے مجمع عکاظ۔ ذوالمجاز۔ مجنہ۔ دومۃ الجندل۔ حباشہ وغیرہ عرب کے تمدنی ادبی سیاسی معاشرتی ارتقاء کے اعلیٰ ذرائع اور مسلمہ امتحان گاہ تھے [illegible] موجودہ متمدن [illegible] کی نمائشوں اور کانفرنسوں [illegible] کسی طرح بھی کم نتیجہ خیز نہ تھے۔

اسواق عرب[1] دس تھے جہاں تجارتی غرض سے سب لوگ جمع ہوتے اور ان کے جان و مال کی حفاظت کی جاتی۔ ربیع الاول کے [illegible] میں سوق دومۃ الجندل ہوتا جہاں رئیس قبیلہ غسان و کلب سے جو غالب ہوتا وہی قرار پاتا۔ جمادی الاول کے مہینہ میں سوق مشقر [illegible] میں لگتا جس میں بنو تمیم ربط المنذرین ساوی رئیس ہوتے۔ رجب میں سوق صحار ہوتا جہاں حفاظت کی ضرورت نہ ہوتی پھر سوق رباہ ہوتا جہاں جلندی و آل جلندی حکمراں ہوتے۔ سوق [illegible] [illegible] کے سایہ میں لگتا جہاں ہود علیہ السلام کی قبر ہے۔ رمضان کی پہلی کو سوق عدن لگتا جہاں [illegible] سے خوشبودار اشیاء خریدی جاتیں رمضان کے نصف ماہ میں سوق صفا لگتا پھر حضر موت میں سوق [illegible] رابیہ ہوتا۔ پھر نجد کے ٹیلہ پر ذیقعد میں عکاظ کا میلہ ہوتا۔ جہاں کے منتظم قریش تھے اس کے بعد سوق ذی المجاز ہوتا جہاں سے فارغ ہو کر لوگ حج کے لئے مکہ جاتے اس زمانہ میں بعض لوگ لڑائی لوٹ مار کو جائز سمجھتے بعض ناجائز سمجھتے یہی نہیں بلکہ ایسے مخدوش زمانہ میں مظلوم کی نصرت پر آمادہ ہو جاتے پہلی قسم کے لوگ قبیلہ اسد۔ طی۔ بنی بکر بن عبد مناۃ بن کنانہ اور کچھ لوگ بنی عامر بن صعصعہ سے۔ دوسری قسم کے لوگ بنی عمرو بن تمیم۔ بنی حنظلہ ابن زید مناۃ کچھ لوگ مجمع میں مسلح پھرتے کہ مظلوموں کی حمایت کریں اس اجتماع کی غرض سے رجب۔ ذیقعدہ۔ ذی الحجہ محرم چار مہینوں میں باہمی جنگ و جدال لوٹ مار کو حرام سمجھتے اور تمام عرب شہور حرام میں ہتھیار نہ لگاتے عکاظ میں عرب پہلے برقع منہ پر ڈال کر آتے کہتے ہیں کہ سب سے پہلا شخص جو برقع نکال کر یہاں آیا

---

[1] تاریخ یعقوبی الجزء الاول

ظریف بن غنم العنبرہ ہے پھر اور عربوں نے بھی اس کی پیروی کی رفتہ رفتہ برقع منہ پر ڈال کر آنا متروک ہو گیا

مشہور بازار عرب[1] سے پہلا بازار غرہ ربیع الاول کو دومۃ الجندل میں ہوتا لوگ یہاں بیع و شریٰ سے فارغ ہو کر ہجر کے بازار کو پہنچتے پھر عمان جاتے اس کے بعد حضر موت کا بازار لگتا پھر صنعا یمن کا مجمع ہوتا غرہ ذیقعدہ سے بیس تاریخ تک سب کا آخری اور مشہور مجمع سوق عکاظ کے نام سے لگتا آخر ذیقعدہ میں ذوالمجنہ میں پھر آٹھ ذی الحجہ تک ذوالمجاز میں جو عرفہ کے قریب ہے مجمع رہتا تھا[2] نہم ذی الحجہ کو میدان عرفات میں لوگ مناسک حج ادا کر کے اپنے اپنے وطن کو واپس ہوتے۔

بازار عکاظ[3] جاہلیت کے تمام بازاروں میں سب سے زیادہ مشہور عکاظ کا بازار تھا یہ بازار نخلہ اور طائف کے درمیان قتق کے لق و دق میدان میں غرہ ذیقعدہ سے شروع ہوتا بیس روز تک چہل پہل رہتی رنگ رلیاں منائی جاتیں بازار کے دنوں میں حج سے آنے والے قبائل یہیں جمع ہوتے تھا کے بعد حج کے لئے مکہ جاتے۔

یہ بازار گویا عرب کا المپیا تھا کہیں شعر و سخن کا بازار گرم ہوتا تو کہیں بیع و شریٰ کھیل تماشوں کی وجہ سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی اس مجمع میں وہ فن کار جن کو جذبہ شہرت سال بھر کے سخت انتظار کے بعد یہاں کھینچ لاتا جمع ہو کر اپنے اپنے قدر دانوں اور جوہریوں کے آگے گوہر کمال پیش کر کے داد تحسین حاصل کرتے کہیں مغنی رقص و سرود کی محفلیں آراستہ کرتے جس میں مہوشان روم مغنیان عرب و عجم اپنی اپنی فن کاری کا عملی ثبوت دیتے کہیں کاہنوں کا ہنگامہ بپا ہوتا جو اپنی غیب دانی اور پیش گوئی کی وجہ سے مرجع خلائق ہوتے یہ غیب دانی کے مدعی جن کا شمار اس زمانہ میں ارباب حل و عقد میں ہوتا مجمع میں کھڑے ہو کر مسجع و مقفیٰ عبارت میں اپنے معتقدین کے نوشتہ تقدیر کو سنا کر ان کے سوالات کا جواب

---

[1]. نہایۃ الارب۔

[2]. معجم البکری صفحہ ۶۶۰۔

[3]. جاہلیت میں عکاظ عرب کے ایک بازار کا نام ہے جہاں عرب کے قبائل ہر سال جمع ہو کر تجارت فخر و مباہات اور شاعری کرتے اصمعی کا بیان ہے کہ عکاظ کھجور کے درخت کا نام ہے اس کے اور طائف کے درمیان ایک رات کا فاصلہ ہے اور مکہ اس سے تین رات کی مسافت پر ہے یہیں عرب کا بازار لگتا اس جگہ کو اشید کہتے ہیں یہیں الم فجار کے حادثات پیش آئے اور یہاں ایک پتھر تھا جس کا طواف کیا جاتا تھا۔ آمدی کا بیان ہے کہ عکاظ نخلہ اور طائف کے درمیان ہے معجم البلدان المجلد الثالث۔

اس طرح ادا کرتے کہ نتیجہ ان کے قول کے خلاف نہ ہوتا۔ ان کا کلام فصاحت و بلاغت قافیہ بندی کے علاوہ کئی مطالب و معانی پر حاوی ہوتا۔

کہیں مورتوں اور مجسموں کی پوجا کی جاتی ترویج مصنوعات ارتقائے تمدن حصول تحسین اور سیاست ملک کے نقطہ نظر سے بھی یہ بازارات نہایت اہم ہوتے اس مجمع میں کوئی مسلح داخل نہ ہوتا اور جو ایسا کرتا قابل سزا سمجھا جاتا سالانہ خراج بھی نہیں وصول کیا جاتا قریش چونکہ حرم کے متولی تھے اس لئے ان کو تمام عربی قبائل پر عظمت و برتری حاصل تھی اور وہ اس مجمع میں منتظم ہوتے ان کی جانب سے منادی کی جاتی کہ لوگو اگر اس میلہ میں کوئی بھوکا یا پیادہ ہو تو اس کا خرچ ہمارے ذمہ ہے۔

ہر ایک[۵۱] شریف و رئیس صرف اپنے اپنے شہر کے میلوں اور بازاروں میں آتے تھے مگر سوق عکاظ میں ہر ایک دیار کے امراء و روسا شریک ہوتے اگر خود نہ آسکتے تو وفد بھیجتے جس کے قبیلہ کا کوئی شخص قید ہوتا تو اس کے فدیہ کا فیصلہ یہیں ہوتا اسی موسم میں حکام کا تقرر ہوتا کسی کو خون کا بدلہ لینا ہو اور قاتل لا پتا ہو جائے تو یہیں سراغ لگاتا اگر کسی کو ایسا کام کرنا ہو جو تمام عرب میں شہرت پائے تو اسی مقام پر کرتا یہاں[۵۲] عرب اپنے حسب و نسب شجاعت خوں ریزی شکار حتیٰ کہ کثرت مصائب پر بھی فخر و مباہات کرتے مستند سپاہی فنون جنگ کے کرتب دکھا کر ناظرین سے داد تحسین حاصل کرتے۔

شاعری اس مجمع میں شاعر کا مرتبہ ارفع و اعلیٰ ہوتا یہاں ہر قبیلے کے شاعر اپنے اپنے کمال کو ظاہر کرنے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے جمع ہوتے کوئی مستند علامہ صدر نشین بن کر ان کے کلام کو سنتا جب شاعر کسی ٹیلہ پر کھڑے ہو کر اشعار پڑھتا تو لوگ ہمہ تن گوش ہو کر سنتے قصیدہ ختم ہونے تک قطع کلام نہ کرتے شاعر کے ہونٹوں سے الفاظ ادا ہوتے کہ کونٹوں چڑھ جاتے اس طرح عمدہ عمدہ اشعار زبان زد [illegible]

یہ مجمع نہ صرف عوام کا ہوتا بلکہ اس میں بڑے بڑے شعرا اعلیٰ درجہ کے نقاد اور خطیب بھی موجود رہتے جب کوئی مرصع اور اعلیٰ قصیدہ ان کے تنقیدی پیمانہ پر پورا اترتا تو اس کے لئے "ملقوہا اثبتوہا"[۵۳] کا نعرہ

۵۱۔ معجم البکری ص ۶۶

۵۲۔ کتاب الاغانی ج ۲ ص ۱۳۔

۵۳۔ معلقات کی وجہ تسمیہ میں مورخین کا اختلاف ہے متقدمین میں سے قدیم شاعر ابو نحاس اور بعض مستشرقین بھی ان کا استدلال یہ ہے کہ جب کوئی قصیدہ پسند آتا تو بادشاہ اس کو حکم کرتا "ملقوہا و اثبتوہا" یعنی وہ لکھ کر خزانے میں محفوظ کیا جاتا اور جو اس طرح محفوظ کر لیا جاتا وہی معلقہ سمجھا جاتا خانہ کعبہ میں آویزاں کرنے کو برا سمجھتے مگر ابن خلدون ابن عبد ربہ اور ابن رشیق نے تعلیق قائل کر کے

بلند ہوتا اور وہ اس شاعر کا شاہکار سمجھا جاتا چنانچہ سبعہ[1] معلقات جن پر قبولیت عام کی مہر لگ گئی تھی اب تک مشہور ہیں جب شاعر شعر کہتا اور خطیب تقریر کرتا تو وہیں ہر شخص کی لیاقت کا امتحان ہو جاتا اور جو جس قابل ہوتا اس قابل مان لیا جاتا یہ بازار گویا اہل عرب کی لیاقت کے امتحان کا مقام تھا جو شاعر اس امتحان گاہ میں کامیاب ہوتا اس کو قبولیت عام کی سند عطا کی جاتی جس سے تمام ملک میں اس کی شہرت ہو جاتی جو یہاں ناکام ہوتا وہ گمنامی کے گڑھے میں گر جاتا سال بھر تک شعرا اس فکر میں رہتے کہ ایسے قصائد تیار کئے جائیں جو یہاں پر بڑھے چڑھے رہیں اور میدان سخن میں بازی لے جائیں زہیر کے حولیات[2] مشہور ہیں۔ یہاں اگر کسی کی ہجو کی جاتی تو وہ سب لوگوں کی نظروں سے گر جاتا اور کوئی مستند شاعر کسی کی تعریف کرتا تو اس کی چار دانگ عالم میں شہرت ہو جاتی وہ کیسا ہی غیر خستہ حال کیوں نہ ہو لوگوں میں معزز و باوقار ہو جاتا چنانچہ محلق کلابی کا واقعہ اس کا شاہد حال ہے۔

اعشیٰ کی مدح کا اثر | محلق[3] کا نام عبدالعزیز بن حنتم بن شداد بن ربیعہ بن عبداللہ اور کنیت ابو کلاب ہے اس کو محلق کہنے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ایک دفعہ گھوڑے نے اس کے رخسارے کو کاٹ کھایا تھا جس سے اس پر ایک حلقہ سا بن گیا اس لئے اس کو محلق کہتے۔ یہ شخص مفلوک الحال تھا اور بدنصیبی سے اسے کئی بیٹیاں بھی تھیں اس نے ایک دفعہ اعشیٰ کو اپنا مہمان بنایا اور ایک اونٹ ذبح کر کے کوہان وجگر کے کباب و شراب سے خوب ضیافت کی محلق نے جواب دیا کہ یہ آٹھ لڑکیاں مجھی بدنصیب کی ہیں ان میں سے بہت کم کی شادی ہوئی ہے یہ سنکر اعشیٰ خاموش ہو گیا عکاظ کے میلے میں ایک قصیدہ مدحیہ علی الاعلان اس کی مہمان نوازی کے متعلق سنایا اس مجمع میں تمام اعیان و اشراف جمع تھے یہ گمنام شخص اس قصیدہ کی بدولت کل اہل وادی کی نگاہ میں وقیع ہو گیا اس کا تمول باوجود خستہ حالی کے معروف ہو گیا کئی جگہ سے پیام آئے اور مہر کثیر پر اس کی لڑکیاں بیاہ لی گئیں جس کی وجہ سے وہ عمر بھر عمدہ زندگی گذار سکا۔

---

[1] شمار معلقات کی نسبت راویان اشعار مختلف الرائے ہیں۔ ابوزید قرشی جمہرۃ اشعار العرب کے پاس آٹھ ہیں مگر زوزنی نے سات ہی قرار دئے ہیں قصائد نابغہ اور اعشیٰ کو خارج کر کے قصیدۂ حارث ابن حلزہ کو داخل کیا ہے اور ابو زکریا تبریزی عبید ابن الابرص کے قصیدہ کو بھی ان پر اضافہ کیا ہے غرض کہ معلقات و ملحقات ملا کر دس ہوتے ہیں جن کے اصحاب حسب ذیل ہیں:۔ امرالقیس۔ نابغہ۔ زہیر۔ طرفہ۔ لبید۔ عنترہ۔ عمرو بن کلثوم۔ حارث ابن حلزہ۔ عبید ابن الابرص۔ اعشیٰ

[2] زہیر چار مہینے میں قصائد تیار کرتا اور چار مہینے نظر ثانی کرتا پھر معصروں میں تنقید کیلئے چار مہینے پیش کرتا یوں قصیدہ کی تیاری میں ایک سال گزرتا اور اس طرح تیار شدہ قصائد حولیات کہلاتے تھے [3] کتاب الاغانی ج ۸، ص ۷۸

جو لوگ خطیب ہوتے وہ تقریر کرتے اور ان کا درجہ مقرر کر دیا جاتا اسی مجمع عکاظ میں جاہلیت کے مشہور خطیب قس ابن ساعدہ کو جو نجران کا اسقف تھا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے سرخ اونٹ پر سوار خطبہ دیتے ہوئے سنا تھا اس جگہ بعض باتوں میں مناظرہ بھی ہوتا اس مجمع میں علاوہ اور فائدوں کے زبان[1] کا بیحد فائدہ ہوتا بہت سی غلطیاں نکل جاتیں زبان شستہ اور ٹکسالی ہو جاتی چنانچہ قریش عکاظ کے بازار میں تمام قبائل کی گفتگو سنتے اس میں سے جو پسند کرتے اس کو اپنی زبان میں داخل کر لیتے اور جو خرابی اپنی زبان میں دیکھتے اس کو نکال دیتے اس طرح ان کی زبان ثقیل لغات اور قبیح کراہت الصوت الفاظ مثلاً کشکشہ[2] کسکستہ عنعنہ فحفحہ وکم وہم عجعجہ استنطاء وستنہ وغیرہ سے پاک و شستہ تھی جو دوسروں میں رائج تھے۔

عکاظ میں مشاعرہ | اصمعی[3] کا بیان ہے کہ بازار عکاظ کے میدان شعر و سخن میں جب دور دراز کے شعرا اپنے اپنے کمال کا اظہار کرنے اور ایک دوسرے پر سبقت لیجانے جمع ہوتے تو میر مشاعرہ کے جلیل القدر عہدہ پر مشہور و مستند شاعر نابغہ ذبیانی[4] ممتاز ہوتا اس کیلئے ادیم سرخ کا ایک خیمہ نصب کیا جاتا مختلف شعرا اپنا اپنا

---

[1] المزہر ۱۰۹ ج ۱۔

[2] ابدال الشین بالکاف نعت بنی تمیم اکر شکش یجعل الہمزہ عینا لغۃ التمیم عن تفعل فی موضع ان تفعل وکذا

[3] کتاب الشعر والشعراء از ابن قتیبہ

[4] اس کا اصلی نام زیاد بن معاویہ کنیت ابو امامہ یا ابو ثمامہ ہے جو اس کی لڑکیاں تھیں نعمان بن منذر ملک الحیرہ کے باپ دادا اور خود اس کا ندیم خاص اور مداح تھا ہمیشہ اس کے انعامات سے مالامال رہا کچھ دنوں بادشاہ کی شکر رنجی کا باعث ہوکر دربار غسان میں پہنچ گیا اور عمرو ابن الحارث اصغر کی مدح سرائی کی اس کے انتقال کے بعد جب اس کا بھائی تخت نشین ہوا تو یہاں سے رخصت ہو کر معذرت لکھ بھیجی اور ملک الحیرہ کے دربار میں داخل ہو گیا۔

ابو عبیدہ کا بیان ہے کہ نابغہ ذبیانی اس لئے صدر نشین بنایا جاتا اور افضلیت کا سہرا اس کے سر اس لئے باندھا جاتا کہ اس کا کلام حشو و زوائد سے پاک حسن مطالع اور مقاطع کے لحاظ سے نہایت ارفع و اعلیٰ ہوتا کلام میں کہیں بلا کی سادگی و بے ساختگی ہوتی۔ روانی زبان و عذوبت بیان سے یہ ظاہر ہوتا کہ اس کے اشعار کیا ہیں شہد اور کبھی اشعار اس قدر متین و پر تمکین ہوتے کہ گویا پہاڑوں سے ٹکرا رہے ہیں ابتداً اس کے کلام میں اقوا پایا جاتا تھا مگر بعد میں ترک کر دیا اس کے اکثر و بیشتر اشعار سے تمثیل کیا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس کو دوسرے شعرا سے مقدم و بہتر مانا ہے اس نے مدح سرائی کے علاوہ متعدد شعبوں خود ستائی میں بھی طبع آزمائی کی ہے اس کا ایک معلقہ اور دو قصیدے جس میں متجردہ کا سراپا بیان کیا ہے شہرہ آفاق ہیں

کلام سناتے جب ہر قبیلہ کا شاعر اپنا اپنا کلام سنا چکتا تو نابغہ ذبیانی بحیثیت صدر نشین ان کے کلام پر اپنی رائے ظاہر کرتا یہاں پر مفردات سے لے کر تراکیب تک کی تحقیق و تنقید ہو جاتی جن کا کلام قریش کے لب و لہجہ سے متجاوز ہوتا وہ ٹکسال باہر سمجھا جاتا اشعار کے معائب و محاسن بتلائے جاتے ایک شاعر کو دوسرے پر ترجیح دی جاتی جس پر ترجیح دی جاتی اس کے کلام پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہوتی اور جس کو ترجیح دی جاتی اس کے کلام کے محاسن دکھلانے پڑتے۔

حسانؓ و خنساءؓ کا ادبی مناظرہ | ایک دفعہ کا دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ عکاظ کے مجمع میں نابغہ ذبیانی کے سامنے مختلف شعرا اپنا اپنا کلام سنا کر داد تحسین حاصل کر رہے تھے کہ دربار نبوت کا مشہور شاعر حسانؓ بھی آ پہنچا۔ اس وقت جاہلیت کا نامور شاعر اعشیٰ اپنا قصیدہ سنا رہا تھا۔ اس کے اختتام پر عرب کی مشہور شاعرہ خنساءؓ کی باری آئی اس کا کلام سن کر میر مشاعرہ نے کہا کہ اگر تجھ سے پہلے میں اعشیٰ کا کلام نہ سنا ہوتا تو ضرور تجھ کو اشعر الشعرا کا خطاب دیتا اس پر حسانؓ نے بگڑ کر کہا "انا واللہ اشعر منک و منھا" اس پر نابغہ خیال صدر نشین نے کہا کہ تم اپنے منتخب اور قابل فخر شعر سناؤ حسانؓ نے یہ اشعار پڑھے اور کہا میں ان پر جس قدر ناز کروں کم ہے دکفی بہ فخرا و ہوذا۔

لنا الجفنات الغر یلمعن بالضحی[۲] | واسیافنا یقطرن من نجدۃ دما
ولدنا بنی العنقاء وابنی محرق[۳] | فاکرم بنا خالا واکرم بنا ابنما

اس کے بعد ان کے اشعار پر خوب جی کھول کر موشگافیاں کیں۔ اعتراضات[۴] کی بوچھاڑ سے ناطقہ بند کر دیا عالی دماغ صدر نشین اور چرب زبان خنساء سے حسانؓ کا پیش پانا مشکل تھا رنگ فق ہو گیا منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں ساری شیخی کرکری ہو گئی حسانؓ بالکل لاجواب ساکت و صامت

---

[۱] الاغانی، ۸ ج ۸

[۲] ہم ایسے فیاض ہیں کہ ہمارے پاس روشن پیالے چاشت کے وقت چمکتے ہیں اور بسبب شجاعت کے ہماری تلواروں سے خون ٹپکتا ہے ہمارے اہل دھیال بنی عنقا اور ملک عمرو ابن ہند سے ہیں ورامون کے لحاظ سے بنی شریف ہیں۔

[۳] ملک عمرو بن ہند کا لقب ہے جو بنو تمیم کے سو حملہ آوروں کو مارنے کی وجہ سے پڑ گیا۔

[۴] وہ اعتراضات یہ ہیں:- (۱) جفنات و اسیاف جمع قلت کا وزن ہے جس کا اطلاق دس تک ہوتا ہے اس کی بجائے جفان و سیوف ٹھیک تھا۔ (۲) غر سے بہتر بیض ہے (۳) یلمعن بالضحیٰ کی بجائے یبرقن بالدجی میں زیادہ آب و تاب ہے کیونکہ مہمانوں کی آمد اکثر شب میں ہوا کرتی ہے اور اسی وقت مہمانی کی شدید ضرورت ہے۔ (۵) یقطرن سے بڑھ کر یجرین مطلب خیز ہے (۶) بجائے دم کے اگر دماء [illegible] [illegible] پر فخر کرتا ہے۔

رہ گئے پھر مشاعرہ کی سب پر دھاک بیٹھ گئی[1]۔

المربد یا عکاظ اسلام

سب سے پہلے بصرہ اور کوفہ میں فاتحین اور ان کے اہل و عیال بس گئے پھر جب اسلامی فتوحات مشرق و مغرب کی جانب بڑھتی گئیں اور مسلمانوں کی حکومت راسخ ہو گئی تو عربوں نے اپنے اہل و عیال کے ساتھ عیش و نشاط کی خاطر بلاد معمورہ سے جدید ملکوں میں سفر کیا اور انہوں نے اپنے لئے بادیہ سے قریب قدیم بلاد چن لئے اس طرح کے موافق طبع بلاد بصرہ اور کوفہ تھے کیونکہ وہ جزیرۃ العرب شام و عراق کے حدود پر واقع ہیں۔

عرب یہاں آکر قبایل و بطون پر منقسم ہو گئے یمن کے عرب بلدہ کے ایک طرف اور حجاز کے دوسری طرف آباد ہو گئے جب یہ لوگ ان بلاد میں منتقل ہو گئے تو ان کے ساتھ ان کے اخلاق و عادات جاہلیہ بھی یہاں جاری و ساری ہو گئے انہوں نے جاہلیت کے بازار عکاظ کی یاد تازہ کرنے کے لئے ایک بازار لگایا جہاں پر فخر و مخاصمہ مناظرہ و مشاعرہ کیا جاتا اس جولانگاہ میں پھر شعر و سخن کی وہی اگلی دلچسپیاں جنم لیتیں۔ ان میں زیادہ مشہور مربد ہے جو بصرہ میں واقع ہے اور ایک بازار سوق الابل کے نام سے مشہور تھا بعد میں ایک بڑا محلہ ہو گیا جہاں لوگ آباد ہو گئے یہاں شعراء و لکچراروں کی بھی گرم بازاری رہتی تھی

دولت امویہ کے زمانہ میں مربد عکاظ اسلام تھا جہاں مشاعرہ[2] مفاخرہ و مجالس ادب کا انعقاد ہوتا یہاں ایک دوسرے کی خوب خبر لیتا اس مجمع میں شاعروں کے راوی[3] اور نقاد سخن بھی موجود ہوتے محفل شعراء کے مخصوص حلقات ہوتے جن میں سب سے زیادہ مشہور فرزدق و راعی الابل کے ہیں اور امراء و شرفا بھی مذاکرہ اور مشاعرہ کی خاطر مربد میں جمع ہوتے اور ہر طرف سے بہ شعر و سخن محفل آراستند نشستند و گفتند و برخاستند کا مضمون نظر آتا اشراف کوفہ بھی اسی طرح نواح کوفہ میں جمع ہوتے مگر سوق مربد سوق عکاظ کے مانند اس زمانے کے سوق متداولہ سے سب میں بڑھا چڑھا تھا۔

---

[1] آداب اللغۃ العربیہ جزء اول جرجی زیدان۔ [2] الاغانی ۱۸۲ ج [3] الاغانی ۱۵ ج [4] الاغانی ۱۶۹ ج ۲۰

خواجہ محمود گاواں کے مزار پر نذر عقیدت کے دو پھول

از

مولوی محمد حسین صاحب ادیب ایم اے، بی ای ڈی

اے کہ تو اجڑے ہوئے بیدر میں آرامیدہ ہے
ساتھ تیرے عظمت ملک دکن خوابیدہ ہے

تھا گلستان دکن کا مرغ خوش الحان تو
تیرے ہی دم سے تھا قائم اس چمن کا رنگ و بو

بہمنی اجلال کی گویا تھا تو روح رواں
تیری تدبیر و فراست کا تھا قائل اک جہاں

عقدۂ مشکل عطارد جس سے تھا خود رو مل
ناخن حکمت سے تیرے پل میں ہو جاتا تھا حل

مصلحت کاری تری تھی ملک میں خیر اندبند
تیرا انداز حکومت تھا خلائق کو پسند

چھپ نہیں سکتی تھی مستقبل کی بھی تیرہ میں
بھانپ لیتی تھی اسے تیری نگاہ پیش بیں

تھا فسوں پرور ترے فکر و تدبر کا رباب
جس سے ہوتا تھا سیاسی مشکلوں کا سد باب

تیرے آئین جہاں بانی کا تھا عالم میں شور
آ ہوئے صحرا پہ چل سکتا نہ تھا ضیغم کا زور

بادۂ حب وطن سے دل ترا سرشار تھا
ملک و ملت کیلئے تو نور کا مینار تھا

تو سیاسی میکدوں ہی میں تھا آتش بجام
رزمگاہوں میں بھی شعلہ بار تھی تیری حسام

دل ترا امن و اماں کی جستجو کا تھا شہید
قوت بازو تری تھی باب نصرت کی کلید

بحر و بر میں جب کیا تو نے لوا اپنا بلند
ہو گیا اقبال و دولت کا ہما صید کمند

اک بپھرتے شیر کا سا تھا ترا جوش و خروش
تیغ کی جھنکار تھی تیرے لئے فردوس گوش

بزم و مجلس میں تری تدبیر و دانش بے مثال
جنگ کے میدان میں تیری شجاعت لازوال

برق خرمن تھی عدو کو تیری تیغ ناصبور
جس کے جوہر کی چمک تھی رشک شمع کوہ طور

تیری ہمت پر شکوہ بہمنی کا تھا مدار
فتح و نصرت سے ہمکنار تابی تری تھی ہمکنار

برق و شعلہ نشیمن تھا تری تلوار میں
زلزلہ برپا تھا جس سے عرصۂ پیکار میں

تیرے دم سے تھی فروزاں شمعِ علم و ہنر
آبیاری سے تری تھی کشتِ حکمت سبز و تر

تھا گلستانِ سخن میں بھی ترنم ریز تو
ہمدمی کی تیری بلبل تھی قتیلِ آرزو

نغمۂ شیریں تھا تیرا گویا جامِ سروش
دل کے ہنگامے سراسر جس سے ہوتے تھے خموش

علم تدویرِ فلک میں بھی تجھے تھی دستگاہ
اوجِ کیواں تھا تخیل کی ترے جولانگاہ

شاہدِ علمِ ریاضی کیوں نہ ہو الٹے نقاب
جس کے جلووں کی تھی محرم تیری فکرِ ضوتاب

فنِ طب میں بھی تجھے حاصل مہارت تھی زبس
نبضِ دودی کو حرارت بخش تھا تیرا نفس

خوشنویسی نے تری مانی کو شرمندہ کیا
باجِ تحسیں موقلم سے تیرے خامہ نے لیا

علم و فن کے نور سے آئینہ تھا روشن ترا
گوہرِ مکنوں سے معمور سے تھا دامن ترا

کن فکاں کے زمزمے سے آشنا تھا تیرا گوش
نورِ عرفاں سے فضائے صدق تھی آئینہ پوش

لذتِ درد و الم سے بھی تو بہرہ یاب تھا
مزرعِ دل گریۂ شب گیر سے شاداب تھا

تیرا مشرب تھا ورائے خانقاہ و کنجِ دیر
شہپرِ مرغِ یقیں تیرا تھا دائم عرش سیر

سینۂ صافی ترا تھا آشنائے سوز و ساز
تندیِ صہبائے ذوق و شوق تھی مینا گداز

گنجِ شاہی کو ملا تھا تجھ سے حکم "دور باش"
آخری دم تک تجارت تھی تری وجہِ معاش

گرچہ اک عالم تری بخشش کا تھا منت پذیر
صوف تھا مرغوب تجھکو جائے دیبا و حریر

شان تھی دربار میں گرچہ امیرانہ تری
خانگی طرزِ رہائش تھی فقیرانہ تری

مثلِ ایوانِ سحر سینہ منور تھا ترا
مشکِ معنی سے مشامِ جاں معطر تھا ترا

ذہن تیرا مائلِ تدبیر باز وصف شکن
سینۂ علم و فن کا مخزن قلبِ تاباں ضو فگن

اتنے اوصافِ حمیدہ ایک جا ہوتے ہیں کم
تجھ میں ساری خوبیاں تھیں لطفِ خالق سے بہم

زندگی یکسر تھی تیری بذل و رحمت کا سحاب
گوشۂ دامن کا ہر قطرہ تھا جس کے درِ ناب

در ترا تھا مامنِ صاحب دل و اہلِ کمال
تیرے الطاف و کرم نے کر دیا سب کو نہال

اہلِ حاجت کیلئے دامن ترا زر بار تھا
دردمندوں کو نفس تیرا مسیحا کار تھا

بزم و مجلس بھی تری نا آشنائے امتیاز
تھا جہاں محمود کا ہمدوش بے مایہ ایاز

آج تک قائم ہے تری عرش پایہ درسگاہ
منفعل جس کی ضیا باری سے ہیں خورشید و ماہ

خون تیرا لالہ کاری کیلئے بیتاب تھا
جس سے گلزار دکن بارونق و شاداب تھا

تیرے جوہر بن گئے آخر کو تیغ آبدار
پارہ ہے جس کی حسد پر ور نہ ہو سینۂ فگار

شعلۂ جوالۂ فتنہ ہوا ایسا بلند
پیکر خاکی کا ترا جس میں جلا مثل سپند

قتل نے تیرے دیا دولت کو پیغام زوال
کس قدر عبرت فزا ہے خون ناحق کا مآل

امن و آسایش کے سامان نذر طوفاں ہوگئے
یعنی تسبیح کے دانے پریشاں ہوگئے

بزم کی رونق گئی گلشن بھی ویرانے ہوئے
جوشش صہبا سے خالی دل کے پیمانے ہوئے

جب سحاب تیرہ گوں میں ماہ کنعاں ہو نہاں
مصر کے بازار میں پھر حسن کی گرمی کہاں

زنگ پیدا ہوگیا آئینۂ ناموس میں
چھپ گئی شمع فروزاں پردۂ فانوس میں

شعلۂ قومی چراغ لالۂ صحرا ہوا
دل مذاق تابش و گرمی سے بے بہرا ہوا

کس قدر حسرت فزا ہے تیرے مرقد کی فضا
بحر خاموشی میں ہے ڈوبی ہوئی موج ہوا

متصل مدفن کے آئینہ صفت تالاب ہے
لہر جس کی سجدہ ریزی کیلئے بیتاب ہے

سطح سیمابی سے اس کی ایک دلکش رقص گاہ
ناچتی ہے ناز سے جس پر شعاع مہر و ماہ

سادگی کی زندگی دنیا میں تو نے کی بسر
بے گماں ویرانی تربت اسی کا ہے اثر

جز رواق چرخ مرقد پر کوئی گنبد نہیں
نام تیرا خاتم شہرت کا لیکن ہے نگیں

عود و شمع و گل سے گو محروم ہے تیرا مزار
داغ خونیں سے مگر تیرا کفن ہی لالہ زار

شامیانہ نیم کا ہے قبر پر سایہ فگن
چشم انساں سے نہاں ہے کوئی جب نغمہ زن

جگنوؤں کی تابشوں میں ہے چراغاں کا اثر
اس سکوں پرور فضا میں ہے شبستاں کا اثر

پھول یا کمخواب و ریشم کیوں ہو بار دوش ہو
چادر مہتاب خود جب تیری تربت پوش ہو

ایسی رفعت پر ہے واقع تیرا خوش منظر مزار
ہے نظر آتا جہاں سے ایک عالم کا فشار

مرغزار و کوہ و شہر و باغ و کشت رنگ زار
سب کے سب ہیں تا مدی ہم آغوش نظر

محو گردش آسماں میں جیسے تیرے قمر
منزلیں طے کرکے جب آتا ہے وہ بالائے سر

تیری تربت پر ٹھہرتا ہے نظر بھی کے لئے
فاتحہ پڑھتا ہے اظہار عقیدت کیلئے

تیرے روشن کارنامے یاد ہیں ازبر ہمیں — خاک تیری قبر کی ہے جنت منظر ہمیں
جام دل لبریز ہو جاتا ہے اس کا رحم سے — اشک کے قطرے ٹپک پڑتے ہیں اس کی خیم پر

گوشۂ مرقد کا ہر ذرہ سراپا درد ہے
نسیم کی ٹھنڈی ہوا بھی گویا آہ سرد ہے

جسم تیرا ہو گیا گرچہ ہم آغوش فنا — نام و شہرہ تیرا لیکن ہے عدم ناآشنا
تیرے روشن کارناموں سے اجل شرمندہ ہے — لوح زریں بقا پر نام تیرا کندہ ہے
پیکر خاکی ہے تیرا چشم عالم سے نہاں — زندگی تیری ہے لیکن جاوداں ہم دواں
کارزار زندگی میں آج بھی رہبر ہے تو — راہ گم کردہ سفینوں کیلئے اختر ہے تو
قلزم دل میں تلاطم خیز ہے تیرا عمل — خفتہ پا رہوار کو مہمیز ہے تیرا عمل
سالکوں کے واسطے ہے خضر رہ تیری حیات — ظلمت شب کیلئے ہے نور مہ تیری حیات
مجلس سینہ سے نالہ کو رہا کرتا ہے تو — چشم بے مایہ کو طوفاں آشنا کرتا ہے تو

ساز ملت کو ہے سامان نوا تیری حیات
کارواں کے حق میں ہے بانگ درا تیری حیات

موت نے تجھ کو اگرچہ رکھدیا زیر زمیں — روح تیری لیکن اپنا سوز کھو سکتی نہیں
نام تیرا آج بھی ہے خلق کے ورد زباں — نقش پا تیرا ہے یکسر رہبر پیر و جواں
اک نمونہ ہے تو یاس و تدبر کیلئے — خضر رہ ہے اہل عرفان و مبصر کیلئے
بے حسی جب دل کے ہنگاموں کو کرتی ہے خموش — یاد سرگرمی تری دیتی ہے پیغام سروش
سورماؤں کو ترا نقش قدم ہے حرز جاں — رجز خوانی کا اثر ہے نام میں تیرے نہاں
ذکر حق گوئی کا تری ہے محبت ہنگامہ خیز — دل کو کر دیتا ہے جو باطل سے گرم ستیز
فیض کا طالب ہے تجھ سے یہ ادیب بینوا — ہے زباں پر اس کی جاری دن صبح و مسا

عارض خاور میں جب تک رنگ عنابی رہے
تیری عریاں قبر پر شبنم کی شادابی رہے

ایک نوزائیدہ کی موت پر

از

جناب سید علی صاحب نظام کالج حیدرآباد دکن

(چارلس لیمب نے اپنے دوست ٹامس ہڈ کے ایک نوزائیدہ طفل کی موت پر ایک نظم لکھی تھی، جس کا یہ نثری ترجمہ ہے)

میں نے ایک عجیب و غریب شئے کفن میں لپٹی ہوئی دیکھی قدرت کی دستکاری کا ایک نادر کرشمہ تھا، ایک نازک حسین ننھی سی کلی تھی، جس کو کھلنے سے پیشتر کچل ڈالا گیا، ایک نوزائیدہ طفل تھا جو اپنے گہوارہ میں (جو اب تابوت بن گیا تھا) پڑا ہوا میٹھی اور دائمی نیند سو رہا تھا، اس کو یہ بھی خیال نہ تھا کہ وہ اب صفحۂ ہستی سے بالکل مٹ چکا ہے وہ ابھی رحم مادر کے… تاریک زنداں سے نکلا ہی تھا کہ موت کا بے رحم پنجہ اس کو لحد کے مظلم و تاریک ترین غار میں گھسیٹ لے گیا۔

ابھی ایک آنکھ کھلنے بھی نہ پائی تھی کہ اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہوگئیں دنیا اس کے لئے بالکل تاریک تھی، اس کو دنیا کی روشنی دیکھنی نصیب نہ ہوئی اس دہر ناپائیدار کا اس کو کوئی تجربہ نہ ہوا خواہ وہ شیریں ہو یا تلخ۔

یہ ایک عجیب معمہ ہے! کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ تیری اس سرسری آمد کا کیا مدعا تھا؛ اور کیا کوئی یہ معلوم کرسکتا ہے کہ تو اس دنیا والوں کیلئے کیا پیغام لایا تھا؟

کیا ہم یہ سمجھیں کہ قدرت نے اپنے موقلم سے ایک اکمل اور نادر تصویر کھینچی تھی اور اس کے بعد ہی (نعوذ باللہ) کوتاہ نظر و سنگین دست بن کے اس کو مٹا دیا اور کیا یہ ممکن ہے کہ قدرت نے اپنی قوت تخلیق کو ضعیف پایا، یا یہ کہ نو مہینوں کی محنت و مشقت کے بعد اس سے جان بخشی کی وہ صفت معدوم ہوگئی جس سے بچہ کے اعضا میں توانائی آجاتی؟

لیکن نہیں تیرے مضبوط اعضا سے تو یقین ہوتا تھا کہ تو صحت مند زندگی اور طویل عمر پائے گا وضع قطع کے اعتبار سے تو اپنی ماں کا بالکل ہم شبیہ تھا۔ تیرے اعضا (افسوس کہ جو اب گرمیٔ حیات کھو کر سرد ہو گئے ہیں) ایسے خوش نما اور سڈول تھے کہ خود صناع ان کو دوسری حسین اشیاء کے تیار کرنے کے لئے نمونہ بنا لیتا۔

تو پھر کیا اب ہم یہ سمجھیں کہ سنگدل قضا نے یہ تصفیہ کر لیا تھا کہ ماں یا بچہ دونوں میں سے کسی ایک کا ضرور خاتمہ کرنا چاہئے اور کیا اسی لئے موت کے تیز و تند جھونکے نے تنے پر رحم کھایا لیکن شاخ کو اس سے جدا کر دیا اس میں بڑی مصلحت پنہاں ہے، شوہر کو بیوی کے صدمۂ دائمی مفارقت اور تنہائی کی صعوبتوں سے بچانے کے لئے ایسا کیا گیا ہے قدرت کا یہ طرز عمل نہایت پر اسرار ہے دنیا کے اکابر علما اس معمہ کے حل کرنے میں ناکام رہے ہیں کہ کیوں نسل انسانی کی معصوم کلی کھلنے سے پیشتر مرجھا جائے اور گمس بے مایہ روزینہ ؟ دشمن کی پوری بہار دیکھے اور کیوں ایک خطاکار مردہ ضمیر پیر زال صد سالہ عمر پائے جس کے جسم پر کہن سالی سے جھریاں پڑ جاتی ہیں اور جو کہ سنی میں شاخ حیات کا رس سوکھ جانے پر نیم خشک یا سنگ و خشت سے بدل جاتی ہے۔

اے عزیز بچے تجھے محروم نہ رہنا چاہئے۔

ماں کے پر شوق بوسوں سے، اور اس کے ان ٹوٹے ہوئے بولوں سے جن کو وہ ممتا کے جوش سے از خود رفتہ ہو کر بچوں کی طرح بولنے لگتی ہے، نقرئی گھنٹیوں سے، اور بچوں کی پوشاک سے مونگے کی اشیاء سے جوان لبوں سے زیادہ سرخ ہیں، جن کو ابھی بے رحم موت نے زرد کر دیا ہے، باجوں سے جو محض بچوں کے بہلانے کیلئے تیار کئے جاتے ہیں، ان سیٹیوں سے جن کو تو نے کبھی نہیں سنا، گو تو ان چیزوں کا طالب نہیں ہے لیکن تجھے وہ ضرور ملنی چاہئیں جو درد مند اور محبت بھرا دل رکھتے ہیں وہ تجھے یہ چیزیں دیں۔

اے دایہ! دیکھ ان میں سے کوئی شئے چھٹنے نہ پائے، یہ تمام چیزیں اس معصوم کے تابوت میں رکھ دے جو ظالم اور ہٹ دھرم تقدیر کے ہاتھوں مٹ چکا ہے کیوں بادشاہ اور امراء اپنی قبروں پر افتخار و امتیاز کے نشان بلند کریں اور ہم بیگانۂ عظمت و شہرت افراد کیوں تجھے ان خوبصورت کھلونوں سے محروم رکھیں جو تیرے ساتھ پڑے رہیں گے۔

ہماری یہ نمائش و نمود بے ضرر و بے عیب ہے۔

باد دکن

(۴)

میر غلام مصطفیٰ سخن اورنگ آبادی

قصیدہ در مدح مہاراجہ چندو لال دیوان دکن

دیوان سخن میں (۵۸) صفحے قصائد کے ہیں، سب سے پہلے حضرت علیؑ کی منقبت و الاقصیدہ قرأت قارئین کی نذر ہو چکا ہے۔ ایک مثنوی "صریر سخن" بھی شاعر کی ذاتیات کے سلسلے میں پیش کی گئی، مدحیہ قصائد میں سے ذیل کا قصیدہ پیش ہے قصیدہ کی نسبت اس شعر کی وجہ سے سہ

سرتاج راجہ ہائے آفاق جس کو کہیے — یعنے وزیر اعظم اسکندرِ زماں کا

میری رائے یہ ہے کہ مہاراجہ چندو لال دیوان دکن کی مدح میں کہا گیا ہے۔ اگرچہ سخن کے زمانے میں مورو پنڈت، دھونڈو پنڈت رائے رایاں، راجہ بھوانی شنکر امانت و راجہ رام بخش برادر زادہ چندو لال خدمت پیش کاری سے علی الترتیب سرفراز تھے۔ لیکن ان راجگان میں سے یہ قصیدہ کسی کی بھی مدح کا نہیں معلوم ہوتا۔ ظن غالب کا تقاضا یہی ہے کہ ہو نہ ہو "راجہ ہائے آفاق" مہاراجہ چندو لال ہی ہیں اور اس پر "وزیر اعظم اسکندر" بھی مستزاد کا ٹکڑا ہے۔ نواب میر اکبر علی خاں سکندر جاہ، آصف ثالث (ولادت سنہ ۱۱۸۲ھ۔ حکومت سنہ ۱۲۱۸ھ رحلت سنہ ۱۲۴۴ھ) مغفرت منزل نے مہاراجہ چندو لال کو ۱۸۰۶ء مطابق سنہ ۱۲۲۱ھ میں خدمت پیش کاری سے سرفراز فرمایا تھا لیکن نواب منیر الملک کی مدار المہامی (سنہ ۱۲۲۴ھ تا سنہ ۱۲۴۸ھ) ہی سے دخیل کار دیوانی تھے۔

ان قصائد وغیرہ کے ساتھ انتخاب کلام سخن میں "عطر دیوان سخن" کی سعی کوشش کی جارہی ہے (مرا یافی)،

راغب بخرمی ہے دل بس کہ آسماں کا	معمور عیش سے ہے عشرت کدہ جہاں کا
بااین خمیدہ پشتی بشاش ہے جو اتنا	اس پیر پر پڑا ہے پرتو مگر جواں کا
ہے وہ پئے تدرع فغل و نشاط نسخہ	رکھ دوش پر پھرے ہے جو دام کہکشاں کا

ہے بہرِ انشراحِ خاطر شگوں بخشی — متصل بیر کرنا چشمِ ستارگاں کا

ہو کیوں نہ فرحت افزا سیرِ بہار دنیا — رکھتی ہے حکم یہ بھی گل گشتِ زعفراں کا

آتی ہیں کب بیاں میں نیرنگیاں جہاں کی — حقا کہ دیدنی ہے عالم جہانیاں کا

اغلب تو ہے کہ اب تک چشمِ زمانیوں نے — دیکھا نہ ہو زمانہ اس امن و اماں کا

ہے تقویت فزائے اربابِ ضعف یہاں تک — جوں پیل دل قوی ہے ہر مور ناتواں کا

یہ کچھ عجب نہیں ہے وقتِ مقابلہ گر — لے جائے پنجۂ لاغر رستم سے پہلواں کا

ذرات کا جو عالم دیکھا بغور ہم نے — رو کش ہے ذرہ ذرہ خورشیدِ خاوراں کا

ہر گل زمیں سے ہے اک حسن تازہ پیدا — رکھتا ہے لطف دیگر ہر باب گلستاں کا

رشکِ ارم نہ ہو جو وہ بزم کونسی ہے؟ — جس مجمعے کو دیکھو محسود ہے جناں کا

ایسی ہی فرحت افزا اب کچھ ہوا ہی ہے — کھلنا عجب نہیں ہے دل ہائے غنچہ ساں کا

ابنائے دہر میں ہے یہ اتحاد باہم — اٹھ ہی گیا تفاوت یک لخت درمیاں کا

پہنچا رواجِ الفت یہاں تک کہ عاشقوں کا — پگھلا ہی جاتا ہے دل کچھ خود بخود بتاں کا

جز مہر دل کسی کو ذرہ نہیں دلوں میں — ہے فیضِ عہد یہ بھی اک ماہ مہرباں کا

سرتاج راجہائے آفاق جس کو کہئے — یعنی وزیرِ اعظم اسکندرِ زماں کا

یہ ہے علوئے منصب اس کا کہ جس کے آگے — کمتر زمانیاں ہے رتبہ کیانیاں کا

دریا دلی گر اس کی کیجے بیاں عجب کیا — خجلت سے آب ہو دل دریائے بیکراں کا

جو داد اسقدر ہے دستِ سوال اس کا — سائل کو بخش دیوے سرمایہ بحر و کاں کا

ضبطِ عدالت اس کا ہے اس قدر کہ بالکل — مفقود ہے جہاں سے ہنگامۂ شب رواں کا

اہلِ زمانہ یکسر ہیں مستِ خوابِ شیریں — یہ عہد ہے کہ جہد راحت زمانیاں کا

چھوٹے نہ اسکے چنگل تقدیر سے ستمگر — مظلوم کو نہ لکھ دے جب تک کہ خط اماں کا

یہ امن ہے کہ چنگ باز و عقاب میں ہے — کبک و تدرو کے تئیں آرام آشیاں کا

خوف معاوضہ میں گھٹ جائے دل قمر کا — چھتا ہے جو اندک پھٹ جائے جی کتاں کا

اے عقل نکتہ پرور! ہرچند بیچ غالب — احسن ہے اور رسم محمود شاعراں کا

لیکن بموجب حاضر پڑھ دو کوئی شعر ایسا — سنتے ہی منبسط ہو تا دل خدائیگاں کا

اے بحر فیض! الحق حاتم ہے تو زماں کا

حاجت روا کہاں کا مقصد رسانِ جہاں کا

اے چارہ سازِ عالم! ہے لطفِ عام تیرا — راحت رسانِ دلوں کا آرام بخش جاں کا

اے ظلِّ رحمتِ حق! ابرِ کرم نے تیرے — برسا دیا جہاں پر مینہ فضل و امتناں کا

جاذب ہے بس کہ تیرا صیتِ کرم دلوں کا — اللہ! ہے فراہم عالم کہاں کہاں کا

فہمِ رسا کو تیری ہے اس جگہ رسائی — وہم و گماں نہ پہنچے جس جائے بخرداں کا

مشائیوں نے کھینچا خجلت سے سر مقابل — اشراقیوں نے تیرے آگے زمیں جہاں کا

ہے بارِ علم تیرا تنا گراں و سنگیں — لائق ہے گر ہو لنگر کشتی آسماں کا

خلقِ عظیم ہے وہ عنبر شمیم تیرا — پہنچے نہ جس کی بو کو مشک ایک کارواں کا

گزرے اگر چمن سے موجِ نسیم اس کے — مغز و مشام خوش بو ہو جائے بلبلاں کا

ہو آبیار گلشن تیری اگر محبت — پیدا ہو شاخِ گل سے گل بوئے نادراں کا

صید افگنی پہ آوے جس دم مزاج تیرا — ہو جمع گلہ گلہ صحرا میں وحشیاں کا

یہ بھی عجب نہیں ہے نخچیر گاہ سے ہو — سبزہ کی جائے پیدا اگلدام آہواں کا

بمری کے سر سے لیوے جس دم کہ تو اڑائے — ہو جائے سست بالِ پرواز طائراں کا

ہے وہ جو خاص گلگوں مرغوب طبع تیرا — سنداں سم و سبک تک سیر خیل تازیاں کا

حاشا کہ ہم نے ایسا دیکھا نہیں تگاور — اس ساق و اس کفل کا اس گوش و اس میاں کا

یہ جلد ہے کہ گرد و پس ماندہ کو اس کی — اشکال ہے پہنچنا برقِ سبک عناں کا

اتنا فرس ہے یہ پہنچے وہاں وہاں یہ — راکب کرے ارادہ دل میں جہاں جہاں کا

با ایں ہمہ فراست لائق ہے اس فرس کو — گر و فراس کہتے خیل تگاوراں کا

ہے یہ وہ نشہ جولاں پیمانہ چشم جس کی — پی جائے ہے خرام مستانہ دل اعیاں کا

ہر ہر قدم سے اس کے مستی کرے تراوش — یہ رنگ دیکھا ہے اس رخشِ عرق فشاں کا

نقشِ سم اس کا کم از رطلِ گراں نہیں ہے — ہو نشہ بخش کیوں نہ رندِ قدح کشاں کا

ہاتھی کے وصف تیرے کیونکر بیاں کریئے — ہے سرمہ رنگ اس کا گویائی زباں کا

خوش تر ہے اس کو خالِ روئے زمیں کہوں گر — احسن ہے در سوادِ دیدہ کہوں زماں کا

ہے دیدہ زیب اس کی ایسی ہی کچھ سیاہی — خوش آئے جس کے آگے سرمہ نہ اصفہاں کا

قدرت ہے وہم کو جو رفعت کو اس کی پہنچے — عظمت کو اس کی یاد ہے حوصلہ کماں کا

با ایں ہمہ مہابت ہے سربلند اتنا ... گزرے ہے آسماں سے سر اس کے فیل باں کا
داد دلاوری دے تو روز رزم میں جو ... ہیبت سے آب زہرہ ہو جائے دشمناں کا
رستم ہو گر مخالف رو برقرار رکھے ... جاں بر نہ ہو نہ چھوڑے تا نام سیستاں کا
رستم کی اور تیری کچھ بھی مناسبت ہے؟ ... وہ ایک ترک ادنا، سردار تو سراں کا
تسخیر ہفت کشور آساں ہے تجھ سے ورنہ ... مشکل ہے اس کو لینا بے ہفتہ ہفت خواں کا
اے خامہ! کوئی مطلع لکھ وصف تیر میں بھی ... تازہ نشین ہووے دستور قدر داں کا

قبضے میں اپنے لاوے قبضہ تو گر کماں کا
ہر ہر خدنگ تیرا ہو دل نشیں نشاں کا

زخم دل عدو کا منھ کیوں نہ لال ہوئے ... پیکان تیر تیرا ہے رشک برگ پاں کا
نوک سناں سے تیری ڈرتا ہی مہہ بجا ہے ... ہے پشت سے شکم جو چسپیدہ آسماں کا
کھینچے جو تو کرے شمشیر روز میداں ... فوج عدو سے برپا ہو شور الاماں کا
رکھتی ہے تیغ تیری کچھ طرفہ ترخم ودم ... خم ابروئے بتاں کا دم برق جاں ستاں کا
یہ رنگ ہے برش کا اس کی کہ نام لیجے ... خون زباں سے ساغر بھر جائے ہے دہاں کا
نزدیک اہل جوہر النسب تو ہے اگر ہو ... عقدہ کشا لقب اس شمشیر برق ساں کا
تقسیم جو ہر فرد اک ضرب یہ ہے اس کی ... ہے منحصر ارادہ ہو جس کو امتحاں کا
بس اے سخن! امنش ہو طول سخن مبادا ... ہو باعث کدورت آئینہ خاطراں کا
اولیٰ ہے اختتام نظم سخن دعا پر ... تا چند بار گردن خامے پہ ہو بیاں کا
روشن کن جہاں ہو تا آفتاب تاباں ... سرمہ سواد شب ہو تا چشم اختراں کا
تا عندلیب کو ہو الفت گل و چمن سے ... پروانہ گرد رہوے تا شمع و شمعداں کا
محتاج آب نیساں تا ہو صدف بدریا ... تا ابر تشنہ ہووے دریائے بیکراں کا
تا قلب کینہ توزاں کیں سے رہے ملوث ... تا سینہ صاف ہووے آئینہ مہرباں کا
تا عجز بیکساں کا شیوہ فروتنی ہو ... تا سر فرو نہ آوے نخوت سے سرکشاں کا
اس مرتبے کو پہنچے تیرا علوئے منصب ... ہو پائے قدر تیرا اور فرق فرقداں کا

ہے وہ جو نونہال باغ امید تیرا
با برگ و بار سایہ گستر رہے جہاں کا

انتخاب اشعار

ہے طرفہ اتفاق کہ حیران کار ہوں — وہ ہے تو میں نہیں ہوں جو میں ہوں تو وہ نہیں
اجماع حسن ظاہر و باطن محال ہے — لالہ کو حق نے رنگ دیا ہے تو بو نہیں
ہوتے ہوئے میں ان کے رہا یہ کہاں محال — شرکت اسے قبول ہو یہ اس کی خو نہیں

وہ زلف سیہ کے فسانے بہت ہیں — شب قدر کے سے دوگانے بہت ہیں

پرستش کے لیے کافر طرح کرتے ہیں بت خانے — عبادت کے لیے مومن خدا کا گھر بناتے ہیں
ق
بنانا خانۂ دل کا رکھے ہے اجر کل سو تو — نہ کافر ہی بناتے ہیں نہ دیں پرور بناتے ہیں

نام بھی لیتے ہوئے ڈرتے ہیں ہم ان کا سخن — دام میں پابند ایسے سخت بے دردوں کے ہے

کبھو ہوتے ہیں دانا اور کبھو ناداں ہوتے ہیں — یہ وہ کافر ہیں سب کچھ جان کر انجان ہوتے ہیں

لب کو فرماؤ تو نبات کہیں — ورنہ سرچشمۂ حیات کہیں
یہ بھی کوئی طور ہے سنو تو بھلا — ہم کہیں دن تو آپ رات کہیں
گرچہ تم خود پسند ہو لیکن — بات مانو تو ایک بات کہیں
ق
بات ایسی نہ کیجیے کہ جسے — لوگ سن کر مزخرفات کہیں

تکلف کا ہے کو کرتے ہو اتنا بے تکلف ہے — کرم فرمایئے نا بندہ پرور! ہم تمہارے ہیں
تمہاری آمد آمد کی خبر افشا ہوئی جب سے — تفاؤل پر تفاؤل ہے پیاپے استخارے ہیں
اثر افسوں بنانے کا جوانی کی گئی ورنہ — بہت ایسے پری رو ہم نے شیشے میں اتارے ہیں
سرکتے اس طرف جاتے تھے کیا اب کیا الاؤ ہے — کنارہ ہم سے گر منظور ہے ہم تو کنارے ہیں
اسے بس انقلاب دہر کا ایسا برا ہو کہ — یہ دل جو دوست تھے اپنے وہی دشمن ہمارے ہیں

تم بخود ہو تو لو کچھ ہم تو بے خود ہیں — رخ پہ نور ہیں یا مہر ہیں یا ماہ پارے ہیں
نہ ہو بایک دگر اب بھی محبت تو ہو ورنہ — ستارے جو تمہارے ہیں وہی اپنے ستارے ہیں

یہ تو باتیں ہیں کہ عبث عادہ گے ہیں — دل ہی دیکھتے نہیں تم اور کیا دو گے ہمیں
تم اگر تن دو ہمیں ہم جان تک حاضر کریں — ہم اگر دل دیں تمہیں فرماؤ کیا دو گے ہمیں؟
خیر ہے اے آنسوؤ ایسا نہ ہو طوفان ہو — تم تو کچھ ایسے ہی بہتے ہو بہا دو گے ہمیں

کب تک بھلا خموش میں اے ہم زباں رہوں — بت بن گیا ہے شوخ تو ایسا کہ ہاں نہ ہوں

اس پست فطرتی پہ جو یہ بلندیاں ہیں — یہ خود نمائیاں ہیں یہ خود پسندیاں ہیں
تم گرچہ سب طرح سے پاکیزہ خو ہو لیکن — گندہ دماغیاں ہی صاحب کی گندیاں ہیں

زیادہ ناز نہ کیجے کہ خوش نہیں آتے — جہاں میں اور بھی دلبر ہیں اک تمھیں تو نہیں
سخن سے ایک دن ایک آشنا نے صاف کہا — "خیال آپ کے مطبوع و دل نشیں تو نہیں
بقدر حوصلہ خلق گفت و گو کریئے — ق — مجھے پسند تمہاری چناں چنیں تو نہیں"

دیکھا نا سخن! تو نے وہ سب جو تک گئے ہیں — بے خود نظر آتے ہیں یا رات کے جاگے ہیں
سنتے ہی مرا قصہ وہ شوخ لگا کہنے — "سونے دے کہیں ظالم ہم رات کے جاگے ہیں"
اک دوست نے اتنے میں یوں بول اٹھا بارے — ق — "سنئے تو سہی آگے کچھ لطف تو آگے ہیں"

غم ساتھ ہی آلگے بے یار جہاں جاویں — بیٹھیں تو کہاں بیٹھیں جاویں تو کہاں جاویں

بے طرح آج اس کی آنکھیں مندی ہوئی ہیں — شاید نظر لگی ہے پلکیں کھڑی ہوئی ہیں

حیراں بجائے خود ہیں نظر باز کیا کریں — سو رنگ ان میں لائے ہیں سحر رو بات میں

قید فرنگ گرچہ اشد ہے پہ اے سخن — اقسام کے عذاب ہیں قید حیات میں

بوالہوس رو بہ رہ عشق ہو یارا ہی نہیں — سر سے جب تک نہ گزر جائے گزارا ہی نہیں

پیش ازیں بندہ نوازی جو کیا کرتے تھے — وہ تواضع ہی نہیں اب وہ مدارا ہی نہیں

لازم ہے آدمی کو کمال و زوال میں — جس حال میں ہو مست رہے اپنے حال میں

جب تک کہ وہ خموش تھے ہم بھی خموش تھے — آپس میں پھر تو ٹھن ہی گئی قیل و قال میں

در پردہ جب رقیب منانے لگے ہیں — جڑنے لگے لپیٹ کے پھر ہم بھی شال میں

بیگانہ اک جہاں سے جسکے لئے ہوئے — پھر بھی سخن وہ عہد شکن آشنا نہیں

چشم بد سے اُسے گزند نہیں — خال تو ہے اگر سپند نہیں

لطف کیا اس دماغ سوزی سے — پند عاشق کو سودمند نہیں

دوستوں کی خبر نہ پوچھو کچھ — چند موجود ہیں تو چند نہیں

وضع اہل زمانہ کیا کہیے — حق تو یہ ہے ہمیں پسند نہیں

یہ جو ہے خون کبوتر سے بھری شیشہ میں — مئے گلگوں ہے کہ [illegible] پری شیشہ میں

ہم نے بے یار پیا ہو تو قسم ہو ہم سے — آج تک ہے مئے [illegible] بھری شیشہ میں

سخن اغلب ہے کوئی سبز قدم آیا ہے — ہو گئی ہو مئے گلفام بھری شیشہ میں

دل لبھانے کو دل زار دیا کرتا ہوں — [illegible] کے [illegible] پیار کیا کرتا ہوں

دور میں سب کو بمقدار دیا کرتا ہوں — [illegible] کو دو تو انہیں پیار دیا کرتا ہوں

عکس کو بھی اس کے صورت اسکی دکھلانے نہ دوں — آئنہ [illegible] دے تو پریاں نے نہ دوں

بے نیازی یا تو پھیلاوے اگر مختار ہے — حرص [illegible] دست طمع پھیلانے پھیلانے نہ دوں

جب وہ آتا ہے تو میرا جی ہی میں رہتا نہیں — میں جو اپنے میں رہوں تو پھر اسے جانے نہ دوں

عجب کیا ہے سخن گر دیکھکر اس شمن رنگ کو   برہمن شیخ ہووے شیخ ہمرنگ برہمن ہو

دل بھی دیجے تو پھر ایسے ہی ستمگر کو سخن   قتل عاشق سے جسے ایک سو عار نہ ہو

صبا لے یار غم دلدار یہ نہ بیہودہ ہو   دوا اسے عاشق بیمار یہ نہ بیہودہ ہو
موافقت ہو یہ دل جس سے ایک کافی ہے   یہ فرض کیا ہے کہ اب بار یہ نہ بیہودہ ہو
رقیب یار سخن مست خواب ہیں باہم   اشارہ چاہیئے بیدار یہ نہ بیہودہ ہو

تم تو ہمیں کو ڈھب نا طرب سمجھتے ہو   ہم اور ہی کہتے ہیں تم اور سمجھتے ہو
کم کا ہے کو سمجھو گے اب دُ مرے دل کا   مطلب کی جو ہوتی ہے فی الفور سمجھتے ہو

اس شمع دار قد پہ تو کچھ ہے شعلہ رو   عالم کو پھر تو پھونک دے گر ہک بلند ہو
جو ہر پہ اور کے بھی لطف چاہیئے رہے   وہ ہی کچھ آدمی ہی جو خود پسند ہو
بندے ہیں ہم تو شعر کی تاخیر کے سخن   حافظ ہو یا کہ میر یا کہ کمال خجند ہو

بدنام کیا چاہتا ہے کیا تو کسی کو   آوے گا کوئی یہاں سے نکل اور نہیں تو
ق
کہتا ہے صنم آج ہی جا مجھ سے سخن سن   آفت کوئی آ جائے گی کل اور نہیں تو

خوب پہنچا لطف معنی سخن کو مرحبا   تو بھی اپنے دور میں اک دور ہیں ہے کیوں نہ ہو

حق اگر پوچھتے ہو ہم سے جو تم سنتے ہو   یہ کہانی ہے کہ ہم ہم ہیں یقیں تم تو ہو

تم جتنے مہرباں تھے سابق میں سو نہیں ہو   ہم گرچہ وہ نہیں ہیں تم بھی تو وہ نہیں ہو
کیا تک رہے ہیں ہم اور تم کس خیال میں ہو   کچھ تو کہو کہاں ہو اپنے میں تم نہیں ہو
اکسیر سے نہیں ہو کم حضرت سخن تم   سب کو مفید ہو پر اک آپ کو نہیں ہو

چاہتا ہوں کہ چلوں اس کے منالانے کو پہ ڈروں ہوں کہ وہ آزردہ ہی بگڑ جانے کو

ق بے خبر راہ سے اپنی وہ چلا جاتا تھا کس تصور میں خدا جانے پری خانہ کو

کیا کیا آپ نے یہ بیٹھے بٹھائے جی کو اک بلا مول لیا چھیڑ کے دیوانے کو

آپ ہی نے تو مجھے لا کے پشیمان کیا ورنہ میں کاہے کو راضی تھا ادھر آنے کو

کام وہ کریئے کہ آئندہ تباہی بھی نہ ہو رو سفیدی جو نہ ہو تو روسیاہی بھی نہ ہو

آزردہ مجھ سے ہو کر غیروں سے مل گیا تو اب تو ہی منصفی کر میں بیوفا ہوا تو ؟

شکوہ نے تیرے مجھ سے بدظن کیا نہ کس کو سب میں برا ہوا میں اور خلق میں بھلا تو

کہنے سے تیرے چھوڑی مدت کی آشنائی اے دشمن مروت لے اب تو خوش ہوا تو

ممکن نہیں کہ تیرا عہدہ برا سخن ہو جتنا وہ بے زباں ہے اتنا ہی بت بنا تو

وعدہ ہی ہمیشہ کرتے ہو پر آج تلک تم آئے ہو ہے بات تو یہ تم جھوٹے ہو اور جھوٹی قسمیں کھاتے ہو

حق تو یہ ہے منھ پر کہنا صاف خوشامد ہوتی ہے جی ہی جانے ہے جان اسے تم جتنا جی کو کھپاتے ہو

وہ قند مکرر کا خواہاں نہ رطب کا ہو اے جان سخن! جس کو لپکا ترے لب کا ہو

عاشق کے بھی مطلب کی کچھ کچھ تو سنے کا ہے معشوق وہ کیا اے دل اپنے ہی جو ڈھب کا ہو

بن دیکھے یہ صورت ہے دیکھے تو خدا جانے کیا حال پھر اس چشم دیدار طلب کا ہو

نہ تم کعبہ ہی جانے دو نہ سوئے دیر جانے دو تمھاری گر یوں ہی مرضی ہے پیارے خیر جانے دو

نہ سیر باغ نہ سیر بہار کرتے ہو کہ تم تو گھر ہی میں بیٹھے بہار کرتے ہو

تمھاری خوبیاں آتی ہیں کب تحریر میں ہم سے میاں جیتے رہو صد سال چندو لال اچھے ہو

"چندو لال"

جوشِ انتقام

(از)

جناب سید شبیر حسن صاحب مقیس حیدرآبادی

خورشید اپنی ضیا پاش شعائیں ڈالتا ہوا روپوش ہو رہا تھا۔ اور اپنی آخری منور کرنیں اوس مکان پر ڈال رہا تھا، جو آبادی سے دُور اسپین کے جپسی گروہ کا مسکن تھا۔ اس گروہ کے لوگ رقص اور نغمہ و دیگر کمالات سے تماشائیوں کا دل مسخر کرتے اور اسی طرح اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ ہر شہر میں گھومتے اور چاقو کے کمالات جس میں مشاق تھے دکھاتے۔

طوفان کا آغاز تھا۔ سیاہ بادل اُمنڈ اُمنڈ کر آسمان پر چھا رہے تھے۔ جو آنے والے طوفان کا پیش خیمہ تھے۔ اس معمولی سے گھر میں مجلس عیش و نشاط برپا تھی اُس گروہ کے لوگ ایک حلقہ کئے ہوئے بیٹھے تھے۔ اور ایک حسین رقاصہ بیچ میں ناچ رہی تھی۔ اور چاقو کے کرتب دکھا رہی تھی جس کو اس فن میں ملکہ حاصل تھا۔ اس کی عمر ۱۶ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ اُس کا سن رسیدہ باپ بھی وہیں کھڑا تھا۔ دفعتاً چند آدمی ایک لاش لے کر برآمد ہوئے۔ لاش کو دیکھتے ہی ایک سنسنی سی پھیل گئی۔ کیونکہ یہ بدنصیب انہیں کے گروہ کا تھا۔ اوس کے باپ نے جو ان سب کا سردار تھا۔ جرأت سے استفسار کیا کہ اس کی موت کس طرح واقع ہوئی؟

لاش کے لانے والوں میں سے ایک نے کہا "ایک انگریز شکار کھیلنے آیا تھا۔ اس کی گولی شکار سے خطا ہو کر اس کو آلگی"۔ "میں اس کا بدلہ لونگا"۔ اُس نے غصہ سے چلا کر کہا! ور اسکی تیاری کے لئے اپنے کمرہ میں چلا گیا۔ اس نے پیڈرو کو تیاری کے لئے حکم دیا تاکہ وہ بھی ہمراہ چلے۔ رقاصہ نے بہتیرا روکا۔ مگر اوس کا باپ نہ رُکا۔

پیڈرو کو رقاصہ سے کمینہ محبت تھی وہ چاہتا تھا کہ اس بلبل کو اپنے دام الفت میں پھانسے لیکن اس کا باپ اس راستہ میں حائل تھا۔ مگر موہنا کو اس سے نفرت تھی چنانچہ جب وہ اوس کے باپ کے ہمراہ جانے لگا تو اس نے کہا "موہنا دیکھ میں ایک انگریز کو اجل کے منہ میں ڈالنے جا رہا ہوں۔ میں کیسا بہادر ہوں"۔ وہ ہنسا۔ اور اس نے چاہا کہ اس کی تھوڑی پر ہاتھ رکھے۔ مس موہنا نے ایک جھڑکی دی۔ اور ہٹ گئی۔

ہنری اور پیٹرو ملکر جا رہے تھے کہ ہنری رکا۔ اس نے اپنی جیبیں دیکھیں اور پیٹرو سے کہا کہ میرا چاقو لے آؤ میں بھول آیا ہوں۔ پیٹرو واپس آیا۔ اور چاہا کہ موہنا سے مذاق کرے۔ مگر موہنا نے اوسے ڈھکیل دیا۔ پیٹرو اپنا سا منہ لیکر اٹھا۔ مکان میں سے چاقو لیا اور چلا گیا۔

(۲)

اس مکان کے قریب ایک میل پر وہ مکان تھا جسمیں آرل ان دنوں شکار کی غرض سے آکر اُترا تھا۔

تمام آسمان پر ابر کا غازہ تھا۔ اور رات ہو چکی تھی۔ اس لئے آرل جو کہ خوبرو حسین جوان تھا۔ اکیلا شکار کھیلنے کے لئے نکلا۔ اور ایک جگہ آکر شکار کے انتظار میں بیٹھ گیا جس کے اطراف میں جھاڑیاں تھیں اور وہیں ہنری نے بھی ابھی ایک ہرن شکار کیا تھا۔ قریب ہی ایک لڑکا جس کی عمر ۱۰۔۱۱ سال کی ہوگی۔ جھاڑیوں میں سے شکار کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ یہ لڑکا بچپن ہی سے گونگا اور بہرا تھا۔ اس لئے موہنا کو اس کے ساتھ خاص ہمدردی تھی۔ اور اُس نے اُسے کئی کمالات سکھائے تھے۔

پیٹرو نے خیال کیا کہ اس رکاوٹ کو جو موہنا کے حاصل کرنے میں مخل ہو رہی ہے۔ دور کر دیا جائے۔ لہذا اُس نے بندوق اُٹھائی۔ اور جبکہ بوڑھا ہرن کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اور اس کی پیٹھ پیٹرو کی طرف تھی۔ اوس نے گھوڑا دبایا اور گولی بوڑھے کے سینہ کے پار تھی۔ جان نے دیکھ لیا اور وہ مکان کی طرف بھاگا۔ بندوق کی آواز نے آرل کو چونکا دیا وہ اٹھا اور حیرت سے ڈھونڈتے ہوئے آیا۔ جب وہ پیٹرو کے قریب آیا تو اوس نے لاش دیکھی۔ اور تعجب سے پوچھا "یہ کس طرح مرا" پیٹرو نے اطمینان سے کہا۔ ابھی ایک گولی چلی تھی۔ جو نہ معلوم کدھر سے آئی جب میں نے اُس کی طرف پھر نظر کی تو وہ تڑپ رہا تھا۔

"میں یہاں کا آرل ہوں تم کو سچ سچ بتانا پڑے گا" "تم آرل ہو۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں میں لاش کو یہاں سے لے جاؤں گا۔ پیٹرو نے کہا۔

آرل مجبور تھا۔ اس لئے وہ اپنے بنگلہ کو واپس گیا۔ اور پیٹرو لاش لیکر مکان میں داخل ہوا۔ اور اُس نے کہا۔ یہ بھی انگریزوں کی گولی کا نشانہ بنا۔ جو ہمارے دشمن ہیں۔ اور آرل کی گولی نے اس کا کام تمام کیا۔ جو یہاں سے قریب رہتا ہے۔ اور مصنوعی طور پر رونے لگا۔

موہنا اپنے پیارے باپ کی اس مرگ مفاجات پر دھاڑیں مار کر رونے لگی اُس کا کلیجہ پھٹ رہا تھا۔ اوس کی نرگسی آنکھیں خونین تھیں۔ وہ ایک دم اچھلی اُس نے چلا کر

کہا" اس کا انتقام لئے بغیر میرا کھانا پینا حرام ہے۔ میں اس خون کا بدلہ لونگی۔ میں قاتل کو زندہ جلا دونگی"۔ اس کا چہرہ غصہ سے تمتما رہا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوئی۔ اُس کے سامنے طوفان جنگل تاریکی کوئی چیز نہ تھی۔ وہ گھوڑے کو اڑاتی ہوئی محل کے قریب پہنچ گئی۔ وہ پشت زین سے زمین پر گری۔ اس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ لیکن وہ دروازہ تک پہونچ گئی۔ پانی برس رہا تھا۔ اور اس پر غشی سی طاری ہوگئی۔

ارل کی نظر دروازہ پر پڑی اس نے ایک غمزدہ مسافر کو دیکھا۔ وہ فوراً بھاگا۔ اور موہنا کو اندر لے آیا۔ اس نے اس کو گرم بلینکٹ اوڑھا دیا۔ موہنا بیہوش تھی۔ وہ بڑبڑا رہی تھی ظالم ارل سے ضرور انتقام لونگی۔ ارل جو اس کے حسین دلربا چہرہ کی دید میں مستغرق تھا۔ چونکا۔ وہ اصل حقیقت کو سمجھ گیا۔

موہنا تھوڑی دیر کے بعد ہوش میں آئی۔ اس نے آس پاس دیکھا۔ اسے حیرت ہوئی۔ میں یہاں کہاں۔ اس نے جلدی سے پوچھا۔ یہاں کون رہتا ہے۔ غصہ سے اس کی جبین ناز پر بل پڑ رہے تھے۔ "یہ ارل کا مکان ہے"۔ ارل نے جواب دیا۔ "اور وہ کہاں ہے"۔ اس نے تجسانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ دور اندیش ارل نے بھاگ کر نامناسب خیال کیا۔ اور کہا۔ میں ارل کا مصاحب ہوں۔ اور ارل باہر گئے ہوئے ہیں۔

"تو کب آئے گا"

"کل صبح تک"

(۳)

ارل کافی حسین تھا۔ اس کے خوبصورت بدن پر سوٹ خوب کھل رہا تھا۔ اس کے چہرہ میں ایک خاص کشش تھی۔ اس کی صورت موہنا کے دل میں کھب چکی تھی۔ اور ارل کو اس سے انس ہوگیا تھا۔ موہنا کا حسن یک بیک دیکھا نہ جاسکتا تھا۔ اس کی بڑی بڑی نرگسی آنکھیں گول ملیح چہرہ اُس کی زلف عنبریں۔ اس کا تن نازنیں اور مرمریں سینہ ہر شخص پر ایک جادو کا اثر رکھتے تھے۔ وہ مجسم حسن کی دیوی تھی۔

صبح کا وقت تھا۔ ارل سیڑھیوں پر رباب لئے ہوئے محو نغمہ سرائی تھا۔ اور موہنا اس کے قریب کھڑی سن رہی تھی۔ آخر موہنا نے رباب لیا اور ایک مسحور کن گیت سے ارل کو پورے طور پر اپنا دیوانہ بنا لیا۔ یہ دونوں اسی طرح مست تھے کہ ملازم نے ایک ضروری بات کہنے کے

لئے آرل کو بلایا۔ اور وہ اسے دوسرے کرہ میں لے گیا۔

موہنا انتقام کی دیوانی بن کر آئی تھی۔ مگر آہ وہ اب محبت کی دیوانی ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خون نہیں بلکہ محبت جھلک رہی تھی۔ اس کے دل میں بجائے بدلہ کے محبت کی دنیا بسی ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ مجبور تھی۔ وہ گملوں کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا۔ انتقام! انتقام۔ لیکن وہ آرل کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اسی سوچ میں مستغرق تھی کہ پیڈرو جھاڑیوں کی آڑ میں چھپ کر یہ سب واقعہ دیکھ رہا تھا۔ اس کے قریب آیا۔ اور ایک تصنع آمیز تبسم کے بعد کہا "کیوں انتقام لے لیا"

آرل ابھی تک نہیں آیا۔ موہنا نے پیچھے ہٹ کر کہا۔ کیونکہ وہ ہمیشہ اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی۔

"میں آرل........ آرل کے گھونسے نے اس کا قطع کلام کیا۔ اور پیڈرو زمین پر گر گیا۔ آرل نے دو تین گھونسے اور رسید کئے۔ اور پیڈرو جان بچا کر بھاگا۔ یہ چھوٹا ہے جوش محبت سے دونوں بغلگیر ہوئے۔

(۴)

موہنا اپنے کیمپ میں پہونچی اور اس نے سب کو مخاطب کر کے کہا آرل ابھی تک نہیں واپس آیا۔ جو اپنے باپ کا انتقام لیتی۔ پیڈرو نے کہا۔ آرل کی دیوانی تو آن جان بن رہی ہے آرل وہی تھا۔ اس طرح تو ہم کو دھوکہ دینا چاہتی ہے۔

آرل وہی تھا۔ موہنا نے سخت استعجاب سے پوچھا۔ اور اس کے ساتھ ہی جوش انتقام کا طوفان ایک مرتبہ اور امنڈ آیا۔ اس نے کہا۔ تم سب ساتھ چلو۔ آج محل میں ناچ ہونے والا ہے۔ میں کرتب دکھا کر اس کا انتقام لوں گی۔ اس کا چہرہ پھر تمتما اٹھا۔ اور وہ گھوڑے پر سوار ہو کر سب کے ہمراہ روانہ ہوئی۔

(۵)

محل میں مجلس عیش و نشاط برپا تھی۔ کہ اتنے میں وہ گروہ پہونچا۔ موہنا نے آرل سے مخاطب ہو کر کہا۔ ہم سب اسپین کا کرتب دکھانے کے لئے آئے ہیں۔ ہم اپنے کمالات سے سب کا دل خوش کریں گے۔ آرل اصل حقیقت کو بھانپ گیا۔ تمام لوگ اسپینی ناچ اور کرتب کے مشتاق تھے۔ اس لئے آرل اجازت دینے پر مجبور ہو گیا۔

موہنا نے پہلے تو ناچ دکھلایا۔ اور خوب اچھی طرح مسخر کر لیا۔ اُس کے بعد دونوں ہاتھوں میں چاقو لیئے۔ اور کہا۔ یہ موت کا ناچ ہے۔ اور ناچنے لگی۔ جب کبھی اس دوران میں اس کی نظر آرل سے ملتی۔ ایک بجلی سے کوند جاتی۔ اور اُس کی آنکھیں نیچی ہو جاتیں اُسے اس کی محبت یاد آ جاتی جو آرل کو چاقو بھونکنے سے باز رکھ رہی تھی۔ وہ آرل کے قریب آ گئی۔ اُس کے ہاتھ آرل کے اوپر تھے۔ آرل ساکت تھا۔ لیکن موہنا محبت کے ہاتھوں بزدل ہو گئی تھی۔ دونوں کی آنکھیں لڑ رہی تھیں۔ موہنا کے ہاتھ عجب حسن سے تھرتھرانے لگے۔ اُس کا تمام جسم بید کی طرح کانپ رہا تھا۔ اُس کا دماغ چکر آ رہا تھا۔ وہ برابر اُس کے چہرہ کو دیکھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ اُس کے ہاتھ سے چاقو گر پڑے۔ اور وہ اُسے لپٹ گئی۔

پیٹرو نے سب سے کہا۔ میں نے نہ کہا تھا کہ یہ دھوکہ دے گی۔ اور اُس نے اپنے لوگوں کو بلایا جو گھات میں تھے..... اور سب کو گرفتار کر کے موہنا اور آرل پر فیر کا حکم دیا۔ عین اُس وقت جان رسی تڑا کر (جس کو پیٹرو نے باندھ دیا تھا) بھاگتا ہوا پہونچا۔ وہ فیر کرنے والوں کے سامنے آیا۔ اور اپنے ہاتھ اٹھا دیئے۔ اُس نے اشارہ سے موہنا کے سامنے آرل کی معصومیت کا اظہار کیا۔ اور پیٹرو کے جرم کا۔

پیٹرو جان بچا کر بھاگا۔ اور ایک گاڑی پر بیٹھ گیا۔ لیکن آرل پیچھے آ کر چڑھ چکا تھا۔ اور گاڑی میں دونوں میں خوب لڑائی ہو رہی تھی۔

موہنا گھوڑا دوڑاتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ اور اُس کے پیچھے اُس کے آدمی بھی تھے۔

پیٹرو کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ اُس نے موقع پا کر آرل کو بھونکنا چاہا۔ اور آرل بے بس ہو گیا۔ اور اگر موہنا کو اپنے چاقو پر کرتب میں قابو نہ ہوتا تو آرل مر گیا ہوتا۔

موہنا نے کھینچ کے چاقو مارا۔ جو پیٹرو کے گلے میں لگا۔ اور وہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔ اور مر گیا۔ آرل موہنا کے پیچھے کود کر بیٹھ گیا۔

چنانچہ گاڑی ایک گہرے گڑھے میں گر پڑی۔

آرل نے موہنا کو اٹھا لیا۔ اور وہ ایک پُرسکون و پُرلطف زندگی بسر کرنے لگے۔

(ماخوذ)

مطبوعاتِ جامعہ ملیہ دہلی

جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جہاں مسلمانانِ ہند کے احیار و بقا کے لیئے بہت سے کام اپنے ذمہ لیئے ہیں وہاں اس ایک اہم کام اُردو زبان میں اعلیٰ لٹریچر بہم پہنچانا بھی ہے - چنانچہ ابتدا ہی سے اس نے اپنے ہاں تصنیف و تالیف کا ایک شعبہ قائم کیا تھا جو اب اردو اکاڈمی کے نام سے موسوم ہے - اُردو اکاڈمی مختلف علوم و فنون پر چند نہایت مفید کتابیں شائع کر چکی ہے - جن کی فہرست ہم آئندہ صفحات میں درج کرتے ہیں نیز ان کتابوں کی بھی ایک فہرست درج کر رہے ہیں جو مکتبہ جامعہ نے مفید سمجھ کر خود شائع کی ہیں - قدردانانِ علم سے ہمیں امید ہے کہ ان مطبوعات کی قدر افزائی فرمائینگے -

سلسلۂ اردو اکاڈمی

تاریخ الامت بمصنفہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری - تاریخ اسلام کا یہ سلسلہ صحیح تاریخی اصول اور تحقیق و تنقید کے ساتھ اردو میں پہلی بار شائع ہو رہا ہے - اس کے مطالعے سے ہر شخص نہایت آسانی سے مسلمانوں کے تاریخی کارناموں سے واقف ہو سکتا ہے جامعہ ملیہ اور صوبہ متوسط و برار کے محکمۂ تعلیم نے اسے اپنے مدارس کے لئے بھی پسند کیا ہے - اب تک چھ حصے شائع ہو چکے ہیں - جو حسب ذیل ہے:-

(۱) حصہ اول سیرۃ الرسول عہ
(۲) حصہ دوم خلافت راشدہ ۸
(۳) حصہ سوم خلافت بنی امیہ عہ
(۴) حصہ چہارم خلافت عباسیہ جلد اول ۸
(۵) حصہ پنجم خلافت عباسیہ جلد دوم ۸
(۶) حصہ ششم عباسیہ مصر ۸

تاریخ الدولتین اس کتاب میں خلافت بنی امیہ و بنی عباس کے حالات پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے - مصر کے مشہور اہل قلم جرجی زیدان کی تصنیف ہے جسے مولانا نیاز فتح پوری نے اُردو کا جامہ پہنایا ہے قیمت عہ

مبادی معاشیات یہ علم المعیشت پر ایڈون کنین کی مشہور و معروف تصنیف ہے جس کا ترجمہ پروفیسر ڈاکٹر حسین خانصاحب نے نہایت سلیس اُردو میں کیا ہے یہ کتاب فن کے مبتدیوں کے لئے مفید ہے قیمت عہ

تاریخ ہند قدیم قدیم ہندوستان کی تاریخ کا ایک مختصر لیکن نہایت جامع خاکہ شعبہ تصنیف نے کے ایم پنیکر صاحب ایم - اے (آکسن) سے انگریزی میں لکھا کر اُردو میں ترجمہ کرایا قیمت عہ

ذکر تفسیر پارہ عم بمصنفہ خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی استاد تفسیر جامعہ سلسلۂ تفسیر الفرقان فی معارف القرآن کسی تعارف کا محتاج نہیں یہ کتاب بھی اسی مفید سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں پارۂ عم کی تفسیر خواجہ صاحب نے اپنے مخصوص انداز سے میں استاسلام کے لئے پیش کی ہے - قیمت ۱۲

عبرت تفسیر سورۂ یوسف سلسلۂ تفاسیر کی ایک اہم جلد جس میں احسن القصص یعنی سورۂ یوسف کی تفسیر نہایت خوبی کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور اس کے عبرت انگیز نتائج کو بہت موثر طریق پر پیش کیا گیا ہے - قیمت عہ

برہان سورۂ نور کی مکمل اور مبسوط تفسیر نہایت پرزور اور دلکش طرز تحریر قیمت عہ

قواعد عربی (حصہ اول) کتاب الصرف

اُردو میں عربی صرف کی مستند کتاب جسے ہندوستان کے مشہور عربی ادیب مولٰنا ابوعبداللہ محمد بن یوسف السورتی استاد عربیات جامعہ نے نہایت تحقیق سے مرتب کیا ہے۔ قیمت عہ

تاریخ فلسفہ اسلام از ڈاکٹر سید

عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (برلن) ہالینڈ کے مشہور فلسفی اور مستشرق ٹ۔ ج۔ دی بوئر کی گرانقدر تصنیف کا براہ راست جرمن زبان سے ترجمہ۔ تاریخ فلسفہ اسلام پر اُردو میں یہ پہلی قابل قدر کتاب ہے۔ قیمت عہ

عربوں کا تمدن ڈاکٹر خودا بخش

پروفیسر میونک یونیورسٹی کی مشہور و معروف تصنیف (KULTURDER ARABER) کا ترجمہ از سید نذیر نیازی صاحب بی اے جامعہ۔ مترجم نے کتاب کی قدر نہایت مفید ضمیمہ لکھکر اور بھی بڑھادی ہے جو تاریخ اسلام پر یوں بھی نہایت محققانہ اور بصیرت افروز مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیمت عہ

دیوان غالب

طبع ثانی

مطبوعہ برلن (جرمنی)

ہندوستان کے مایۂ ناز شاعر و ادیب مرزا غالب کا کلام جو شان رکھتا ہے اور جس قدر و منزلت کا وہ مستحق ہے ہم نے اسی حسن و خوبی اور لطافت و نفاست کے ساتھ مرزا کے کلام کا مجموعہ ارباب ذوق کے سامنے پیش کیا ہے۔

یہ دیوان نہایت اہتمام کے ساتھ جرمنی میں طبع کرایا گیا ہے۔ خوبصورت ملائیم جلد اس پر سنہرے دلفریب نقش و نگار طلائی اوراق اور سب سے زیادہ مرزا غالب کی لاثانی عکسی تصویر جرمن ہنرمندی اور کمال کا اعلٰی نمونہ ہیں۔

ہمارے اس دیوان کی مقبولیت کا اندازہ صرف اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ چند ماہ کے قلیل عرصہ میں اس کا ایک ایڈیشن ختم ہوگیا اور دوسری بار طبع کرانا پڑا دیوان مکمل ہے جس میں مرزا مرحوم کا خود نوشتہ مقدمہ غزلیات قصاید اور رباعیات ہیں۔ جلد مطلّا نہایت عمدہ سائز ۵ قیمت صرف عہ

دیوان شیدا

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خانصاحب مرحوم

کے فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ

دنیا مسیح الملک کو طبیب، قومی رہنما عالم، ادیب اور حافظ کی حیثیت سے جانتی ہے لیکن اس کا علم شاید خواص کے علاوہ کسی کو نہو کہ حکیم اجمل خانصاحب مرحوم فارسی اور اردو کے ایک اعلٰی پایہ اور کہنہ مشق شاعر بھی تھے۔ آپ کا کلام استادانہ ہے اور رفعت خیالات اور سادگی اظہار کے لحاظ سے آپ اپنی نظیر ہے۔ اس دیوان کا ایک لفظ حکیم صاحب مرحوم کی ہمہ گیری نکتہ رسی اور قادر الکلامی کا شاہد ہے

مکتبہ جامعہ نے اس دیوان کو جرمنی میں طبع کرایا ہے۔ پاکٹ سائز جلد سنہری منقش نہایت خوبصورت، اوراق مطلا، رنگ سرخ نیلا۔ سبز قابل دید چیز ہے۔ قیمت صرف عہ

زندہ طلسمات

جس کو باشندگان حیدرآباد کے علاوہ معزز حکما اور ڈاکٹروں نے صدہا مریضوں پر امتحان کر کے سینکڑوں سرٹیفکیٹ عطا کئے۔ زندہ طلسمات ملکی ہونے کے علاوہ رجسٹرڈ اور پیٹنٹ شدہ ہی حسب ذیل امراض پر آناً فاناً میں طلسمی اثر دکھانا اسکا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے مثلاً ہیضہ۔ پلیگ۔ بخار۔ پیچش۔ پتلی۔ کھانسی۔ دمہ۔ بواسیر۔ خارش۔ سانپ بچھو کے زہر اور ہمہ اقسام کے درد کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ آزمایئے ایک بار ضرور آزمایئے پبلک کے فائدہ پہنچانے کی غرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہی۔ شیشی نمبر (۱) عہ نمبر (۲) ۸ نمبر (۳) ۴ ایک درجن کے خریدار کو خرچہ وی پی معاف ہوگا۔

پتہ خط اور تار کا "زندہ طلسمات حیدرآباد دکن"

ویجیٹال بام

بیرونی استعمال کی پرتاثیر اور لاجواب دوا

یہ دوا بیرونی استعمال کے لئے آپ اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزا سے مرکب اور بالکل بے ضرر ثابت ہوچکی ہی۔ جو اقسام کے اعصابی و اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس کو سالہاسال کی تجربہ اور عرق ریزی کے بعد اعلیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہی اور متعدد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اس کو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں اس سے زیادہ پر اثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے کوئی گھر اور خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہئے استعمال کے ساتھ ہی اپنا برقی اثر دکھلاتی ہے اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہوجاتا ہے۔ علی الخصوص نقرس وجع مفاصل۔ دمہ۔ درد سر۔ درد سول بچھو کے زہر کے لئے زخم کے لئے اور جلے ہوئے جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال۔ تھوڑی دوا لے کر دن میں تین چار وقت مقام ماؤف پر ملیں اور اگر افاقہ نہ ہو تو دوا کے استعمال سے پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر اچھی طرح اعصاب کو بھانپ دیں اور صاف کریں جو اصحاب بغرض امتحان طلب فرماویں بخوشی تعمیل کیجائیگی۔

نوٹ:۔ ہمارے دواخانہ میں ہر قسم کی تازہ ادویات کا ذخیرہ ہر وقت مہیا رہتا ہی۔ اور نسخہ جات نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کئے جاتے ہیں۔

المشتہر

جیمس اینڈ کمپنی ڈسپنسنگ کیمسٹ اسٹیشن روڈ قریب محکمہ مالگزاری حیدرآباد دکن

ہندوستان کی طباعت میں عظیم الشان انقلاب اور یورپ کو مات

مرقع چغتائی (یعنی) دیوان غالب مصور

جس کی پہلی اشاعت کے ۲۱۰ نسخے بحساب فی نسخہ ۱۱عہ کلدار فروخت ہو چکے

یہ شاندار مرقع اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ اعلیٰحضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ کے نام نامی اسم گرامی سے باجازت منسوب ہے

مختصر تفصیل

تعارف نامہ از ڈاکٹر سر محمد اقبال — دیباچہ از نقاد مصوری ڈاکٹر کزنز (مدراس)

(۱) مکمل متن دیوان غالب نہایت عمدہ طریق سے۔ (۲) مقدمہ سخنہائے گفتنی از مصور (چغتائی) (۳) انتخاب کلام

(۲۱) تصاویر جو چار رنگوں میں بذریعہ بلاک یورپ کے ایک ماہر فن کارخانہ سے تیار کرائی گئی ہیں۔

(۲) تصاویر حضرت چغتائی کی بہترین صناعی کا اعلیٰ نمونہ ہاف ٹون و لائین بلاک کے ذریعہ تیار کرائی گئی ہیں

(۲) تصاویر جناب چغتائی کے پنسلی خاکوں سے بنوائی گئی ہیں۔

(۹) تصاویر عام رنگوں اور باقی ہلکے رنگوں میں تیار ہوئی ہیں۔

کتاب کی جلد نقلی مراکو کے چمڑے سے تیار کرائی گئی ہے جس پر طلائی بیل بوٹے اور کتاب کا نام کندہ ہے جا پانی ولیم کاغذ پر نہایت نفاست سے چھپی ہے

قیمت ان تمام خوبیوں کے باوجود صرف لعہ سکہ عثمانیہ رکھی گئی ہے۔

مکتبۂ ابراہیمیہ نے ممالک محروسہ سرکار عالی میں فروخت کا انتظام اپنے ذمہ لیا ہے

الملتمس

مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی (محدود) اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

نوٹ :- مکتبہ کے شوکیس میں کتاب کو ہر وقت ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے

مطبوعاتِ مکتبہ

دکن میں اردو مولفہ مولوی محمد نصیر الدین ہاشمی صاحب منشی فاضل
جنوبی ہند میں اردو کی ابتدائی تاریخ قطب شاہی عادل شاہی اور آصف جاہی دوران میں اردو نظم و نثر کی حالت اور شعرائے اردو کا تذکرہ مع نمونۂ کلام ضخامت ۴۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا بار دوم قیمت للعہ

خیابانِ اردو مرتبہ جناب محمد عارف صاحب حیدرآبادی ہندوستان کے ممتاز اردو انشا پردازوں اور نامی گرامی شعرا کے نظم و نثر کا بہترین انتخاب جو مدارس کے تعلیمی نصاب کیلئے نہایت موزوں ہے ضخامت تقریباً ۳۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد سادہ للعہ

روح تنقید مصنفہ مولوی ابوالحسنات سید غلام محی الدین قادری زور ایم اے۔ فن تنقید کے متعلق اردو زبان میں پہلی کتاب ہے جس میں ماضی و حال کے علمائے یورپ کی تنقیدی اصول بیان کیے گئے ہیں اور ان اصولوں کی روشنی میں مثنوی سحر البیان پر ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے ضخامت ۲۰۵ سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ بار دوم قیمت عہ

تنقیدی مقالات مصنفہ زور صاحب۔ یہ روح تنقید کا دوسرا حصہ ہے جس میں مصنف نے روح تنقید کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں انگریزی، فارسی اور اردو زبانوں کے مشہور اہل قلم کی قلمکاریوں پر تنقید کرکے ان اصولوں کا استعمال دکھلایا ہے اور نیز بعض مشہور اردو انشا پردازوں کے طرز تحریر پر تبصرہ کرنے کے خاص خاص اصول بیان کئے گئے ہیں ضخامت ۵۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی وغیرہ عمدہ مجلد سادہ ہے

اردو کے اسالیب بیان مصنفہ زور صاحب۔ نثر نگاری کی ابتدائی کیفیت۔ ابتدا سے لیکر آج تک کے نثر نگاروں کے طرز تحریر و انداز بیان کا تذکرہ۔ خاص طرز تحریر کے اردو انشا پردازوں کے اسالیب بیان پر تبصرہ ضخامت ۲۴۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد سادہ عہ

سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب مصنفہ زور صاحب
سلطان محمود غزنوی سے پہلے اور بعد کے علم و ادب کے حالات سلطان محمود غزنوی کے علمی، ادبی کارنامے ترتیب کتاب میں پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ضخامت ۱۲۰ صفحے۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۱۲ ار

دنیائے افسانہ مصنفہ مولوی محمد عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی۔ افسانہ نگاری کی ابتدائی تاریخ اور افسانہ نویسی کے اصول و مبادیات۔ اردو زبان میں اپنے مضمون کی پہلی کتاب ہے ضخامت ۲۱۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی بہترین قیمت عہ

مبادی فلسفہ مولفہ مولوی میر حسن الدین صاحب بی اے ایل ایل بی۔ ڈاکٹر اے کیں راپورٹ پی ایچ ڈی کی پرائمر آف فلاسفی کا مفصل با محاورہ اور عام فہم اردو ترجمہ ضخامت ۱۳۶ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۱۲ ار

ارباب نثر اردو مصنفہ مولوی سید محمد صاحب قادری ایم اے۔ فورٹ ولیم کالج کے اردو اہل قلم کے تحقیقی حالات اور ان کے مصنفات پر تنقید و تبصرہ۔ انیسویں صدی عیسوی کی اردو نثر نگاری کی تاریخ ضخامت ۲۴۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت عہ

آثار الکرام جلد اول مصنفہ شمس المورخین جناب حکیم سید شمس اللہ قادری ایم آر اے ایس۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے علمی و ادبی کارناموں کی محققانہ تاریخ ضخامت ۲۴۴ صفحے۔ سائز ۲۲×۲۷/۱۶ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی خاصی قیمت ۱۲ عہ

جواہر کلیات نظیر منتخبہ جناب مولانا ذہین و سید مختار احمد۔ نظیر اکبرآبادی کے کلیات سے اخلاقی۔ ادبی نصیحت آموز ظرافت آمیز اور دلنواز نظموں کا مجموعہ ضخامت ۲۰۰ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی خاصی قیمت عہ

عقائد امام مترجمہ مولوی محمد عبدالغفور عابدی صاحب۔ فقہ اکبر کا عام فہم اور با محاورہ اردو ترجمہ۔ قیمت ۴ ر

اسوۂ حسنہ مصنفہ مولوی احمد عبداللہ مسدوسی بی اے ایس۔ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کے سامنے کیسی زندگی پیش کی تھی ضخامت (۸۰) صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۸ ر

دکنی لغت مولفہ مولوی سید شعار احمد شعار ہاشمی۔ اردوئے قدیم یعنے دکنیات کا لغت جس میں دکنی زبان کے الفاظ و محاورات کی تشریح کی گئی ہے ضخامت ۱۲۱ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ۸ ر

شاہ رفیع الدین قندھاری مرتبہ مولوی محمد عبدالغفور صاحب عابدی۔ دکن کے ایک مشہور صاحب دل صوفی عالم کے دلچسپ حالات ضخامت ۴۸ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی قیمت ۵ ر

خزینۂ اخلاق مصنفہ مولوی سید عبدالعزیز صاحب عزیز۔ اخلاقی و ادبی نظم و نثر کا مجموعہ۔ ضخامت ۴۶ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۲ ر

سیرت خیر البشر و سیرت مبارک مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالے جس میں آنحضرت صلعم کے مکارم اخلاق بیان کیے گئے ہیں۔ قیمت ا ر

نیک بی بی مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالہ جس میں بتلایا گیا ہے۔ نیک خو بی بی کس طرح اپنے شوہر کو نیک کر سکتی ہے۔ قیمت ۲

چھوٹا شیطان مصنفہ مولانا ذہین۔ منظوم اخلاقی رسالہ قیمت ا ر

ملنے کا پتہ۔ انجمن امداد باہمی مکتبۂ ابراہیمیہ روبروئے محکمۂ مالگذاری اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

مطبوعہ مطبع مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن باہتمام رام کشن لیتھوگرافر مطبع

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ

مدیر
محمد عبدالقادر سروری
ایم اے، ال ال بی

۱- یہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا ماہوار رسالہ ہے۔

۲- یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جسمیں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

۳- بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالۂ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

۴- قیمت سالانہ (لله) مع محصول ڈاک پیشگی، چھ ماہ کے لئے (عاہ) فی پرچہ ۶ پائی

۵- اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (صہ) نصف کے لئے (ے) اور چوتھائی کے لئے عہ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲½ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

مجلۂ مکتبہ کی خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے انکے نام رسالہ سال بھر کیلئے بلا قیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خریدیں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ مکتبہ بلا قیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے ان کو ایک رسید دیجائے گی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبوں کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحت بالا رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں ”منتظم مجلہ مکتبہ“ کے پاس بھیجدیں تاکہ انکے نام جاری کردیا جائیگا۔ یہ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ترسیل زر و مضامین اور جملہ خط و کتابت بتوسط ”منتظم مجلہ مکتبہ“ مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ہونی چاہیئے۔

رجسٹر نشان ڈپہ سرکار آصفیہ (۶۵)

رجسٹر نشان ڈپہ سرکار انگلیشیہ (۰۰۰۰۰۱)

مجلہ مکتبہ

جلد (۳) بابتہ ماہ مہر و آبان ۱۳۳۸ف م اگست و ستمبر ۱۹۲۹ء شمارہ (۵ و ۶)

(تصاویر)

(۱) نواب نظام علیخاں بہادر آصفجاہ ثانی والی دکن۔ (۲) نواب مسعود جنگ بہادر نائب امیر جامعہ علیگڑھ

(فہرست)

شذرات

اس دفعہ ہم نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ کسی نہ کسی طرح رسالہ وقت پر نکال دیا جائے۔ لیکن افسوس ہے مطبع کی دقتوں نے ہمیں اس دفعہ بھی اپنے وعدہ کو پورا نہ کرنے دیا۔ پھر کا رسالہ مکمل ہوتے ہوتے آبان کا وسط آگیا اس مجبوری سے اپنی عادت کے خلاف ہم دو رسالے ایک ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ قارئین کرام اس تاخیر اور خرق عادت کو معاف فرمائینگے۔

اس مہینے کے بعد ہمیں توقع ہے کہ ہم یہ تو وعدہ نہیں کر سکتے کہ کسی معین تاریخ تک رسالہ آپ کی خدمت میں پہنچ جایا کریگا، ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں رسالہ شائع کر سکیں گے۔

آبان کے رسالے پر "مکتبہ" کی تیسری جلد ختم ہو رہی ہے۔ اس وقت تک اس میں شک نہیں کہ رسالہ نے علمی حلقوں میں خاص جگہ حاصل کر لی ہے۔ لیکن ہم اس پر قانع نہیں ہیں۔ اپنے پچھلے تجربہ سے ہم یہ محسوس کر رہے ہیں کہ ہمارے رسالے کے مخاطب اعلیٰ علمی طبقوں کے ساتھ متوسط طبقے بھی ہو جائیں۔ اعلیٰ طبقوں تک تو روشنی کسی نہ کسی طرح پہونچ ہی جاتی ہے۔ لیکن متوسط طبقوں میں رہ کر ان کے احساسات کو اپیل کر کے ان کے مذاق کے معیار کو آہستہ آہستہ اونچا کرنا زیادہ مفید اور وسیع خدمت ملک کی ہو سکتی ہے۔ خصوصاً مدیر کو اس کا اعتراف ہے کہ سرکاری خدمت کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ خود اپنے ذاتی علمی مشاغل اور متعدد کتابوں کی تکمیل میں مصروف رہنے کی وجہ سے اس مقصد کی طرف کما حقہ توجہ مبذول نہ ہو سکی۔ پچھلے سال کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ کے اردو مخطوطات کی فہرست مفصل اور جدید ترین اصول پر مرتب کرنے میں میرا بیشتر وقت صرف ہوا۔ کتب خانوں کی تلاش کرنے اور قلمی کتابوں کے مطالعہ اور ان کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے ہمت آزما کام سے رسالے کے کام میں تاخیر ہوتی رہی تاہم خدا کا شکر ہے کہ یہ فہرست اب مکمل ہو چکی ہے اور جامعہ کی طرف سے شائع ہو رہی ہے۔

میری ان مصروفیتوں کی وجہ سے جو مجلہ کے کام میں حارج ہو رہی ہیں، میں نے مناسب سمجھا کہ مولوی سید محمد صاحب ایم اے مددگار سٹی کالج کو بھی مستقل طور پر ادارت میں شریک کر لوں۔ کیونکہ سید صاحب مولوی عمر یافعی صاحب کی طرح ادارت کے کام میں ابتدا سے نہایت گرمجوشی کے ساتھ میرا ہاتھ بٹاتے رہے ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ سید صاحب اور یافعی صاحب ادارت میں التزاماً شریک رہکر مجلہ کے مقاصد کو باحسن الوجوہ کامیاب بنا سکینگے۔ اور اس کے مستقبل کو شاندار بنانے کے لئے مفید تدبیروں سے میرے لئے سہولتیں پیدا کر دینگے۔ یہ امر میرے لئے مسرت اور اطمینان اور مکتبہ کے لئے خوش قسمتی کا باعث ہے کہ سید محمد صاحب

اصرار پر اپنی علمی مصروفیتوں کے باوجود اس ذمہ داری کو قبول کیا چنانچہ وعنایت گستری

اس نئے انتظام کے ساتھ رسالے کے موجودہ سائز کو بھی بڑا کر کے اوزان میں بدل دیا جا رہا ہے۔ مضامین میں تنوع اور دلچسپی خاص طور سے ملحوظ رہیگی۔ علمی اور تحقیقی مضامین کے ساتھ عام فہم مفید اور دلچسپ مضامین اس کے لازمی اجزا ہونگے

اب تک طباعت کی دشواریوں کی وجہ سے رسالہ کی ہر نئی جلد کو غیر معمولی اشاعت کی صورت میں شائع کرنے کی ہمت نہیں ہو سکتی تھی۔ مشین پریس میں کام شروع ہو جانے سے آئندہ اس کا موقع مل سکیگا فی الحال ماہ آذر ۱۳۴۳ف (اکتوبر) کا رسالہ ذرا ضخیم اور خاص اہتمام کے ساتھ شائع ہوگا۔ اسکی ترتیب شروع ہو چکی ہے۔ آذر کے آخر تک یہ خریداروں کے پاس پہنچ جائیگا۔ اس لئے جن حضرات نے اب تک چندہ ادا نہیں فرمایا ہے۔ یا وی پی طلب نہیں کی ہے براہ کرم فوراً دفتر پر چندہ روانہ فرمادیں۔ آذر کی اشاعت صرف انہیں حضرات کے پاس بغیر کسی مزید قیمت کے روانہ کی جائے گی جو خریدار ہیں۔ چونکہ یہ نئی جلد کا پہلا نمبر زیادہ تعداد میں نہیں چھپ رہا ہے اور نیز جن حضرات کو اس کی اطلاع ہو چکی ہے اُن کی فرمائشیں وصول ہو رہی ہیں ممکن ہے کہ ان خریداروں کو جنہوں نے اب تک چندہ نہیں دیا ہے، اس کے حاصل کرنے میں دقت ہو۔ اس لئے اس کا پہلے ہی سے انتظام کر لیا جائے تو مناسب ہے

ان تمام امور کی خاطر خواہ تکمیل کے لئے ظاہر ہے کہ غیر معمولی اخراجات کا بار رسالہ پر پڑیگا اس سے بچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ۔ وہ حضرات جن کو مکتبہ کے مقاصد سے دلچسپی ہے، اور وہ بزرگوار جو رسالہ کے خریدار ہیں مہربانی کر کے کم سے کم ایک ایک خریدار جدید فراہم کر دیں اس کی توضیح کی یہاں ضرورت نہیں کہ کسی رسالے کی کامیابی کا دارومدار کہاں تک اس جماعت کی ہمدردی پر ہے جس کے درمیان کوئی رسالہ جنم لیتا ہے۔ بہرحال ان دقتوں کو قارئین کرام پر ظاہر کر دینے کے بعد ہم اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا دفتری سال پچھلے شہریور کے مہینے میں ختم ہو گیا۔ پہلے اراکین انتظامی جو تین سال تک بڑی دلچسپی سے کام کرتے رہے اُن کی کارگزاری بھی اس کے ساتھ ختم ہو گئی۔ آئندہ سال کے لئے اراکین مجلس انتظامی کا انتخاب ہوا یہ صرف ایک سال کے لئے ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) صدر ۔ جناب نواب بہادر خاں صاحب خلف نواب نصیب یار جنگ بہادر

(۲) نائب صدر ۔ مسٹر پروہت ۔

(۳) معتمد۔ مولوی مرزا مظفر بیگ صاحب (مداحی)

رکن ۔ مولوی غلام رسول صاحب۔

عبدالقادر سروری

(۶) رکن - مولوی سید محمد صاحب - ایم - اے۔

(۷) " - " عمر یافعی صاحب۔

(۸) " - " نذیر حسین شریف صاحب۔

(۹) " - " احمد عبداللہ صاحب المسدوسی - بی - اے

توقع ہے کہ جدید کمیٹی کا عہد عمل پہلے سے زیادہ درخشاں ثابت ہوگا۔

بڑے مسرت کی بات ہے کہ ہندوستان بھی کچھ دنوں سے فلم سازی کی صنعت میں حصہ لے رہا ہے اور چند تماشکاروں کے نام بھی عزت سے لئے جا رہے ہیں ہوں نسبتاً ہی جو تجارتی پہلو سے ہو مگر بھی مغربی تمدن اور تہذیب کی اشاعت میں سب سے زیادہ حصہ لے رہی ہے۔ اس کا دیکھنا اور دکھانا دونو مفید ہیں۔ ان ہندوستانی فلم کمپنیوں سے امید بندھتی ہے کہ یہ ہندی تہذیب اور تمدن کو اصلی خدوخال میں دنیا سے بہ طریق شائستہ روشناس کرانے کی کوشش کرینگے۔ ہم قنوطی نہیں جو بعض خلاف واقعات کو دیکھکر بھی اس مفید صنعت کو ہندوستانیوں کے ہاتھ میں "بخاری اور کاربوزیۃ" سمجھیں۔

کچھ روز ہوئے کہ مدن کمپنی کی بنائی ہوئی فلم "انارکلی" حیدرآباد میں بھی دکھلائی گئی۔ مغل سلاطین کی معاشرت کی جیتی جاگتی تصویریں، "سقلائی" فضا میں متحرک نظر آتی تھیں۔ لیکن اس کے علاوہ کوشش کے باوجود بھی کوئی پہلو میں ایسا نظر نہ آیا جو یاد رکھنے کے قابل ہو۔ اگر تماشکاروں کا مقصد صرف لہو و لعب تھا تو بہتر ہوتا کہ وہ اس محترم بادشاہ کے احوال کو نشانہ ستم نہ بناتے۔ اس کو اس وقت کے لئے اٹھا رکھتے جبکہ ہم میں اپنے بزرگوں کے احترام کا احساس، اور حسن کاری کے امتیاز کا جذبہ پیدا ہو جاتا۔ شہزادہ سلیم سے تو بحث نہیں اس کی بھی ابتدائے عشق تھی لیکن شہنشاہ اکبر اور علامہ ابوالفضل کے "بھانڈ" نہ ہونے میں شبہ ہو لیکن تعال (اکثر) ہوتے میں کیا شک ہے۔ اکبر کے سر میں انگریزی وضع کے بال، ابوالفضل کی مضحکہ خیز رفتار شستہ از نمونہ ہیں۔ قصے کا انجام بڑا نازک مرحلہ ہوتا ہے۔ "انارکلی" کے انجام کی بنیاد معلوم نہیں کہ کونسے حسن کارانہ اصول پر قائم کی گئی تھی کہ سلیم جیسے "عاشق مزاج" پر اپنی محبوبہ کا مقبرہ دیکھ کر بھی اثر نہ ہوا۔ سچ ہے "یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا"

سنا ہے کہ لاہور کے بعض سمجھدار لوگوں نے بھی اس فلم میں کھیل کھیلا۔ خدا کرے کہ یہ غلط ہو۔ اس فلم سے کچھ برا ہی حال "شیراز" کے فلم کا تھا۔ جو کچھ روز پہلے حیدرآباد میں دکھایا جا رہا تھا لیکن حکومت بمبئی کے فیصلہ کے نفاذ سے معینہ مدت کے اندر بند کر دیا گیا۔

ڈاکٹر جولیس جرمانس پروفیسر علوم اسلامیہ، شعبہ مشرقیات، رائل ہنگیرین یونیورسٹی (بوڈاپسٹ) وسوا بھارتی کے شعبہ مشرقیات میں ابھی ابھی نظام اسلامک چیر کے لئے منتخب ہوئے ہیں۔ اس سال سنہ ۱۹۳۰ء سنہ ۱۹۳۱ء کے نظام عمل کا جو خاکہ تیار کیا ہے وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ابتدائی نصاب۔ عربی ادبیات العالیہ (چھ سے چودھویں صدی عیسوی تک) کے انتخابات کے علاوہ تاریخ لسانیات اور ادب کی تعلیم۔

(۲) تاریخ اسلام۔ ازمنہ جاہلیت سے لیکر بعثت اور نزول قرآن مجید سے پہلے تک عربی تاریخ۔ اسلامی سلطنت، عباسی خلفا، اسلام کی اشاعت اکناف عالم میں، ترکوں اور ہندوستان میں اسلام کی آمد وغیرہ کا بالاستیعاب مطالعہ۔ تاریخی ماخذ اور ماخذوں کی جانچ کے تقابلی طریقہ کی تعلیم۔

(۳) ریسرچ اور تاریخی طرز تحقیق کی تعلیم اور اس کی وضاحت تاریخ اسلام ہند پر اس کے عملی تطابق سے دی جائیگی۔

(ا) تاریخ اسلام پر باضابطہ اور مسلسل لکچر ہوں گے۔ ہر لکچر کے بعد ایک جماعت منعقد ہوگی جس میں اُن ذکر ماخذوں کا تحقیقی مطالعہ کیا جائیگا جو لکچر کے موضوع تھے۔

(ب) ادبی اور لسانیاتی تصنیفات کے مطالعہ اور تفہیم کے لئے علحدہ جماعتیں بنی جائینگی۔

(۴) فارسی اور ترکی نصاب۔ فارسی اور ترکی نصاب اور اس کے ماخذوں کے مطالعہ کیلئے درسوں کے ساتھ اعلیٰ جماعتیں ترتیب دی جائینگی۔

(۵) اسلامی کتب خانہ۔ اسلامیات سے متعلق مستند کتابوں کا کافی ذخیرہ تنقیدی اصول پر فراہم کیا جارہا ہے تاکہ طلبہ اور تحقیق کرنے والوں کی ضروریات پوری ہوسکیں۔

فیس اور رہائش کے انتظام کے متعلق "کرما سا شیوا" ۲۱۰، کارنوالس اسٹریٹ (کلکتہ) سے معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔

چار ہندی حسن کار سدھانشو چودھری، رانا داچرن وکیل، دھرندر ادب برمن اور للت موہن سین سرکاری وظیفہ پر یورپ جانیکے لئے منتخب کئے گئے ہیں، یہ لوگ وہاں ہندی حسن کاری سے جدید انڈیا ہوز "کی آرائش اور زیبائش کا کام انجام دینگے۔ انگلستان پہنچتے ہی یہ پہلے ایک سال تک رائل کالج (ساؤتھ کنگسٹن) میں آرائش کی تعلیم حاصل کرینگے۔ معلومات حاصل کرنے کی غرض سے یہ اطالیہ اور یورپ کے دوسرے ممالک کا سفر بھی اختیار کرینگے۔ ہندی حسن کاری کی قدر شناسی کی یہ ابتدا ہے۔

ہماری فیاض حکومت نے بھی گذشتہ سال ملک کے ایک نوجوان حسن کار مسٹر امیر حسن کو وظیفہ دیکر اطالیہ میں نقاشی اور مماثل فنون کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے یورپ روانہ کیا ہے۔ یہ پروجیا کی ریگیا یونیورسٹی میں قابل قدر کام انجام دے رہے ہیں۔ حیدرآباد دکن کے یہ سب سے پہلے طالب علم ہیں جو اس فن کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان کی واپسی ملک میں حسن کاری کے ذوق کی اشاعت کا سبب ہوسکے گی

کچھ عرصہ ہوا کہ میونچ یونیورسٹی نے مابعد طیلسانی تعلیم کے لئے تین ہندوستانی طالب علموں کو وظیفہ دینے کا اعلان کیا تھا۔ جس کے لئے ہندوستان کے مختلف صوبوں سے درخواستیں بھی طلب کی گئی تھیں۔ "دی ڈیوتاق اکاڈمی" کے پریذیڈنٹ نے ہندوستانیوں کی اطلاع کی غرض سے یہ تحریر "گرشیر انڈیا سوسائٹی" کے اعزازی معتمد کے پاس روانہ کی ہے کہ اعلان کے جواب میں تقریباً تمام ہندوستانی جامعات کے متعلمین کی (۴۸) درخواستیں پیش ہوئیں۔ ہر درخواست گذار کی علمی قابلیت ممتاز تھی اس لئے وظیفہ کی کمیٹی کے اراکین کو انتخاب میں بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ آخرکار ان تین خوش نصیب طلبہ کو یہ وظیفے عطا کئے گئے۔

۱۔ ڈاکٹر اگرندر ناتھ مکھوپادیہ (کلکتہ یونیورسٹی) کو آرٹس میں ریسرچ کے لئے۔
۲۔ مسٹر کالی پارا باسو (ڈھاکہ یونیورسٹی) کو طبیعیات اور کیمیا کا وظیفہ حیاتیاتی کیمیا کے لئے۔
۳۔ مسٹر ترگنا چرن سین (نیشنل کالج آف انجینرنگ بنگال) کو انجینرنگ کا وظیفہ عطا ہوا۔

ان جرمن علم دوست اصحاب نے جس قدر اعتراف ہندوستانیوں کی غیر معمولی قابلیتوں کا کیا ہے اس سے زیادہ قدر خود ہندوستانی ان کے دوستانہ جذبات کی کرتے ہیں۔

اس دفعہ کی تصویروں میں ایک نواب نظام علی خاں بہادر نظام الملک آصفجاہ ثانی والی دکن کی ہے۔ جن کا عہد حکومت بعض ناقابل فراموش علمی اور ادبی کارناموں کی وجہ سے یادگار ہے۔

دوسری تصویر نواب مسعود جنگ بہادر سابق ناظم تعلیمات ریاست حیدرآباد دکن کی ہے۔ آپ ریاست کے اس عہدہ سے وظیفہ پر سبکدوش ہوکر اپنے دادا آنریبل سر سید احمد خان کی تعلیمی یادگار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے عہدہ وائس چانسلری پر فائز ہوکر تشریف لے جارہے ہیں۔ اپنے اکثر پیشرو نواب دنظم یار جنگ، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک وغیرہ کی طرح آپ نے حیدرآباد کی خدمات سے سبکدوشی کے بعد علی گڑھ کالج کی علمی اور قومی خدمات کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے۔

POST GRADUATE

سلطان علاؤالدین حسن گنگو بہمنی

از

مولوی محمد احمد صاحب انصاری بی۔اے ایل ایل بی (عثمانیہ)

(بسلسلۂ گذشتہ)

جنوب بعید کی چولا سلطنت جس زمانہ میں چلوکیا سلطنت کا خاتمہ ہوا (یعنی بارھویں صدی کے آخری حصہ میں) چولا سلطنت اپنے عروج پر تھی اور ایک سرسری نظر ڈالنے والا شخص کبھی اس کا خیال بھی نہیں کر سکتا تھا کہ آئندہ نصف صدی میں یہ بھی اپنے پڑوسی کی طرح ہمیشہ کے لئے دنیا پر ایک درخشاں یادگار چھوڑ کر چلی جائیگی مگر باریک بین نظریں اس کی ظاہری شان و شوکت عروج اور اقبال کے باوجود اس کے زوال کے آثار و اسباب اسی وقت سے دیکھتی ہیں چنانچہ ۱۱۶۷ئ؁ میں پانڈیا سلطنت میں وراثت کا ایک جھگڑا برپا ہوا جس کی وجہ سے جزیرہ سراندیپ کے راجہ نے اپنے مشہور و معروف سپہ سالار لنکا پورونڈ ناتا کی سرکردگی میں ایک بڑی بھاری فوج جنوبی ہند میں بھیجی۔ چولا سلطنت نے فریق مخالف کی طرفداری میں فوجیں روانہ کیں۔ بہت دنوں تک لڑائی ہوتی رہی۔ اس کے تفصیلی واقعات بڑے دلچسپ ہیں لیکن یہاں ان کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس جنگ کے متعلق جو بات یاد رکھنے کے قابل ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس جنگ میں شرکت کا اثر سلطنت چولا پر بہت برا پڑا جو صدمہ اس کی وجہ سے سلطنت کو پہنچا اس سے وہ کبھی سنبھل نہ سکی۔

مشہور راجگان چولا میں آخر شخص کلوتنگا سوم ہے جو ۱۱۷۸ء سے ۱۲۱۶ء تک حکمراں رہا پھر اس کے بعد کوئی شخص ایسا نہیں ہوا جس کا ذکر کیا جاسکے۔ یہ شخص بڑا مدبر اور بہادر سپاہی تھا اس نے اپنی پوری کوشش سے سلطنت کے وقار کو قائم رکھا اور ہر طریقہ سے چولا سلطنت کو مضبوط اور دیرپا بنیادوں پر کھڑا کرنا اس کی عین خواہش تھی۔ گو اسے بہت کچھ کامیابی حاصل ہوئی لیکن جو قوتیں اس کے خلاف کام کر رہی تھیں وہ بھی آہستہ آہستہ اپنی جڑیں مضبوط کرتی جارہی تھیں پانڈیا ملک جو بے انتہا خون بہانے اور زر کثیر کے صرف کرنے کے بعد فتح کرکے زبردستی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا گیا تھا۔ بے چینی سے اپنی قید کے دن گزار رہا تھا۔

متعدد باجگزار ریاستیں تھیں جن کی تفصیل کلوتنگا کے بعض کتبات میں دیکھی ہے یہ ریاستیں اس وقت تک آپس میں متحد تھیں دو کتبوں سے ایک قسم کے عہدناموں کا پتہ نکلتا ہے جس میں ان ریاستوں کا ایک دوسرے سے تعلق اور مرکزی حکومت سے اتحاد ظاہر ہوتا ہے۔

راجہ راج سوم جو کلوتنگا کے بعد راجہ ہوا اس کے زمانہ کی حالت ایسی ہی تھی جیسے طوفان کے پیشتر خاموشی اس میں شک نہیں کہ کلوتنگا کی حکمرانی بہت کامیاب رہی لیکن زمانہ کے آثار مقامی حکومتوں کی روزافزوں ترقی قوت اور مرکزی یا شہنشاہی حکومت سے رفتہ رفتہ اختیارات کا سلب ہوتے جانا شمالی طاقتوں کا عروج جو چالوکیا شہنشاہیت کے ڈھانچے کی تقسیم سے اپنے گھر آراستہ کر رہی تھیں یہ سب چولا شہنشاہیت کے خاتمہ کے نقیب تھے۔ ظاہرا چولا سلطنت ایک بزرگ اور عظیم الشان ہیت رکھتی تھی لیکن اندرونی حالت روزافزوں بدتری کی طرف راجع تھی۔

دراصل سوائے پایۂ تخت اور وہ علاقے جو اس کے اطراف تھے اور سری رنگم۔ تانجور اور گنگا کونڈا سولا پورم کے صوبے علاوہ کوئی حصہ ملک شہنشاہ کے ماتحت براہ راست باقی نہیں رہا تھا۔ شمال میں پالوا کا ایک خاندان جنوبی ارکاٹ پر قبضہ کئے ہوئے تھا۔ ٹونڈا منڈلم شمال میں اوپر کی طرف ہٹکر دوسرے پالوا خاندان کے زیرنگیں تھا ان سب سے بڑھکر خطرہ پانڈیا حکومت سے تھا جو کیڑے کی طرح شہنشاہیت کو اندر ہی اندر چاٹ رہی تھی اس حالت میں چولا سلطنت کی حالت قابل رحم تھی۔ ہر ایک ہی خواہی کا دم بھرتا تھا اور معاملات کے سلجھانے کی غرض سے دخل دیکر کوئی نہ کوئی حصہ سلطنت کو غصب کر لیتا۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں پہلی ہوئسیالہ مداخلت شامل ہے جو دراصل مبنی بر خیر خواہی تھی۔

ہوئسیالہ مداخلت

ہوئسیالہ سلطنت پہلے چالوکیا کا ایک صوبہ تھی اُس کا بانی بٹی دیوا تھا۔ ویرا بلال نے اپنے زمانہ میں اُس کے حدود دریا کرشنا تک وسیع کر لئے اور جب ویرا نرسا تخت نشین ہوا تو اُس نے کچھ تو عزیزداری کے لحاظ سے اور کچھ ذاتی اغراض کی بنا پر چولا سلطنت کے معاملات میں مداخلت کی۔ راجہ راج چولا کے زمانہ میں راجہ سندرا پانڈیا سلطنت کا حکمران تھا وہ سلطنت کی زبوں حالت کا اندازہ کر کے انتقام کے درپئے ہوا۔ تانجور اور یور کو جلا کر خاک کر ڈالا۔ ہوئسیالہ نے شہنشاہ کی طرفداری میں فوجیں روانہ کیں لیکن کانچی میں بغاوت ہو گئی جس کی وجہ سے ویرا نرسا کو اپنی فوجیں واپس بلا لینی پڑیں موقع پاکر سندرا نے راجہ کو ملک بدر کر کے خود شہنشاہ چولا بن گیا۔ کاڈوا نے راجہ راج کو قید کر لیا اور کچھ حصہ ملک جو اُس کے قبضہ میں رہ گیا تھا اس سے چھین لیا۔ ویرا نرسا خود تو نہ جا سکا لیکن اُس کے دو تجربہ کار سپہ سالار مع افواج کثیر روانہ کیا انہوں نے پانڈیا کو شکست دیکر کچھ دنوں کے لئے سلطنت کو بچا لیا۔

مگر اس کی وجہ سے دشمنوں میں اور آگ بھڑک گئی انہوں نے فوراً آپس میں اتحاد عمل کے معاہدہ کئے کویرن جیگا اور پانڈیا راجہ میں ہوئسیالہ اور چولا کے خلاف معاہدہ عمل میں آیا۔ دراصل یہ مداخلت ہی چولا سلطنت کے لئے پیام اجل تھی ۱۲۳۳ء میں نرسا کے بعد سومیشور تخت نشین ہوا اور ۱۲۳۴ء ۱۲۴۳ء میں دوسری مداخلت عمل میں آئی۔

چولا سلطنت کا خاتمہ

اس کی وجہ راجہ راج اور اُس کے بھائی راجندر کا بغض و حسد تھی ان دونوں کے دو پارٹیاں تھیں جنہیں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ سومیشور نے راجندر کو شکست دے کر اپنی ذاتی اغراض کی وجہ سے اسی کو راجہ بنا دیا اور خود سری رنگم میں اپنا جنوبی پایۂ تخت مقرر کر کے استقامت حاصل کر لی۔

چولا سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور ملک کی تقسیم شروع ہوئی چنانچہ ہوئسیالہ برائے نام راجہ کو قائم رکھکر پانڈیا کے خلاف چدمبرم کے جنوب سے رامناد ضلع کے اندرونی حصہ تک خود دبا بیٹھے۔

جنوبی ارکاٹ مطلق العنان کوپرانجنگا کے قبضہ میں تھا جو در اصل مخالفین سلطنت کا حلیف اور ہمیشہ فتنہ و فساد اور رخنہ اندازی کا باعث تھا۔ تیسرا بڑا حصہ شمالی ارکاٹ اور چنگلپٹ کا تھا یہ برائے نام سلطنت میں داخل تھے اور ہوئسیالہ کی قوت کی وجہ سے خاموش تھے شمال کی طرف سے کاکاٹیہ کے حملے برابر سلطنت کو کمزور کئے جا رہے تھے۔ نلور میں چودا خاندان کے تلنگے سلطنت کے ایک صوبے کے مالک بن گئے تھے۔

سنہ ۱۲۹۱ء میں دکن کی عام حالت

کاکاٹیا کا راجہ گنپتی تھا۔ اس نے سلطنت پر حملہ کیا اور شکست کھا کر اپنے ملک میں سے ہٹ جانے پر مجبور کیا۔ گنپتی کے بعد اس کی بیٹی رودرمبا سنہ ۱۲۶۱ء تا سنہ ۱۲۹۱ء تک حکمراں رہی مگر رودرمبا کو اپنے ہی ملک کی حفاظت آپ کرنی تھی چنانچہ انہیں وجوہات کی بنا پر اس نے سنہ ۱۲۹۲ء میں تخت سے کنارہ کشی اختیار کی اور پرتاب رودرا کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ اسی سال مسلمانوں نے تلنگانہ پر حملہ کیا سنہ ۱۳۲۸ء تک رودرا حکمراں رہا جس کے بعد وہ پھر سلطنت کا ایک باجگذار صوبہ ہو گیا۔

چولا سلطنت کی قوت ہوئسیالہ کی مدد پر مبنی تھی لیکن اب ہوئسیالہ خود اپنی بے وقت طاقت سے زیادہ فائدہ اٹھا نہ سکے اور چالیس ہی سال میں ان میں خود پھوٹ پڑ گئی۔ سومیشور کے بعد سلطنت کے دو حصے ہو گئے شمال میں ویرا نرسما اور جنوب میں ویرا رامناتھن نے سلطنت کو تقسیم کر لیا سنہ ۱۲۹۳ء میں ویرا رامناتھن کا بیٹا ویرا وسوناتھ اپنے باپ کا جنوب میں جانشین ہوا اور اسی زمانہ میں شمالی ہوئسیالہ نرسما کے بیٹے ویرا بلال سوم کے زیر نگیں آیا (یہ شخص بھی) بعد از وقت پیدا ہوا تھا اس کی قابلیت نے کوئی معتدبہ فائدہ نہ پہنچایا کچھ دنوں تک ان تھک محنت اور زبردست کوشش نے سلطنت کو بجھنے سے پہلے کچھ روشن کر دیا لیکن سنہ ۱۲۹۲ء میں مسلمانوں کی آمد نے ان سب بدتمیزیوں کا خاتمہ کرنے کے لئے ہوشیار باش کی صدا سے میدان جنوب بعید کو چونکا دیا۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ وکرمادتیہ کے معین و مددگار صوبہ دار سلطنت چالوکیا کے زوال کی وجہ خود ہی ہوئے تھے یہی سوناچندر یادو صتودا، دیوگری برائے نام اطاعت و وفاداری کا دم بھرتا تھا لیکن در اصل اس نے اپنے بیٹے کے لئے ایک موروثی سلطنت قائم کر کے چھوڑی۔ پرمادیو نے سنہ ۱۱۸۷ء میں اتنا پاس و لحاظ بھی اٹھا دیا اور وجیالا کی بغاوت کے ساتھ اس نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

سومیشور چہارم نے جب سلطنت کو پھر از سر نو منتظم کرنے کی کوشش کی تھی بلیما یادو نے جو اس وقت صوبہ دار تھا باغیانہ مخالفت کی اور جب ویرا بلال نے بوما جنرل کو کامل شکست دی تو سنہ ۱۱۹۱ء میں شہر دیوگری میں اس نے کامل خود مختاری کا اعلان کر دیا اور تخت پر بیٹھ کر تاج شاہی اپنے سر پر رکھکر خود کو بادشاہ کے القاب سے ملقب کیا اور جتنا ملک کرشنا کے شمال میں تھا سب پر قبضہ کر لیا۔

یادو ہوئسیالا کا رقیب اور برابر کا دعویدار خاندان تھا دونوں ایک ہی سلطنت کے صوبہ تھے دونوں نے نکمرانی کی وجہ سے سلطنت کو برباد کرکے اُس کے حصہ بخرے کرنے میں بڑا حصہ لیا تھا اور دونوں نے اسی کی بدولت فائدہ اُٹھایا تھا اس لئے ہوئسیالا کی بڑھتی ہوئی قوت یادو خاموشی سے نہیں دیکھ سکتے تھے انہیں خود اس کا خوف تھا کہیں یہ زور پکڑلیں تو انہیں نہ ہضم کرجائیں۔ آپس میں کشیدگی بڑھتی گئی ۱۱۹۲ء میں تصادم ہوا یادو کو ہزیمت اُٹھانی پڑی مگر اس سے کوئی تصفیہ نہیں ہوا۔ یہ سلطنتیں سب برابر کی تھیں اب ان پر کوئی باقاعدہ بالادست جو سب کو اپنی اپنی حدتک رکھکر ایک اتحاد عمل پر مجبور کرتا باقی نہ رہا تھا۔ سو سال تک یہ اسی طرح آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے جیتر پال کے بیٹے سنگھانا نے یادو خاندان کو بہت عروج بخشا۔ گجرات و مالوہ اور شیبی کونکن فتح کرنے کے بعد جنوبی مرہٹواری کو اپنے علاقہ میں داخل کرکے ۱۲۴۷ء تک حکومت کرتا رہا۔

اس کے بعد اُس کا پوتا کرشنا دوم ۱۲۶۰ء تک دیوگیری میں حکمراں رہا اور مالوہ وغیرہ میں بہت سے کارہائے نمایاں اپنی یادگار چھوڑے۔ ۱۲۶۰ء میں اس کا بھائی مہادیو تخت نشین ہوا جس نے شمالی کونکن کو اپنی سلطنت میں داخل کرلیا ۱۲۷۱ء میں مشہور امدیو مہادیو کا بھتیجا اور کرشنا کا بدقسمت بیٹا دیوگیری کے تخت پر بیٹھا۔ اس کا ابتدائی زمانہ بہت کامیاب رہا وہ اپنے زمانہ کا جنوب میں سب سے بڑا راجہ تھا اُس نے میسور اور مالوہ پر حملے کئے اور کامیاب رہا۔ تیس برس تک اُس نے سلطنت کی لیکن جو عام اور عالمگیر قوتیں خود اس کو ایک مطلق العنان راجہ بنانے میں ممد رہ چکی تھیں انہی کا دوسرا کام اُس کو اُکھاڑ کر پھینکنا تھا چنانچہ ۱۲۹۴ء میں دیوگیری مسلمانوں کے قبضہ میں آگئی۔

تیرھویں صدی کے آخری ربع کی حالت ہمارے سامنے اوپر کی سطروں میں رکھی ہوئی ہے جس سے ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ ہندوستان کے جنوب میں کیا حالت تھی اور کونسا زمانہ ختم ہورہا تھا اور کیا قوتیں وہاں کام کررہی تھیں اور کیا صورتیں وقوع پذیر ہورہی تھیں۔ ہم نے شروع سے تیرہ سو سال کی تاریخ پر ایک سرسری اور بہت ہی تیز نظر ڈالی ہے لیکن جو کچھ بھی ہمارے پیش نظر ہے اس سے ایک عام حالات کا تصوری نقشہ ہمارے ذہن نشین ہوجاتا ہے جس پر غور کرنے سے ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدا ایک خاص قسم کے واقعات سے ہوتی ہے اور یہی واقعات ترقی کرتے ہوئے ایک مسلسل حالت میں نظر آتے ہیں اور گیارھویں و بارھویں صدی سے دوسرے واقعات بطور نتیجہ آہستہ آہستہ موجودہ واقعات میں سے نکلنے لگتے ہیں جن کی رفتار بالکل غیر محسوس رہتی ہے حتیٰ کہ تیرھویں صدی میں وہ اپنی پوری قوت حاصل کرلیتے ہیں اور اپنا اثر کام میں لانا شروع کردیتے ہیں۔

تیرھویں صدی کے آخر میں ذرا تامل سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پرانے واقعات نے بالکل جگہ خالی کردی ہے اور نئے انتظام کی تیاری ہے چنانچہ چودھویں صدی کے پہلی ہی ربع میں وہ بالکل محیط ہوجاتا ہے اور ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔

عام طور پر تاریخ کو تین حصوں پر تقسیم کرتے ہیں یعنی قدیم۔ وسطی اور موجودہ جدید سہولت کے لحاظ سے ہر زمانہ کی ابتدا اور انتہا کی مقررہ تاریخیں بھی قائم کی گئی ہیں اس کے یہ معنی نہیں کہ فلاں تاریخ اور سنہ میں فلاں قدیم

ختم ہو جاتا ہے اور زمانہ وسطیٰ شروع ہوتا ہے اگر ایسا کیا جائے تو ایک تاریخی غلطی ہوگی کیونکہ موجودہ زمانہ میں واقعات کا تسلسل جس میں کوئی باقاعدہ رکاوٹ نہیں پائی جاتی ایک ناقابل ترک اصول ہے۔ ایک زمانہ دوسرے زمانہ سے گتھا ہوا ہے ہم بعض تاریخی واقعات چن کر زمانہ قدیم میں شامل کر کے علحدہ نہیں رکھ دے سکتے کیونکہ ہر واقعہ اپنی ابتدا کسی زمانہ میں اور انتہا کسی دوسرے میں اپنی علت کسی ایک میں اور نتیجہ کسی دوسرے میں رکھتا ہے۔ ایک واقعہ ایک زمانہ میں پیدا ہوتا ہے اور وہ بڑھتا اور ترقی کرتا ہوا اپنے ارتقائی منازل طے کر کے ایک دوسرے زمانہ میں عظیم الشان اہمیت حاصل کر لیتا ہے ہم جو کچھ کر سکتے ہیں وہ اپنی سہولت کے لئے بعض اہم واقعات سے جو خاص قوتوں کے تحت ظاہر و نمودار ہوئی ہیں اُن سے ایک خیالی حد قائم کر لیتے ہیں کسی واقعہ کا پورا اثر اسی وقت محسوس نہیں ہوتا اور تبدیل کے وقت کوئی شخص فرق کو معلوم نہیں کر سکتا کیونکہ انسانی زندگی کے واقعات انقلابی نہیں ہوتے بلکہ ارتقائی ہوتے ہیں وہ ہمیشہ موجودہ ترتیب و انتظام کو آہستہ آہستہ بدلتے ہوئے زمانہ کے موافق بنا دیتے ہیں۔

زمانہ کا تعین دراصل سن عیسوی یا ہجری سے نہیں ہوتا بلکہ واقعات پر ہوا کرتا ہے ہم دراصل تاریخ عالم کے واقعات کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں اور پھر یہ دیکھتے ہیں کہ اس کے مماثل واقعات کس جگہ اور کس وقت وقوع پذیر ہوئے تو اس سوال کا ہم جو جواب ملتا ہے اس سے ہم اس ملک کی تاریخ کو ازمنہ سنین کے مطابق مقرر کر دیتے ہیں مثلاً یورپ میں عموماً ۵۰۰ء سے ۱۵۰۰ء کے بیچ میں جو زمانہ گزرا ہے اس کو ازمنہ وسطیٰ کہتے ہیں۔

ہر زمانہ کے کچھ نمایاں خصوصیات ہیں جس سنہ میں وہ نمایاں خصوصیات کسی ملک میں پائی جاتی ہیں وہ زمانہ انہیں کی مناسبت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تجربہ سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ تین قسم کے واقعات اپنے خصوصیات کی وجہ سے علحدہ علحدہ کیے جا سکتے ہیں اور یہ ہر حصہ دنیا میں وقت اور مقام کے فرق سے پائے جاتے ہیں جن کے لحاظ سے ہر ملک میں اُن کا تعین مروجہ سنین میں کیا جاتا ہے۔ تاریخ عالم کے مطالعہ سے یہ مطلب صاف طور پر سمجھ میں آسکے گا۔

ہمارے مطلب کے لئے تاریخ یورپ کا دکن سے مقابلہ کرنا کافی ہے چنانچہ یورپ میں ۱۵۰۰ء کے قبل جو رجحانات اور واقعات کے خصوصیات ہیں انہیں ذہن نشین کر کے اگر تاریخ دکن سے مقابلہ کیا جائے تو ۱۲۹۴ء تک دکن میں ہمکو پھر وہی عالمگیر اصول کام کرتے ہوئے نظر آئینگے جو یورپ میں ۵۰۰ء تک موجود تھے۔ اس لئے ہم تاریخ دکن کو ۱۲۹۴ء تک زمانہ قدیم اور اُس کے بعد ۱۸۵۷ء تک ازمنہ وسطیٰ اور اُس کے بعد سے زمانہ حال میں تقسیم کرتے ہیں۔

ہمارے مضمون کا تعلق زمانہ قدیم و زمانہ وسطیٰ کے درمیانی حصہ سے ہے اور یہی وجہ اس کی اہمیت کی ہے۔ علاؤ الدین کی شخصیت کی اہمیت کو ذہن نشین کرانے کے لئے ہم تاریخ یورپ سے تاریخ دکن کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے نتیجے پر پہنچینگے یہی بہترین طریقہ واقعات کو اچھی طرح سمجھنے اور عالمگیر اصول کی اہمیت کو جانچنے کا ہو سکتا ہے یہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ یورپ میں ۵۰۰ء عیسوی سے زمانہ وسطیٰ شروع ہوتا ہے اور ہم یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ تاریخ کو ازمنہ میں تقسیم کرنا محض

ایک خیالی چیز نہیں، بلکہ خاص اصول کے تحت اس کو ایسا کیا جاتا ہے لہٰذا اب ہم دیکھینگے کہ یورپ کی تاریخ کو زمانہ قدیم سے زمانہ وسطیٰ میں تقسیم کرنے والے کون سے واقعات ہیں اس کے لئے یہاں زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں بلکہ صرف ہم ان عالمگیر واقعات کو دکھلائینگے جو اس کے موید ہیں ۔

زمانہ قدیم کی تاریخ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ کا جنوبی حصہ ترقی یافتہ اور مہذب ہے رومی سلطنت اپنے عروج پر ہے اور کوئی اس کی قوت اور اس کے حقوق کا دعویدار اور رقیب نہیں دریائے ڈانیوب اور رواالگا کے شمال میں بربریت پھیلی ہوتی ہے ۔ یونانی اور رومی تہذیب اٹلی ۔ یونان ۔ اندلس ۔ فرانس کے جنوبی حصوں تک محدود ہے۔ زمانہ قدیم کے اختتام پر جو واقعات صاف طور پر نظر آتے ہیں وہ مختصر یہ ہیں کہ زبان کے لحاظ سے صرف دو زبانیں یعنی رومی اور یونانی ترقی یافتہ اور مہذب ہیں باقی جتنی زبانیں یورپ کی تھیں وہ غیر مہذب حالت میں ردی پڑی تھیں جنہیں غیر مہذب اقوام اپنے ضروریات معمولی پورا کرنے کی غرض سے استعمال کرتی تھیں ۔ مذہباً سارا یورپ عام تاریکی اور جہالت بت پرستی و اوہام پرستی میں گھرا ہوا تھا کوئی روحانی رفعت انسانی تخیل میں نہیں پائی جاتی ۔ انسان فطرتی مناظر سے ڈرتا ہے اور اپنی جان کی حفاظت کے لئے اُن کی پرستش کرتا ہے ۔ الوہیت سے محبت اور عشق نہیں ہے وہاں تک پہنچنے کی خواہش نہیں بلکہ صرف اپنی دنیوی زندگی کو خوشی سے گزارنے کو خواہش اور خلاف ورزی کرنے میں اُس کے زائل ہونے کا اندیشہ اسے پرستش کرنے پر مجبور کرتا ہے ۔ سیاسی حیثیت سے یورپ کی صرف دو حصوں میں تقسیم ہوسکتی ہے ۔ رومی یورپ اور بربری یورپ لیکن سنہ ۴۰۰ء میں جب گاتھ اقوام نے سلطنت روما پر ترکتازیاں شروع کیں تو اس میں شک نہیں کہ اس سے زمانہ قدیم کی ایک عظیم الشان عمارت ہل گئی اور اسی وقت سے اس کی بیخ کنی کی بنیاد پڑی اس کے پیشتر کوئی اس کا مدمقابل نہ تھا اور کوئی اس کے حق حکمرانی کا دعویدار نہ تھا لیکن یہ ایک نیا اثر ہے جو رومی سلطنت کے دعویٰ عالمگیر حکمرانی کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے اگر اس واقعہ کو تاریخ کی روشنی میں ہم بیان کرتے چلے جائیں تو ظاہر ہوگا کہ ایک مسلمہ اصول ہے جو کام کر رہا ہے جس نے پرانے واقعات کے خلاف نئے واقعات کی بنا ڈالی لیکن یہ نیا واقعہ بطور نتیجہ کے پرانے سے پیدا ہوتا ہے ۔ زمانہ وسطیٰ کی خصوصیات میں سے ایک عالمگیر سلطنت کی مخالفت کا خیال ہے جو آخرکار کامیاب ثابت ہوتا ہے سارے زمانہ وسطیٰ میں یہی نظر آئے گا ۔

المانی اقوام کا جب رومی سلطنت سے تصادم ہوا تو رومی اثرات نے اُن کو خود اپنے سے متاثر کیا اور رومی اثرات المانی لباس میں ظاہر ہونے لگے ۔ المانی آزادمنش اور مغرور تھے اُن کی نمایاں خصوصیت انفرادیت تھی رومی تہذیب اور ان خصوصیات کے میل جول سے جو چیز پیدا کی وہ انفرادی اصول حکومت تھا انفرادی اجزا کا شہنشاہی حکومت میں یکجا رہنا اب ناممکن تھا یہ اس تحریک کی ابتدا ہے جو اپنے حدکمال پر زمانہ وسطیٰ کے اختتام پر پہنچی ہے ۔

نئے اصول کی مخالفت کیجاتی ہے اور اس کو بار آور ہونے سے روکنے کی انتہا درجہ کوشش ہوتی ہے لیکن زمانہ کے اثرات رک نہیں سکتے۔ یہ مخالفت اور کوشش نہایت ہی ضروری چیز ہے یہ بھی نتیجہ واقعات اور ضرورت زمانہ کا ہے۔ اگر ان قوتوں کو روکنے کیلئے کوئی دوسری مخالف قوت نہ ہو تو یہ اپنی تیز رفتاری سے ساری سوسائٹی کو برباد کرکے ہنوز روز اول کا تماشہ دکھانے لگتے۔ چنانچہ کارل اعظم نے مخالف قوت کا کام روا کیا یہ اپنے زمانہ کے لئے پیدا کیا گیا تھا اس نے قدیم اصول کی حمیت میں اپنی خدمت مفوضہ پوری کی اور اپنی حیات تک نئی قوتوں کو روکے رکھا اور بہت آہستہ آہستہ اُن کو جانشین ہونے کا موقع دیا گیا ورنہ اگر یہ مخالف قوت نہ ہوتی تو نہ معلوم اور کیا حشر ہوتا۔ المانی حملہ ناگزیر تھا اس کے ساتھ کی بربادیاں ایک حد تک ناقابل اعتنا تھیں۔ ظاہرا یہ ایک عذاب تھا جو یورپ پر نازل ہوا لیکن باطنا اس کی تہ میں ایک اصول کام کر رہا تھا وہ شہنشاہیت اور مرکزیت میں اتحاد و یگانگت عالم کے خلاف ردعمل تھا۔ المانی قوم ان خصوصیات سے مختص تھی اس ردعمل پورا ہونے کی صرف دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک انقلابی صورت اور ایک ارتقائی۔ انقلابی صورت جلد اثر دکھلاتی ہے لیکن یہ غیر فطرتی ہے اور دیرپا نہیں ہوتی تاریخی واقعات انقلابی نہیں ہوتے وہ ارتقائی ہوا کرتے ہیں اور جو انقلابات تاریخ میں نظر آتے ہیں وہ دراصل ایک ارتقائی واقعہ کے دوران رفتار کی شدید صورت پیش کرتے ہیں مثلاً ایک بیمار کو کبھی نہ کبھی شدت مرض ہوتی ہے۔ اگر یہی انقلابی صورت اختیار کی جاتی تو اس کے بہت برے اثرات مترتب ہوتے بجائے ترقی کے دنیا ادبار و تنزل کی طرف ہٹ جاتی۔

المانی بربریت کو روکنے سے کچھ اُن کو مقامی ضروریات کے موافق اپنی طبیعت ڈھالنے کا موقع ملے گا اور اسی طرح رفتہ رفتہ وہ عالمگیر اصول جاگزیں ہوتا گیا۔

۸۸۷ء میں کارل کا انتقال ہوا لیکن تین صدیوں میں بربریت اور رومی تہذیب نے ایک دوسرے پر اپنا پورا اثر کر لیا تھا اور ان دونوں کے اتحاد سے ایک نئی شکل نمودار ہوئی۔ قانونی جکڑ بندی اقوام کی غلامی اور مرکزیت اپنی جا چھوڑ چکے تھے۔ انفرادی آزادی اور اس کے ساتھ جنگجو خصلت قومیت اور لامرکزیت کے ساتھ رومی تہذیب کے اثرات یعنی فوجی انتظام شہنشاہ کی بجائے بادشاہ۔ عالمگیر قومیت کی بجائے مقامی حب قومیت قائم ہو گئی اور فرانک۔ برگنڈی لمبارڈی وغیرہ میں چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہو گئیں۔

ازمنہ وسطیٰ کے بیچوں بیچ جاگیرت اس انفرادیت کا بدترین مثالی عروجی پہلو ہے اس کے خلاف پھر ردعمل شروع ہوتا ہے اور اس کی روک تھام ہوتے ہوتے موجودہ زمانہ میں وہ تصفیہ شدہ ہو کر قومی انفرادیت قائم ہو جاتی ہے دوسرا پہلو مذہبی ہے۔ عیسائی مذہب اپنے مراحل ابتدائی طے کرکے اور اس کی گوناگوں دشواریوں اور قدیم مذاہب مختلف کی زبردست عصبیت کا مقابلہ کرتے ہوئے کانسٹنٹین کے زمانہ میں سیاسی وجوہات کی بناء پر رسنانے کا موقع پاتا ہے۔ اور ۳۷۹ء تا ۳۹۵ء میں تھیوڈوسیس اور گراشین نے آخر کار اس مذہب کو

قانونی اور ملکی مذہب بننے کا افتخار بخشا گرجہ کی مصروفیت اور کوشش نے دو ہی صدیوں میں سارے یورپ کو اپنے دامن میں لے لیا۔

آئرلینڈ میں سینٹ کتھبرٹ جس کا انتقال ۶۶۵ء یا ۶۹۳ء میں ہوا سب سے پہلا مبلغ تھا۔ ساتویں صدی عیسوی میں انگریزوں نے عیسائیت کو کامل طور سے قبول کر لیا آٹھویں صدی کے درمیان بونیفیس کی محنت جرمنی میں بار آور ہوئی۔

مگر یہ مذہبی پہلو سیاسی پہلو سے جدا نہیں ہے۔ شہنشاہ نے اپنے اغراض کے لئے عیسائی مذہب کو موزوں جانکر رواج دیا اور عیسائیت گو وہ مسیح علیہ السلام کی نبوت کا نہیں بلکہ پطرس کی زبردست ابلہ فریبی اور دنیا پرستی کا منقلب اور ملتبس نتیجہ تھی اور تبلیغ و اشاعت سے زیادہ بزور شمشیر رومی سلطنت میں منوائی گئی۔ باوجود اس کے اس مذہب اور یورپ کے قدیم مذاہب میں بین فرق تھا اس میں اعلیٰ روحانیت اور آسمانی الوہیت کی کچھ نہ کچھ جھلک باقی رہ ہی گئی تھی اس لئے اس نے المانی بربریت اور انگریزی نامرادی کو دفع کرنے میں بہت امداد دی اور حملہ کے مضر اثرات کو روکنے میں اس کا بڑا حصہ ہے مگر پھر یہ خود گرجہ بھی ایک طرف انفرادی اصول کی ترویج دوسری طرف شہنشاہی حکومت کی بیخ کنی کا باعث ہو جاتا ہے رہبانیت اور پاپائیت دو ادارں کا وجود اپنے وقت کے لئے موزوں تھا۔ مذہبی رنگ میں شہنشاہ کی حکومت کی مخالفت اور پاپا اور شہنشاہ میں اختیارات کی تقسیم بھی ایک مخالفت تھی اتحاد کی پھر خانقاہیں اور گرجوں کی آپس میں تقسیم جن کی ابتدا اب ہو کر ریفرمیشن میں پائے تکمیل کو پہنچتی ہے اور آخر کار ہر قوم بلکہ ہر شخص کو مذہبی آزادی یعنی مذہبی انفرادیت حاصل ہو جاتی ہے اسی طرح غیر مہذب زبانیں ترقی کرتی ہیں اور یونانی اور لاطینی زبان کی ہمہ گیری زائل ہو جاتی ہے اور یہی بربری زبانیں آخر کار مہذب بن جاتی ہیں۔

یورپ کی تاریخ سے گزر کر ایشیا کو اگر ملاحظہ کیجئے تو یہاں پر بھی زمانہ وسطیٰ کے اثرات وہی نظر آئینگے خلافت کی ہمہ گیری کا زوال چاروں طرف اس کی مخالف قومی سلطنتوں کا قیام۔ جنگی اور امرائی اصول کی ترقی مرکزیت کی خلاف ورزی۔ انفرادیت کی عام مقبولیت۔ ہندوستان۔ ایران۔ افغانستان۔ سمرقند۔ بخارا۔ تاشقند۔ مصر۔ اندلس سب علیحدہ علیحدہ قومیں نظر آئینگی اور زمانہ اول کی یگانگت کہیں دکھائی نہ دے گی۔ مذہبی فرقہ واری کی ابتدا بھی اسی زمانہ میں مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ خلیفہ برائے نام رومی شہنشاہ کی طرح ایک زمانہ تک رہتا ہے لیکن اس کی اہمیت قطعاً گھٹ جاتی ہے اور کوئی سلطان اور امیر دراصل اپنے کو کسی کا محکوم نہیں سمجھتا یہ بجائے خود ایک طویل مضمون ہے

اس پر زیادہ بحث نہیں کی جا سکتی صرف ایک سرسری نظر ڈالنا اس لئے مناسب ہے کہ اس سے ہمارے نفس مضمون پر روشنی پڑتی ہے (جس کثرت سے سلطنتیں اور امارتیں دنیائے اسلام میں اس زمانہ میں پائی جاتی ہیں اور جو تاریخ اسلام میں من حیثیت المجموع زمانہ وسطی ہے) جس طریقہ سے یورپ ہمہ گیر سلطنت۔ تہذیب و مذہب و زبان سے نکلکر بدترین لامرکزیت اور انفرادیت سے ہوتا ہوا موجودہ زمانہ کی تقسیم یعنی قومیت اور قومی تقسیم سیاسی مذہبی اور زبانی پر آ گیا ہے اسی طرح اسلامی سلطنت زمانہ کے انقلابات و حادثات کا شکار ہوتے ہوئے وہ پستی اور زوال کے عالم میں پہنچ چکی ہے۔

زمانہ قدیم اور موجودہ زمانہ کے بیچ میں زمانہ وسطی ایک عبوری دور ہے۔ زمانہ قدیم کے خلاف ایک اور عمل شروع ہوتا ہے۔ وہ اپنی مختلف حالتوں سے گذرتا اور تدریجی ترقی کرتا ہوا کبھی تیز رفتاری کبھی سست رفتاری کبھی انقلابی کبھی ارتقائی طور پر زمانہ وسطی کے آخر میں ختم ہوتا ہے اس تحریک کا ماحصل اور نتیجہ انفرادیت ہے اس انفرادیت کے مختلف پہلو ہیں۔

اسکی بدترین صورت امرائی حکومت ہے یعنی جاگیریت اور بہترین شکل قومیت ہے چنانچہ مرکزیت سے بغاوت کرکے دنیا مختلف حالتوں کا اندازہ کرتی ہوئی اور تجربے حاصل کرتی ہوئی موجودہ زمانہ تک آئی اور موجودہ زمانہ پھر اس حالت سے لازمی طور پر بغاوت کر رہا ہے انفرادیت کے خلاف ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ مضر اثرات کو روکنے کے لئے مخالف قوتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں چنانچہ کارل اعظم کی شخصیت بحیثیت شہنشاہ کے۔ پوپ کی شخصیت بحیثیت مذہب کے یورپ میں مخالف قوتیں ہیں۔ اس طریقہ سے سلطان صلاح الدین کی شخصیت دنیا اسلام میں اور علاؤالدین خلجی کی شخصیت خاص ہندوستان میں اس مخالف قوت کی مظہر ہیں۔ اگر یہ قوتیں نہ ہوتیں تو معاشرہ اور تہذیب انسانی کا شیرازہ پارہ پارہ ہو جاتا اور دنیا نہیں معلوم کس ابتری اور زبون حالت پر پہنچ جاتی ان شخصیتوں کا وجود کوئی اتفاقی نہیں تھا بلکہ ضرورت اور واقعات کی ارتقائی حالت اس کی مقتضی تھی اور یہی اُن کی پیدائش کا باعث ہوئی۔

علاؤالدین خلجی کی شہنشاہت پرستی ہندوستان میں زمانہ وسطی کی انفرادیت اور لامرکزیت کے اصول کے خلاف بڑی زبردست روک تھی جس نے نہایت ہی کامیابی سے اپنا کام کیا اور دنیا کی تاریخ میں جو حصہ اس کے سپرد تھا اس کو اس نے پورا کیا۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ

دکن نے جس پر ابھی ہم غور کرینگے اس ردعمل سے مفید فائدے اٹھائے۔ دکن کی تاریخ ہم پڑھ چکے ہیں اوائل زمانہ یعنی زمانہ قدیم میں وہی عالمگیر اصول یہاں بھی کام کرتے نظر آتے ہیں۔ چلوکیا سلطنت کی عالمگیری دکن میں اور چولا سلطنت کی شہنشاہت جنوب بعید میں مسلمہ ہے کوئی انکی مخالفت نہیں کرتا اور صدیوں تک نہایت ہی شاندار طریقہ سے حکومت ہوتی رہی ہے تہذیب و تمدن زمانہ کے موافق اپنے انتہا پر پہنچ چکتے ہیں دکن کے تعلقات بیرونی دنیا سے ہم دیکھ چکے ہیں نہ صرف عرب و ایران چین و مصر بلکہ سلطنت روما اور یونان سے قائم ہیں امن و امان کی وجہ سے لوگ ادبی اور معاشرتی اغراض کو پورا کرتے ہیں۔ شاعری۔ بت تراشی۔ معماری کے فنون ترقی پر ہیں۔ فلسفہ۔ جغرافیہ۔ فلکیات۔ علم نباتات۔ علم ہندسہ وغیرہ پایۂ تکمیل کو پہنچتے ہیں گیارھویں صدی عیسوی سے زمانہ وسطیٰ کو بنانے والے اثرات پیدا ہوجاتے ہیں۔

دکرما دتیا کی بغاوت صرف ایک وجہ تحریک تھی عالمگیر اثرات کے ظہور پذیر ہونیکا راجہ اسوکا اور موریا سلطنت رومی سلطنت کی مانند ہندوستان میں عالمگیر حکومت تھی۔ موریا سلطنت کے بعد اندھرا قوت نے اپنا لوہا سارے ہندوستان سے منوایا۔ افسوس ہے کہ اس کے بعد تین صدیوں تک تاریخ خاموش ہے ورنہ ہم کو اس سے واقعات کا تسلسل قائم کرنے میں بڑی مدد ملتی۔

چھٹی صدی عیسوی میں چلوکیا سلطنت دکن میں عالمگیر حیثیت قائم کرنے میں کامیاب ہوئی۔ راستوں کی خرابی اور ارسال رسل و رسائل کی کمی نے ہندوستان اور دکن کی تاریخ کو ہمیشہ علٰحدہ رکھا۔ اس لئے اب عالمگیریت سارے اقلیم ہند کی نہیں بلکہ دکن کے لئے چلوکیا سلطنت نے قائم کی۔ چلوکیا راجہ دراصل شہنشاہ تھے جو سارے دکن کی وسعت پر حکومت کرتے تھے۔ کرتی ورمن اور پولاکسن دوم نے نہایت ہی بہادری سے اس شہنشاہت کو قائم رکھا۔ ہندوستان اور دکن کی رقابت ایسی ہی ہے جیسے یونان اور روما کی۔ چنانچہ پھر ایک کوشش بادشاہ کے زمانہ میں ان کو متحد کرنے کی کیگئی لیکن زمانہ اس کے لئے موزوں نہ تھا۔ ہیون تسانگ کا سفرنامہ پولاکسن کی عظمت و وقار کا نمونہ ہے۔

اس کے بعد راشٹرکوٹ دو سو سال دکن کی سلطنت کو چلاتے رہے اور پھر چالوکیا گیارھویں صدی عیسوی تک اپنے فرض کو انجام دینے میں کامیاب رہے جس کا اندازہ گزشتہ ذرائع سے ہوسکتا ہے۔ سلطنت کی عظمت اور اس کی مرکزیت پر کبھی کسی کو اعتراض نہیں ہوا۔

اور باجگذار ہمیشہ اپنے کو شہنشاہ کے نوکر تصور کرتے رہے لیکن آنے والے زمانہ کے اثرات ٹکرا دیتا دوم کی بغاوت سے اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں صوبہ داروں اور باجگذار سلطنتوں کی لاپروائی اور مخالفت وجیالا کی بغاوت زمانہ وسطی کی ابتدا کرتے ہیں لامرکزیت نمایاں ہونے لگتی ہے اور انفرادی اصول ترقی کرتا جاتا ہے۔ دکن میں تین زبردست صوبہ دار خود مختار بادشاہ بنجاتے ہیں جنوب میں بھی ہوسلہ کی مخالفت زمانہ وسطی کا پیش خیمہ ہے۔ چولا سلطنت جو اپنا کام بارھویں صدی تک پورا کرتی رہی آخر کار مختلف حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

زمانہ قدیم کے آخر میں چھ سات بڑی سلطنتیں اور بیسیوں چھوٹی ا مارتیں سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں جس کا اندازہ تاریخ دکن کے سرسری مطالعہ سے ہوسکتا ہے جو ہم نے اوپر پیش کر دیا ہے یہ لامرکزیت اور انفرادیت روز افزوں ترقی کرتی ہے اور اپنی پوری قوت سے انسانی معاشرۂ تہذیب وتمدن کو سیلاب کی طرح بہا لیجاتی ہے۔ نہ صرف سیاسی شیرازہ بکھرتا ہی بلکہ مذہبی اثرات اتحاد بھی اپنی جگہ چھوڑ دیتے ہیں ملک کے گوشہ گوشہ سے نفسانفسی کی صدا بلند ہوتی ہے۔ اب سلطنت کی حفاظت کیلئے قلعے تیار نہیں کئے جاتے بلکہ ہر حصے پر اور جہاں جو کوئی سورما ہوتا ہے اپنی اور اپنے متعلقین کی حفاظت کے لئے قلعے تیار کرلیتا ہے جسکا پتہ ابتک دکن کے ہر گاؤں اور قریہ میں ملتا ہے۔ مذہبی تفرقہ کی زبردست تحریک بھی تنزل کی طرف رہبر تھی اس لامرکزیت کو روکنے والی قوتیں سب اپنی جگہ چھوڑ چکی تھیں اور زمانہ وسطی کے اثرات بہت بری طرح جاگزیں ہو گئے تھے۔ تہذیب وتمدن مٹ چکا تھا صرف جنگ وجدال فوجی کارنامے لوٹ مار اور اسکی گویا اس کے سر کی نوبت پہنچ چکی تھی کر ۱۲۹۴ء میں علاؤ الدین خلجی نے اپنی مخالف قوت کے تحت دکن پر حملہ کیا۔ گو اُس کی سلطنت دکن پر زیادہ دن قائم نہ رہ سکی بلکہ وہ ایک آنے والی قوت کا پیش خیمہ تھی اور گو ملک کافور دکن اور جنوب بعید میں مدھرا تک پہنچ گیا لیکن یہ ہراول تھے تغلق شاہی حملے کے۔

محمد تغلق نے سلطنت دکن کو اپنے قبضہ میں لاکر ایک حد تک ردعمل کا کام کیا مگر خود ہندوستان میں زمانہ وسطی اپنا رنگ پوری قوت سے دکھلا رہا تھا۔

امیر قرون وسطی میں پورے سوداؤں کا کام کر رہے تھے۔ محمد تغلق کی نااہلی نے اور واقعات کو پیچیدہ کر دیا۔ ابتک صرف ہندو لامرکزیت تھی لیکن اب اس میں مسلمان بھی شامل ہو گئے اور نہ صرف دکن بلکہ سارا ہند اس مرض میں مبتلا ہو گیا۔

ایسے وقت زبردست قوتوں کی ضرورت تھی جو نئے خیالات کو بارآور ہونے دیتیں اور اُن کے مضر اثرات کو بھی روکے رہتیں - ہندوستان میں بابر کی تخت نشینی اس کا کام کرتی ہے اور دکن میں اس کو علاؤالدین حسن گنگو پورا کرتا ہے۔ گو وہ خود ایک سورما ہے لیکن اس نے اپنا فرض ادا کیا۔ صرف دکن ہی حیثیت المجموع بغاوت نہیں کر رہا تھا بلکہ دکن میں ہر حصہ دوسرے حصہ سے باغی تھا اور ہر فرد دوسرے کا مخالف تھا۔

ایسی صورت میں ایک تحریک جو معاہدہ معاشری کے قریب ہوسکتی ہے دکھنی امراء میں پیدا ہوتی ہے گو یہ خود مرکزیت کے خلاف تھی لیکن یہی ایک دوسری مرکزیت کا باعث ہوتی ہے جس نے اپنے کام کو نہایت ہی عمدگی سے انجام دیا۔

امیر اسمعیل کی تخت نشینی برائے نام ایک مرکزی قوت قائم کر دیتی ہے اور جب بیرونی مقامات سے جان و مال کا خوف جاتا رہتا ہے اور کچھ وقت سوچ بچار کا ملتا ہے تو علاؤالدین گنگو کی شخصیت اپنی ضرورت کو محسوس کر کے اُس کو آگے لاتی ہے اور ۱۳۴۵ء میں تخت دکن پر جلوہ افروز کراتی ہے۔

خواہ علاؤالدین گنگو برہمن کا غلام ہو یا دراصل شاہان ایران کی نسل سے ہو وہ تخت نشین ہوتے ہی انہیں قوتوں کو جو مرکزیت کو توڑ رہی تھیں اپنے قابو میں لاتا ہے اور ردعمل شروع ہو جاتا ہے۔

وہی امراء جو بادشاہت دہلی کی مخالفت میں جگہ جگہ بغاوت اور لوٹ کھسوٹ مچائے ہوئے تھے اب ایک علم کے نیچے متحد ہو جاتے ہیں اور اُن کا مطمع نظر خود غرضی سے بلند ہو کر ایک اور اعلیٰ اور ارفع زینہ پر قائم ہوتا ہے۔ اسمٰعیل کی تکمرامی پر اس کا قتل اور امراء کی اطاعت پتہ دیتی ہے کہ کس قدر جلد وہ اپنی حکومت اور عزت قوم کی نظروں میں قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔

حسن کے بیٹے کی شادی میں ایک سال کا جشن بتلاتا ہے کہ اس ہنگامہ بے تمیزی اور خونریزی کے بعد آخر کار کامل اطمینان اور امن و امان قائم ہو گیا جس نے علاؤالدین حسن کو ایک سال تک جشن منانے کی فرصت دی یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ایک عیاش شخص تھا جو موقع پاتے ہی ملک کے کاروبار کو چھوڑ کر عیش و عشرت میں گزارنے لگا۔

علاؤالدین کو بہت کچھ کرنا تھا صرف بادشاہ بنجانا کافی نہ تھا اور نہ دکن کو ایسے وقتیہ

پادشاہ کی ضرورت تھی۔

ایک سلسلہ پادشاہوں کا درکار تھا جو زمانہ وسطیٰ کے اثرات کو روکے ہوئے ارتقائی منازل طے کراتا ہوا سیدھے راستے لے چلے۔ اس عظیم الشان کام سے وہ غافل نہ تھا چنانچہ اس کا جشن منانا اُس کی عیش پرستی نہ تھی بلکہ اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ایک گونہ اطمینان اس جلیل القدر اور مصروف شخص کو ستانے کے لئے مل گیا۔ ملک سیف الدین غوری کی بہن شاہ بیگم کو اپنی بہو بنا کر سال بھر تک خیر و خیرات انعام و اکرام میں بسر کی۔

فوج کثیر اور دولت بے انتہا دکن میں منتشر پڑی تھی علاؤالدین نے ملک کو اپنے امراء میں تقسیم کرکے سب کو ایک ملک میں باندھ دیا اور فیوڈل جاگیرت کے نظام کو جو لامرکزیت کا موید تھا مرکزیت میں شامل کرلیا۔ اس کی دو وجوہات ہوئیں ایک تو یہ کہ مسلمانان دکن کا تعلق اب بالکل ہندوستان سے ٹوٹ گیا اور انہوں نے اس کو اپنا ملک بنالیا یہاں استقامت حاصل کرنے کی ضرورت نے انہیں متحد کردیا چنانچہ بادشاہت کے قائم ہوتے ہی امراء نے بغیر کسی چون چرا کے اس کی اطاعت قبول کرلی دوسری وجہ یہ کہ بادشاہت انہیں کی مرضی سے قائم ہوئی تھی اور جو دہلی کے خوف کا سدّباب تھی۔ علاؤالدین نے مقبوضہ ملک کو امراء میں تقسیم کرکے جو جاگیری نظام حکومت کی ابتدا ڈالی اس سے ہندو رعایا جو پریشان حال تھی اس کو اطمینان حاصل ہوگیا۔ اور خود مختار چھوٹے چھوٹے جاگیردار آپس میں لڑنے جھگڑنے اور پُرامن مشغولیتوں کا لطف خراب کرنے والے باقی نہ رہے۔ یہ مسلمان جاگیردار ایک منتظم جماعت تھی جو خاص جوش و فروش اور خاص خیالات اور خصوصیات اپنے ساتھ رکھتی تھی۔

ان کی قسمت ان کے پادشاہ کی قسمت کے ساتھ وابستہ تھی اور پادشاہ کی قسمت امراء کی قسمت سے وابستہ۔ اس لئے وہ لامرکزیت کے مخالف تھے اور پادشاہ کی اطاعت اور وفاداری میں دن رات مستعد تھے۔

اسمٰعیل خاں کا بادشاہت کرکے تخت سے دست بردار ہونا اور پھر سپہ سالاری کے عہدے کو خوشی سے قبول کرکے امراء میں داخل رہنا اور مہمات سلطنت میں مدد دینا ان تعلقات کو واضح کرتا ہے جو پادشاہ اور امراء کو شیر و شکر کئے ہوئے تھے۔

ان امراء کی وجہ سے رعایا کا رشتہ بادشاہ سے راست بندھ گیا۔ نئے نظام کے تحت

بادشاہ سارے ملک کا مالک منبع فیض وعدل اور سپہ سالار تھا اُس کی سماجی حیثیت مثل ایک باپ کے تھی۔ امرار دراصل جاگیردار تھے جنہیں فوجیں فراہم کرنے کے لئے موضع بادشاہ کی جانب تفویض کئے جاتے تھے اور بادشاہ کو ہر وقت ان کے واپس لینے کا اختیار تھا۔

نظریہ کی شکل میں یہ واقعات اس طرح ڈھالے جاسکتے ہیں کہ علاؤالدین کے ہمعصر امرا میں معاہدہ ہوا ہر ایک نے ایک وقت میں اپنے حقوق کو ایک شخص کے تفویض کردیا جو اس معاہدہ کا فریق نہ تھا۔ سارا ملک مقتدر اعلیٰ کا۔ کل حکومت اُس کی اگر وہ حفاظت کرے تو ہم اپنی جان ومال عزت آبرو ملک اور دولت اور حکومت سب اُس کے تفویض کرتے ہیں چنانچہ یہی ہوا ورنہ جو حق اسمٰعیل کو تھا وہی ملک سیف الدین غوری کو اور وہی علاؤالدین بہمنی کو۔ مگر امرا نے اسمٰعیل کو اپنا مقتدر اعلیٰ بنایا اُس نے اپنے میں قابلیت نہ دیکھی اور اقتدار کو علاؤالدین کے سپرد کیا دوسرے جو اپنے حقوق دے چکے تھے اب اطاعت اور فرمانبرداری میں کمربستہ ہوگئے چونکہ سارے ملک کے یہ مالک تھے لہذا یہی عام خلایق کے نمائندہ تھے رعایا کا خاموشی اور خوشی سے علاؤالدین کی حکومت کو قبول کرلینا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ امرا کے تصفیہ سے راضی تھی۔

اس کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ برہمن جو ہندوں کا سب سے زیادہ سربرآوردہ فرقہ ہے اس نے کبھی اس کے پیشتر اہل اسلام کی نوکری قبول نہیں کی اور ہمیشہ آزادانہ بسر کرتا رہا۔ لیکن علاؤالدین حسن بہمنی پہلا مسلمان بادشاہ ہے جس کے یہاں سیکڑوں برہمن نوکر ہوئے اُس کے خزانہ اور محاسبی پر برہمن متعین تھے اور حیرتناک واقعہ یہ ہے کہ آج تک بھی برہمن ہی محاسبی میں کثرت سے حکومت کی نوکری کرتے چلے آتے ہیں چنانچہ اس وقت بھی یہی لوگ کثرت سے خزانہ عامرہ اور صدر محاسبی میں پائے جاتے ہیں۔

اس سے جو نتایج نکلتے ہیں وہ یہ ہیں ایک تو یہ کہ علاؤالدین صرف مسلمانوں کا بادشاہ نہ تھا۔ اس کو دکھنیوں نے اپنا قومی بادشاہ تصور کیا جس میں دکھنی قوم بلا امتیاز مذہب و زبان کے اس کو قبول کرلیا دوسرے اُس کی بادشاہت ہندو مسلم اتحاد کا انتہائی نمونہ جس میں ہندو اور مسلمان دونوں اپنے قومی مفاد اور ملک کی بہبودی کے لئے ایک دوسرے کے حلیف ومددگار تھے۔ بادشاہ بادشاہ دکن تھا اور سب اُس کی رعایا۔

جب علاؤالدین کا تسلط دکن پر ہوگیا اور ملک دکن میں ایک آزاد سلطنت قائم

ہوگئی تو کولاس اور اس کے مضافات کی مہم کو ختم کرکے سلطان نے افواج کو اطراف و اکناف میں روانہ کیا تاکہ طوائف الملوکی کا خاتمہ کرکے سارے ملک اور ساری قوم کو ایک جھنڈے کے نیچے لے آئے چنانچہ رائے ورنگل اور دوسرے چھوٹے چھوٹے راجاؤں نے جو چلوکیا سلطنت کے ٹوٹنے کے باعث خود مختار ہوگئے تھے اور ہمیشہ آپس میں جنگ و جدل کرتے رہتے تھے حلقۂ اطاعت قبول کیا اور سارا دکن صرف ایک بادشاہ کی حکومت میں آگیا۔

مرکزی حکومت استوار ہوگئی ملک کے لئے قوانین۔ ضوابط مرتب کئے گئے اور مختلف صوبوں میں سارے دکن کو تقسیم کرکے مرکزی حکومت نے اپنے صوبہ دار مقرر کئے۔ جو خاندانی اور موروثی نہ تھے۔

اب ان واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور مذکورہ واقعات کے مطالعہ سے یہ آسانی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ زمانہ وسطیٰ کے مضر اثرات کو روک کر اُس کے رجحانات کی ترجمانی کے لئے۔ جس قسم کی مخالف قوت کی ضرورت تھی وہ علاؤالدین حسن کی شخصیت میں ظاہر ہوئی اُس نے انفرادی اصول کی اس حد تک مخالفت کی کہ جاگیری حکومت کو اُس کے بُرے اثرات ظاہر نہ کرنے دئے اور انہیں روک دیا اور قومی مرکزیت قائم کرکے سب کو اُس کا تابع فرمان بنادیا اور زمانہ کا ساتھ اس طرح دیا کہ عالمگیر شہنشاہیت کی مخالفت میں اس نے قومی حکومت قائم کی اور اُس کی بنیاد ڈالی گو یہ ابتدا تھی لیکن اس کی انتہا موجودہ سلطنت دکن ہے۔ علاؤالدین حسن کی شخصیت ناگزیر تھی اور اُس کی اہمیت تاریخ دکن میں بہت بڑی ہوئی ہے۔ دکھنی تہذیب تمدن مذہب زبان اپنا ایک خاص رنگ اور آن بان رکھتے ہیں ان کا بانی مبانی سلطان علاؤالدین ہی تھا اس نے جس کام کی ابتدا کی وہ دیرپا اور مستقل تھا۔ گو کچھ دنوں تک مخالف اثرات نے پھر شیرازہ کو پریشان کرنے کی کوشش کی لیکن دراصل موجودہ دکھنی قومیت اور اُس کی خصوصیات کی ابتدا اسی کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے دکن کی تاریخ کا تسلسل برابر آج تک قائم ہے چلوکیا سلطنت کا جانشین جائز علاؤالدین حسن تھا۔ اور اُس کی بعد سے تاریخ صاف ہے۔ زیادہ صراحت کی ضرورت نہیں آپس کی شادی بیاہ میل ملاپ اور قومیت نے بلحاظ مذہب دکنی قوم کی یگانگت کو آجتک قائم رکھا ہے بہت سے ہندوانی رسومات اور اسلامی طریقے مل جل کر ایک نئی چیز بنگئے ہیں اور اسی کا نام دکھنیت ہے۔

بہمنی خاندان کا نمود اپنے زمانہ میں لازمی تھا اور عالمگیر واقعات کے تحت مسلمہ اصولوں کی پابندی میں اس کا ظہور ہوا وہ بطور نتیجہ پیدا ہوا اور وہ علت ہے موجودہ زمانہ کی۔ ہماری حکومت قومی اور ملکی حکومت ہے جس کو قوم نے اپنی خوشی سے قبول کیا اور یہی وجہ ہماری تاریخ کے تسلسل اور ہماری تدریجی ترقی کی ہے۔ ہماری تاریخ ارتقائی مدارج طے کرتی ہوئی یہاں تک آئی ہے۔ اس میں انقلابی صورت نہیں ہے اس کے ہر واقع میں علت و معلول کا تعلق ہے۔ اور اس کا بحیثیت مجموعی تاریخ عالم سے تعلق ایسا ہی ہے جیسے جزو کا کل سے۔

افسوس ہے کہ بعض ناگزیر واقعات کی وجہ سے مجھے اس کا موقع نہ ملا کہ کافی طور پر میں اس اہم تاریخی دور پر تبصرہ کرسکتا تاہم جو کچھ ہو سکا وہ ایک سرسری انداز کیلئے کافی ہے۔ انشاءاللہ کسی اور وقت بہمنی سلطنت کے احسانات پر کچھ ہدیہ ناظرین کیا جا سکیگا اور اس میں سلطان کی حکومت کے ایام کے تفصیلی حالات درج کرکے خاص اس کی حکومت پر نظر ڈالی جائے گی۔

غزل

(از جناب عشق رامپوری)

یہی شرط وفا ہے کیا یہی رسم محبت ہے
میں دم دیتا ہوں تم پر اور تمہیں غیروں کی چاہت ہے

نہ مجھ سے پوچھتے ہیں وہ نہ کچھ کہنے کی حاجت ہے
مری صورت ہی اسکی ترجماں جو دل کی حالت ہے

وفا کہتے ہیں کس کو مرنے والے کیسے ہوتے ہیں
یہ منظر بھی دکھا دینگے جو اپنا دم سلامت ہے

بھلا میں اور شکوہ آپ کی بے التفاتی کا
جفا بھی ہو تو گویا آپ کی مجھ پر عنایت ہے

کرو تم شوق سے پامال لیکن سوچ لو اتنا
یہ وہ دل ہے کہ جس دل میں تمہارا راز الفت ہے

غضب ہے وہ مرے پہلو سے اٹھ کر گھر کو جاتے ہیں
قیامت آئیگی اکدن لیا تو اب قیامت ہے

مرا دل چھینتے ہیں اور یہ بھی کہتے جاتے ہیں
کسی سے پوچھنے کی اسمیں کیا ہمکو ضرورت ہے

رسائی گوش جاناں تک کہاں اب تک نہیں آئی
ہماری آہ بھی کمبخت اتنی پست ہمت ہے

کسی پر دین و مذہب عشق کا ظاہر نہیں ہوتا
نہ داخل ہے طریقت میں نہ پابند شریعت ہے

مجلس مکتبہ

نواب مسعود جنگ بہادر نائب امیر جامعہ اسلامیہ علیگڈھ

بھوت

از

(جناب ایم - اسلم صاحب)

میں اکثر لوگوں کی طرح نہ تو توہم پرست ہوں اور نہ ہی طبیعت کا اسقدر کمزور واقع ہوا ہوں کہ جہاں کہیں بھوت یا آسیب کی بات سنی وہیں خوف زدہ ہوگئے۔ اگر سچ پوچھو تو میں ایک حد تک بھوت کے وجود کا قائل بھی ہوں۔

فی زمانہ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے "جو حیات بعد الممات" کے نظریہ کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن اپنی آنکھوں سے کسی مدتوں سے بچھڑے ہوئے عزیز کو دیکھ کر بھی یہ کہنے کی کہ "ہاں ہم نے دیکھا ہے" جرات نہیں کرتے اور پھر دوسروں کو یقین دلانے کی کوشش بھی نہیں کرتے کہ جو کچھ مشاہدہ میں آیا ہے وہ وہم کی پیداکردہ چیز نہیں بلکہ ایک حقیقت امر ہے۔ یہ ایک قسم کی اخلاقی کمزوری ہے۔ اور غالباً اس کی وجہ یہ قرار دیجا سکتی ہے کہ دیکھنے والا خود شش و پنج میں ہوتا ہے اور حتمی طور پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُس کی آنکھوں نے اُسے دھوکا نہیں دیا۔

اس قسم کے واقعات عموماً ایسے مقامات میں ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ جہاں مرنے والے نے ایک طویل زمانہ تک قیام کیا ہو۔ اور جہاں ایسی متعدد چیزیں موجود ہوں جو اس کی یاد کو تازہ کرتی رہیں۔ یا بالفاظ دیگر مرنے والا اپنے گھر میں اپنا ایک دائمی نقش چھوڑ جاتا ہے اور اُس کی ہر چیز دیکھ کر اُس کی موجودگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ کسی چیز کی یاد اُس کی محبت سے زندہ رہتی ہے اور محبت کی مقدار کے مطابق دل متاثر ہوتا رہتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ اگر مرنے والے کی محبت اور یاد دل میں مستور ہے تو اُس کی دید سے آنکھیں کیوں محروم ہیں تو اُس کا جواب صرف اس قدر دیا جا سکتا ہے کہ یہ صرف اپنی آنکھوں کا قصور ہے۔ "وہ" جس کی محبت آپ کو بے قرار رکھتی ہے مختلف حالتوں کے ماتحت اکثر آپ کے پاس موجود ہوتا ہے۔ اگر آپ اس کو دیکھتے نہیں تو سمجھ لیں کہ ابھی آپ کو اور زیادہ انہماک اور جستجو کی ضرورت ہے۔

بعض لوگ اس بات پر فخر کیا کرتے ہیں کہ ان کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ لیکن اگر یہ حضرات ٹھنڈے دل سے غور کریں تو یہ "ہجوم دوستاں" کچھ زیادہ لطف کی چیز نہیں۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے تو میں اتنا عرض کروں گا کہ اس وسیع دنیا میں میں نے حتہ الوسع بہت کم دوست پیدا کئے ہیں۔ میری طبیعت کی افتاد ہی کچھ ایسی ہوئی ہے کہ میرے ملنے جلنے والے بہت جلد مجھ سے اکتا جاتے ہیں اور یہ اُسی کی طفیل ہے کہ آپ مجھے اکثر تنہا ہی پائینگے۔ صبح و شام دریا کی سیر میرا روزآنہ معمول ہو لیکن تین سو پینسٹھ دن میں سے تین سو چونسٹھ دن آپ مجھ کو تنہا ہی لب جو ٹہلتے دیکھینگے۔ یہ اور بات ہے کہ بارود کی زبان سے آتشیں باتیں کرنے والی بندوق گاہے گاہے آپ میرے کندھے پر دیکھ لیں۔

میں قدرتاً خاموشی اور تنہائی پسند ہوں۔ اور اکثر "بقائے دوام" کے مسئلہ پر غور و فکر کیا کرتا ہوں۔ میں اس دنیا اور اُس کے دھندوں کو ایک نقلی کھیل سمجھتا ہوں اور بسا اوقات نقالوں کی انگشت نمائی کو نظر انداز کرتے ہوئے ایسے کھیل تماشوں میں بھی شریک ہو جاتا ہوں جنہیں اکثر لوگ کچھ پسندیدہ نہیں سمجھتے۔

میرے ملنے جلنے والوں میں ایک ڈاکٹر بھی ہیں۔ اور جہاں تک میں خیال کرتا ہوں مجھے ممنون کرنے کے لئے وہ اس تمنا میں رہتے ہیں کہ میں بیمار ہو جاؤں اور وہ میرا علاج کریں۔ حالانکہ ان کو یہ خوب معلوم ہے کہ میں علاج اور پرہیز کا چنداں قائل نہیں۔ انسان دنیا میں اس لئے نہیں آیا کہ اپنی مختصر سی زندگی پر قیود عائد کرتا رہے۔ خصوصیت سے کہانے پینے والی چیزوں کے معاملہ ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو بھی بھوتوں کے قصے افسانے پڑھنے یا ایسے مقامات کی سیر کا بہت شوق ہے جہاں اس قسم کے واقعات ظہور پذیر ہونے کی افواہ ہوا کرتی ہے۔ ایک روز میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے۔

میں نے اپنی کرسی سے کسی قدر اُٹھتے ہوئے اُن سے ہاتھ ملایا۔ وہ ایک آرام کرسی کھینچ کر میرے پاس ہی بیٹھ گئے اور بولے۔

"کہو کس فکر میں ہو؟"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"میں اس وقت اس فکر میں تھا کہ دیکھیں حشر کے روز کے لوگ آپ پر غلط علاج کرنیکا دعوے کرتے ہیں"

"او ہو تم میری فکر میں تھے۔ لیکن تمہارا رنگ کیوں زرد ہو رہا ہے"!

"اس خوف سے کہ آپ آتے ہی کوئی پرہیز بتلا دینگے" لیکن آپ اتنے روز کہاں رہے"!

ڈاکٹر بولا

"میں پہاڑ پر گیا تھا"

"تو پہاڑ کی خوب سیر کی۔ کہاں ٹھہرے تھے؟"

"ارادہ تو یہ تھا کہ ایک عزیز کے ہاں جو مدت سے وہیں کاروبار کرتے ہیں قیام کرونگا۔ لیکن وہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ اُن کے بچے بیمار ہیں۔ اور ایک دو مہمان بھی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اس لئے مجھے اور جگہ تلاش کرنی پڑی۔ ایک ڈاکٹر کا مکان کرایہ پر مل گیا"

"اچھا ہوا" میں نے کہا "کہ ڈاکٹر کو ڈاکٹر کا ہی مکان ملا۔ ہم پیشہ آدمی کی صحبت میں تو خوب بسر ہوئی ہو گی؟"

"نہیں" ڈاکٹر بولا "مکان خالی تھا۔ دس برس سے کسی کو یہ معلوم نہیں کہ ڈاکٹر کہاں چلا گیا ہے۔ زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ ایک چوکیدار ہے جو مکان کی رکھوالی کرتا ہے اور ایک مختار ہے جو کرایہ وصول کر کے ڈاکٹر کے ایک عزیز کو جو کسی شہر میں رہتا ہے بھیج دیتا ہے"

"یہ تو خاصی مسٹری ہسٹری" میں نے ہنسکر کہا "شاید اس مکان میں بھوت رہتے ہوں گے۔ اور ڈاکٹر اُن کے خوف سے بھاگ گیا ہو گا"

"سنو تو سہی" ڈاکٹر میرے زانوں پر ہاتھ مار کر بولا "ایک عجیب واقعہ سناتا ہوں"

"فرمائیے میں ہمہ تن گوش ہوں"

"تو ہاں میں یہ کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر دس سال سے گم ہے۔ اس کی پریکٹس کچھ زیادہ نہ تھی کچھ مدت سے اُس نے کاروبار بالکل بند کر دیا۔ اور ساتھ ہی لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر کے گوشہ نشیں ہو گیا۔ اس تمام عرصہ میں وہ ایک خاص موضوع پر ایک کتاب تصنیف کرتا رہا۔ جب کتاب تیار ہو کر شائع ہوئی تو اس کے ہم پیشہ ڈاکٹروں نے اس کے متعلق یہ فتویٰ صادر کر دیا کہ وہ دیوانہ ہو گیا ہے۔ یہ کتاب نہ تو میں نے دیکھی ہے اور نہ ہی اسوقت مجھے اس کا نام یاد ہے۔ لیکن جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے یہ کتاب اس موضوع پر تھی کہ

انسان موت کا صحیح وقت بہت پہلے بتلا سکتا ہے۔۔۔۔ اگر غور کیا جائے تو یہ نظریہ ایک دیوانے آدمی کی دماغی کاوش کا نتیجہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔"

"معلوم ہوتا ہے" میں نے مسکرا کر کہا "آپ کی عقل بھی گھاس چرنے گئی ہے۔ اس سے بڑھ کر اس کے دیوانہ پن کی اور دلیل کیا ہو سکتی ہے؟"

"ارے یار بات تو پہلے سن لو۔ پھر رائے بھی دیجیو" ڈاکٹر نے کہا" مجھے اکثر لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ ڈاکٹر نے کئی لوگوں کی موت کے متعلق پیشنگوئی کی اور وہ حرف بحرف پوری اتری۔ لیکن جو کچھ میں تم کو سنانا چاہتا ہوں وہ اس سے بھی عجیب تر ہے۔"

"آپ نے کتاب تو تلاش کی ہوتی" میں نے کہا۔

"تلاش کیا خاک کرتا" ڈاکٹر نے کہا" کتاب کا نام تو معلوم نہیں ہو سکا۔ تو ہاں جب میں نے یہ مکان کرایہ پر لیا تو تمام سامان عین اسی حالت میں پڑا تھا جیسے مالک چھوڑ گیا تھا۔ لیکن یہاں کی فضا بہت اداس معلوم ہوتی تھی یا یوں سمجھو کہ تمام گھر میں وحشت برستی تھی۔ اور میں اس کے اثر سے بہت دنوں تک محفوظ نہ رہ سکا۔ چند روز کے قیام کے بعد میری طبیعت میں بھی کچھ الجھن سی پیدا ہونے لگی۔

گو یہاں ملنے جلنے والوں کی کچھ کمی نہ تھی۔ تاہم میرا اکثر وقت مطالعہ کرتے یا بربط بجاتے گزر جاتا۔ ڈاکٹر کے مطالعہ کا کمرہ جہاں بہت سی نادر اور دلچسپ کتابیں رکھی تھیں۔ غالباً اس مکان میں بہترین جگہ تھی۔ سامنے کی جانب کوہسار کا دلفریب نظارہ تھا۔ دور فاصلہ پر برفانی چوٹیاں جن پر شعاع آفتابی مختلف وقتوں میں مختلف رنگ پیدا کرتی رہتی تھی بہت خوشنما نظر آتی تھیں۔

لیکن اس کمرے میں آتے ہی کچھ خوف سا دامنگیر ہونے لگتا تھا۔ اور مطالعہ میں دل نہ جمتا تھا۔

اس کمرے کی جنوبی دیوار پر ڈاکٹر کی قد آدم تصویر آویزاں تھی اور مصوری کا ایک نادر نمونہ پیش کرتی تھی۔ تصویر دیکھنے سے ڈاکٹر کی عمر پچاس کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ اور شکل و صورت سے خوش وضع اور خوش قطع آدمی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن طرفہ تر بات یہ تھی کہ جس روز سے میں نے یہ تصویر دیکھی تھی اس کا تصور یا خیال ہر وقت میرے دل میں یا آنکھوں کے سامنے موجود رہتا تھا۔

ایک روز میں کھانے سے فارغ ہو کر کھانے والے کمرے کا دروازہ بند کر کے اسی کمرے میں سے جہاں تصویر آویزاں تھی گزرتا ہوا اپنے کمرے میں جا رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں روشنی کے لئے ایک بتی تھی۔ اچانک میری نگاہ ڈاکٹر کی تصویر پڑی۔ بتی کی دھندلی سی روشنی میں آج مجھے اس تصویر میں زندگی کی ایک خفیف سی لہر نظر آ رہی تھی۔ میں بتی اوپر اٹھا کر غور سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر مختلف سمتوں سے اُس پر روشنی ڈالی۔ اس وقت جو کیفیت میں اس تصویر میں محسوس کر رہا تھا۔ آج سے پہلے مجھے اس کا تجربہ نہ ہوا تھا۔

میں نے تصویر دیکھتے دیکھتے ایک بار پیچھے پلٹ کر جو دیکھا تو اس وقت ایک شخص اسی کمرے کی جانب سے جسے میں بند کر کے آیا تھا لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا میرے کمرے کی طرف والے دروازے کی جانب جا رہا تھا۔

لطف یہ تھا کہ اس کے چلنے کی آہٹ بھی سنائی نہیں دیتی تھی جس وقت وہ میرے نزدیک پہنچا تو میں نے اُسے پہچان لیا۔ یہ وہی مالک مکان ڈاکٹر تھا جس کی تصویر میں ابھی ابھی دیکھ رہا تھا۔

اسے دیکھتے ہی خود بخود معذرت کے طور پر یہ الفاظ میری زبان سے نکلے۔

"معاف فرمائیے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ واپس تشریف لے آئے ہیں۔"

لیکن ڈاکٹر نے جواب میں صرف ایک انگلی منہ پر رکھ لی۔ گویا مجھے خاموش رہنے کا اشارہ تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے وہ میرے سونے والے کمرے کی جانب چلا گیا۔ لیکن جب میں وہاں پہنچا تو وہ وہاں بھی موجود نہ تھا۔

میں رات بھر اس واقعہ پر غور کرتا رہا۔ اور اسی فکر میں آنکھ لگ گئی۔ اگلے روز صبح صبح مجھے گھر سے طلبی کا تار آیا۔ اور میں یہ عقدہ حل کئے بغیر وہاں سے چلدیا۔ . . . . . .

. . . ممکن ہے کہ تم اسے میرا وہم کہو۔ یا یہ کہو کہ میں نے بھوت دیکھا ہوگا۔"

"وہم نہیں تو اور کیا ہے . . . . چلو بھوت ہی سہی۔" میں نے ڈاکٹر کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "لیکن کیا آپ یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ وہ ڈاکٹر ہی تھا؟"

"بلاشک وشبہ۔ تم تو اسے شاید کوئی افسانہ سمجھتے ہوگے۔ خدا کی قسم ڈاکٹر زندہ سلامت موجود ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے اُسے چوک میں آج پھر دیکھا ہے" ڈاکٹر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"اور آپ نے اُسے پہچان لیا۔ کچھ بات بھی ہوئی؟"
ڈاکٹر بولا
"میرے دیکھتے دیکھتے وہ لوگوں کے ہجوم میں غائب ہو گیا۔ لیکن جب میں چوک کے سرے پر کھڑا ایک اخبار دیکھ رہا تھا تو وہ اچانک میرے پاس سے گذرا اور مجھے دیکھ کر رُک کر بولا۔
"ڈاکٹر چھوڑ و اخبار کو۔ جاؤ بربط بجاؤ اور فرشتوں کو گیت سناؤ۔"
میرے دیکھتے دیکھتے وہ پھر کہیں اِدھر اُدھر لوگوں میں مل جل کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔"
"تو شائد وہ زندہ ہی ہو" میں نے کہا
"کون جانے؟ لیکن اس کے الفاظ جب یاد آتے ہیں تو طبیعت کچھ پریشان ہونے لگتی ہے۔"
کچھ دیر تک ڈاکٹر میرے پاس بیٹھا رہا۔ لیکن اس کے چہرے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت پریشان ہے۔
اگلے روز صبح صبح اس کا خادم میرے پاس آیا بہت پریشان اور گھبرایا ہوا تھا بیچارہ بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔
میں نے پوچھا
"کیوں خیر باشد؟"
وہ رونی صورت بنا کر بولا۔
"ڈاکٹر صاحب اس دنیا سے چل بسے۔"
"کیا کہا۔ کب؟" میں نے انتہائی تعجب سے پوچھا۔ "ارے کل شام تو وہ میرے پاس سے بھلے چنگے گئے تھے۔"
خادم صرف اتنا کہہ کر "جنازہ دس بجے تک اُٹھے گا" چلا گیا۔
میں جلدی سے تیار ہو کر ڈاکٹر کے مکان پر پہنچا۔ مجھ سے پہلے اس کے کئی دوست وہاں پہنچ چکے تھے۔ جب ہم اُس کے کمرے میں گئے تو وہ ایک گہری نیند میں سوتا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بربط اور دوسرے میں گز تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بربط بجاتے بجاتے سو گیا ہے۔

اقبالؔ

(اپنی رُباعیات کی روشنی میں)

(از جناب عزیز احمد صاحب)

عجم از نغمہ ام آتش بجان است صدائے من دِرائے کارواں است
حُدی را تیز تر خوانم چو عرفیؔ کہ رہ خوابیدہ و محمل گراں است
(اقبالؔ)

(۱)

جب مشرق کا کوئی شاعر تمام اصنافِ سخن کو اپنی شوخیٔ تحریر کا فریادی بنا چکتا ہے، اور اُس کی مسلّمہ قابلیت، شاعری کی ہر صنف کو اپنے جواہر ریزوں سے مالا مال کر دیتی ہے، تو وہ رُباعی کی طرف توجہ کرتا ہے۔

رُباعی کیا ہے؟ ــــــ صرف چار مصرعے۔ مگر وہ چار مصرعے جن میں مطالب و معانی کے دریا بند ہوتے ہیں۔

چار قطروں میں علم و معانی کے دریا بھرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ اور اگرچہ رُباعیات لکھنے والے شعرا، حشرات الارض کی طرح موجود ہیں، مگر خیامؔ اور سرمدؔ شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔ عجم کے تقریباً تمام بلند پایہ شعرا نے رُباعی کی طرف توجہ کی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم کو فارسی رُباعیاں معرفت اور فلسفے کے دریا نظر آتی ہیں۔

(۲)

ناظرینِ کرام خیامؔ اور سرمدؔ کے صہبائے سخن سے مست ہوں گے۔ مگر آج میں آپ کے سامنے ہندوستان کے سحر طراز شاعر علامۂ اقبالؔ کی فارسی رباعیاں پیش کرتا ہوں ــــــ معرفت کے لبالب ساغر، جو اہلِ وطن کی بے توجہی سے محفلوں میں نہیں آئے۔

اقبالؔ کی ذات پر ہندوستان جس قدر فخر کرے کم ہے۔ آپ اقبالؔ کو اسلام کے نشاۃ ثانیہ کے شاعر کی حیثیت میں، ہندوستانی شاعر کی حیثیت میں، شاعرِ مشرق کی حیثیت میں، فلاسفر کی حیثیت میں اور صوفی کی حیثیت میں دیکھ چکے ہونگے۔ آج میں اقبالؔ کی شاعری کا ایک اور رُخ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں

اقبال کی رباعیات ان کے زندۂ جاوید شاہکار "پیام مشرق" کے آغاز میں "لالۂ طور" کے عنوان سے شائع کی گئی ہیں۔ ملک میں اور ملک کے باہر پیام مشرق کی بہت قدر ہوئی۔ اور اس قدر میں "لالۂ طور" کا بھی بہت بڑا حصہ تھا۔ مگر غالباً بہت کم حضرات نے "لالۂ طور" کو خالص رباعی کی روشنی میں دیکھنے کی زحمت گوارا فرمائی ہوگی۔

قصہ مختصر یہ کہ میں اقبال کو صرف ان کی رباعیوں کی روشنی میں دکھانا چاہتا ہوں۔ کہ جس سے مجملاً اندازہ کیا جاسکے کہ مادر ہند کے اس مایۂ ناز سپوت کو صنف سخن میں کس قدر کمال حاصل ہے۔

(۳)

اقبال کی تمام تر رباعیاں برق طور کی تجلی پاشیوں سے منور نظر آتی ہیں۔ یہانتک کہ ان کی ہر ہر رباعی میں خواہ اُس کا حاصل کچھ ہی کیوں نہ ہو معرفت کی جھلک ضرور نظر آتی ہے۔ توحید و معرفت میں شعرائے عجم نے بادۂ تخیلات کو بالکل خالی کر دیا تھا۔ اور کسی شاعر کے لئے نئے خیالات پیدا کرنا، تقریباً ناممکن تھا۔ مگر اقبال کی طبع رسا، وہ پھول توڑتی ہے، جن تک عجمی شعرا کے خیالات تک بھی نہ پہنچ سکے۔ مثلاً اقبال لکھتے ہیں:۔

بہ یزداں روز محشر برہمن گفت — فروغ زندگی تاب شرر بود
ولیکن گر نہ رنجی با تو گویم — صنم از آدمی پائندہ تر بود

یہی نہیں بلکہ وہ ہر خیال کو اس جدت طراز اور دلکش اسلوب سے ظاہر کرتے ہیں، کہ دل پر خاص اثر ہوتا ہے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو کسی رباعی گو شاعر میں یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اقبال کو مغربی ادب، مغربی خیالات، مغربی اسالیب بیان، اور مغربی فلسفے پر عبور حاصل ہے اور یہ خصوصیت متقدمین تو کیا ان کے ہمعصروں میں بھی بہت کم پائی جاتی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

شنیدم در عدم پروانہ می گفت — دمے از زندگی تاب و تبم بخش
پریشان کن سحر خاکسترم را — ولیکن سوز و ساز یک شبم بخش

(۴)

عمر خیام لکھتے ہیں:۔

مقصود ز جملہ آفرینش مائیم — در چشم خرد جوہر بینش مائیم
ایں دائرۂ جہاں چو انگشتری است — بے ہیچ شکے نقش نگینش مائیم

لیکن اقبال کا توسنِ خیال کہیں آگے نکل گیا ہے:۔

نوائے عشق را ساز است آدم کشاید راز و خود راز است آدم
جہاں اُو آفرید ایں خوب تر ساخت مگر با ایزد انباز است آدم

عمرِ خیام لکھتے ہیں:۔

کس را پسِ پردۂ خدا راہ نشد وز سِرِ خدا ہیچ کس آگاہ نشد
ہر کس زِ قیاسِ خویش چیزے گوید معلوم نہ گشت و قصّہ کوتاہ نشد

لیکن اقبال اسکے قائل نہیں۔ اُن کے نزدیک:۔

نہ ہر کس از محبّت مایہ دار است نہ با ہر کس محبّت سازگار است
بروید لالہ با داغِ جگر تاب دلِ لعلِ بدخشاں ورشرار است

اور اگر خیام کا فلسفہ قابلِ قبول سمجھا جائے، تب بھی اقبال نا اُمید نہیں ہوئے:۔

دریں گلشن پریشاں مثلِ بُویم نمی دانم چہ می خواہم چہ جُویم
بر آید آرزو یا بر نہ آید شہیدِ سوز و سازِ آرزویم

اور اس طرح وہ کشاکشِ دوام میں فراغتِ دوام کی ظلم پالیتے ہیں اور اُن کا یہ خیال عمرِ خیام کے فلسفے سے کہیں زیادہ بلند پایہ نظر آتا ہے۔

عمرِ خیام بادۂ ناب کے شیدا ہیں، مگر اُن کے بادۂ ناب میں غالباً "برف کی امیزش" کی وجہ سے سوز و گداز زیادہ نمایاں نہیں نہ اُن کے گہرے فلسفے کی دُردآشامی بادہ کشوں کو مست کر دیتی ہے:۔

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما کے رندِ خراباتی و دیوانۂ ما
برخیز کہ پُر کنیم پیمانہ زِ مے زاں پیش کہ پُر کنند پیمانۂ ما

لیکن اقبال صرف جذباتِ صادقہ اور حرارتِ دلی کا دہکایا ہوا ایک جام پیش کرتے ہیں، جو سینوں کو گرما دیتا ہے اور دلوں کو تڑپا تا ہے:۔

شنیدم در عدم پروانہ می گفت دمے از زندگی تاب و تبم بخش
پریشاں کُن سحر خاکسترم را ولیکن سوز و سازِ یک شبم بخش

عُمرِ خیام کی شرابِ معرفت، مغرب اور مشرق سے یکساں خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے اور وہ حقیقتِ منتظر کا جلوہ لباسِ مجاز میں اس خوبی سے دکھاتے ہیں، کہ اُس کی حقیقت تک

پہنچنے کے لئے دیدۂ نگراں کی ضرورت ہے۔ اقبال کھلے میدان میں نئے معرفت کے ساغر لنڈھاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں، جو حق و باطل اور روح و مادے کی جنگ کا زمانہ ہے، حقیقت عریاں کو پیش کرنے کی سخت ضرورت ہے اور شاعرِ مشرق ہونے کی حیثیت سے یہ اُن کا فرض ہے کہ مشرق کی روحانیت کو مغرب کے مقابلے میں پیش کریں۔

عمر خیام لکھتے ہیں :-

خشتِ سرِ خُم ز ملکتِ جم بہتر ۔۔۔ بوئے قدح از غذائے مریم بہتر
آہِ سحرے ز سینۂ خمارے ۔۔۔ از نالۂ بوسعید و ادہم بہتر

مگر اقبال لکھتے ہیں :-

نفس آشفتہ موجے از یم اوست ۔۔۔ نالۂ ما، نغمۂ ما، از دم اوست
لبِ جوئے ابد چوں سبزہ رستم ۔۔۔ رگِ ما، ریشۂ ما، از نم اوست

لیکن وہ خیام کے عیش و نشاط کے مخالف ہیں :-

سخن درد و غم آرد، در دو غم بہ ۔۔۔ مرا ایں نالہائے دمبدم بہ
سکندر راز عیشِ من خبر نیست ۔۔۔ نوائے دلکشے از ملکِ جم بہ

آج مغرب فٹز جیرالڈ کی نقاب کشائیوں کے طفیل خیام کے جام و سبو سے مخمور ہے، اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یورپ کی مادہ پرست سرشت عمر خیام کے ضمر کو جذب کر سکی؛ ورنہ میری نظر میں اقبال کی رُباعیوں کا درجہ بھی کم نہیں۔

(۵)

سر رابندر ناتھ ٹیگور جن کا زمزمۂ توحید، مشرق اور مغرب سے خراجِ تحسین وصول کر رہا ہے، "گیتان جلی" کو ان حقیقت پاش الفاظ سے شروع کرتے ہیں :-

"تیری مرضی نے میری تخلیق میں لا انتہائی مُضمر رکھی ہے۔ اس کوزۂ خاکی کو تو ہمیشہ خالی کرتا اور پھر حیاتِ نو سے لبریز کرتا رہتا ہے۔"

لیکن اقبال کہیں زیادہ بلند پروازی سے لکھتے ہیں :-

بہ عالم رائے او جام جم کرد ۔۔۔ درون قطرہ ام پوشیدہ یم کرد
خرد، اندر سرم بتخانہ ریخت ۔۔۔ خلیل عشق دیرم را حرم کرد

اب ناظرین ہی انصاف فرمائیں کہ کس کا خیال عرش سے آگے نکل گیا۔

ٹیگور ایک جگہ فرماتے ہیں :-

"جب تو مجھے نغمہ سنجی کا حکم دیتا ہے تو میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا دل بار فخر سے ٹکڑے ہو جائیگا۔

میں تیرے رُخِ زیبا کی طرف دیکھتا ہوں۔ اور میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔

فرحتِ نغمہ سنجی سے مخمور ہو کر میں تجھکو اپنا محبوب کہہ اٹھتا ہوں، حالانکہ تو میرا آقا ہے"

اب ذرا اقبال کا تخیل ملاحظہ کیجئے :-

چو ذوقِ نغمہ ام در جلوت آرد　　قیامت انگنم در محفلِ خویش

چو می خواہی، دمے خلوت بگیرم　　جہاں را گم کنم اندر دلِ خویش

ٹیگور فرماتے ہیں :-

" اے مجنون تو خود کو اپنے ہی شانوں پر لے جانا چاہتا ہے۔ اے بھکاری تو اپنے ہی دروازے پر بھیک مانگنے آیا ہے۔

یہ تمام بارِ گراں رہنے دے اُس کے لئے، جس میں اِس کے اُٹھانے کی سکت ہے۔ اور غفلت سے پیچھے مڑ کر مت دیکھ"

علامہ اقبال فرماتے ہیں :-

کنشت و مسجد و بتخانہ و دیر　　جز ایں مشتِ گلے پیدا نہ کردی

ز حکمِ غیر نتواں جز بدل زیست　　تو اے غافل دلے پیدا نہ کردی

(۹)

گدائے جلوہ رفتی بر سرِ طور　　کہ جان تو ز خود نامحرمے ہست

قدم در جستجوئے آدمے زن　　خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

ٹیگور فرماتے ہیں :-

" تو خاموش ہے، تو میں بھی اپنے دل کو خاموشی اور ضبط سے عزیز کر لونگا۔ میں خاموش رہوں گا، اور اختر بہ گریباں شب کی طرح سر جھکا کر تیرا انتظار کرونگا"

مگر اقبال کی آتشیں طبیعت اِس افسردگی کی متقاضی نہیں :-

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی　　حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

ز من با شاعرِ رنگیں بیاں گوئے　　چہ سود از سوز اگر چوں لالہ سوزی

نہ خود را می گدازی ز آتشِ خویش　　نہ شامِ دردمندے بر فروزی

ممکن ہے کہ بعض "ٹیگور پسند" حضرات کو میری رائے سے اتفاق نہ ہو مگر میں نے خالص حقیقت آپ کے سامنے پیش کردی ہے۔

(۶)

جب شاعری حقیقی جذبات، اور دلی کیفیات کا عکس بن جاتی ہے تو اس کو الہام کہا جا سکتا ہے۔ شاعر کا دل، جس کی حقیقت کو ٹیگور نے بڑی شد و مد سے واکیا ہے، اپنے اندر بہت سے محشر برپا رکھتا ہے۔ اب دیکھئے علامۂ اقبال کی نظروں میں دلِ سوزاں کی کیا حیثیت ہے۔

جہاں مشتِ گِل و دل حاصلِ اوست ہمیں یک قطرۂ خون مشکلِ اوست
نگاہِ ما دو بیں افتاد ورنہ جہانِ ہر کسے اندر دلِ اوست

تنے پیدا کُن از مشتِ غبارے تنے محکم تر از سنگیں حصارے
درونِ او دلے درد آشنائے چو جُوئے در کنارِ کوہسارے

بہ کوشش، وہ سپاری آدل آدل! مرا تنہا گزاری آدل، اے دل
دما دم آرزوہا آفرینی مگر کارے نداری آدل، اے دل

چہ می پرسی میانِ سینہ دل چیست خرد چوں سوز پیدا کرد دل شد
دل از ذوقِ تپش دل بود لیکن چو یک دم از تپش افتاد گِل شد

دلِ من! اے دلِ من! اے دلِ من!!! یمِ من، کشتیٔ من ساحلِ من!
چو شبنم بر سرِ خاکم چکیدی و یا چوں غنچہ رستی از گِلِ من

(۷)

اگرچہ کہ اقبال کی رباعیات کا بیشتر حصہ معرفت، اور سوز گداز سے لبریز ہے مگر وہ اس صنف میں بھی وہ فرض نہیں بھولے ہیں جو نشاۃِ ثانیہ کا شاعر ہونے کی حیثیت سے اُن پر عائد ہے۔ وہ صوفی بھی ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ فلاسفر بھی، لیڈر بھی۔ لکھتے ہیں:-

زجانِ بیقرار آتش کشادم دمے در سینۂ مشرق نہادم
گِلِ او شعلہ زاد از آتشِ من چو برق اندر نہادِ او فتادم

قبائے زندگانی چاک تا کے؟ چو موراں آشیاں در خاک تا کے
بہ پرواز آو شاہینی بیاموز تلاشِ دانہ در خاشاک تا کے؟

مسلماناں مرا حرفیست در دل
که روشن تر زجانِ جبرئیل است

نهانش دارم از آذر نہاداں
که ایں سرّے ز اسرارِ خلیل است

(۸)

اقبال کی کم و بیش ڈیڑھ سو رباعیاں ہیں، جن میں سے ہر ایک "دامانِ رنگ و بو" اور "مے" سے بھرا سبو ہے۔ طوالت اجازت نہیں دیتی کہ ان سچے موتیوں کو رولوں۔ مگر بے اختیار چند رباعیاں لکھ رہا ہوں، اب آپ خود اندازہ فرمائیے کہ اقبال کو اس صنف میں کیا مرتبہ حاصل ہے۔

(۱) سحر می گفت بلبل باغباں را
دریں گل جز نہالِ غم نگیرد

به پیری می رسد خارِ بیاباں
ولے گل چوں جواں گردد بمیرد

(۲) سحر در شاخسارِ بوستانے
چه خوش می گفت مرغِ نغمه خوانے

برآور ہر چه اندر سینه داری
سرودے، ناله، آہے، فغانے

(۳) اگر در مشتِ خاکِ تو نہادند
دلِ چند پاره اے خونابه بارے

ز ابرِ نوبہاراں گریه آموز
که از اشکِ تو روید لاله زارے

(۴) بگردوں فکرِ تو دارد رسائی
ولے از خویشتن ناآشنائی

یکے بر خود کشا چوں دانه چشمے
که از زیرِ زمیں نخلے برائی۔

(۵) دریں گلشن پریشاں مثلِ بویم
نمی دانم چه می خواہم چه جویم

برآید آرزو یا بر نیاید
شهیدِ سوز و سازِ آرزویم

(۶) خرد گفت، او بچشم اندر نه گنجد
نگاهِ شوق در امید و بیم است

نمیگردد کہن افسانۂ طور
که در ہر دل تمنائے کلیم است

(۷) ز رازِ معنیٔ قرآں چه پرسی
ضمیرِ ما بآیاتش دلیل است

خرد آتش فروزد، دل بسوزد
ہمیں تفسیرِ نمرود و خلیل است

(۸) ندانم باده ام یا ساغرم من
گہر در دامنیم یا گوہرم من

چناں بینم چو بر دل دیده بندم
که جانم دیگر است و دیگرم من

(۹) مرا مثلِ نسیم آواره کردند
دلم مانندِ گل صد پاره کردند

نگاہم را که پیدا ہم نه بینند
شهیدِ لذّتِ نظاره کردند۔

(۱۰) گریزد آخر زِ عقلِ ذو فنوں کرد — دلِ خود کام را از عشق خوں کرد
زِ اقبالِ فلک پیمانہ چرسی — حکیمِ نکتہ دانِ ما جنوں کرد

(۹)

در دیدۂ معنی نگراں حضرتِ اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

کیا صرف علامۂ اقبال کی رباعیات ہی حضرت گرامی کے اِس شعر کی تصدیق نہیں کرتیں۔

غزل

از

(جناب سید قادر حسین صاحب قادرؔ)

نکلو بھی گھر سے بیٹھے ہیں اُمیدوار لوگ — بے چین مضطرب ہمہ تن انتظار لوگ
آخر سبب بھی اسکا کوئی اُسکی وجہ بھی — کوچہ میں اُس کے پھرتے ہیں کیوں بیقرار لوگ
میں اور جرمِ عشق سے توبہ کروں غلط — کیا فیصلہ کرینگے مرا ملکے چار لوگ
تقدیر میں جو ہے وہ بھگتنا ضرور ہے — میری طرف سے لیتے ہیں کیوں دل پہ بار لوگ
اب تو خیال و خواب ہیں ہیں وضعداریاں — سنتے ہیں تھے جہاں میں کبھی وضعدار لوگ
تھم تھم کے اور ہوتا ہے جوشِ جنوں فزوں — رہ رہ کے چھیڑتے ہیں عبث مجھکو یار لوگ
لی ہی جو لیکے قرض تو پی ہی کسی کو کیا — پیچھے پڑے ہیں کیوں مرے کھا کر اُدھار لوگ
اس کی بھی کچھ خبر ہے تجھے او ستم شعار — اُمید ہی میں مر گئے اُمیدوار لوگ
دیکھو زبان دے کے بدلنا نہ تھا تمہیں — ہاتھوں سے اپنے ہوتے ہیں بے اعتبار لوگ
تم کو ہے مجھ سے کام مجھے تم سے کام ہے — مانو نہ تم جو تم کو اُبھاریں ہزار لوگ
قادر حسین ہے کہیں چھپ کے جائے دخترِ رز — کرتے ہیں شکوہ بھی آپس میں یار لوگ

امام سیوطی اور تاریخ

مترجمہ
(جناب مولوی فاضل حافظ نثار احمد صالحی)

سیوطی مشہور ہیں نام جلال الدین عبدالرحمن ابن ابی بکر ہے۔ سیوط مصر کا بڑا مردم خیز شہر ہے، یہ وہیں کے رہنے والے ہیں اسی لئے سیوطی کہلاتے جمیع علوم میں عالم متبحر ہو گزرے ان کو تمام عمر سوائے لکھنے پڑھنے کے گویا کوئی کام ہی نہ تھا مقبول عام وخاص کم از کم ان کی پانسو تصانیف موجود ہیں ۹۱۱ ہجری میں وفات پائی۔ الشماریخ فی التاریخ انہیں کا ایک رسالہ ہے جس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔ (از مترجم)

تاریخ کی ابتدا جب سے کہ حضرت آدم جنت سے اُتار دیئے گئے اور اُن کی ذریات منتشر ہوئی اسی وقت سے اولاد آدم نے تاریخ شروع کی حتیٰ کہ خداوند کریم نے حضرت نوح کو مبعوث فرمایا۔

طوفان نوح پھر بعثت حضرت نوح سے طوفان نوح تک تاریخ لیجاتی رہی حتیٰ کہ طوفان میں جملہ کائنات ارضی غرق ہو گئی۔ بعد کو حضرت نوح جب طوفان سے نجات پاکر مع ذریات واہل سفینہ زمین پر آباد ہو گئے تو آپ نے تمام روئے زمین کو تین حصوں میں تقسیم کرکے درمیانی حصہ سام کو دیا جس میں بیت المقدس نیل فرات دجلہ سیحون جیحون اور فیشون ہیں یہ حصہ وسط فیشون سے مشرق نیل تک اور وسط جنوب سے تا آخر شمال ہے۔
اور مغرب نیل اور اُس کے ماسوا سے تا آخر مشرق حام کے حصہ میں دیا۔
نیون اور اُس کے ماسوا سے تا آخر مغرب نیل یافث کا حصہ ہوا۔

آتش نمرود جب بنو اسماعیل کی تعداد بڑھی اور جب کے بعد وہ متفرق ہوئے تو

بنو اسحاق نار ابراہیم سے تا بعثت حضرت یوسف تاریخ لیتے رہے پھر یوسف سے حضرت موسےٰ تک اور موسےٰ سے ملک سلیمان تک اور سلیمان سے بعثت حضرت عیسےٰ ابن مریم تک پھر عیسےٰ سے سیدنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تک۔

تاریخ عرب بنو اسماعیل نے نار ابراہیم نیز بنا رکعبہ سے بھی (جبکہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے اُس کو بنایا تھا) تاریخ شروع کی تھی چنانچہ بنائے ابراہیمی سے تفرقۂ بنی اسماعیل تک یہی مبدء تاریخ تھا۔

عام الفیل بنو اسماعیل سے جو لوگ بچ رہے تھے یہ سعد و نہد جہینہ کے خروج سے کعب ابن لوی کی وفات تک تاریخ کا آغاز لیتے رہے۔ پھر کعب کی وفات سے سنہ فیل تک اور سنہ فیل سے حضرت عمر ابن الخطاب کے تعین تاریخ تک۔

حضرت عمر کا تعین مبدء ۱۶ھ یا ۱۷ھ ہجری میں ہوا ہے[1]

ابن جریر کی رائے - ابن جریر کہتا ہے کہ ایسی تشریح یہودی تاریخ کے متعلق مناسب ہو گی کیونکہ اہل اسلام نے سوائے ہجرت اور کہیں سے آغاز تاریخ نہیں رکھا ہے ہاں قریش دقبل اسلام سنہ فیل سے تاریخ لیتے رہے اور تمام عرب اپنی مشہور لڑائیوں کو مبدء تاریخ قرار دیتے تھے جیسے یوم جبلہ و کلاب اول و کلاب ثانی وغیرہ

رومی و ایرانی عیسائی زمانہ سکندر ذی القرنین سے تاریخ لیتے تھے اور ایرانی اپنے سلاطین کے زمانہ سے تاریخ لینے کے عادی تھے۔

مبدء تاریخ اگلے زمانہ میں حضرت آدم کے نزول جنت سے لیکر حضرت نوح کی بعثت تک انسان کے لئے کوئی مبدء تاریخ نہ تھا جہاں سے آغاز تاریخ ہوتا پھر طوفان نوح سے تاریخ ہو کر نار ابراہیم تک رہی نیز بنی اسماعیل کی جانب سے از بنا کعبہ تا وفات کعب ابن لوی تاریخ تھی پھر وفات کعب سے سنہ فیل تک حتیٰ کہ اہل اسلام نے ہجرت سے تاریخ آغاز کی[2]

تاریخ ہجری کا آغاز نبی صلعم نے ماہ ربیع الاول کے یوم قدوم مدینہ کو آغاز تاریخ کے لئے حکم دیا[3]۔

---

[1] علی ابن محمد و ابن جریر لیکن ابن جریر نے اس تفصیل میں ایسے اختصار سے کام لیا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ صلعم تک تاریخ رہی [2] ابن عساکر [3] ابن عساکر۔

شہاب نے کہا کہ جس روز نبی صلعم ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے یہی روز سبد تاریخ ہے[۱]
ابن عساکر کہتے ہیں کہ یہ بہت ٹھیک ہے اس سے بچاؤ ہو گیا کہ حضرت عمر تاریخ کے آمر ہیں۔

اس تاریخ کے بانی آنحضرت ہیں

امام سیوطی فرماتے ہیں کہ قول اول کی تائید میں میں نے ابن القماح کی تحریر اُن کے مجموعے میں دیکھی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابن الصلاح نے کہا کہ میں نے استاد ابو طاہر محمد ابن محمش الزیادی کی کتاب الشروط سے معلوم کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کو آغاز تاریخ کیلئے مقرر فرمایا۔ کیونکہ جب آپ نے نجران کے نصاری کو مراسلہ بھیجا ہے تو حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ وہ اس میں سنہ ہجری لکھ دیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہجرت کو مبدء قرار دینے والے خود رسول اللہ ہیں اور حضرت عمرؓ اس معاملہ میں حضور کے پیرو ہیں۔

تحقیق

۔اس موقع پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس حدیث سے تاریخ کا آغاز سنہ ہجری سے مفہوم ہوتا ہے اور پہلی حدیث سے یوم قدوم پر۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث اول میں جو یوم قدم المدینہ میں ظرف ہے وہ فعل اَمَرَ سے متعلق نہیں بلکہ تاریخ سے متعلق ہے اس صورت میں یہ مفہوم ہوگا کہ اُس دن سے تاریخ کا حکم دیا نہ کہ اس دن میں غور کرو یہ ایک عمدہ لطیفہ ہے۔

حضرت ابن عباس کا مقولہ ہے کہ آغاز تاریخ اسی سنہ سے ہے جس میں کہ نبی صلعم مدینہ تشریف لائے[۲]

حساب کی غلطی

سعد نے کہا کہ لوگوں نے حساب میں غلطی کی جو بعثت رسول اللہ صلعم یا وفات آنحضرت سے تاریخ کا شمار نہیں لیا بلکہ آپ کی مدینہ میں تشریف آوری کا سے شمار لیا ہے[۳]

لیکن مصعب نے اسی شئے کے تذکرہ کے علاوہ یہ بھی کہا ہے کہ قریش کا آغاز تاریخ ہاشم ابن مغیرہ کے وفات سے تھا یعنی اُنکا آخری مبدء تاریخ۔ بخاری نے اس حدیث کو اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے۔ لیکن اخطاء الناس (لوگوں نے غلطی کی) کا ذکر نہیں کیا ہے۔

کتابت میں کس نے پہلے تاریخ لکھی

کتابت میں تاریخ لکھنے والے پہلے شخص یعلے ابن امیہ امیرِ یمن ہیں جبکہ انہوں نے حضرت عمر کو ایک مراسلہ

---

[۱] جریج [۲] تاریخ صغیر [۳] محمد ابن حسان دمصعب۔

بھیجتے وقت لکھی تھی۔[علہ]

فاروق اعظم نے اس کو رواج دیا۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ مہاجرین کو جمع کرکے کہتے تھے کہ تاریخ کب سے لکھیں ؛ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ جس دن سے کہ نبی صلعم نے ہجرت فرمائی۔ ابو موسیٰ نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ آپ کے پاس سے غیر مورخ مراسلے وصول ہوتے ہیں تاریخ لکھا کیجئے چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس معاملہ میں مشورہ فرمایا۔ بعض نے کہا کہ بعثت نبی صلعم سے تاریخ رکھیئے بعض نے کہا کہ وفات سے۔

تاریخ ہجری کا اصلی سبب

حضرت عمرؓ نے کہا کہ نہیں بلکہ ہم ہجرت سے تاریخ رکھتے ہیں کیونکہ ہجرت ہی نے حق و باطل میں تفرق کی چنانچہ اسی ہجرت سے تاریخ بھی متعین کر دی الغرض تاریخ ہجری پر سب متفق بھی ہو گئے۔[علہ]

تاریخ کے اول کاتب کی نسبت ابن المسیب کا قول

ابن المسیب کہتے ہیں کہ تاریخ لکھنے والے پہلے شخص حضرت عمرؓ ہیں کہ بہ مشورۂ حضرت علیؓ انھوں نے اپنی خلافت کے ڈھائی سال بعد لکھی تھی یہ واقعہ سولھویں محرم کا تھا۔

محرم سے ابتداء

ایک مسلمان نے یمن سے آکر حضرت عمرؓ سے کہا کہ میں نے وہاں ایک چیز دیکھی ہے جس کو وہ لوگ تاریخ کہا کرتے ہیں اور فلاں اور فلاں مہینہ لکھا کرتے ہیں حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہ ہے تو ٹھیک (سب سے مخاطب ہوکر) تم تاریخ وضع کرو چنانچہ جب تاریخ کے لئے سب متفق ہو گئے تو آغاز حساب کے لئے مشورہ کیا بعض لوگوں نے ولادت رسول اللہ صلعم سے رائے دی اور بعض نے آنحضرت کی بعثت سے اور بعض نے وہ وقت بتایا جب کہ رسول اللہ ہجرت کرکے مکہ سے روانہ ہوئے بعض نے وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رائے دی حضرت عمرؓ نے تصفیہ فرمایا کہ آنحضرت کے مکہ سے ۔ وانگی مدینہ کے وقت سے آغاز حساب تاریخ کرو۔ اب سوال پیدا ہوا کہ کس مہینہ سے آغاز ہوا کرے جس سے سنہ کی ابتدا ہو بعض نے کہا کہ رجب چونکہ زمانہ جاہلیت میں عرب اس مہینہ کی بڑی عظمت کرتے تھے۔ بعض نے رمضان کی رائے دی۔ اور بعض نے ذی الحجہ کیونکہ اس میں حج ہے بعض لوگوں نے کہا کہ وہی

علہ امام احمد ابن حنبل علہ واقدی و تاریخ صغیر علہ ابن عساکر، ابو الزناد۔

مہینہ جس میں کہ آنحضرت نے ہجرت فرمائی۔ بعض نے کہا کہ جس مہینہ میں حضور مدینہ میں تشریف لائے۔ حضرت عثمان نے فیصلہ فرمایا کہ آغاز سال کی تاریخ محرم کی ابتداء سے لیا کرو اس لئے کہ وہ شہر حرام بھی ہے اور شمار شہور میں پہلا بھی ہے۔ ماسوا یہ مہینہ لوگوں کو حج سے فراغت دلا کر واپس کیا کرتا ہے لہذا محرم ہی سے آغاز سال رکھو یہ واقعہ ۱۷ھ یا بقول بعض ۱۶ھ ہجری کے نصف ماہ ربیع الاول کا ہے۔[1]

ایک نکتہ مصنف کا قول ہے کہ محرم سے آغاز سال میں ایک اور بھی نکتہ ہے چنانچہ سعد ابن منصور نے اپنی سنن میں ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے والفجر کو انہوں نے کہا کہ یہ وہی ماہ محرم ہے جس کو فجر سنہ کہنا چاہیئے۔ بیہقی نے بھی اس کو شعب میں لکھا ہے۔

ابن حجر کہتے ہیں کہ اس حدیث سے اس اعتراض کے حکیمانہ جواب کا پتہ چلتا ہے کہ آغاز تاریخ ربیع الاول سے موخر کر کے محرم میں رکھی گئی باوجودیکہ مبدء تاریخ بالاتفاق ہجرت قرار پائی اور یہ تو ربیع الاول ہی میں تھی۔[2]

عبید ابن عمر نے کہا کہ محرم شہر اللہ (اللہ کا مہینہ) اور راس السنہ ہے اس میں خانۂ کعبہ کو پوشش دیجاتی ہے اور تاریخ آغاز ہوتی ہے اور درہم ڈھلتے ہیں۔[3]

فائدہ سنہ ہجری کی یکم محرم پنجشنبہ ۹۳۳ سنہ ذوالقرنین کے ماہ ایار میں تھی۔[4]

(تاریخی فوائد)

میقات شناسی اوقات مشروطہ کا علم شیوخ کی وفات و ولادت اور اُن کے راویوں کا علم یہ جملہ فوائد تاریخ سے حاصل ہوتے ہیں اس سے جھوٹوں کا جھوٹ اور سچوں کا سچ معلوم ہوتا ہے قرآن میں وارد ہے یا ایہا الذین آمنوا اذا تداینتم بدین الی اجل مسمی فاکتبوہ (اے ایمان والو جس وقت کسی اُدھار کی معاملت کسی معین وعدہ پر کیا کرو تو لکھ لیا کرو) حضرت عمرؓ کے پاس ایک دستاویز پیش ہوئی جس میں شعبان کی معیاد تھی چنانچہ حضرت عمر نے جرح کی کہ کونسا شعبان آیا گذشتہ یا موجود کہ آئندہ؟ پھر صحابہ سے فرمایا کہ تاریخ وضع کرو چنانچہ بعض نے کہا کہ رومیوں کی تاریخ لکھا کرو تو

---

[1] ابن ابی خیثمہ [2] الی لابن حجر [3] یعقوب بن القسوی [4] ابن عساکر۔ ابن القورس۔

حضرت نے جواب دیا کہ اُن کی تاریخیں طولانی ہوتی ہیں (طولانی حساب کی ہوتی ہیں) کہ زمان ذی القرنین سے اُن کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ بعض نے رائے دی کہ ایرانیوں کی تاریخ لکھا کرو تو فرمایا کہ جب اُن کے یہاں جدید بادشاہ ہوتا ہے تو اُس کے ساتھ ہی ساتھ تاریخ سابق بھی تبدیل ہو جاتی ہے حتیٰ کہ سب کے سب ہجرت سے آغاز حساب تاریخ پر متفق ہو گئے جس کو دس ہی برس ہوئے تھے چنانچہ ہجرت نبی صلعم سے تاریخ لی گئی۔[۱]

کذب راوی کی شناخت ۔جب راویوں نے کذب شروع کیا تو ہم نے تاریخ کے استعمال کا انتظام کیا۔[۲]

جب کسی شیخ (راوی حدیث یا محدث) پر کذب کا الزام آئے تو زمانہ کا حساب کر لیا کرو اور مروی عنہ کے زمان زندگی کو دیکھا کرو۔[۳]

ہمیں کاذبین روایت پر تاریخ کے مثل مدد دینے والی اور کوئی شئی نہیں۔[۴]

فوائد متعلقہ

اول تاریخ تو ماہ قمری کی ہے جو کبھی اُنتیس اور کبھی تیس دن کا ہوتا ہے (جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے) بخلاف حساب ماہ شمسی جس میں ہمیشہ تیس دن ہوتے ہیں لہذا یہ ماہ قمری سے بڑھ جایا کرتا ہے سورۂ کہف میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وَلبثوا فی کہفہم ثلاث مائۃ سنین وازدادوا تسعا (اور ٹھہرے یہ لوگ اپنے غار میں تین سو سال اور انہوں نے نو کا اضافہ کر لیا) مفسرین کہتے ہیں کہ نو کی زیادت قمری حساب سے ہے ورنہ شمسی حساب سے صرف تین سو ہوتے ہیں۔

احادیث سے حساب قمری کی تائید ۔ قمری حساب کی تائید احادیث ذیل سے بھی ہوتی ہے انا امۃ امیۃ لانکتب ولانحسب (ہم امی قوم ہیں حساب کتاب نہیں کرتے) اذا رأیتموہ فصوموا اذا رأیتموہ فافطروا (چاند دیکھ کر روزے رکھا کرو اور چاند ہی دیکھ کر روزے چھوڑا کرو)

---

[۱] بخاری فی ادب المفرد ۔ الحاکم [۲] ابن عدی [۳] حفص ابن غیاث [۴] ابن زیاد ۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ازدواج میں سے کسی سے ایلاء[1] کیا اور انتیسویں دن اُن کے پاس بھی تشریف لے گئے حتیٰ کہ حضور سے اس متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا کہ مہینہ انتیس دن کا ہوتا ہے۔

باستثنائے ماہ ستحاضہ و نفساء شریعت میں ہر مہینے سے ماہ ہلالی ہی مراد ہوتا ہے[2]۔

دوم چونکہ رات دن سے قبل ہے اس لئے تاریخ رات سے لینا ضروری ہے۔ قرآن میں ہے کانتا رتقاً ففتقناھما (زمین و آسمان منہ بند تھے پھر ہم نے اُن کو کھول دیا) مفسرین نے بیان کیا ہے کہ ارتقاق (بندش) کے ساتھ ظلمت ہی ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ وہ نور (دن) سے سابق ہے۔

پہلے خدا نے نور و ظلمت کو پیدا کیا اور اُن میں تمیز اس طرح پر کی کہ ظلمت کو رات اور نور کو دن بنایا[5]۔

پنجم اسمائے شہور و ایام

یکشنبہ (الاحد) خود اس نام کا تقاضہ ہے کہ وہ ہفتہ کا پہلا دن ہو[6]۔ ابن عباس فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے اللہ نے یوم الاحد (یکشنبہ) کو پیدا کیا اسی لئے یوم الاحد سے موسوم کیا[7]۔ عرب اس دن کو یوم اول کہتے تھے۔ لیکن ہمارے متاخرین اصحاب حدیث مسلم التربتہ یوم السبت الخ (خدا نے مٹی شنبہ کو پیدا کی پہاڑ یکشنبہ کو درخت دوشنبہ میں مکروہ اشیاء سہ شنبہ میں نور چہار شنبہ میں حیوانات منتشر کئے پنجشنبہ میں اور جمعہ میں عصر کے بعد آدم کو پیدا کیا) کے قائل ہیں۔

نصاریٰ و یہود کی روایت اہل توریت کا مقولہ ہے کہ خلق دنیا خدا نے یکشنبہ کو شروع کی اور اہل انجیل دوشنبہ بتاتے ہیں[8]۔

---

[1] لغت میں ایلاء کے معنی قسم کھانے کے ہیں مگر اصطلاحاً مدت معینہ تک اپنی بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھانا [2] تدریب [3] فائدہ سوم و چہارم عربی ادب سے متعلق ہیں جن کو موضوع سے چنداں علاقہ نہیں لہذا ترجمہ میں ہم ان کو محذوف کرتے ہیں از مترجم [4] شرح مہذب [5] ابن عساکر۔ [6] ابن اسحاق۔

اہل اسلام کا مسلک اور ہم اہل اسلام (اس بنا پر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت پہنچی ہے) شنبہ کہتے ہیں۔

خلق دنیا خدا نے یکشنبہ کو شروع کی اور اسی کو ابن جریر نے اختیار کیا ہے۔ چنانچہ ایک جماعت بھی اسی جانب مائل ہے[1] حدیث مذکور کی لفظ احد سے تائید ہوتی ہے[1]۔ غرض خداوند کریم نے تکمیل خلق جمعہ میں کی چنانچہ اہل اسلام نے اس کو اپنا تیوہار بنالیا۔ قبل اسلام اہل کتاب اس دن سے واقف نہ تھے۔

اعتراض۔ مسلم کی اگلی حدیثوں میں شدید غرابت ہے اس لئے کہ زمین چار یوم کی مدت میں بنائی گئی پھر دو دن میں آسمان۔ اس امر کو بخاری اور بعض محدثین نے بیان کیا ہے چنانچہ یہ زیادہ صحیح ہے[2]۔

فائدہ۔ صرف ایک دن اتوار کا روزہ مکروہ ہے[3]۔

فائدہ۔ احد کی جمع آحاد بالمد اِحاد بالکسر اور وُحود آتی ہے۔

دوشنبہ (الاثنان) اس کا نام اثنان اس وجہ سے ہے کہ وہ ہفتہ کا دوسرا دن ہے[4]۔ عرب اس دن کو اہون سے موسوم کرتے تھے۔

دوشنبہ کا روزہ۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دوشنبہ کے روزے کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ اس دن میں پیدا ہوا اور اُس روز مجھ پر وحی اتری[5]۔

مدینہ میں ورودِ نبوی۔ نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم دوشنبہ ہی میں وارد مدینہ ہوئے[6]۔

سہ شنبہ۔ (الثلثاء) جس کی ثلاثاوات اور اثالث جمع ہوتی ہے۔ عرب اس کو جُبار سے موسوم کرتے تھے۔

چہار شنبہ۔ (الاربعاء) جس کی اربعاوات اور ارابیع جمع ہوتی ہے عرب اس کو دبار کہتے تھے لوگوں میں مشہور ہے کہ آیۃ فی یوم نحس مستمر سے یہی چہار شنبہ مراد ہے اور اسی لئے اس دن سے شگون بد لیتے ہیں۔

بد پیشنگوئی کی تحقیق۔ یہ ایک سخت غلطی ہے اس لئے کہ قول خداوندی فی ایام نحسات سے آٹھوں دن مراد ہیں اس سے تو لازم آئے گا کہ تمام کے تمام دن منحوس ہو جائیں بلکہ درحقیقت وہاں نحس علیہم (موعود علیہم) کے لئے نامبارک مراد ہے[8]۔

---

[1] ابن جریر [2] ابن کثیر [3] ابن یونس [4] شرح مہذب [5] مسلم [6] طبرانی من ابن ابی الدنیا [8] المرسلیکا

پنجشنبہ۔ (الخمیس) جس کی اخمسہ و اخامس جمع ہوا کرتی ہے عرب اس کو مونس کہتے تھے۔
جمعہ۔ بضم و سکون میم ہر دو درست ہے اس کی جمع جمعات آتی ہے عرب اس کو عروبہ کہتے ہیں۔
فضیلت جمعہ۔ بہترین ایام جن میں کہ آفتاب طلوع ہوتا ہے جمعہ ہے اسی دن حضرت آدم پیدا ہوئے۔ اسی دن جنّت میں داخل ہوئے اور اُسی دن جنّت سے نکالے گئے۔ اور ایک روایت سے ثابت ہے کہ اُسی دن وفات بھی پائی۔ اُسی روز قیامت بھی شروع ہوگی۔ اسی روز ایک بے مثل ساعت ہے کہ جس میں خدا بندۂ مسلم کی دعا قبول فرماتا ہے[۱]۔ ایک حدیث میں مذکور ہے کہ بزرگترین ایام روز جمعہ ہے اور بہترین شب لیلۃ القدر اور افضل شہور رمضان ہے[۲]۔ ایک حدیث میں ہے کہ شب جمعہ مخصوص شب ہے اور روز جمعہ ممتاز ترین[۳]۔
فائدہ۔ چند احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ تنہا جمعہ ایک دن کا روزہ مکروہ ہے[۴] لیکن بزار کی حدیث کہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کسی جمعہ میں بے روزہ نہ تھے ضعیف ہے[۵]۔
شنبہ۔ (اسبت) جس کی جمع اسبت اور سبوات آتی ہے اس کو پہلے شیار کہا کرتے تھے۔ تنہا شنبہ ایک دن کا روزہ مکروہ ہے[۶]۔
فائدہ۔ ہاں اگر شنبہ کے روزے کے ساتھ جمعہ یا اتوار کا روزہ ہو تو کراہت نہیں جس کی توجیہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ جب دو مکروہ جمع ہو جاتے ہیں تو کراہت زائل ہو جاتی ہے۔ شنبہ سے متعلق یہودیوں کا قصہ مشہور ہے[۷]۔
فائدہ۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ یکشنبہ ابتدائے تخلیق کا روز ہے اور دوشنبہ سفر کا دن سہ شنبہ ذبح و کشتار کا دن۔ چہارشنبہ لین دین کا۔ پنجشنبہ شاہوں سے ملاقات کا جمعہ شادی بیاہ کا دن ہے[۸]۔
مشاغل یومی۔ مصنف کہتا ہے کہ میں نے حافظ شرف الدین دمیاطی کے قلمی یہ چند اشعار دیکھے جن کو حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ سے منسوب کیا گیا تھا۔

نعم الیوم یوم السبت حقا   لصید ان اردت بلا امتراء

---

۱ صحیح ۲ طبرانی ۳ بیہقی ۴ صحیحین ۵ امام سیوطی ۶ امام سیوطی ۷ امام سیوطی ۸ ابو یعلے۔

ترجمہ۔ مقصد شکار کے لئے بہترین روز بے شبہ شنبہ ہوا کرتا ہے۔

وفی الاحد البناء لان فیہ تبدّیٰ اللہ فی خلق السماء

ترجمہ۔ یکشنبہ میں تعمیر بہتر ہے اس لئے کہ خداوند کریم نے اس دن آسمان بنانا شروع کیا۔

وفی الاثنین ان سافرت فیہ فترجع بالنجاح وبالثراء

ترجمہ۔ اگر تم دوشنبہ میں سفر کروگے تو فیروزی اور کامیابی سے واپس آوگے۔

وان ترد الحجامۃ فی الثلاثاء ففی ساعتہ هرق الدماء

ترجمہ۔ اگر تم کو پچھنے لگانا منظور ہو تو سہ شنبہ میں (مناسب ہے) اس لئے کہ اُسی دن کی گھڑیوں میں خون بہایا گیا ہے۔

وان شرب امرءٌ یوماً دواءً فنعم الیوم یوم الاربعاء

ترجمہ۔ اگر کوئی دوا پینا چاہے تو چہارشنبہ بہتر ہے۔

وفی یوم الخمیس قضاء حاج فان اللہ یاذن بالقضاء

ترجمہ۔ پنجشنبہ میں دعا مناسب ہے کیونکہ اللہ اس دن دعا قبول فرماتا ہے۔

وفی الجمعات تزویج وعرسٌ ولذات الرجال مع النساء

ترجمہ۔ مردوں کی عورتوں سے لذت اندوزی اور شادی بیاہ جمعوں میں بہتر ہے۔
مصنف کہتا ہے کہ ان اشعار کی حضرت علی سے نسبت میں مجھے تامل ہے۔

محرم جس کی محرمات محارم اور محاریم جمع آتی ہے بعض عرب اس کو مُؤتمر کہتے ہیں جس کی جمع مآمر اور مآمیر آتی ہے۔

محرم کے روزے۔ رمضان کے روزوں کے بعد شہر اللہ (اللہ کا مہینہ) محرم کے روزے افضل ہیں[1]

صفر۔ جس کی جمع اصفار آتی ہے۔ ابن اعرابی کہتا ہے کہ تمام لوگ صفر کو منصرف کہتے ہیں مگر خلاف اجماع۔ مگر ابو عبیدہ اس کو غیر منصرف کہتا ہے۔ جس کی وجہ تانیث اور علمیت بتاتا ہے۔ لیکن ثعلب کا مقولہ ہے کہ ابو عبیدہ نے یہ نہ سمجھا کہ جملہ ازمنہ اوقات ہیں (ان میں علمیت نہیں ہوتی) بعض عرب اس کو ناجر کہتے ہیں۔

---

[1] مسلم۔ ع۔ا۔ج

ماہ صفر کی تحقیق بدشگونی | بعض لوگ اس مہینہ سے بُرا شگون لیتے ہیں اسی لئے حدیث ہے لا عدویٰ ولا طیرۃ ولا صفر (تعدیہ اور شگون کوئی چیز نہیں ہے)

ربیع | - فراء نے کہا کہ ربیع الاول جب کہا جائے تو گویا لفظ اول شہر کی صفت ہوتی ہے اور جب اولیٰ کہا جائے تو وہ ربیع کی صفت ہوتی ہے۔ بعض عرب اس کو خوان کہتے ہیں جس کی جمع خوانہ آتی ہے بعض عرب وبصان بھی کہتے ہیں جس کی جمع وبصانا آتی ہے۔

ربیع الاول کی فضیلت | اسی مہینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہوئے اسی میں ہجرت فرمائی اور اسی میں وفات پائی۔

جمادی | - جس کی جمع جمادیات ہوتی ہے فراء کہتا ہے کہ باستثنائے جمادئین ہر مہینہ مذکر ہے اہل عرب جمادی الاولیٰ وجمادی الآخرۃ بولتے ہیں۔ بعض لوگ جمادی الاولیٰ کو حنین کہتے ہیں جس کی جمع احنۃ آتی ہے اور جمادی الآخرۃ کو ورنہ کہتے ہیں جس کی جمع [illegible]

مسئلہ - کیا سلم صرف ربیع یا جمادی کے تذکرے سے ہو سکتی ہے؟ بعض کہتے ہیں کہ ابہام کے باعث صحیح نہ ہوگی۔ لیکن درست یہی ہے کہ ہو سکتی ہے اور اس صورت میں ربیع الاول اور جمادی الاولیٰ کا مفہوم لیا جائے گا۔

رجب | جس کی جمع رجبات ارجاب یا رجاب ہوتی ہے چونکہ اہل عرب اس مہینے کی بڑی عظمت کرتے تھے کہ جنگ وغیرہ اس مہینے میں حرام جانتے تھے ہتیاروں کی جھنکار نہ سنائی دیتی تھی اس لئے وہ اس مہینے کو اصم کہتے تھے۔

صیام رجب کی حقیقت | اس ماہ کے روزوں کے متعلق بہت سی حدیثیں وارد ہیں۔ لیکن وہ سب کی سب منکر یا موضوع ہیں کوئی بھی ثابت نہیں ہے۔

شعبان | جس کی شعابین اور شعبانات جمع ہوا کرتی ہے۔ بعض اس کو وعل کہتے تھے جس کی جمع اوعال یا وعلان آتی ہے۔

شعبان کے روزے | رمضان کے سوا اور کوئی ایسا مہینہ نہیں ہے جس میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پورے مہینے کے روزے رکھے ہوں۔

ہاں اگر نصف ماہ اول میں روزے نہ رکھے جائیں تو صرف نصف آخر کے روزے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حرام کر دیتے تھے۔

رمضان | یہ رمضاء بمعنے شدت الحرارت سے مشتق ہے جس کی جمع رمضانات ارمضہ یا رماض آتی ہے۔ نحاۃ نے کہا کہ شہر رمضان بولنا بجائے صرف رمضان بولنے کے زیادہ فصیح ہے۔

کیا رمضان خدا کا نام ہے | مصنف کہتا ہے کہ ابن حاتم نے بسند ضعیف ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ یہ خدا کا نام ہے اس لئے مطلق رمضان نہ کہا کرو شہر رمضان کہا کرو۔

بعض عرب اس کو ناتق کہتے ہیں جس کی جمع نواتق آتی ہے۔

شوال | جس کی جمع شوالات شواول یا شواویل آتی ہے۔ اس کو بعض عرب عادل کہتے ہیں جس کی جمع عوادل آتی ہے۔

اس مہینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے نکاح کیا حضرت عائشہؓ اس مہینے میں نکاح پسند فرماتی تھیں۔ شہور حج میں یہ پہلا مہینہ ہے۔

ذوالقعدہ و ذوالحجہ | قعدہ کے ق کا فتحہ اور حجہ کے ح کا کسرہ زیادہ فصیح ہے۔ اس کے برعکس غیر فصیح ہے۔ اگرچہ ان ہر دو حروف کا فتحہ و کسرہ دونوں درست ہیں ان کی جمع ذوات القعدہ اور ذوات الحجہ آتی ہے۔ اول کو ہواع جس کی جمع اہوعہ اور ہواعات آتی ہے کہتے تھے اور دوسرے کو بُرک کہتے تھے جس کی جمع برکات آتی ہے۔

فائدہ - محرم کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں جنگ حرام ہے۔

صفر کی یہ ہے کہ عرب اس مہینے میں بمقام صفر جمع ہوا کرتے تھے۔

جمادین٭ اس لئے کہ ان مہینوں میں پانی جم جاتا تھا۔

رجب اس لئے کہ اس مہینے میں درختوں کو نصب کرتے تھے۔ ع۲

شعبان اس لئے کہ اس مہینے میں قبائل متفرق ہوتے تھے ع۳

٭ یعنی ... عام طور پر ان مہینوں میں دنیا خشک رہتی تھی

ع۱ ربیع ربع سے مشتق ہے ربع بمعنے مکان و قیام کرنا ع۲ رجب بمعنے خاص اہتمام کرنا ع۳ شعبان شعب بمعنے تفرق و تفرع سے مشتق ہے۔

رمضان اس لئے کہ اس مہینے میں شدت گرما سے پستانوں میں دودھ خشک ہو گئے تھے عہ
شوال اس لئے کہ اس مہینے میں اونٹنیاں گرما کر دم اٹھاتی تھیں عہ
ذوالقعدہ اس لئے کہ عرب اس مہینے میں جنگ سے باز رہتے تھے عہ
ذوالحجہ اس لئے کہ اس میں حج کرتے ہیں عہ
چونکہ یہ فوائد مہتم بالشان تھے اس لئے ہم نے ان کو یہاں بیان کیا کسی کاتب یا مورخ کو اُن سے لاعلمی امناسب نہیں ہے۔

رُباعی

از

جناب قتیل حیدرآبادی

بلبل کو چمن میں جست و جو ہے — قمری کی زباں پہ نعرۂ کوکو ہے
توحید کا تیری بولتا ہے طوطی — مینا کہتی ہے میں نہیں ہوں تو ہے"

عہ رمضان رمضا بمعنی شدت الحرارت سے مشتق ہے عہ یہ شوال الناقۃ سے مشتق ہے یعنے اونٹنی کا دم اٹھانا چونکہ انتہائے مستی سے اونٹنی دُم اٹھاتی تھی اس لئے شوال اس مہینے کا نام ہوا عہ قعدہ اور قعود بمعنی بیٹھنا عہ ابن عساکر۔

خاندان چوہان کا آخری راجہ

(ایک تاریخی ڈرامہ)

(از جناب شیخ نورالحسن عثمانی صاحب)

تمہید - پرتھوی راج شمالی ہند کا زبردست اور طاقتور راجہ تھا دہلی اور اجمیر دونوں ریاستوں کا مالک تھا۔ راجہ بننے سے پہلے ہی شجاعت اور بہادری میں مشہور تھا اجمیر کی ریاست اُس کو باپ کے اور دہلی کی ریاست چچا کے ورثہ میں ملی تھی۔

دہلی کی ریاست کے مل جانے سے اُس کا قریبی رشتہ دار جے چند حسد کرنے لگا۔ اور اس طرح دونوں میں باہم عداوت پیدا ہو گئی جے چند نے جو قنوج کا راجہ تھا اپنی دختر سنجوگتا کا سوئمبر رچایا اور تمام ہندوستان کے رجواڑوں کو مدعو کیا۔ پرتھوی راج پہلے ہی سے چاہتا تھا کہ سنجوگتا کو اپنی رانی بنائے۔ مگر جے چند نے عداوت کی بنا پر اُس کو ذلیل کرنے کی غرض سے مدعو نہ کیا بلکہ اس کی ایک مورت بنوا کر اپنے دربار کی جگہ کھڑا کر دیا۔ عین سوئمبر کے وقت پرتھوی راج چند سورماؤں کو لے کر قنوج پہونچا۔ اور بھیس بدل کر رسم میں شریک ہو گیا۔ سنجوگتا نے کسی کو پسند نہیں کیا بلکہ پرتھوی راج کی مورت کو ہار پہنا دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ پرتھوی راج نے موقع پاکر فوراً سنجوگتا کو گھوڑے پر سوار کیا اور لڑ بھڑ کر قنوج کی سرحد سے پار نکل گیا۔

افراد

پرتھوی راج - دہلی اور اجمیر کا راجہ۔

سنجوگتا - پرتھوی راج کی رانی۔ راجہ جے چند والئے قنوج کی بیٹی۔

سفیر - دایہ - پرتھوی راج کی قدیم خادمہ۔

پہلا سین

سین - محل دہلی کا اندرونی برآمدہ جس میں پردے لٹکے ہوئے ہیں۔ راجہ اور رانی

دونو گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ رانی پرتھوی راج کو ہتیار اور زرہ بکتر پہننے میں مدد دے رہی ہے۔ راجہ لڑائی پر جانے کو تیار ہو رہا ہے۔

سنجوگتا۔ پیارے شوہر۔ سب سامان تیار ہے۔ باہر دربار میں لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ تاکہ آپ کو منزل مقصود پر لے جائیں۔

پرتھوی راج۔ پرماتما اُن کو ثابت قدم رکھے۔ چھ مرتبہ میں نے دشمنوں کو مار بھگایا اور اب پھر بارہ[1] چاند کے بعد ہمارے آرام میں خلل ڈالنے آئے ہیں۔

سنجوگتا۔ کیا ہمیں آرام اور امن کی زندگی بسر کرتے ہوئے بارہ چاند ہو گئے؟ مگر مجھکو تو ایک ہی دن معلوم ہوتا ہے۔

پرتھوی راج۔ پیاری ہم دونوں نے خوشی اور شادمانی کے جام خوب بھر بھر پیئے ہیں۔ اس لئے کچھ معلوم نہیں ہوتا۔

سنجوگتا۔ تو کیا اب ہمارا خمار اتر گیا ہے؟۔ اور ہماری عیش کی گھڑیاں گزر چکی ہیں۔ اور آپ مجھ سے منہ چھپانا چاہتے ہیں۔

پرتھوی راج۔ پیاری۔ تم کیا کہہ رہی ہو۔ تمہارے الفاظ بدشگونی ظاہر کرتے ہیں۔ مگر یہ چمکدار آنکھیں پھر کب...... تم اپنے دل میں کوئی وسوسہ نہ لاؤ۔ کسی بات کا خیال ہرگز دل میں نہ لاؤ۔ قسمت ایسی ظالم اور بے رحم نہیں ہے کہ وہ ہم دونوں میں جن کے لئے اُس نے بہشت کے دروازے کھولدئے ہیں۔ جدائی ڈالدے!۔

سنجوگتا۔ پرمیشور نے ہمیں بہت سی فتوحات عطا کی ہیں۔ مگر جو کچھ تقدیر میں ہوتا ہے وہی ہوگا۔ تقدیر کے لکھے کو کوئی مٹا نہیں سکتا۔ وہ جسے چاہے فتح دے اور جسے چاہے شکست دے۔

پرتھوی راج۔ پرمیشور کی کرپا کر یا سے بزدل دشمنوں کو کئی مرتبہ نیچا دکھا چکا ہوں۔ اب بھی اُسنے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔ کیا خوف ہے۔

سنجوگتا۔ اُس شخص کے لئے جس نے اپنے دشمن کی لڑکی سے شادی کی کوئی فتح آخری فتح نہیں ہو سکتی۔

پرتھوی راج۔ (آہستہ سے) مجھے کسی کی سازش کا خوف نہیں ہے۔ میری پیاری۔ مجھے

---

[1] بارہ ماہ

کسی کا بھی خیال وخوف نہیں ہے۔ مگر اُس کا جس کا کہ خیال مجھے اوّل اور آخر ہے۔

سنجوگتا۔ نہیں میرے پیارے سورج بنسی خاندان کے راجہ میں آپ سے متحول نہیں کر رہی ہوں۔ بلکہ میرا حریف باپ راجہ قنوج جس کے سامنے ہم دونوں نے ایک بھڑکتا ہوا حسد کا شعلہ گرایا ہے۔

پرتھوی راج۔ آہ۔ میری انمول۔ میری پیاری۔ تم نے تمام چوہان اور دیگر ہندوستانی راجاؤں کے سامنے اپنے باپ کی ذلت کی۔ آہ، وہ وقت! جبکہ تم نے سب رجواڑوں کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھا اور مجھکو ترجیح دی۔

کیا میں اُن راجاؤں سے زیادہ خوش قسمت تھا؟ کیا تم میری ہی قسمت میں تھیں؟ کیا اُن میں سے کوئی ایسا خوش قسمت نہ تھا جیسا کہ میں۔

سنجوگتا۔ اوہ۔ وہ دن! کیسی خطرناک گھڑی تھی۔ مگر غیر متوقع اور مسرت آمیز تھی۔ جس کا افتتاح ایک شاندار جشن سے ہوا اور انتہا ایک خطرناک لڑائی سے۔ اوہ۔ کس مہربانی سے میری قسمت نے مجھے اُن خطروں اور مصیبتوں سے چھڑایا۔ جو عنقریب میری آرزوؤں اور تمناؤں پر پانی پھیرنے والے تھے۔

پرتھوی راج۔ یہ تمہاری راجپوتانہ اور رانی پن کی دلیری اور مستعدی تھی جس نے اُس دن بچایا۔ ایک مستعد ذلیل شدہ بہادر اور ایک سچے آدمی کو تقدیر کیونکر روک سکتی ہے۔ جو اپنے آرزوؤں بھرے دامن مراد کو پورا کرنا چاہتا ہے۔

سنجوگتا۔ اس لئے میں نے آپ سے محبت کی۔ جیسا کہ دوسری عورتیں کیا کرتی ہیں۔ ایک ایسا جانباز عاشق۔ ایک ایسا بے نیاز سورما۔ جس کا گیت تمام شعراء اور مطرب گاتے ہیں۔ مگر کیا۔ میرے سوئمبر کے جشن کے وقت آپ کی تذلیل؟ آہ۔ میرا حاسد باپ جو میری امیدوں کو خاک میں ملانے کی خواہش رکھتا ہو!۔ اوہ۔ آپ کی بے عزتی اور وہ بھی میری وجہ سے!۔ اب میں اس خیال کو آپ کے دل سے کس طرح بھلاؤں۔

پرتھوی راج۔ نہیں۔ پیاری نہیں۔ تمہارا اس میں کچھ دخل نہیں ہے بلکہ یہ دشمنی اور عداوت کا سلسلہ کچھ اور ہی ہے۔ اور تمہارا غریب باپ۔ جس نے حسد کے مارے میری مورت بنوا کر دروازے پر رکھوائی۔ وہ ذلت نہیں تھی بلکہ معمولی تضحیک تھی۔

اُس موقع پر مجھے کسی بات کا خیال نہ تھا۔ بجز اس کے کہ میں چپ چاپ بیٹھا اپنے خیال میں منہمک تھا اور یہ دیکھ رہا تھا کہ دیکھئے بجلی کس طرف گرتی ہے۔ آہ۔ وہ سماں مجھکو اچھی طرح یاد ہے جبکہ میں ایک مطرب کے بھیس میں وہاں تمہاری حرکتیں اور انتخاب کا منظر چپ چاپ بیٹھے دیکھ رہا تھا۔

سنجوگتا۔ کاش مجھے وہاں آپ کی موجودگی کا علم ہوتا تو مجھے اتنی مصیبتیں سہنا نہ پڑتیں پھر بھی میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ آپ کی عدم موجودگی میں کیسے آپ کا انتخاب لاجواب کیا۔ وہ مقام ایسا تھا جہاں آپ کا نام لینا بھی ناگوار تھا۔

پرتھوی راج۔ وہ تمہارے شہرہ آفاق حُسن کی پہلی جھلک تھی۔ اور جب تم دربار میں آئیں تو دور ہی سے تمہارے پازیب کی آواز سنکر تمام درباری خاموش ہو گئے تھے اور محل کے دروازہ پر ٹکٹکی لگائے ہوئے تھے۔ اور جب سامنے ہوئیں تو تمام لوگ سکتہ کے عالم میں تم کو گھورنے لگے تھے۔

سنجوگتا۔ شائد اُس وقت میرے پاؤں نے پر لگائے تھے تاکہ اُڑ کر تمہاری مورت کے جو دروازہ پر رکھی ہوئی تھی گلے میں ہار ڈال سکوں۔

پرتھوی راج۔ مگر تمہاری یہ جرارت دوسرے برابر والے راجاؤں کے سامنے تمہارے باپ کی بے عزتی کا باعث ہوئی۔

سنجوگتا۔ میں اپنی تمناؤں کو نظرانداز کر کے کسی دوسرے سے کبھی شادی نہ کرتی۔ میں یا تو خوشی کے ساتھ اپنے باپ کے گھر میں مقید رہتی یا موت کو ترجیح دیتی۔ مگر پریتما کسی کی آس نہیں توڑتا۔

پرتھوی راج۔ جب سے کہ ان حاسدوں کو شکست ہوئی ہے اس وقت سے ہم دونوں کی کس عمدگی اور خوشی و خرمی سے زندگی بسر ہو رہی ہے۔ گویا ہم دونوں نے خوشی اور امن کا جام پی لیا ہے۔

سنجوگتا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس جام نے ہمارے آقا کی تمام جنگجو خصلتوں کو بھلا نہ دیا ہو اور اس طرح کی عیش پسندی سے راجپوتانہ جوش اور اولوالعزمی مدھم نہ پڑ گئی ہو۔ اور پہلے کی سی حالت نہیں رہی ہو!۔

پرتھوی راج۔ نہیں نہیں۔ تم اطمینان رکھو میری فوج پہلے سے زیادہ وفادار اور

طاقتور ہے۔ علاوہ ازیں دوسری ریاستوں نے بھی ہر طرح سے مدد دینے کا وعدہ کیا ہے۔
سنجوگتا۔ یقین ہے کہ تمام بہادر سپاہی میدان جنگ میں اپنی پوری شجاعت اور مردانگی دکھائینگے۔

پرتھوی راج۔ ہاں ہاں۔ یقیناً ایسا ہی کریں گے۔ میں نے ایک خط مسلمانوں کے سردار کو لکھا ہے کہ گذشتہ واقعات کو یاد کریں کہ کس بری طرح شکست فاش کھائی تھی۔ اور بہتر ہوگا کہ بلاخوف وخطر صحیح وسلامت اپنے حدود میں داخل ہوجائیں۔
سنجوگتا۔ کیا وہاں سے کوئی جواب آیا۔؟

(ایک قاصد آتا ہے)

قاصد۔ مہاراج (حضور) سپہ سالار غزنی کے پاس سے ایک پیام وصول ہوا ہے۔
پرتھوی راج۔ .... کیا جواب آیا ... بولو۔
قاصد۔ مہاراج۔ آج کل شہاب الدین اعظم غزنی کی فوجوں کا سپہ سالار ہے۔ اور وہ مکار۔ قنوج کا راجہ بھی ہمارے خلاف مسلمانوں کے ساتھ مل گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان صلاح کے لئے رضامند ہیں اور متامل ہیں تا آنکہ غزنی ہدایت صلح پر غور کرے اور اپنے احکام صادر کرے۔
پرتھوی راج۔ (مسکراکر) یہ چالاکی کی گئی ہے۔ اور ایسا ہی ہوا ہے۔
سنجوگتا۔ یہ مصلحت آمیز جواب ہے۔ اس میں بھید ضرور ہے پھر بھی ہم کو ہوشیار رہنا چاہیئے۔

پرتھوی راج۔ ہاں۔ رانی کا کہنا سچ ہے۔ اچھا خیر۔ آج چل کر شب خون مارنا چاہیئے۔ ان الفاظوں میں مکاری اور دغابازی پوشیدہ ہے۔
سنجوگتا۔ ہاں ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ اب راجپوت جان نثاروں کی آزمائش کا وقت آگیا ہے۔ ہر ایک کا منزل مقصود موت ہے۔ انسان کی زندگی کا کیا بھروسہ ہے!
میرے پیارے شوہر میرا خیال نہ کرو۔ ہم دونوں کے جدا ہونے کا وقت قریب آگیا ہے۔ جاؤ۔ جاؤ پیارے شوہر۔ تمہاری بڑی بڑی سرخ اور چمکدار آنکھیں فتح کی متلاشی ہیں۔ مگر فتح اگر پرماتما نے چاہا تمہارے زیر قدم ہوگی۔

پرتھوی راج۔ پیاری سنجوگتا۔ ہمت کرو اور مجھے خوشی سے اجازت دو تاکہ میرا راستہ خوشی سے طے ہو۔

(پرتھوی راج سنجوگتا سے بغلگیر ہوتا ہے۔ اور نہایت حسرت بھری آہ کھینچ کر گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو جاتا ہے)

سنجوگتا۔ اب مجھے کامل یقین ہے کہ میں اپنے پیارے شوہر کو اس یوگنی پور (دہلی) میں نہ دیکھ سکوں گی۔ بلکہ اُس کو سُوارگا (جنت) میں دیکھوں گی۔

دوسرا سین

سین۔ دوسرے دن شام کو اسی برآمدہ میں سنجوگتا اپنی دایہ سے گفتگو کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

سنجوگتا۔ (اداسی کی حالت میں) آہ۔ !۔ وہ غمگین دن جس روز میں نے اپنی محبت کا ہار اُس کے گلے میں ڈالا تھا۔ ڈر ہے کہ وہی اُس کے گلے کی زنجیر نہ ہو۔ اور اُس کو شکست کی طرف کھینچے۔ افسوس میں یہ کیا کر بیٹھی جب سے کہ میں نے اپنے باپ کے خلاف کیا ہے اس وقت سے خوف لگا ہوا ہے کہ میرا شوہر اُس کے حسد اور غصہ کا نشانہ نہ بنے۔ اسی غرض سے میرا باپ مسلمانوں سے ملا جلا ہے۔ تاکہ اگر میرا شوہر مُرافعت کرے تو وہ اپنے بھڑکتے ہوئے حسد کے شعلے پرتھوی راج پہ گرائے۔

دایہ۔ بیٹی خاموش رہو۔ اپنے دل کو کیوں اداس کر رہی ہو۔ ! کیا تم نہیں جانتی کہ پرتھوی راج کی زندگی پر دیوتاؤں کا سایہ ہے۔ اس کا ہر ایک ہاتھ چھ چھ آدمیوں کا کام کر سکتا ہے .... اچھا ہمارانی اور کیا خبر ہے۔

سنجوگتا۔ صبح کو یہ خبر ملی تھی کہ میرا باپ مسلمانوں سے مل کر جنگ کر رہا ہے۔ اور اُن کی ہر طرح سے کمک کرنے پر آمادہ ہے۔ چند مسلمان بھیس بدل کر راجپوتوں کے خیموں میں گھس گئے تھے۔ مگر چند بہادروں نے دیکھ پایا اور انہیں تیر کا نشانہ بنا دیا۔ سلطان محمود تو برابر لڑائی کر رہا ہے۔ صورت حال نازک ہے۔ راجپوت صف آرائی میں کچھ رخنہ پڑ گیا ہے۔ سلطان بھی کچھ خاموش ہے۔ مسلمان کچھ دور پیچھے ہٹ گئے ہیں۔

مگر یہ فریب ہے۔

دایہ - مگر مہاراج بھی کچھ کم نہیں ہیں - وہ اُن کے فریبوں سے بخوبی واقف ہیں - کیوں نہ ہو وہ ایک نڈر شہسوار ہیں - جن کے سامنے لڑائی کا میدان ایک معمولی بازی گاہ ہے - وہ راجپوت بہادروں اور سورماؤں کے سرتاج ہیں - وہ کبھی مسلمانوں کے فریب اور دھوکے میں نہیں آسکتے -

سنجوگتا - ہاں سب کچھ صحیح ہے مگر میں یہ نہیں سمجھتی کہ مجھے کیوں اور کس بات کا خوف ہو رہا ہے - ایک نامعلوم خوف نے میرے دل پر ایسا قبضہ کر لیا ہے کہ میرا دل دھڑک رہا ہے - پرماتما خیر کرے -

دایہ - مہارانی کیا تم وہی مہارانی سنجوگتا نہیں ہو جس نے اپنے باپ کے سامنے ایسی دلیری دکھائی تھی -! - کہ اب شکست ہونے کے احتمال سے پست ہمت ہو رہی ہو!-

سنجوگتا - بالکل ٹھیک ہے - لیکن یہ ذلت اور بے عزتی کی جھلک معلوم ہوتی ہے - . . . . . . نہیں - ! - - نہیں - ! - اب میں نہیں رہوں گی - ! - لو - ! - ہاں - ! - میں اب پھر رانی ہوں ! -

(قاصد آتا ہے) محل کے باہر شور سنکر رانی چونکنا ہوتی ہے -

قاصد - مہارانی ایک قاصد کرنال کے میدان سے آیا ہے -

سنجوگتا - (آہستہ سے) میں اُس کو دیکھنا چاہتی ہوں -

قاصد - اور وہ زخموں سے چور چور اور نڈھال ہیں -

سنجوگتا - میں ایک سپاہی کی عورت ہوں ! - اندر لاؤ -

دایہ - نہیں - رانی کی نظروں سے دور رکھو - ورنہ . . . .

سنجوگتا - کیا کہا ؟ . . . . پھر کہو - ؟

قاصد - مہارانی خبر بہت بری ہے - آپ اُس کو برداشت نہ کر سکینگی -

سنجوگتا - کیا میں نہیں سن سکتی ؟ - اچھا کیا خبر ہے - جلد سناؤ میرا دل دھڑکتا ہے . . . . جلد . . . .

قاصد - مہارانی کیا کہوں - ! - راجپوتوں نے مسلمانوں کا خوب مردانہ وار مقابلہ کیا - نہایت جان توڑ لڑائی ہوئی مگر دشمن کی امداد کافی اور زبردست تھی - اگرچہ کہ

پہلے ہی حملہ میں ہمارے بہادروں نے مسلمانوں کے دانت کھٹے کر دئے تھے۔ مگر جب حیلہ سازی کی لڑائی ختم ہوئی۔ تو مسلمانوں نے ایک جان ہو کر ایسا حملہ کیا کہ بازی لے گئے۔ اور.....

سنجوگتا۔ بس! بس! اب اس معرکہ کا خاکہ میرے سامنے مت کھینچو۔ میں سب جانتی ہوں۔ شائد ہماری جھول دار طاقتور گھوڑے اور فوجی ہاتھی میدان سے بھاگ نہ سکے۔ مگر.... جلدی کہو.... کیا راجہ جی بچ کر نکل گئے؟

قاصد۔ مہاراجہ کے زخم تو خفیف تھے۔ اُن کا گھوڑا مر بھی گیا تو وہ پیدل لڑتے رہے۔ مگر چند ساتھیوں کے ہمراہ فرار ہو کر ایک گنے کے کھیت میں جا چھپے مگر.... آہ! ..... کوئی اس واقعہ کو کیسے بیان کرے۔؟

سنجوگتا۔ اوہ۔ بیان کرو..... بیکھا دست۔ میں اس کو سن سکتی ہوں۔ (سنجوگتا اپنا سر ایک لمحہ کے لئے نیچے کرتی ہے اور ایکدم ہمت کے ساتھ سر اُٹھاتی ہے۔)

(سرد آہ بھر کر) ہاں۔ میں پہلے ہی سے جانتی تھی کہ وہ اب دوبارہ اس محل میں قدم نہ رکھینگے۔ مگر ہم دونوں اُس پار ملینگے۔

قاصد۔ (سر جھکائے ہوئے) مہاراجہ (مہاراجہ کی لاش) محل کے باہر اپنے آخری رسوم کا انتظار کر رہے ہیں۔

سنجوگتا۔ آہ۔ یہ انجام ہے! نہیں! کس کو خبر ہے! شاید یہ ابتدا ہو!۔ اچھا مجھے بھی تیاری کرنا ضرور ہے۔ تاکہ میں بھی سبقت لیجاؤں۔ آہ۔! جو دنیا میں شان سے رہتے ہیں وہ شان ہی سے مرتے ہیں..... مجھے بھی جانا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ فاتح کے ہاتھ میری ذلت ہو۔ چلو۔ میں تیار ہوں۔

(رانی آہستہ آہستہ چتا کی طرف قدم بڑھاتی ہے گویا خواب میں ہے)

ہٹو!۔ ہٹو!۔ مہارانی کے لئے راستہ چھوڑو۔!

پرتھوی راج کی دلہن اپنے شوہر سے ملنے جا رہی ہے۔

(ترجمہ)

اِعتماد

(از جناب غلام رسول صاحب (سٹی کالج)

(۱)

سوراجیہ سویان" نامی روزنامہ کے مدیر اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے اپنے نام کی ڈاک دیکھ رہے تھے اسی وقت چپراسی نے اُن کو ایک کارڈ لاکر دیا۔ کارڈ کو دیکھ کر ایڈیٹر نے کہا۔ "انہیں بھیجو" چپراسی چلا گیا تھوڑی دیر کے بعد ایک کھدر پوش جوان کمرے میں داخل ہوا۔ ایڈیٹر کو دیکھ کر اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر "بندے" کہا۔ ایڈیٹر مسکرا کر بولے۔ "آیئے مشکل جی آپ کب تشریف لائے؟

جوان کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کل شام کو آیا تھا"۔

ایڈیٹر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے بولے۔ "اچھا! ٹھہرے کہاں؟"

"ایک دھرم سالہ میں ٹھہر گیا ہوں"

"یہ کیوں، یوں ہی کیوں نہ چلے آئے؟"

"بات یہ ہے کہ کل وقت بہت ہو چکا تھا۔ میں نے سوچا دفتر بند ہو گیا ہوگا"۔

"دفتر بند ہو گیا تھا، تو کیا کھل نہیں سکتا تھا؟"

"ہاں کھل تو سکتا تھا۔ مگر میں نے سوچا کیوں تکلیف دوں"۔

"تکلیف کی کونسی بات تھی خیر! اب آپ یہاں آجائیے۔ یہاں دو کمرے بالکل خالی پڑے ہیں۔ آپ انہیں میں ڈیرہ جمائیے"۔

"اچھی بات ہے"

"تو اسباب کب لاؤ گے؟"

"آج کسی وقت لے آؤنگا۔ آپ کہاں رہتے ہیں؟"

"میں بھی قریب ہی رہتا ہوں۔ یہاں سے پانچ منٹ کا راستہ ہے"۔

"تب تو بڑا اچھا ہے"۔

"اور کوئی بات ہے؟"

"بس اور کون بات ہے۔ کل سے کام شروع کرونگا"

"کل سے شروع کرنا چاہیئے پرسوں سے۔ کوئی جلدی نہیں ہے۔ دو ایک دن آرام کرلو"

"آرام تو کرتا ہی تھا۔ آرام سے طبیعت اکتا گئی ہے۔ کام کرنے کو جی چاہتا ہے"

"ایڈیٹر اہنس کر بولے۔ "یہ بات ہے؟ اچھا تو جب سے خواہش ہو۔ تب سے شروع کرو"

"کل ہی سے کرونگا"

"کل ہی سے سہی"

شکل جی اسی دن شام کے وقت سی، آئی، ڈی انسپکٹر کے پاس پہنچے۔ انسپکٹر نے انہیں تنہائی میں لے جاکر پوچھا "آپ کب آئے؟"

شکل جی نے کہا "میں کل آیا تھا"

"میرا خط آپ کو مل گیا تھا؟ انسپکٹر نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ اسی کے بموجب میں نے یہاں آنا ٹھان لیا"

"اچھا تو یہاں آپ کو کیا کرنا ہوگا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں"

"جی ہاں، اس میں سے پہلا کام تو میں پورا کر چکا ہوں"

"کونسا"

"میں نے 'سوراجیہ سوپان' میں شریک مدیر کی جگہ حاصل کرلی"

"اچھا! شاباش۔ تب پھر دوسری باتیں آسان ہو جائیں گی"

"جی ہاں"

"میں ایک بار پھر سمجھا دوں۔ آپ ایڈیٹر پر اپنی نظر رکھئے۔ ان کے خیالات کیسے ہیں۔ ان کے پاس کون کون آدمی آتے ہیں۔ ان کی خط و کتابت کن سے ہوتی ہے اور کس بارے میں ہوتی ہے۔ اس کی خبر رکھئے گا۔ ایڈیٹر جب کبھی باہر جائیں تو اس بات کا پتہ لگا کر کہ وہ کہاں جارہے ہیں اس کی اطلاع فوراً مجھے یا میرے مددگار کو۔ جو اس وقت یہاں موجود ہوں دیجئے۔ ان کے علاوہ اور جو کچھ آپ اپنی عقل اور سمجھ سے کرسکیں وہ کیجئے گا۔"

"بہت اچھا"

"ایک بات کا خیال رکھیگا۔ اپنا بھید کسی شخص کو بھی چاہے وہ آپ کا کتنا ہی گہرا دوست کیوں نہ ہو کبھی مت دیجئے گا۔ سی، آئی، ڈی محکمہ کا پہلا اصول یہ ہے کہ اپنے افروں

اور مددگاروں کے علاوہ دوسرے کسی شخص کو کبھی اپنا بھید نہ دے چاہے وہ اپنا دوست ہو یا رشتہ دار"

"یہ باتیں میں سمجھتا ہوں۔"

"سمجھنے کو تو بہت سے لوگ سمجھتے ہیں۔ پر ان کے موافق کام نہیں کرتے۔ بہتیرے تو اتنے گدھے ہوتے ہیں کہ اپنے کو سی، ائی، ڈی کا آدمی ظاہر کرتے ہیں۔ اس کام میں کامیابی اُسی وقت ہوتی ہے جب کسی کو آپ کے اصلی منشا اور ارادوں کا پتہ نہ چلے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ آپ مطمئن رہیں۔ جیسا آپ کہتے ہیں ویسا ہی ہوگا"

"تو بس۔ اب میں بے فکر ہوں۔ آپ جب کوئی ضروری بات ہو۔ جیسے کوئی نیا آدمی ایڈیٹر کے پاس آوے اور اُس پر آپ کو شبہ ظاہر ہو یا کوئی ایسا خط ملے، جس میں کوئی شبہ کی بات ہو تو اس کی اطلاع میرے دفتر میں دیجئے گا۔"

"بہت اچھا"

شکل جی چلنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انسپکٹر نے کھڑے ہو کر کہا۔ "یہ تو شاید آپ کو معلوم ہی ہے کہ اس شہر میں آپ کا مددگار کوئی نہیں ہے اور میں اور میرے مددگار آپ کے افسر ہیں"

"یہاں کی مقامی سی، ائی، ڈی۔"

انسپکٹر شکل جی کا جملہ پورا ہونے کے قبل ہی بول اٹھا۔ "یہاں کی مقامی سی، ائی، ڈی سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کے لئے آپ اتنے ہی اجنبی ہیں جتنا کہ ایک معمولی آدمی کے لئے۔ آپ صرف یہ دو باتیں یاد رکھیں ایک تو یہ کہ آپ یہاں اکیلے ہیں۔ آپ کا کوئی مدد کرنے والا نہیں ہے اور میں اور میرا مددگار آپ کے افسر ہیں۔ یہ میں پہلے بتلا چکا ہوں کہ اپنا راز اپنے مددگار اور افسروں کو چھوڑ کر کسی پر ظاہر نہ کیجئے۔ تو اس سے کیا نتیجہ نکلا؟

"یہی کہ آپ اور آپ کے مددگار کے علاوہ یہاں اور کوئی شخص ایسا نہیں ہے۔ جس پر میں اپنا منشا اور اپنی نیت ظاہر کروں"

"ٹھیک۔! اب آپ اپنا کام شروع کریں۔"

(۲)

شکل جی کو "سوراجیہ سوپان" میں کام کرتے ہوئے تین مہینے گزر گئے ہیں۔ اخبار کے

ایڈیٹر شکل جی سے نہایت ہی محبت کرنے لگے ہیں۔ شام کے وقت کام سے فراغت پاکر شکل جی اکثر ایڈیٹر صاحب کے گھر پہنچ جاتے اور اکثر کھانا بھی وہیں کھاتے ہیں۔ ایڈیٹر صاحب کے چھوٹے بچے ان سے ہل گئے ہیں۔ شکل جی ان کو اکثر کھلایا کرتے ہیں۔ ایک دن شام کے وقت شکل جی ایڈیٹر کے مکان پر پہنچے۔ انہوں نے ایڈیٹر صاحب کے کمرے میں پہنچ کر آواز دی۔ "شانتی کیا کر رہی ہے؟" ان کے آواز دیتے ہی ایک پنج سالہ لڑکی گھر میں سے دوڑی آئی اور چچا چچا کہہ کر ان سے لپٹ گئی۔ شکل جی نے اُسے گود میں اُٹھا لیا اور بولے۔

"کیا کر رہی تھی؟"

لڑکی نے کہا۔ "کچھ نہیں بیٹھی تھی"

"کھانا کھا لیا؟"

"ہاں"

"آپا کیا کر رہے ہیں؟"

"نہا رہے ہیں"

شکل جی لڑکی کو گود میں لئے باہر آ گئے۔ کمرے کے سامنے کچھ تھوڑی سی کھلی زمین تھی۔ وہیں خوب پانی چھڑکا ہوا تھا اور تین چار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ شکل جی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ لڑکی تھوڑی دیر کے بعد اندر چلی گئی۔ لڑکی کے اندر جانے کے پانچ منٹ بعد ایڈیٹر صاحب باہر آئے اور بولے۔ "کہئے شکل جی کیا ہے؟"

"کچھ نہیں ایسے ہی چلا آیا"

"بھوجن کر چکے؟"

"جی ہاں"

"نہ کیا ہو تو یہاں تیار ہے۔ کر لو"

"نہیں میں کھا پی کر آیا ہوں"

"اچھا تو پھر بیٹھو میں بھوجن کر کے ابھی آتا ہوں"

"ہاں آپ بھوجن کر آئیے میں بیٹھا ہوں"

ایڈیٹر صاحب چلے گئے۔ بیس منٹ کے بعد ایڈیٹر صاحب باہر آئے اور شکل جی کے پاس کرسی پر بیٹھ گئے۔ نوکر نے پان دئے۔ پان کھا کر ایڈیٹر صاحب پیٹ پر ہاتھ

پھیرتے ہوئے بولے "آج شام کی ڈاک سے مجھے ایک خط ملا ہے اُس خط کے مطابق کل شام کو تین چار دن کے لئے باہر جاؤں گا"

تلکل جی ڈھیلے ڈھیلے بیٹھے تھے۔ ایڈیٹر صاحب کی بات سُن کر چوکنے ہو گئے اُنہوں نے نہایت اطمینان سے پوچھا۔ "کہاں جائیں گے؟"

"بنارس جاؤں گا"

"کچھ کام ہے؟"

"ہاں وہاں میرے ایک رشتہ دار ہیں۔ اُن کے یہاں شادی ہے"

"بچے بھی جائیں گے"

"نہیں بچوں کو لے جانا جھوٹ ہے گرمی بہت پڑ رہی ہے۔ اکیلے ہی جاؤں گا"

"اچھی بات ہے ہو آئیے"

"لیڈر (افتتاحیہ) اور شذرات آپ کو لکھنے پڑیں گے"

"لکھ لوں گا"

"دوسرے سب کام تو ایڈیٹر لوگ کر ہی لیں گے"

"آپ بے فکر رہیں سب ہو جائے گا"

"مجھے زیادہ سے زیادہ چار دن لگیں گے۔ جس میں ایک دن کے لئے یعنی پرسوں کے لئے تو میں لیڈر دے ہی جاؤں گا اور ممکن ہو تو شذرات بھی لکھ دوں گا۔ باقی تین دن آپ کو سب لکھنا پڑے گا"

"کوئی بات نہیں شذرات تو اکثر میں ہی لکھتا ہوں۔ رہ گیا صرف لیڈر۔ سو تین دن کی تو بات ہی ہے۔ ہاں مقالے اتنے اچھے نہ ہوں گے جتنے آپ کے ہوتے ہیں"

"نہیں آپ بھی اچھا لکھتے ہیں۔ آپ نے ابھی تک دو لیڈر لکھے۔ دونوں اچھے تھے"

"ابھی ابھی مجھے لکھنا وکھنا آتا ہی کہاں ہے۔ ہاں آپ کی خدمت میں کچھ دن رہنے کا عمدہ موقع ملا۔ تو کچھ سیکھ جاؤنگا۔ کل کس ٹرین سے جائیے گا؟

"رات میں دس بجے کے لگ بھگ ایک ٹرین جاتی ہے اسی سے جاؤں گا"

"آپ کے رشتہ دار وہاں کس محلے میں رہتے ہیں؟"

"ٹھٹھری بازار میں رہتے ہیں۔ کیوں؟"

"میں بھی کچھ دن بنارس میں رہا ہوں۔ میں نے خیال کیا شائد میں انہیں جانتا ہوں"
"وہ کوئی مشہور آدمی تو ہیں نہیں۔ معمولی آدمی ہیں برتنوں کی دوکان کرتے ہیں"
"برتن والے تو کئی میرے شناسا ہیں۔ اُن کا نام کیا ہے ؟"
ایڈیٹر صاحب نے نام بتا دیا۔ شکل جی کچھ لمحہ تک سوچ کر بولے۔ "انہیں میں نہیں جانتا"
اس کے بعد تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی بات چیت کرکے شکل جی بولے "اچھا تو اب جاتا ہوں ٹہلتا ہوا دفتر چلا جاؤں گا"
"اچھی بات ہے جاؤ۔ میں بھی اب اوپر چھت پر جا کر لیٹتا ہوں آٹھ تو بجے ہوں گے ؟"
شکل جی اپنی جیبی گھڑی دیکھ کر بولے۔ "ہاں آٹھ بج کے دس منٹ ہوئے ہیں"
وہاں سے چل کر شکل جی سیدھے خفیہ پولس انسپکٹر کے پاس پہنچے۔ انہیں دیکھ کر انسپکٹر نے پوچھا "کہئے کیا خبر ہے ؟"
"خبر یہ ہے کہ کل ایڈیٹر صاحب بنارس جائیں گے۔ دس بجے رات کی گاڑی سے"
"کس کام سے جا رہے ہیں ؟"
"ان کا بیان تو ہے کہ کوئی شادی ہے۔ اُس میں جا رہے ہیں"
"کہاں ٹھہریں گے ؟"
شکل جی نے پورا پتہ دیا۔ انسپکٹر نے کچھ دیر چپ رہ کر کہا: "تین مہینے آپ کو ہو گئے آپ نے ابھی تک کوئی ایسی بات نہ بتائی۔ جس سے کچھ کام نکلتا"
"کوئی ایسی بات ہی نہیں ہوئی۔ ہوتی تو بتاتا"
"ہوئی کیوں نہیں ہوگی۔ پر معلوم ہوتا ہے آپ کو پتہ نہیں چلتا"
"یہ تو ممکن ہے۔ میں دفتر ہی میں رات دن رہتا ہوں۔ ہر ایک آدمی کو دیکھتا رہتا ہوں جتنے خط آتے ہیں۔ انہیں بھی پڑھتا ہوں صرف ایڈیٹر کی ذاتی ڈاک مجھے پڑھنے کو نہیں ملتی"
"وہی تو خاص چیز ہے" انسپکٹر نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔
"وہ تو مجھے دیکھنے کو مل ہی نہیں سکتی"
"ضرورت اسے ہی دیکھنے کی ہے۔ نرے ایڈیٹر کے دوست احباب میں کیا دھرا ہے"
"دیکھئے سعی کروں گا"
"اس سررشتہ میں آپ کی ترقی تب ہی ہو سکتی ہے جب آپ کوئی کام کرکے دکھائیں گے"

"کوشش تو میں ایسی ہی کر رہا ہوں"

"آپ کو تین مہینے کی اور مہلت دی جاتی ہے۔ اگر اتنے عرصے میں آپ نے کوئی کام نہیں کیا تو پھر آپ کو یہاں رکھنا فضول ہوگا۔ سمجھے؟"

"ہاں سمجھ گیا۔ کوشش کروں گا"

"اچھی بات ہے جائیے"

(۳)

ایڈیٹر صاحب کے بنارس جانے کے دو دن بعد شکل جی مہاراج پھر انسپکٹر کے پاس پہنچے انسپکٹر انہیں دیکھ کر کچھ تعجب کے لہجہ میں پوچھا۔ "کہئے کوئی نئی بات؟"

شکل جی نے "سوراج سوپان" کا تازہ نمبر اُن کے سامنے رکھ دیا اور کہا "اس کا لیڈر پڑھ جائیے"

انسپکٹر نے لیڈر پڑھا۔ لیڈر پڑھ چکنے کے بعد اس نے کہا "مقالہ تو بہت ہی سخت ہے۔ اس کے سبب تو ایڈیٹر یقینی پھنس جائیں گے"

"تو بس ٹھیک ہے۔ اسی لئے تو لکھا گیا ہے"

"کس نے لکھا ہے؟"

"میں نے"

"اچھا!"

"جی ہاں! اس دن آپ نے کہا تھا کہ کچھ کام کر کے دکھلاؤ۔ سو فی الحال مجھے یہی سوجھا۔ ایڈیٹر صاحب باہر گئے ہوئے ہیں۔ آجکل میں ہی لکھتا ہوں۔ میں نے سوچا یہ اچھا موقع ہے"

انسپکٹر نے ذرا مسکرا کر کہا۔ "خوب! لیکن اس سے نتیجہ؟"

شکل جی نے سوچا تھا کہ انسپکٹر ان کی اس کارگزاری پر بہت خوش ہوں گے۔ لیکن جب اس نے مذکورہ بالا سوال اٹھایا تو شکل جی کا چہرہ اتر گیا۔ انہوں نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا۔ "نتیجہ؟"

"ہاں اور کیا اس سے اس کے علاوہ اور کیا ہوگا کہ ایڈیٹر کو سال دو سال کی سزا ہو جائے گی۔ بس!"

"اور آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"خالی ایڈیٹر کو جیل ہی جانے سے ہماری کارگزاری ثابت نہیں ہوتی۔ ہم تو یہ جانتے تھے کہ ہمیں اُن کے اُن ساتھیوں اور دوست احباب کا پتہ لگتا جن کے خیالات حکومت کے خلاف ہیں۔ ایڈیٹر کے جیل چلے جانے سے یہ بات نہ ہوگی"۔

شکل جی ہکے بکے ہو کر انسپکٹر کا منہ تاکنے لگے۔ انسپکٹر نے کہا "اب آپ میرا مطلب سمجھے؟"

شکل جی اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولے۔ "جی!"

کچھ لمحہ تک سوچ کر انسپکٹر نے کہا۔ "خیر" اب تو جو ہونا تھا ہو گیا۔ لیکن اب بھی آپ کے لئے بہت وقت ہے اس مقالے کے بارے میں ایڈیٹر کو سزا ہونے میں تین چار مہینے لگ جائیں گے۔ ممکن ہے اس سے زیادہ بھی لگ جائے۔ اس لئے آپ اپنا کام جاری رکھ سکتے ہیں"

شکل جی کی جان میں جان آئی۔ انہوں نے دانت نکال کر کہا "ہاں یہ بات تو ہے۔ ابھی کافی وقت ہے"

ایڈیٹر صاحب نے "سوراجیہ سوپان" کا نمبر میز پر رکھتے ہوئے کہا "مقالہ تو بہت شاندار رہا لیکن کچھ باتیں تو اس میں ایسی آگئی ہیں۔ جن پر اگر سرکار چاہے تو مقدمہ چلا سکتی ہے"

شکل جی نے کہا۔ "چلا سکتی ہے تو چلائے۔ میں اس بات سے ذرا بھی خائف نہیں ہوتا میں تو ہر وقت جیل جانے کے لئے تیار ہوں"

ایڈیٹر نے ہنس کر کہا۔ "لیکن اس معاملے میں تمہیں نہیں مجھے جیل جانا پڑے گا"

"کیوں؟"

شکل جی نے زیادہ تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"اس لئے کہ اخبار کا ایڈیٹر۔ ناشر۔ طابع سب کچھ میں ہی ہوں"

"لیکن مقالہ تو میں نے لکھا ہے"

"تو اس سے کیا ہوا۔ اول تو اس میں تمہارا نام نہیں ہے۔ دوسرے اس کا جواب دہ تو میں ہی ہوں"

شکل جی نے سر جھکا لیا اور بہت سست ہو گئے۔ ایڈیٹر نے شکل جی کی حوصلہ افزائی کرنے کے خیال سے کہا "کوئی زیادہ فکر کی بات نہیں ہے جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا"

شکل جی روتی صورت بنا کر بولے۔ "اگر آپ پر کچھ آنچ آئی تب تو مجھے بڑا ہی افسوس ہوگا"
"افسوس ہونے کی کونسی بات ہے بہت ہوگا سال دو سال کی سزا ہو جائے گی۔ تو کاٹ آوں گا جب اوکھلی میں سر دیا۔ تو موسل کا کیا ڈر؟"
"اجی آپ مجھے آگے کر دیجئے گا۔ میں صاف صاف کہ دوں گا کہ مقالہ میں نے لکھا ہے"
"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پہلے تو اس سے میں بچ نہ سکوں گا اور اگر بچ بھی سکتا۔ تب بھی میں ایسا نہیں کرتا۔ ہمارا یہ قاعدہ نہیں ہے۔ اور ہمارا کیا۔ کسی اچھے ایڈیٹر کا بھی ایسا قاعدہ نہیں ہو سکتا"

"تب تو بڑا برا ہوا"
"کچھ برا نہیں ہوا۔ جو کچھ ہوا سب اچھا ہوا"
اوپر سے کہنے کو تو ایڈیٹر صاحب نے کہ دیا، لیکن دل میں وہ شکل جی کی اس نالائق حرکت پر بہت ہی کڑھے، لیکن اپنا غصہ انہوں نے اس لئے ظاہر نہیں کیا کہ کہیں شکل جی انہیں خائف اور ڈرپوک نہ سمجھے۔ اسی وقت ایڈیٹر صاحب کے ایک دوست آگئے انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔ "کل کے نمبر میں تو بڑے زور کا افتتاحیہ لکھ مارا"
ایڈیٹر صاحب ذرا مسکرا کر بولے "آپ کو پسند آیا؟"
دوست موصوف کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے "مجھے ہی کیا سب ہی کو پسند آیا۔ آپ کو پتہ ہے یا نہیں کل ہرکاروں نے دگنے دام پر نمبر بیچے ہیں"
ایڈیٹر صاحب کا سارا غصہ ہوا ہو گیا۔ ارے تعریف کے باغ باغ ہو کر بولے۔ "اچھا!"
"جی مقالہ بھی تو غضب کا لکھا ہے۔ میں نے تو اُسے تین چار بار پڑھا۔ خوب لکھا ہے واہ وا!"
ایڈیٹر صاحب نے کہا۔ "وہ مقالہ شکل جی کا لکھا ہوا تھا"
گو یہ کہتے ہوئے ایڈیٹر صاحب کو تھوڑا افسوس ہوا، لیکن وہ اتنے تنگدل بھی نہیں تھے کہ شکل جی کو دھتا بتا کر ساری شہرت خود لوٹ لیتے۔ دوست موصوف شکل جی کی طرف دیکھ کر بولے "اچھا" تب تو اور بھی کمال کی بات ہے۔ شکل جی آپ تو چھپے رستم نکلے"
شکل جی دانت نکال کر بولے۔ "اجی میں کیا ہوں؟ یہ سب ایڈیٹر صاحب کی تعلیم کا نتیجہ ہے" "ہاں پھر ان کی تعلیم ایسی ویسی تھوڑی ہی ہو سکتی ہے اس وقت آپ کی ٹکر کا ایڈیٹر

ہندی میں اور ہے کون ؟"

ایڈیٹر صاحب نے دل میں سوچا۔ "چلو حقیقی شہرت تو ہمیں کو حاصل ہے" اس خیال نے ایڈیٹر صاحب کے دل کی پوشیدہ فیاضی کو نمایاں کر دیا اس لئے انہوں نے کہا۔ "تعلیم پانے کے لئے شاگرد میں اہلیت بھی تو ہونی چاہئے۔ شکل جی میں اہلیت ہے اس لئے وہ جلد سیکھ گئے۔ بہت تو ایسے ہوتے ہیں کہ برسوں سیکھنے پر بھی انہیں ایک جملہ لکھنا نہیں آتا۔"

دوست نے غور و تامل سے کہا "یہی بات ہے جس وقت استاد اور شاگرد دونوں قابل ہوتے ہیں تب ہی کچھ ہوتا ہے !"

(۴)

اوپر کے واقعہ کو ہوئے دو مہینے گزر گئے۔ شکل جی کے مقالہ کا چرچا آٹھ دس دن رہا اس کے بعد رفتہ رفتہ لوگ اسے بھول گئے۔ ایک دن علی الصباح پولیس نے ایڈیٹر صاحب کا گھر اور "سوراجیہ سوپان" کا دفتر گھیر لیا۔ دونوں مقامات کی تلاشی لینے کے بعد پولیس ایڈیٹر صاحب کو گرفتار کر کے لے گئی۔ الزام وہی۔ اخبار میں باغیانہ مضمون لکھنے کا۔ لگایا گیا۔ ایڈیٹر صاحب اسی دن ضمانت پر رہا کئے گئے۔ اچھے وقت پر ان کا مقدمہ شروع ہوا۔ حکم سنائے جانے کے چار دن پیشتر ایڈیٹر صاحب نے شکل جی سے کہا "شکل جی میں تو اب جیل جا رہا ہوں"

شکل جی نے سراسیمگی کا اظہار کر کے بولے "کیا یہ یقینی ہے ؟"

"بالکل"

"یہ آپ نے کیسے جانا ؟"

"ارے بھائی یہ تو ظاہر بات ہے۔ جیسی کی افتاد ہے۔ اس کے دیکھتے ہوئے تو بچنا محال ہی ہے۔ آگے خدا کی مرضی ہے۔ ہاں تو میری عدم موجودگی میں اخبار کا سارا بار آپ ہی پر رہیگا"

شکل جی حیرت زدہ ہو کر بولے "مجھ پر رہے گا ؟"

"ہاں آپ پر رہیگا مجھے اور کوئی ایسا شخص دکھائی نہیں دیتا جس پر میں پورا بھروسہ کر سکوں"

شکل جی بت بنے بیٹھے ایڈیٹر صاحب کا منہ تاکتے رہے۔ ایڈیٹر صاحب کہتے گئے "زیادہ سے زیادہ دو برس کی سزا ہوگی۔ وہ برس تک سب آپ کو ہی کرنا ہوگا۔ اگر کوئی قابل

مددگار مل جائے تو اُسے رکھ لیجئے گا۔ سینئر مدیر تو وہیں ہی۔ کام چلتا رہے گا۔ اور ایک مہربانی کیجئے گا۔ جب تک میں رہا ہو کر نہ آؤں تب تک کوئی مقالہ ایسا نہ لکھئے گا جو سرکار کی نظر میں آفت برپا کرے۔ کیوں کہ اگر آپ بھی جیل میں پہنچ گئے۔ تو یہاں کا سب کام چوپٹ ہو جائیگا۔ اور گھر کی دیکھ بھال بھی آپ ہی کیجئے۔ ویسے تو میں نے اپنے ایک رشتہ دار کو لکھ دیا ہے۔ وہ کل پرسوں تک آجائیں گے۔ لیکن نگرانی آپ کی ہی رہے گی۔ وہ فقط گھر کا انتظام سنبھالے رہیں گے۔" شکل جی خاموش بیٹھے رہے۔

ایڈیٹر صاحب نے کہا۔ "آپ تو گُم سُم بیٹھے ہیں کچھ 'ہاں نہیں' تو کہئے۔"

شکل جی بولے۔ 'ہاں نہیں' کیا کہوں مجھے جب یہ خیال آتا ہے کہ صرف میرے باعث آپ پر یہ مصیبت نازل ہوئی۔"

"اس کا خیال آپ بالکل چھوڑ دیجئے۔ یہ کام ہی ایسا ہے۔ اس میں آدمی کا ایک پاؤں جیل خانہ میں ہی رہتا ہے۔ آپ کا کوئی قصور نہیں۔ آپ کے مقالے سے اخبار کو فائدہ ہی پہنچا جب سے وہ مقالہ نکلا ہے تب سے خریداروں کی تعداد بڑھ گئی ہے۔"

"مجھے تو بڑا افسوس ہے۔"

"آپ کا افسوس بیکار ہے۔ ہم لوگوں کا تو یہ کام ہی ہے۔ کل میں آپ کو ایڈیٹر، طابع اور ناشر بنانے کے لئے ڈکلیریشن دلوا دونگا۔ بس پھر میں بے فکر ہو جاؤں گا۔"

شکل جی کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ اس وحشت ناک خبر کے بعد شکل جی انسپکٹر صاحب سے ملے اور انہوں نے سب واقعہ اُسے سنایا۔

انسپکٹر نے کہا۔ "آپ کبھی بھی اس جھنجھٹ میں نہ پڑیے گا ورنہ آپ سی، آئی، ڈی محکمہ سے علیحدہ کر دئے جائیں گے۔"

"لیکن اگر میں اس وقت قبول نہ کروں گا تو اخبار کے بند ہو جانے کا اندیشہ ہے۔"

"بڑی عمدہ بات ہے! ہم تو یہ چاہتے ہی ہیں کہ اخبار بند ہو جائے۔"

"لیکن کل ایڈیٹر صاحب میرے نام سے ڈکلیریشن دینے والے ہیں۔"

"آپ صاف طور پر انکار کر دیجئے۔"

"میں جس مصیبت میں ہوں اس کو دیکھتے ہوئے تو بہت دشوار ہے۔"

"مصیبت کچھ نہیں آپ یہ کام مت کیجئے گا۔ نہ ہو۔ کچھ بہانہ کر کے ٹل جائیے۔"

"کہاں ٹل جاؤں؟"
"کہیں باہر چلے جائیے"
"شکل جی بولے اچھا کوشش کروں گا"
انسپکٹر نے ذرا اکڑک کر کہا "کوشش کے کیا معنی! ہم لوگ ایسا لفظ سننے کے کم عادی ہیں یہ کہئے کہ ایسا ہی ہوگا"
انسپکٹر کا یہ کہنا شکل جی کو برا لگا۔ انہوں نے کہا "اس طرح ایک دم سے بھاگ جانے سے لوگ مجھے کیا کہیں گے اور ایڈیٹر صاحب کیا سمجھیں گے؟"
"اف اوہ! آپ تو بڑے بزرگ معلوم ہوتے ہیں! ایسا ہی تھا تو آپ نے مقالہ لکھ کر انہیں پھنسایا ہی کیوں؟ میں نے تو آپ سے مقالہ لکھنے کے لئے کہا نہیں تھا" انسپکٹر نے بڑی سادگی سے مسکراتے ہوئے کہا
شکل جی کچھ جواب نہ دے سکے۔ انہوں نے اپنا سر جھکا لیا۔
انسپکٹر پھر بولے "اس محکمہ میں مروت و شرافت کام نہیں دیتی۔ اس میں تو بس جو آپ سے کہا جائے اسے آنکھ بند کرکے کیجئے۔ تب ہی آپ اس میں ٹِک سکیں گے اور ترقی کر سکیں گے"
شکل جی نے سوچ کر کہا "اچھی بات ہے"
شکل جی انسپکٹر کے پاس سے چلے آئے۔ رات میں بڑی دیر تک پلنگ پر پڑے پڑے شکل جی اس معاملے کی نسبت غور کرتے رہے۔ ایک جانب اُس کو ایڈیٹر صاحب کی سادگی، اپنے اوپر اُن کی محبت اور اعتماد کا خیال آتا تو دوسری طرف انسپکٹر کی بیرحمی، خودغرضی اور بے مروتی کا دھیان۔ شکل جی نے سوچا "انسپکٹر اور ایڈیٹر صاحب میں سب سے کونسا مالک بہتر ہے ایک تو ہم پر اتنا اعتماد اور محبت کرتا ہے کہ اگرچہ ہمارے باعث ہی وہ جیل جا رہا ہے تاہم وہ سب کچھ ہمیں سونپ جا رہا ہے دوسری جانب ایسا مالک ہے جو پرلے درجے کا خودغرض ہے جو کوشش کا لفظ کہنے پر طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیتا ہے۔ جس کی گفتگو حکومت اور دھمکی سے بھری رہتی ہے۔ جو ہم پر پوری طرح اعتماد نہیں کرتا، جو ذرا سی غفلت ہونے پر ہمارا دشمن بن سکتا ہے"
دوسرے دن شکل جی سے ایڈیٹر صاحب بولے "آج تمہاری جانب سے ڈکلریشن

داخل ہو جانا چاہئے"

شکل جی نے کہا "اچھی بات ہے"

اسی دن ڈیکلریشن داخل کر دیا گیا۔ ڈیکلریشن منظور ہونے کے تیسرے دن حکم سنایا گیا۔ ایڈیٹر صاحب کو ڈیڑھ سال کی سزا اور دو سو روپیہ جرمانہ ہوا۔ ایڈیٹر صاحب کے جیل چلے جانے کے بعد شکل جی نے "سوراجیہ سوپان" کو بڑی قابلیت کے ساتھ ایڈیٹ کیا۔ ڈیکلریشن منظور ہونے کے ایک دن پہلے شکل جی انسپکٹر سے ملے تھے تب سے وہ اس سے نہیں ملے۔ ایک دن راستے میں اس سے مٹ بھیڑ ہو گئی۔ انسپکٹر نے مسکرا کر سادگی سے کہا "اب تو آپ پورے دیش بھگت بن گئے؟"

"جی ہاں آپ اپنا مطلب کہئے"

"میرا مطلب؟ وہ بھی آپ کو جلد معلوم ہو جائے گا۔ افسوس صرف اتنا ہے کہ ایک دن آپ کو بھی جیل کی ہوا کھانی پڑے گی"

"اس کے لئے تو میں خود تیاری کر رہا ہوں۔ صرف ایڈیٹر صاحب کے آنے کی دیر ہے"

"اچھا!" انسپکٹر نے تعجب سے پوچھا۔

"آپ کو شک بھی ہے کیا؟ آخر آپ کی باتوں میں آکر میں نے جو پاپ کیا ہے مجھے اس کا کفارہ بھی تو ادا کرنا ہے۔ بغیر جیل گئے کفارہ ادا ہو گا نہیں"

"اچھا جیل جانے کے لئے کیا کیجے گا؟"

"کچھ نہیں۔ جیسا ایک مقالہ پہلے ایڈیٹر صاحب کو پھانسنے کے لئے لکھا تھا ویسا ہی ایک پھر لکھ دوں گا۔ اور ایڈیٹر صاحب کے رہا ہونے کے ٹھیک دو مہینے پہلے لکھوں گا"

"اگر آپ ہمارا کام کرتے رہتے تو یہ نوبت کاہے کو آتی؟ اس وقت چین کرتے ہوتے"

"بھگوان اس چین سے بچائے۔ اس چین سے یہ بے چینی کہیں اچھی ہے" اتنا کہکر شکل جی چل دیے۔ انسپکٹر ہونٹ چباتا ہوا اُن کی طرف تاکتا رہ گیا۔ (مادھری)

میر کی ایک اور تصنیف

از
جناب سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم۔اے (لکھنؤ یونیورسٹی)

اُردو انشا پردازی کے صدر مجلس اور ادبی و لسانی تحقیق کے خضر طریقت حضرت آزاد مغفور نے اپنی غیر فانی کتاب آبِ حیات میں معلومات کا وہ انبار لگا دیا ہے جو تنگ نگاہوں میں سما نہیں سکتا۔ اور ان کی تحقیق کی وسعت اور جامعیت کا یقین کرنے سے زیادہ آسان یہ معلوم ہونے لگا ہے کہ ان کے اکثر بیانوں کا من گڑھت افسانوں میں شمار کر لیا جائے۔ کوتاہ نظری اور تنگ ظرفی نے ایک ایسی جماعت پیدا کر دی ہے جس نے آزاد پر جا بے جا اعتراض کر دینا اپنی وضع میں داخل کر لیا ہے۔

لیکن دور بیں نگاہیں دیکھتی ہیں کہ یہ حالت بہت دنوں تک قائم رہنے والی نہیں ہے۔ ادبی تحقیق کا ذوق اب ہمارے دلوں میں گھر کر رہا ہے۔ اور اپنے ادبی دفینوں کی تلاش میں خاک چھاننے کی دھن پیدا ہو چلی ہے۔ یہ ذوق ذرا اور ریختہ اور یہ دھن کچھ اور پکی ہولے اور تحقیق کے راستوں کی مصیبتوں اور خطروں کا احساس عام طور پر ہونے لگے تو یہ عارضی "آزاد بیزاری" بے شبہ "آزاد پرستی" میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس وقت بھی ادبی تحقیق میں آزاد ہی کو یہ مرتبہ حاصل ہے کہ ان سے اختلاف کرنا محقق ہونے کی سند سمجھا جاتا ہے۔

آزاد کے خلاف جو بدظنی پھیل رہی یا پھیلائی جا رہی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں آبِ حیات میں کسی ایسی چیز کا ذکر دیکھا جو ہماری دسترس سے دور یا ہمارے علم سے باہر ہے اس کو آزاد کا گڑھا ہوا افسانہ سمجھ لیا۔ آزاد کی تحقیق میں غلطیاں ممکن ہیں اور کسی محقق کو غلطیوں سے مفر نہیں۔ لیکن جو لوگ تحقیق کی غلطی اور افسانے کی تصنیف کا فرق سمجھتے ہیں اُن کی نظر میں آزاد محقق ہی ٹھیرتے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ آزاد تحقیق کو افسانے سے زیادہ دلچسپ بنا سکتے ہیں۔ انشا پردازی کا یہ کمال اگر کسی اور کے حصے میں نہ آیا ہو تو آزاد سے نہیں فطرت سے لڑنا چاہیے۔ آزاد کی تحقیق اور انشا پردازی پر مفصل بحث کرنے کا یہ محل

نہیں ہے لیکن ع دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے۔

میر تقی میر کے بارے میں آزاد کی بہت سی مفروضہ غلط بیانیاں دکھائی جا چکی ہیں۔ انہیں کی تصانیف میں آزاد نے رسالۂ فیض میر[1] کو بھی شمار کیا ہے۔ جس وقت تک یہ رسالہ دنیا کی نگاہ سے اوجھل تھا اس وقت تک وہ آزاد کی تصنیف کیا ہوا افسانہ تھا۔ آج یہ رسالہ آنکھوں کے سامنے موجود ہے[2]۔ اب دیکھئے وہی افسانہ ایک حقیقت بن گیا۔ اسی طرح ادبی تحقیق جس قدر بڑھتی جائے گی آزاد کے افسانے حقیقت بنتے جائینگے۔

آزاد نے ہم کو بہت سی راہیں پہلے پہل دکھائی ہیں اور بہت سی کہانیاں پہلے پہل سنائی ہیں۔ اگرچہ بہت سی باتیں آزاد نے ایسی کتابوں سے لی ہیں جو طاق نسیاں کا نقش و نگار ہو گئیں یا جن کا ایک آدھ بوسیدہ کرم خوردہ نسخہ دنیا کے کسی گوشے میں پڑا ہوا ہے۔ تاہم چونکہ اُن کو منظر عام پر لانے کا سہرا حضرت آزاد ہی کے سر ہے لہذا ان باتوں کے علم کیلئے بھی ہم آزاد ہی کے منت گزار ہیں۔ فیض میر کا نام بھی انہیں کی بدولت ہم تک پہونچا۔ مگر آزاد نے اس رسالے کا فقط نام ہی لکھا ہے۔ غالباً یہ رسالہ اُن کی نظر سے نہیں گزرا۔ ورنہ وہ اس کے موضوع وغیرہ کا کچھ ضرور ذکر کرتے۔

فیض میر کے ذکر سے اکثر تذکرے خالی ہیں۔ البتہ محسن نے میر کی تصنیفوں کی فہرست ان لفظوں میں دی ہے:۔

"چھ دیوان ہندی مع قصائد و مثنوی۔ ایک دیوان فارسی۔ ایک تذکرہ۔ ایک رسالہ فیض میر[3] اس کی یادگار ہے"

مولف تذکرہ کے قلم کی لغزش ہو یا کاتب کی اصلاح۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ میر فیض وہی رسالہ مراد ہے جس کا صحیح نام آزاد نے فیض میر بتایا ہے۔

ایک زمانہ ہوا کہ اودھ کے شاہی کتب خانوں کی فہرست میں میں نے ذکر میر[4] کا نام دیکھا۔ حضرت میر کی خود نوشتہ سوانح عمری کی زیارت کے لئے دل بے چین ہو گیا۔ میں ان دنوں قدیم اور کم یاب کتابوں کی تلاش میں لکھنؤ کی گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ میری آنکھیں ذکر میر کو ڈھونڈتی تھیں۔ لیکن اس کا پتہ کہیں نہ لگتا تھا۔ طلب صادق کی کشش دیکھئے کہ ایک مدت کے بعد میر کی غیر مطبوعہ اور نہایت کم یاب تصنیفوں کا ایک مجموعہ ہاتھ آ گیا

---

[1] رسالۂ فیض میر زیر طبع ہے۔ عنقریب شائع ہو نے والا ہے۔ [2] آب حیات صفحہ ۲۰۷ [3] تذکرۂ سراپا سخن صفحہ ۲۶

[4] فہرست کتب خانہائے اودھ مرتبہ ڈاکٹر اسپرنگر صفحہ ۶۲۲

اس مجموعے میں ذکر میر بھی تھی۔ میر کا فارسی دیوان بھی تھا۔ اور رسالۂ فیض میر بھی تھا۔ اس گنج بادآورد کے ملتے ہی مجھے خیال ہوا کہ جس گلدستہ سے میں نے اپنی آنکھیں روشن کی ہیں اس سے ارباب ذوق کی نگاہوں کی بھی ضیافت کروں۔ ذکر میر کی اشاعت طے ہوئی۔ کاتب تلاش کیا گیا۔ مقدمہ لکھنے کا سامان ہونے لگا۔ یہاں تک کہ کتاب کی نقل بھی ختم کے قریب پہونچی۔ لیکن اس کتاب کی اشاعت کی سعادت میری قسمت میں نہ تھی۔ یکایک رسالۂ اردو نے خبر دی کہ انجمن ترقی اردو عنقریب ذکر میر کو شائع کرنے والی ہے۔[1] غرض کہ یہ محنت رائگاں ہوئی اور دل کی آرزو ایک سنگ بچہ کر رہ گئی۔ مگر میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ ایسا ہو چکا تھا کہ کسی کام کو شروع تو میں نے کیا لیکن ختم کسی اور نے کر دیا۔ بہرحال ذکر میر شائع ہو گئی اور دنیا نے دیکھ لیا کہ جو قلم اردو نظم کے سینہ میں کوثر اور سلسبیل بہاتا تھا۔ وہ فارسی نثر میں بھی کیا کیا گلکاریاں کرتا ہے۔ نکات الشعرا نے میر کی فارسی انشا پردازی کی سند میں جو عذر پیش کیا تھا اس پر ذکر میر نے ایک مہر اور لگا دی۔

نکات الشعرا اور ذکر میر دو آئینے ہیں کہ میر کی سوانح نگاری کے جوہر دکھاتے ہیں اگر میر کے قلم کی رفتار تصوف اور الٰہیات کی دشوار گزار منزلوں میں دیکھنا ہو تو فیض میر پڑھئے فیض میر ایک مختصر رسالہ ہے مصنف نے نہایت مختصر حمد و نعت کے بعد لکھا ہے:۔

"میگوید فقیر حقیر میر محمد تقی متخلص بہ میر کہ دریں ایام فیض علی پسر مرا ذوق خواندن
ترسل پیدا کردہ بود۔ لہٰذا حکایات خمسہ متضمن فوائد بسیار را باندک فرصت نگاشتم مراعات
رسم او نمودہ نام نسخہ فیض میر گذاشتم"

یہ عبارت بتاتی ہے کہ میر نے یہ رسالہ اپنے بیٹے فیض علی کے لئے لکھا اور انہیں کے نام کی رعایت سے اس کا نام فیض میر رکھا۔ میر صاحب! سبحان اللہ! سبحان اللہ! آپ کے ذوق لطیف اور حسن تلاش کی داد کون دے سکتا ہے! کتاب کس نے لکھی۔ کس کے لئے لکھی۔ اور کس موضوع پر لکھی۔ مذاق سلیم ان سب باتوں پر نظر کرتا ہے اور اس تمام کے مزے لیتا ہے۔

میر کی عبارت جو اوپر نقل کی گئی ہے اس سے ظاہر ہے کہ رسالۂ فیض میر میں پانچ حکائتیں بیان کی گئی ہیں۔ لیکن یہاں حکایت سے مراد نہ بادشاہوں اور وزیروں

---

[1] رسالہ اردو بابت اپریل ۱۹۲۶ء

کے قصے ہیں نہ دیوؤں اور پریوں کی کہانیاں۔ ان حکایتوں میں میر نے اللہ والوں کے حالات اور پیروں کی کرامات بیان کی ہے اور جو کچھ لکھا ہے وہ سنی سنائی نہیں آنکھوں سے دیکھی باتیں ہیں۔ یہ واقعات ہوں یا میر کی خوش عقیدگی کے کرشمے۔ بہر حال ان کی روشنی میں میر کی ذہنیت صاف نظر آتی ہے۔ اور واضح ہو جاتا ہے کہ شاعروں کے پیر[1] حضرت میر ایک فقیر منش بزرگ تھے۔ درویشوں سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ ان کی خدمت کو اپنی عزت اور ان کی دلجوئی کو فرض انسانیت سمجھتے تھے۔ ان کو خدا رسیدہ جانتے اور صاحب کرامات مانتے تھے۔ تصوف اور الٰہیات کے مسائل سے بڑی دلچسپی تھی۔ اُن کو غور سے سنتے تھے اور سمجھتے اور یاد رکھنے کی کوشش کرتے تھے جس کی تربیت میر علی متقی اور میر امان اللہ[2] کی گود میں ہوئی ہو اُس کی طبیعت کا اندازہ کیا ہوتا۔

میر کی شاعری کو بخوبی سمجھنا ہو تو خود میر کو سمجھئے اور میر کو سمجھنا ہو تو ذکر میر اور فیض میر پڑھئے۔ حقیقت یہ ہے کہ میر کے کلام کی تہ کو پہونچنے کے لئے ان دونوں کتابوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ذکر میر اگر میر کے ماحول کا صحیح نقشہ ہے تو فیض میر اُن کی سیرت کی سچی تصویر ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب سے صوفیوں کا انداز طبیعت۔ پرواز خیال۔ اور طرز کلام بھی خوب سمجھ میں آتا ہے۔ اس لئے عشق حقیقی کے معاملات اور تصوف کے خیالات جو ہماری شاعری کو زینت دیتے ہیں اُن کے ذہن نشین کرنے میں بھی اس رسالے سے بہت مدد ملے گی۔

میر کی معاشرت۔ حالات زندگی اور تعلقات خاندانی کے بارے میں اس رسالے سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ میر کے یہاں ایک غلام اور ایک بوڑھی خادمہ تھی۔ منہ ہاتھ دھونے کے لئے طشت و آفتابہ استعمال کرتے تھے۔ شہسواری جانتے تھے۔ گر گھر میں گھوڑا نہ تھا۔ اکبرآباد کو چھوڑ کر دہلی میں رہنا شاق تھا۔ ان کے ایک بیٹے فیض علی تھے اور ایک عزیز محمد حسین کلیم تھے جو اسحاق خاں شہید کے چھوٹے بھائی مرزا محمد علی کے یہاں پچاس روپے ماہوار پر نوکر تھے۔

میر کو فارسی زبان پر جو عبور تھا اور فارسی نثر لکھنے کی جو قدرت تھی وہ ان لوگوں سے پوشیدہ نہیں ہے جنھوں نے میر کی خود نوشتہ سوانح عمری ذکر میر اور اُن کا تذکرہ نکات الشعرا

[1] میر خود کہتے ہیں ع۔ گرچہ بوڑھا ہوں ہیں نوجواں پر شاعروں کا پیر ہوں۔ [2] ذکر میر صفحہ ۱۰

دیکھا ہے۔ میر کے ہمعصر بھی اُن کی نثر نگاری کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے میر حسن نے اِن کی نظم کے ساتھ نثر کی بھی تعریف کی ہے:۔

"چراغ نثرش روشن وساحت نظمش گلشن"[1]

میر بالعموم مقفّیٰ عبارت لکھتے ہیں لیکن قافیہ کے التزام سے عبارت کی شگفتگی، بےساختگی اور روانی میں فرق نہیں آتا۔ شائد کہیں کہیں کچھ تصنع پیدا ہو گیا ہو لیکن زیادہ تر عبارت کا حسن بڑھ جاتا ہے۔ ہم قافیہ فقروں اور جملوں کی قید سے عبارت میں اکثر یہ نقص پیدا ہو جاتا ہے کہ ہر فقرے اور جملے کے بعد جو دوسرا جوابی فقرہ یا جملہ آتا ہے اس میں کبھی پہلے فقرے یا جملے کے مفہوم کی بیجا تکرار ہوتی ہے اور کبھی بے ضرورت لفظوں کی بھرتی ہوتی ہے۔ اس سے عبارت میں تصنّع۔ طوالت۔ اور سستی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن میر کے یہاں یہ نقص نہیں ہے۔ ان کے یہاں جوابی فقرے اور جملے بھی چست ہوتے ہیں اور اپنا مفہوم علیحدہ رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ جس عبارت میں بڑے بڑے جملوں کے آخر میں قافیہ لایا جاتا ہے۔ وہ اکثر بے لطف معلوم ہوتی ہے لیکن میر کے یہاں چھوٹے چھوٹے جملوں بلکہ دو لفظی اور سہ لفظی فقروں کے بعد قافیہ آتا ہے تو عجب بہار دکھاتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

"پسراو راخوں بگیرد۔ خودش بخواری بمیرد۔ ناگہاں آتش در افتد۔ رسم باش و بود برافتد۔ ازیں آثار نماند۔ اینجا دیار نماند۔ آبادی غیرت وادی شود۔ مار بہ عصا راہ رود۔ مرداں تباہ۔ خانہا سیاہ۔ ازیں سرتا بہ آں سر ویرانہ۔ ایں باہم نشستنہا افسانہ۔ محلا اب بعد۔ اینجا تو نبید"

"اں سرمایۂ جانہا کہ مقصود دلہاست آئنہ در پیش دارد۔ و سر با خویش گرم تماشائے خود ست۔ دمحو سراپائے خود۔ اگر بر آسمان ہفتم بردی بے پرواست۔ و در خاک شوی ہماں گرم استغنا۔ بیرنگی او رنگہا دار۔ و ساز وحدتش آہنگہا۔ شفق یا دمی دہد از رنگ آتش۔ گل میگوید کہ گل بجالش"

"نومیدی از برائے چہ مقصود ہمکنارست۔ دل تنگ چرا نشستہ کہ عالم ہمہ یارست۔ برخیز سیاحت کن۔ خوش باش و فراغت کن۔ بر خاستم ہمراہ شدم۔ اگاہے بود آگاہ شدم"

"خدا طرفہ خود آراست۔ عجیب دلبر خود نماست۔ گرد راہش قیامت انگیزد۔ دطرز خرامش بلاہا ریزد۔ کار او ہیچ بفہم در نیاید۔ دانش عتریف بعجز می نماید۔ حیران کار خردمند۔ دعجب وقت پسند او۔ سرگرم کار۔ فکر در آثار۔ آگاہ ناآگاہ۔ دلیل گمراہ۔ ادراک فہم۔ ایں جا ہمہ وہم"

---

[1] تذکرہ میر حسن صفحہ ۱۷۵

میر اپنی نثر میں عام طور پر قافیے کا التزام کرتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ قافیے کی تلاش میں مطلب کی راہ بھول جائیں اور نہ یہی ہے کہ بغیر قافیہ کے قدم آگے نہ بڑھائیں ایسے جملے اور فقرے بکثرت ہیں جن کے جوابی جملے اور فقرے نہیں لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ کہیں کہیں دور تک نثر عاری لکھتے چلے گئے ہیں مثلاً :۔

"باآنکہ محو یاد الٰہی می بود اما ربطہ درستے باشعر و شاعری داشت۔ یکے دم صبح مرا خواست۔ چوں حاضر شدم گفت کہ خفقان بشارت دارم۔ واشدے نمیشود۔ شعرہائے عاشقانہ بخواں کہ زار بگریم۔ اتفاقاً ایں شعر از زبان من برآمد ؎

صبر پیش دل تو شکیب من تاش ۔۔ کاز برائے تپیدن بہانہ می طلبد

دست بر دل نہاد و غش کرد۔ مردماں بر دوستش برداشتہ۔ اندروں خانہ بردند۔ از اں بعد بیروں نیامد۔ دو سہ روز حال عجبے داشت۔ گاہے غش و گاہے افاقت۔ آخر در گزشتہ خدائے کریمش بیامرزاد۔"

توصیفی فقروں کے بنانے میں میر کو بڑا کمال حاصل تھا۔ وہ جب کسی کے اوصاف بیان کرنے پر آتے ہیں تو چھوٹے چھوٹے فقرے پے در پے لکھتے چلے جاتے ہیں۔ ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

"اسد دیوانہ۔ ساکن ویرانہ۔ سالک مجذوب۔ درویش خوب۔ رند بوریا پوش۔ چوں بحر در جوش۔ مردے بود کامل۔ ہمہ تن دست و دل۔ بالا بلند۔ دقت پسند۔ گرم جوش۔ سراپا ہوش۔ چسپاں اختلاط۔ خوش ارتباط۔ وضع مربوط حال مضبوط۔ دل با یار و دست در کار۔ قائم اللیل صائم النہار .... رو از دنیا برتافتہ۔ عارف قرار یافتہ .... چادر بر دوش۔ بایک ستر پوش۔ پابے کفش سر عریاں۔ گاہے خنداں گاہے گریاں۔"

"دلیل راہ عرفاں۔ میاں شاہ برہاں۔ دست از دنیا برداشتہ۔ قدم براہ فنا گزاشتہ آوارۂ بمنزل رسیدہ۔ بہ گلیم سیہ سر درکشیدہ۔ سفید گو برہنہ تن۔ باسعی در یک پیرہن۔"

میر کو فلسفۂ الٰہیات کے مسائل سے دلچسپی تو تھی ہی وہ ان کو بڑی خوبی سے بیان بھی کر سکتے تھے جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے ظاہر ہے :۔

"لذت دریافتن چیزے ملائم است۔ والم دریافتن چیزے منافی آں۔ ہر قوت را لذتے

مدرکاتِ لذت والم است بحسب آں قوت ۔ چنانکہ لذت باصرہ در دیدن محبوب و لذت سامعہ در سمع آواز خوب ۔ چندانکہ مدرک عظیم تر لذت قوی تر ۔ وگراز ضداد است ۔ رنج والم زیاد است ۔ چوں ہیچ مدرک شریف تر از ذات و صفات واجب الوجود نیست پس ہیچ لذتِ لذیذ تر ۔ از معرفت او نباشد ۔ وقوتہائے جسمانی بابدن می روند یعنی از فنائے آں باطل می شوند ۔ قوت عقلی کہ لذت والم را می داند بانفس ناطقہ باقی میماند ۔ ادراک نفس متعلق بہ بدن قاصر و مجرد در مشاہدۂ جمال او ناظر"

"در اثبات بعث و حشر دلائل بسیار است ۔ اما عود نفس بہماں بدن دشوار است ۔ مثلاً آدمی مرد و خاکش ہمہ خورد ۔ و پس از روزگار طویل اجزائے ارضی بہ نبات تحلیل ۔ نبات غذائے حیوان شد و حیوان غذائے انسان ۔ اگر ہمت بر حشر برگمارند بکدام صورت باز آرند معہذا النفوس مفارقہ را غایت نیست و ابدان و مادہ را نہایت ۔ اگر حشر کنند و بہ قسمت مواد گرایند نفوس از مواد البتہ بیشتر آیند ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حقیقت جانِ آدم قدیم است بذات خویشتن ۔ و گفتگوئے قالب در اینجا بر قالب زدن ۔ گماں مبر کہ معنی مرگ نیستی جانِ عزیز است ۔ ایں انقطاع تعرف آں از قالب ناچیز است ۔ معنی بعث و حشر نہ آں باشد کہ جان را قالب ہماں باشد ۔ قالب مرکبے بیش نیست از بدل آں چہ زیان است رخت تازہ باسوار است ۔ سوار خود ہماں است"

بہشت و دوزخ کہ قالب در آں شریک است متعارف است حاصلِ یکے حور و قصور و انہار و اشجار ۔ حاصل دیگرے زہر و زقوم و نار و مار ۔ اما بہشت و دوزخ روحانی یعنی لذت والم جانی حاصل آں دریافت معقولات و مشاہدۂ آں ماہ تمام ۔ حاصل ایں شرم و خجالت و سوختگی و آلام ۔ حکما میگویند کہ نفس را بعدِ موت لذت عظیمے است کہ لب بتوصیف او نتواں کشاد ۔ یا الم الیمے است کہ شرح آں نتواں داد ۔ اشارت بہ ہمیں دو حال است نفوس کاملہ را لذت دوام ناقصہ را رنج والم مدام"

میر کے قبضے میں فارسی لفظوں اور محاوروں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے ۔ اور اُن کے استعمال پر اُن کو جو غیر معمولی قدرت حاصل ہے اس کے ثبوت میں کوئی مثال پیش کرنے کی ضرورت نہیں ۔ کتاب کا ہر صفحہ اس پر شہادت دے رہا ہے ۔

فیض میر کا زمانۂ تصنیف نہیں معلوم ہو سکا۔ اتنا پتا تو چلتا ہے کہ میر نے یہ رسالہ دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد۔ میر محمد حسین کلیم کی زندگی میں اور میاں سعید خاں کے انتقال کے بعد لکھا ہے۔ لیکن کلیم اور سعید خاں کے انتقال کی تاریخ بھی معلوم نہیں ورنہ اس رسالہ کی تصنیف کا زمانہ معین کرنے میں کچھ مدد ملتی۔

غزل

از

جناب صفی اورنگ آبادی (حیدرآباد)

خیال بھی دلِ بیمار کا ذرا نہ ہوا
خوش آمدید! کہاں تھے؟ بہت زمانہ ہوا!

وہ واقعات کہ [illegible]
کسی نے کیا نہ کیا [illegible] یہ کیا نہ ہوا

جوابِ شکوہ بھی کیا خوب ہیں [illegible]
ترا یہ وہم ہے؟ تو تو کبھی خفا نہ ہوا

نہ جانے ہوتی ہے پھر اور عاجزی کیسی
یہ سر کبھی ترے قدموں سے تو جدا نہ ہوا

کیا جب آنے کا اقرار آپ بھول گئے
یہ ایک وعدہ تو شاید کبھی وفا نہ ہوا

وہ سب کے واسطے اچھا ہو میرے حق میں نہیں
ہزار شکر! کہ جو کچھ ہوا برا نہ ہوا

زمانہ آپ کو عاشق نواز کہتا ہے
یہ سچ بھی ہو تو کبھی ہم کو کچھ عطا نہ ہوا

مجھے کیا ہی اچٹتی نگاہ نے بسمل
مبارک آپ کا یہ تیر بھی خطا نہ ہوا

جواب اگر نہیں دیتے تو زہر دیدیجے
برے ہوئے بھی تو دل آپ کا برا نہ ہوا

زمانہ دوسرا، دل دوسرا ہوئے تو ہوئے
وہ دوسرے نہ ہوئے میں تو دوسرا نہ ہوا

غمِ فراق بھی تھی کس مزے کی چیز کہ ہائے
کبھی زباں سے ترا شکریہ ادا نہ ہوا

ستم کرے بھی تو سمجھوں کہ یہ ستم نہیں ہے
خفا ہوا بھی تو جانوں کہ تو خفا نہ ہوا؟

وہ اب نہ آئے تو جانو کہ موت ہی آ لی
ہمیں تو پہنچ گئے نالہ اگر رسا نہ ہوا

جنابِ دل! یہ لب و لہجہ اور وہ دعوے؟
خطا معاف! خوشامد ہوئی گلا نہ ہوا!

وہ خود ملیں تو بتا۔ کیا جواب دوں اے دل! یہ عذر لنگ ہے کہ کوئی بھی رہ نما نہ ہوا

وہ کیا کہیں گے جو قبال ہی نہ ہو مجھ کو؟ وہ کیا کریں گے جو میں قائل خطا نہ ہوا؟

کسی کا درد محبت اگر تھا کم مایہ تو ٹھیر ٹھیر کے پھر کیوں ذرا ذرا نہ ہوا

فراق دوست سے بھی جاں بچ گئی افسوس! یہ زہر بھی تو مرے درد کی دوا نہ ہوا

وہ خوش یہ ہے! کہ کبھی اُس نے مجھ کو خوش نہ رکھا بھلا ہو اُس کا! کہ اُس سے مرا بھلا نہ ہوا

ہم اُن کے سامنے مجبور ہو کے رو دیں گے اگر زباں سے اک حرف بھی ادا نہ ہوا

ترے سوال کا اب کیا جواب دوں ناصح! یہ کب کی بات ہے۔ مدت ہوئی! ارمانہ ہوا!!

زمانہ دیکھ نہ لے چشم دل سے کیا دیکھوں اس آنکھ کو تو پلک کا بھی آسرا نہ ہوا

خدا کے سے دولتِ دنیا ضعیفی میں کیا مانگوں

غضب ہوا جو مرا کام بے دعا نہ ہوا

سرمایہ داروں کے لیے زرین موقع

ملک میں علم و ادب کی خدمت کے لئے ملک والوں کے فائدہ ہی کے لئے ملک ہی کے مشترکہ سرمایہ سے بڑے پیمانہ پر تجارتی کاروبار چلانے کی غرض سے انجمن امداد باہمی مکتبۂ ابراہیمیہ محدود کی بنیاد ڈالی گئی اور انجمن ہائے امداد باہمی ملک سرکار عالی کی تحت رجسٹری کرائی گئی ہے۔

انجمن کا کاروبار تین شعبوں پر منقسم ہے:۔

(۱) **تجارت کتب** (۲) **اشاعت کتب** (۳) **طباعت**۔ اس انجمن کو اتحادی طور پر کام کرتے ہوئے چوتھا سال ہے۔ تین سال سے اپنے حصہ داروں کو سالانہ (۱۰) فیصدی نفع علاوہ زکوٰۃ کے تقسیم کر رہی ہے۔ انجمن کا مجوزہ سرمایہ ایک لاکھ روپے کے (۱۰۰۰) حصوں پر مشتمل ہے۔ ہر ایک حصہ کی قیمت ایک سو روپیہ ہے اور ہر حصہ کی ادائی (۲۰) اقساط ہیں۔ اجرا شدہ سرمایہ پچاس ہزار روپے۔ قیمت فروخت شدہ حصص۔ انتیس ہزار روپیہ شرکت کے فارم اور قواعد و ضوابط کے لئے ذیل کے پتہ پر درخواستیں آنی چاہئیں۔

منتظم انجمن امداد باہمی مکتبۂ ابراہیمیہ محدود اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

فن تقریر

از

(جناب غلام اطہر صاحب عثمانی (عثمانیہ کالج)

تقریر و تحریر دونوں کا نقطۂ ابتدا یہ ہے کہ پہلے مضمون کی تشریح کردی جائے۔ کیونکہ اس طرح سامعین یا ناظرین مقرر یا انشا پرداز کے مقصد سے واقف ہو جاتے ہیں اور پھر بعد میں وہ جو کچھ کہتا یا لکھتا ہے اس کے سمجھنے میں بھی آسانی ہو جاتی ہے۔ سمجھ لیجئے کہ تقریر و تحریر کا یہی ایک گر ہے۔ اسی بنا پر میں بھی پہلے اصل مضمون کی تشریح مناسب سمجھتا ہوں۔

"فن تقریر" میں دو لفظ ہیں۔ فن اور تقریر۔ فن کی اصطلاح گو عام ہے مگر غلطی سے اُسے علم کا مرادف سمجھ لیا گیا ہے۔ علم صرف جاننا سکھاتا ہے اور فن کرنا۔ ایک شخص علم موسیقی کا ماہر ہو سکتا ہے لیکن اس کے لئے یہ لازمی نہیں کہ وہ گا بھی سکتا ہو مگر جب فن موسیقی کا ماہر کہا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ بہترین گانے والا ہے۔ غرض فن کا عملیت سے بہت گہرا تعلق ہے۔

اب تقریر کو لیجئے۔ دنیا میں تبادلۂ خیالات کے دو ذرائع عام ہیں۔ تقریر و تحریر۔ ان میں وجود کے لحاظ سے تقریر کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔

جب "فن تقریر" کہا جائے تو اس سے یہ مراد لینی چاہئے کہ ایک یا چند آدمیوں نے بیٹھ کر گفتگو کے چند اصول یا قواعد بنا لئے اور اُسے فن کا جامہ پہنا دیا۔ وہ زمانہ بھی تھا جب نہ گفتگو کی ضرورت تھی نہ اس کا وجود۔ جیسے جیسے آدم و حوا کے سادہ لوح بچے کائنات کی رنگینیوں سے متاثر ہوتے گئے دنیا کے اسرار نہاں ایک ایک کرکے ان پر عیاں ہوتے گئے، ان میں اجتماعیت کی روح دوڑتی گئی۔ انہیں نئی نئی ضرورتیں پیدا ہوئیں۔ انہیں اظہار مطالب کی ضرورت ہوئی۔ پہلے پہلے اشاروں ہی اشاروں میں باتیں ہوئیں۔ پھر زبان ٹوٹی۔ انسان اور زمانہ کے ساتھ گفتار نے بھی ارتقائی

منازل طے کئے تا ایں کہ آج اُس نے فن کا جامہ پہن لیا۔ اب ہم اُسے ترسیل خیالات کا صرف سادہ ذریعہ ہی نہیں بلکہ اس سے بھی کچھ اعلیٰ شئے سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اُسے حاصل کرنے کی خاص طور پر کوشش کرتے ہیں اور اس کوشش کے مظاہر ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ اب رہا یہ کہ یہ کوشش کیوں کی جاتی ہے؟ اس کا جواب انشاء اللہ آگے دیا جائیگا۔ پہلے میں ایک اچھی تقریر کے اجزا ضروری بیان کر دینا چاہتا ہوں۔

ایک کامیاب تقریر کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ سامعین کے معیار علم کے مطابق ہو۔ نہ تو اُن کی دماغی سطح سے بلند ہو نہ پست۔ اگر ایسا نہ ہو تو گو آپ اپنے دماغ کے جواہر ریزے ہی اُن کے سامنے کیوں نہ پیش کریں لیکن اگر سامعین کے دماغ انکی کسوٹی نہیں ہیں تو وہ آپ کے جواہر ریزوں کو معمولی شیشے کے ٹکڑوں سے زیادہ وقعت نہیں دینگے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ مقرر کو تا بحدِ امکان سامعین کی توجہ کو اپنی طرف مصروف رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس کا نفسیاتی طریقہ یہ ہے کہ اپنی تقریر کے تہیج کو دوسرے خارجی تہیجات سے زیادہ شدید اور دلچسپ بنائے۔ مثلاً تقریر میں موسیقیت پیدا کرنے کی کوشش کرلے۔ موسیقیت سے آپ یہ نہ سمجھئے کہ وہ راگ میں تقریر کرے۔ بلکہ اُس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح موسیقی کے سُروں میں تناسب اور پورے گانے میں ایک خاص طرح کا ربط ہوتا ہے یہی حال تقریر کا بھی ہونا چاہیئے یعنی الفاظ میں برجستگی ہو۔ تقریر میں تسلسل اور تناسب ہو کہ جب تقریر ختم ہو تو سامعین اس طرح چونکیں جیسے راگ ختم ہونے پر انتہائی محویت سے چونکتے ہیں۔ جس طرح ایک اچھا گانا سنکر معمولی سے معمولی آدمیوں کے قلوب بھی رقص کرنے لگتے ہیں اسی طرح بہترین تقریر کی خصوصیت ہونی چاہیئے اس سے سامعین محظوظ بلکہ متکیف ہو جائیں۔

تقریر میں تمام امور سلسلہ وار اور اپنی اپنی جگہ پر بیان کئے جائیں ورنہ تقریر کی حالت ویسی ہی ہوگی جیسی اس نظم کی جس میں اشعار کے مصرعے تبدیل کر کے بے موقع مصرعوں کے ساتھ جوڑ دئے گئے ہوں۔

تیسری بات یہ ہے کہ تقریر کرنے سے پہلے مقرر کو سامعین کی ذہنی حالت کا اندازہ لگا لینا چاہیئے اور یہ بھی معلوم کرلینا چاہیئے کہ اُن کے خیالات کا بہاؤ کدھر ہے۔ تھوڑی دور تک اُن کے ساتھ جانا چاہیئے اور پھر اُن کو اس طرح موڑ کر اپنے راستے پر لگا لینا چاہیئے۔

کہ انہیں کوئی اجنبیت نہ محسوس ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو مقرر اور سامعین کے خیالات میں تصادم ہو جائے گا اور ایسی تقریر سے سامعین کو وہی تکلیف ہوگی جو انتہائی تیزی سے دوڑتے ہوئے کو یکایک رک جانے سے ہوتی ہے۔ اس نکتہ کو وہ لوگ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے شکسپیر کے ڈرامہ "جولیس سیزر" میں مارک انتونی کی وہ تقریر پڑھی ہے جو اُس نے سیزر کے جنازہ پر کی۔

ایک اور بات قابل لحاظ یہ ہے کہ تقریر کو زمانہ کے مطابق سانچوں میں پیش کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ یعنی زمانہ کا جو عام میلان ہو اپنی تقریر کو اسی میلان کا رنگ دیکر پیش کرنی چاہئے۔ مثلاً آجکل زمانہ کے خیالات سائنٹفک اور فلسفیانہ ہیں۔ صرف دعوؤں سے کام نہیں چلتا۔ بلکہ دیکھنے والے دعوے کے ساتھ دلائل بھی طلب کرتے ہیں۔ تا اینکہ مذہب جسے استدلال سے اصولاً کوئی سروکار نہیں وہ بھی آجکل استدلال کا جامہ پہنا کر پیش کیا جاتا ہے اس کے علاوہ ہمارا جمالی میلان بھی زمانہ سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ اس لئے تقریر کو جمیل بنانے کے لئے زمانہ کے ظرف میں ڈھال کر پیش کرنا چاہئے۔

تقریر میں اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ جس مقصد کو پیش نظر رکھکر ہم تقریر کر رہے ہیں اس سے نہ ہٹیں۔ اور ایسا نہ ہو کہ جانا تو ہے کعبہ کو اور رخ کریں ترکستان کا۔

تقریر کو دقیق بنانے کی کوشش نہ کرنی چاہئے۔ جہاں تک ممکن ہو ہر بات سادہ طریقہ پر پیش کی جائے۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ سامعین کو ایسا معلوم ہوتا کہ جو کچھ مقرر کہہ رہا ہے سب انہیں کے خیالات ہیں انہی کو۔ مرزا غالب نے شاعرانہ انداز میں خوب ظاہر کیا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ مقرر و سامعین کے خیالات میں توافق ہو۔

ایک سب سے گہری بات اور بھی کہنی ہے۔ تقریر میں صنعت نہ ہو بلکہ حقیقت ہو۔ آپ تقریر کرتے وقت زائد از ضرورت جوش دکھائیے کہ جو شئے زیادہ زور سے بجتی ہے وہ اکثر اندر سے خالی ہوتی ہے۔ آپ کے الفاظ میں صداقت ہو۔ زبان آپ کے دل کی حقیقی ترجمان ہو تو آپ جو کچھ کہینگے وہ کانوں کے ذریعہ رس رس کر سامعین کے دل میں اترتا جائیگا۔ اور آپ دیکھ لینگے کہ سارا مجمع آپ کا ہمنوا ہے یہ اور ان کے علاوہ بہت سی شرائط بیان کی جاسکتی ہیں مگر اب میں شرائط سے ہٹکر اثرات کا کچھ ذکر

کروں گا۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا کہ اظہار مطالب کے دو ذرائع ہیں تقریر اور تحریر۔ اگرچہ دونو موثر ہیں مگر تحریر کے اثرات تقریر کے اثرات سے لگا نہیں کھا سکتے۔ تقریر صرف آنکھوں نہیں بلکہ کانوں کے ذریعہ بھی انسان کے دماغ پر اثر کرتی ہے۔ اور مقرر بے جان کاغذ نہیں بلکہ ایک ذی روح ہستی ہوتا ہے جس کی شخصیت کا بھی اثر پڑتا ہے اب غور کیجئے کہ تقریر کیا ہے؟ الفاظ کا بالترتیب مجموعہ۔ الفاظ کیا ہیں حروف کا مجموعہ۔ حروف میں ظاہرہ کوئی جان نظر نہیں آتی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بیجان الفاظ اپنے اندر وہ قوت پنہاں رکھتے ہیں کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتی۔ آپ کسی کے ساتھ محبت کی دو باتیں کہہ دیجئے۔ پھر دیکھئے کہ یہ چند الفاظ اس پر کیا اثر کرتے ہیں۔ آپ کسی مجمع کو گالی دے دیجئے اور دیکھئے کہ صرف بے جان الفاظ کا یہ چھوٹا سا جملہ اُن میں کیا ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔ ایسی صدہا مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک اچھا گانے والا انسان تو انسان جانوروں پر بھی اس طرح چھا جاتا ہے کہ جب تک اس کے راگ زندہ رہتے ہیں تمام سننے والے بے جان بت کی طرح ساکت۔ اسی طرح مقرر انسانی دماغ پر چھا جاتا ہے بشرطیکہ تقریر اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ کی جائے۔ ایک حقیقی اور صداقت سے بھرے ہوئے مقرر میں ایسی قوت ہوتی ہے کہ وہ مجمع کو اپنے قابو میں کر لیتا ہے۔ صداقت بھری آواز کبھی خالی نہیں جاتی۔

پھر یہی نہیں الفاظ کے مافوق الفطرت اثرات بھی بتائے جاتے ہیں مثلاً جادو، عملیات وغیرہ۔ یہ صرف الفاظ ہیں جن کی ایک خاص ترتیب دینے سے ان میں خاص اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ خیال کیجئے کہ جب الفاظ کے ایسے مجموعے کا بالواسطہ یہ اثر ہوتا ہے کہ عامل معمولی کو اپنے قابو میں کر لیتا ہے تو کیا ایک متناسب تقریر جو براہ راست سامعین کے دل و دماغ پر اثر کرتی ہے ان کو مقرر کی شخصیت کا تابع نہیں بنا سکتی؟ یقیناً بنا سکتی ہے۔ پیغمبر آخر الزماں اپنے پُرجوش اور صداقت سے بھرے ہوئے الفاظ میں اظہار خیال کرتے ہیں تو اُن کا جانی دشمن بھی ان کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے۔

ایک یورومین سیاح اپنا ایک واقعہ بیان کرتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک بازیگر تماشہ دکھلا رہا تھا۔ سیاح کو صرف یہ معلوم ہوا کہ وہ کھڑا ہوا کچھ باتیں کر رہا ہے۔ مگر

اُس کے ایک ساتھی نے جو اس بازیگر کی زبان سے واقف تھا بہت سے شعبدے دیکھے آخر میں سیاح نے نتیجے کے طور پر لکھا ہے کہ اُس نے کانوں کے ذریعہ مجمع کے دماغ پر اس قدر قابو حاصل کر لیا تھا کہ جو کچھ وہ کہتا تھا سامعین وہی دیکھتے تھے۔ غرض اسی طرح کی تقریر کے صدہا اثرات بیان کئے جا سکتے ہیں مگر اب میں اثرات کی بحث ختم کر کے یہ بتاؤں گا کہ یہ اثرات کیوں کر پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ دنیا میں ہر شئے کی ایک انتہا اور اس کی اپنی ایک تکمیل ہے جس کی طرف وہ قدرتاً بڑھتی رہتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سی اشیاء اپنے سے اعلیٰ ہستیوں کے ذرائع بن جاتی ہیں مگر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کی تکمیل کا وہی ذریعہ تھا۔ انسان کا ایک نصب العین ہے۔ انسان اس کی طرف بڑھتا ہے اور اس کے لئے جو جو ذرائع کار آمد ہوتے ہیں کام میں لاتا ہے۔ تقریر چونکہ اسے بام ترقی کی طرف اُڑنے میں مدد دیتی ہے اس لئے وہ اُس سے پوری طرح مستفید ہونا چاہتا ہے اور اس طرح خود تقریر باوجود ایک معمولی سا ذریعہ ہونے کے اپنی تکمیل کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔ چنانچہ آپ خود دیکھ لیجئے کہ اولاد آدم کے بے ڈول بولوں اور بے تکی آوازوں نے آج کیا صورت اختیار کر لی ہے اور کس طرح ایک فن کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ انسان تو اسے اپنے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ سمجھ کر حاصل کرتا ہے مگر یہ خود اپنی تکمیل کی طرف بڑھتی جا رہی ہے مگر یہ نہ سمجھو کہ تقریر اپنے انتہاء عروج پر پہونچ گئی ہے۔

گماں مبر کہ بہ پایان رسید کارِ مغان
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

ادبی دنیا کو خوشخبری

منشی درگا سہائے جہاں آبادی کا کلام موسوم بہ خمکدۂ سرور جس میں قریباً بہترین (۱۵۰) مضامین نظم و نثر ہیں صاحب کلام کی تصویر کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔ شائقین جلدی فرمائیں کیونکہ تھوڑی تعداد ہونے کی وجہ سے کتاب دستیاب نہ ہو سکے۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ: (۱) مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن۔
" " (۲) کتب خانہ سید عبدالقادر صاحب تاجر کتب چارمینار حیدرآباد دکن۔
" " (۳) قاضی محمد غوث محلہ مغل پورہ عقب احاطہ زبردست خاں بہادر حیدرآباد دکن۔

دکھیا سہاگن

(از جناب ابوالافتخار فخر حیدرآبادی)

تمہیں یاد ہوں کہ نہ ہوں وہ دن نہ تھا سولہ سال کا میرا سن نہیں چین تھا تمہیں میرے بن تھا فراق میرا بڑا کٹھن
وہ زمانہ چاہ کا کیا ہوا نہیں مجھ پہ اگلی سی کیوں دیا

مرا بھرتے رہتے تھے دم سدا تمہیں رات دن مرا دھیان تھا وہ تمہارے دل میں تھی میری جا تمہیں جان سے بھی تھی میں سوا
وہ زمانہ چاہ کا کیا ہوا نہیں مجھ پہ اگلی سی کیوں دیا

میں جو روٹھتی تھی مناتے تھے گلے اپنے مجھکو لگاتے تھے مرے دل کو تم نہ دکھاتے تھے سبھی ناز میرے اٹھاتے تھے
وہ زمانہ چاہ کا کیا ہوا نہیں مجھ پہ اگلی سی کیوں دیا

میں تمہاری آنکھوں کا نور تھی میں تمہارے دل کا سرور تھی میں تمہاری نظروں میں حور تھی میں تمہاری جان ضرور تھی
وہ زمانہ چاہ کا کیا ہوا نہیں مجھ پہ اگلی سی کیوں دیا

مرے حسن سے گیا دل جو بھر کہیں لڑ گئی تو نہیں نظر سبب اس کا تم کہو صاف تر مری بات سچ یہ نہیں اگر
وہ زمانہ چاہ کا کیا ہوا نہیں مجھ پہ اگلی سی کیوں دیا

مرے دل سے سکھ مرا جائے گا میں ہونگی رنج میں مبتلا نہ رہینگے عیش کے دن سدا نہ یہ سان تھا، نہ گمان تھا
وہ زمانہ چاہ کا کیا ہوا نہیں مجھ پہ اگلی سی کیوں دیا

نہ دکھاتے تھے کبھی شوخیاں نہ مزاج میں تھیں یہ گرمیاں نہ تھی بات بات پہ دھمکیاں وہ تمہاری کیا ہوئیں نرمیاں
وہ زمانہ چاہ کا کیا ہوا نہیں مجھ پہ اگلی سی کیوں دیا

ہے بلا جو چاہ یہ جانتی تو نہ دیتی تم کو میں دل کبھی ملی خاک میں مری زندگی ہے یہ دلبری کہ ستمگری
وہ زمانہ چاہ کا کیا ہوا نہیں مجھ پہ اگلی سی کیوں دیا

کروں کیوں نہ آہیں میں دکھ بھری مری جان جوکھوں میں پڑ گئی نہیں آس اب مرے جینے کی مجھے مار ڈالے گی بے رخی
وہ زمانہ چاہ کا کیا ہوا نہیں مجھ پہ اگلی سی کیوں دیا

کوئی تم سا ہوگا نہ بے وفا مجھے تم نے دل سے بھلا دیا یہ بتا دو فخر مجھے ذرا یہی پھل ہے میری وفاؤں کا
وہ زمانہ چاہ کا کیا ہوا نہیں مجھ پہ اگلی سی کیوں دیا

بادۂ دکن

میر غلام مصطفیٰ سخن اورنگ آبادی

(۵ و ۶)

نمبر (۴) میں مہاراجہ چندو لال والے قصیدے میں ایک حد تک شبہ پیدا ہو گیا تھا، دیوان میں ایک "رنگین" غزل نکل آئی ہے جس میں صاف "چندو لال راجہ" لکھا ہے۔ غزل کی تقریب "ہولی" کی عید ہوگی، مضامین کی رنگ رلیاں قابل دید ہیں، زمین شعر سے لے کر مطلع آسماں تک رنگا رنگی ہی ہے۔

غزل

نہ تنہا جوش گل سے گلشن و گلزار رنگیں ہے
فضائے دشت رنگین۔ دامن کہسار رنگیں ہے

ہوئی ہے رنگ کی اس رنگ طغیانی زمانے میں
کہ سقف و بام سے لے تا در و دیوار رنگیں ہے

در و دیوار پر ہی کچھ نہیں موقوف رنگینی
کرے مد نظر اپنی جہاں تک کار رنگیں ہے

عجب راحت فزا ہے دور چندو لال راجہ کا
کہ گھر گھر عیش ہے اور کوچہ و بازار رنگیں ہے

کروں کس رنگ سے تعریف بزم خاص کی اُسکی
کہ جوں گلزار سب دربار کا دربار رنگیں ہے

ہوا ہی رنگ سے یہ رنگ اب تسبیح و برہمن کا
کہ تار سبحہ سے تار رشتہ زنار رنگیں ہے

خم و خمخار رنگیں، شیشہ رنگیں، بادہ کش رنگیں
مئے گلرنگ رنگیں۔ ساغر سرشار رنگیں ہے

سخن کے شعر رنگیں کا اثر یہ ہے کہ مطرب کا
دہاں رنگیں، زباں رنگیں، لب گفتار رنگیں ہے

بھرا ہے رنگ تد اہونے مضمون معانی میں
زمین شعر رنگیں، صفحۂ اشعار رنگیں ہے

بادۂ دکن کے اس نمبر میں سخن کی سخن سنجیوں کا یہ آخری دور ہے۔ ان کا دیوان کتب خانہ آصفیہ (۱۸۰) میں ہے۔ تقطیع (درائل) ایک سو ترانوے اوراق (ناتمام) چودہ سطری مسطر، خط صاف نستعلیق شکستہ آمیز، کاغذ دیسی ابتدا میں (۵۸) صفحات پر قصائد، حمد، نعت، منقبت، مدح امرا، وغیرہ ــــــ (۵۹)، ورق سے (۱۵۴) تک

ردیف وار غزلیات، (۱۵۴) سے رباعیات، تاریخات، مخمسات ——— دیوان کی ابتداء قصاید (میں) بعض اوراق کے کونے ترش گئے ہیں جن کی وجہ سے اکثر آدھے آدھے مصرعے ناقابلِ قرأت ہیں۔ پہلے صفحے پر "دیوان غلام مصطفیٰ سخن باشندہ حیدرآباد" لکھا ہے۔

الف :- قصائد کی تفصیل

(۱) قصیدہ در منقبت حضرت علیؓ - (۷ اشعار)

(انتخاب)

کیا کرے تحریر کوئی شوکت و شانِ علیؓ ——— شرق سے لے غرب تک جاری ہے فرمانِ علیؓ
بندۂ احسان ہیں باشندگانِ شش جہت ——— عام ہے عالم میں کیا فیضِ فراوانِ علی
وصفِ قربِ منزلت کی یہ زباں قابل نہیں ——— ہے حدیث "لحمک لحمی" ہی شایانِ علی
کس کا منہ ہے اے سخن! جو مدح ایسے کی کرے ——— اولیا تا انبیا سب ہیں ثناخوانِ علی

(۲) (۷۶ شعر)

مقلد اے فرومایہ نہ ہو ارباب جوہر کا ——— کہ ہے محسود شعرِ تر ہمارا گوہرِ تر کا
نوشت معنیٔ باریک ممکن ہی نہو جب تک ——— رگِ اندیشۂ نازک خیالاں تارِ سطر کا
عبارت میں لطافت ہے معانی پر صفا ایسی ——— کہ جس کے روبرو دُردی کرے ہے صاف کوثر کا
اثر معنی سے یوں پیدا معانی یوں عبارت سے ——— فرح جیوں نشأ سے شیشہ سے جلوہ آتشِ تر کا
اثر پیدا ہی کرتا ہے سخن منہ سے جہاں نکلا ——— عرض کا عرض کرنا جوہرِ ذاتی ہے جوہر کا
نگارستانِ معنی وہ تسلی بخش ہے شاید ——— زلیخا بھول ہی جاوے مزا کلخ مصر کا
لکھوں وہ مطلع ثانی کہ دل سنتے ہی روشن ہو ——— زر حل کردہ پیدا ہو اگر خورشید انور کا

بجا ہے گر سخن عازم ہو فتحِ ہفت کشور کا
کہ جوشِ معنی و مضمون رکھے ہے حکم لشکر کا

جہاں گیری کرے نظمِ سخن کیوں کر نہ اب جیسے ——— کہ ہے تاج کس شاہنشہِ خورشید افسر کا
ہنر پر پیشۂ یزداں کفیل کار انس و جاں ——— کہ جس کو ہم اخی و ہم وصی کہیئے پیمبر کا
سمیِ خالق اکبر جہاں بان جہاں پرور ——— ہمہ لطف و کرم گستر و سیلہ روزِ محشر کا
بہارِ گلشنِ عرفاں چراغِ خانۂ ایماں ——— ضیائے دیدۂ ایقاں پیٔ تفسیرِ قرآن کا
ہمہ دانش ہمہ بینش ہمہ عقل و ہمہ فطرت ——— کہ استاد ادب آموز ہے ناموس اکبر کا

نہ ہے عدل و زہے انصاف ایام بہاراں میں — لہو اک قطرہ کم ہوئے اگر مجنون مضطر کا
موافق امر عالی کے یقین ہے ہر گلشن میں — رگ گل اسے کرے مژگان بلبل کا نشتر کا
دعا پر ختم کر بس اے سخن! یہ کون باتیں ہیں — رہے پاس ادب تد نظر ساقی کوثر کا
موافق کو ہمیشہ ہوئے حب علی خم خم
مخالف کو میسر چشمہ چشمہ آب خنجر کا

ب :-

قصیدۂ شادی کیوان جاہ :- (۵۲ شعر)

ہے ترے لطف عام سے بر فاہ — اک جہاں اے جہانیاں کی پناہ
سر قدم کر کے اپنا آتے ہیں — در کو تیرے سمجھ کے باب اللہ
نقش پا کا نشاں نہیں پاتا — در پہ تیرے سوائے نقش جباہ
گر صدا پر، پرند کی شب بدر — تیر پھینکے تو اے ارسطو جاہ
ڈر سے پیکان تیر کے تیرے — یہ کبود فلک خدا آگاہ
متردد ہوا اس قدر کہ وہیں — چنگ سے چھوٹ جائے بیضۂ ماہ
رشک سے صد جشن کیقبادی ہے — شادیٔ دل کشائے کیواں جاہ
شادیانوں کا شور ماہی سے — دفعتہً ہی پہنچ گیا تا ماہ
ساز عشرت سوائے عالم کو — ہے صدائے دگر صدائے چاہ
دیکھ وہ روشنی وہ مہندی ہے — ہے یقیں یہ ہی بس بلا اشتباہ
ورق نقرہ و طلا سے ہیں — خوان مہندی کے رشک مہر و ماہ
سر اٹھانا وہ رقص مہر افزا — وہ ادائیں فسوں معاذ اللہ
وہ گتیں دل فریب وہ ٹھوکر — وہ تغافل وہ عاشقانہ نگاہ
ایک سو شاعران سحر بیاں — قطعۂ تہنیت لیے ہمراہ
امرا بہر نذر اک طرف — ایک سو صف بصف ستادہ سپاہ
اے سخن! یہاں سے لکھ دعائیہ — کر یہ طول کلام کو، کوتاہ
یا الہی بحرمت احمد — اور بحق علی ولی اللہ
دوست اس کے ہمیشہ شاد رہیں — اور دشمن رہیں بحال تباہ

ج:-

در مدح عالی جاہ (احمد علی خاں) (۱۱ شعر)

ترے بحر کرم سے بہرہ ور گر ابر نیساں ہو — صدف تو کیا کہ ہر خوشہ میں پیدا دُرِّ غلطاں ہو

نشاں خلق و آثار کرم باطن سے ظاہر ہیں — ترا اسم مبارک کیوں نہ پھر احمد علی خاں ہو

عجب کیا اس شجاعت پر اگر تیرے تصرف میں — دکن سے ہند تک اور ہند سے لے تا صفاہاں ہو

بحق ہشت و چار او رچار دہ معصوم دنیا میں — خوشی ہو، خرمی ہو، تو ہو اور عیش فراواں ہو

موافق سے ترے یا رب زمانہ بھی موافق ہو

مخالف سے مخالف گردش گردون گرداں ہو

د:-

قصاید مدحیہ اعظم الامرا، ارسطو جاہ۔

(۱) (۳۷ شعر)

کیا کہوں آپ سے رنگ گل لالہ کی مثل — آتش طور بھڑکتی ہے بہر دشت و جبل

رنگ ہے رنگ چمن پر کہ تماشہ کے لئے — شاہد نکہت گل آئے ہے پردہ سے نکل

قوت نامیہ یہ اور ہے عہد ایسے کا — بار ور کیوں نہ خلایق کا ہو پھر نخل امل

یعنی نواب فلک قدر امیر اعظم — جس کی ہمت کا جہاں میں ہے یہ کچھ قدر و محل

غائبانہ سخن اب مدح طرازی تا کے؟ — روبرو اُس کے تو یہ مطلع روشن لے چل

ہو سکے کیوں کہ مفصل تری وصف مجمل

افضل الناس تجھے کہتے ہیں اکمل افضل

(۲) (۸۷ شعر)

سرور و عیش کا گھر گھر ہے ان دنوں چرچا — ہزار رنگ . . . .

کہ جس کا اسم مبارک ہے اب مشیر الملک — کہاں زبان کو ایسے کی مدح کا یارا

خیال خام نے لایا کدھر معاذ اللہ! — کہاں میں ہیچ مداں اور وہ اعظم الامرا

وزیر شاہ دکن طرح سلطنت تیرا

کرم سرشتہ ازل منبع نوال و سخا

(۳) (۴۸ شعر)

اے سزاوار علم و فضل و کمال — جان وہ معنیٔ خیال و مثال
کیوں نہ کہتے تجھے ارسطو جاہ — اے سزاوار مسند اجلال
چاہتا ہوں میں اس قصیدہ کا — یہ صلہ تجھ سے اے فلک اجلال
عزت و خلعت گراں قیمت — اور سواری کو اسپ برق مثال
اس میں پھر جو تری ہو مرضی خاص — یہ بھی لازم نہیں ہے قابل و مقال

دوست تیرے ہمیشہ شاد رہیں
اور دشمن سدا رہیں پامال

(۴) (۶۷ شعر)

زیر عرش اے ہے سنا جان سخن — ہے نہاں گنج شائگان سخن
اے سخن! تا بکے غزل گوئی؟ — تا کجا شرح این و آن سخن
مدح اُس کی ہے فرض عین تجھے — ہے جو ممدوح صاحبان سخن
مدح غائب بھی گرچہ دل کش ہے — پر بھلا کب تک اے زبان سخن
باریاب حضور ہو یہاں سے — نذر لے کر تو ارمغان سخن

اے مددگار دوستان سخن
کار فرماؤ کامران ... سخن

ہے بعید از ادب تجھے کہتے — گر ارسطوے نکتہ دان سخن
اب صلہ میں سخن قصیدہ کے — چاہتا ہے اے قدردان سخن
ایک تو یہ کہ ...... عزت ہو — اے خدا و ند مہربان سخن
دوسرا یہ کہ یہ قصیدہ بھی — ہو ملقب بہ "استان سخن"
تا رہے شعر و شاعری قائم — تا زباں ندرہے بیان سخن

یا الٰہی رہے بہ عیش و طرب
ذات ممدوح صاحبان سخن

ھ:۔ قصیدۂ مدحیہ بجناب سیف الملک[1] (۲۰ شعر)

منبع احساں ہے تیری ذات والا جناب — آستاں بوسی ہوا ہے اک عالم کا منیا

---

[1] نواب میاں خلعدار سطوجاہ ... انتقال ... ۱۳۰۰ ... تحت ... محمد خاں ... کا مادۂ تاریخ ہے ۱۲

کیوں نہ گھٹ جاوے عدو سنتے ہی تیرے نام کو — مشتہر نواب سیف الملک ہی تیرا خطاب
چاہتا ہی تجھ سے اتنا ہی تحسین اے ذوالکرام — مشتہر ہووے ترے بندوں میں ہمراہ کلب

جب تلک گردوں ہے پادار ہر سیدان میں
پنجتن رکھیں تجھے فیروز مند و فتح یاب

۹:- بمدح نواب شاہ یار الملک۔ (۴۸ شعر)

ترو تازہ ہے اس قدر گلشن — ہے بہار ارم جس بہ چمن
یعنی نواب شاہ یار الملک — واقف رمز ہائے ہر یک فن۔
جب تلک نور و نار توام ہیں — اور جمال و جلال جلوہ فگن

نور میں غرق ہوں ترے مخلص
غرق ظلمت رہیں ترے دشمن

۱۰. قصیدہ :- (۵۰ شعر)

(۱) کفِ گل زر سے بھر دیا تو نے — دُر سے مُشتِ صدف کیا مملو
لطف تیرا ہے بس کہ جاں پرور — اور اخلاق و حلم ہے دل جو
یہ تیرا عدل ہے کہ رکھتے ہیں — آشتی یک دگر سگ و آہو
زلفِ معشوق ہے تری تحریر — اور تقریر ہے بہ از جادو
کیوں نہ کہیے تجھے نظام الدین — باعث انتظام دیں ہے تو
عہد میں تیرے فیض سے اب تو — جو رہی ہے برائے خود ساہو
یہی شاعر خیال کرتا ہے — ہے یہ بے شک زمیں کا حال رو
اور کیا تجھ سے اے سخن پرور! — چاہیے اس قصیدہ کا جلدو
بس ہے مداح کو یہی تیرے — عزت روزگار و آب رو

جائے زر کے بجے یہ ہاتھوں سے
لعل خوش آب و دانۂ لو لو

(۲) قصیدہ :- (۶۰ شعر)

کس قدر ہے غرور پر خود بیں — اُف رے ناز و اُف رے تمکیں
دیکھتا ہی نہیں سوائے فلک — سرکشی سے کبھی بروئے زمیں

لہ نقل ؟

نمک زخم دل ہے عاشق کا — نازنیں کا تبسم نمکیں
ظالم ایسا کہ خون دل کے سوا — نہ کرے دست و پا کبھو رنگیں
الغرض اُس کے ظلم سے نالاں — کوئی ایسا بشر نہیں کہ نہیں
ہاں! مگر ایک ہے سخن محفوظ — کہ ہے اُس کا ممدوح وہ عدل گزیں
ظلم ہوتے سُنا نہیں ہم نے — عہد میں جس کے آج تک تو کہیں
خلف الصدق مرتضیٰ ہے وہ — کہ ریاضت سے ہیں نمود آئیں
روضۂ گلشن علیؑ ہے گا — باغ احمد کا ہے گل رنگیں
اے سخن! چل حضور میں یہاں سے — مدح غائب سرور بخش نہیں
کیوں نہ شاغل ہو تو مدام کہ ہے — مستفید جناب فخر الدیں
ہے وہ بے شک فرید گنج شکر — اور تو بالیقین نظام الدیں
فکر روزی سے دور میں تیرے — نہیں آتا نظر کوئی غمگیں
پالکی میں سوار دیکھ تجھے — یہی ہوتا ہے بے گمان یقیں
یعنی محراب میں برائے دعا — ظاہر ہے امام صدر نشیں
یا الٰہی یہ دولت و اقبال — رہے پایدار تا قیام زمیں
اور تجھے یہ ثواب سی روزہ — دین و دنیا میں ہو ممد و معیں
جشن عید سعید بابرکات — میمنت ہو بحرمت یٰسیں

چاہیے حاضران مجلس بھی
دل سے اک بار سب کہیں آمیں

(۳) قصیدہ :- (۲۵ شعر)

عجز سے بس کہ سر فرو ہے قلم — کیا کرے مدح اہلِ حال رقم
کیوں کہ ایسے کا ہو ثنا گستر — جو پیمبر کے ہو قدم بقدم
نام نامی زبان پر ... لانا — بے وضو کے نہیں گناہ سے کم
شاہ درویش قادری یعنی — ہے بلا ریب ہم سر ادہم

سے:- ابن شاہ ولی اللہ، حضرت بندہ نواز گیسو دراز کی اولاد سے ہیں، یکمیا اور علم تصوف اپنے والد ہی سے حاصل کیا۔ زہد و تقویٰ میں مشہور ہمیشہ گوشۂ تنہائی میں رہتے، صرف مابین عصر و مغرب خانقاہ میں آتے اور حاجت مند بہرہ یاب ہوتے، تصوف کے کئی رسائل و کمی [illegible] اردو میں لکھے ہیں، ۱۴ جمادی الاول ۱۱۸۵ھ میں وصال ہوا، لبوہری گلی (حیدرآباد) کے متصل [illegible] اللہ کے روضے میں مدفون ہوئے۔

فی الحقیقت ہے مرتبہ اس کا ــــ شبلیؒ و بایزیدؒ سے تو ام
حاصل اس گفت گو سے ہے یہ سمجھے ــــ ایک پنت اور کاج دو باہم
چاہتا ہوں کہ مدح رہبر میں ــــ صفت راہ رو بھی ہو مدغم
راہ رو سے مراد ہے مجھ کو ــــ ذات تہنیت النسا بیگم
ہے وہ مخدومہ رابعہ ثانی ــــ اور ہے ہم فضیلت مریم
پاس عصمت ہے اس قدر اس کو ــــ اپنے سایہ سے بھی کرے ہے رم
آئینے سے بھی احتراز کرے ــــ تا نہو چشم عکس بھی محرم
زوجۂ خاص رستم دوراں ــــ زال ہے جس کے روبرو رستم
عمر اس کی ہزار سالہ ہو ــــ اور زائل ہو اس سے درد و الم

فارغ البال اُس کے دوست ہیں
اور دشمن ہوں مبتلائے غم

متفرق

الف :-

زہے جناب عجب کیا ہے مدح میں اسکی ــــ زبان ناطقہ ہوئے برنگ لال گرہ
برائے قطعۂ دلچسپ و مصرع تاریخ ــــ ہوا مزاج یہ جس دم مرے خیال گرہ

کہا پکار کے دل نے "بجان و دل" و ہیں
"ہزار سال مبارک ہے یہ سال گرہ" ــــ ۱۳۰۹ھ

ب :-

نوید دل کش جشن فرح بخش ــــ ہوئی جب سامعہ افروز عالم
سخن تو بھی برائے نذر نواب ــــ رقم کر قطعۂ دلچسپ و محکم
نشاط افزا ہو ایسی ہی عبارت ــــ کہ تا ممدوح ہو دل شاد و خرم

لکھا سنتے ہی سال فرحت افزا
خدایا جشن بسم اللہ جسیم جم
(۵ شعر) ۱۲

ج :- نامہ منظوم :-

---

۱ حضرت آصف جاہ ثانی غفران مآب -

اے بادِ بہار برق رفتار — اے ہمدم عاشق دل افگار
اے نامہ برِ نیاز منداں — اے حامل خطِ مستمنداں
گلرو کو میرا سلام کہنا — اور اتنا ہی بس پیام کہنا
جس روز سے تو صنم جدا ہے — شاہد احوال کا خدا ہے
بھاتا ہی نہیں پلنگ مجھ کو — شیشہ بھی ہوا ہے سنگ مجھ کو
وہ نیند میں آہ مار اُٹھنا — لے نام ترا پکار اُٹھنا
ہمسایہ کو خواب سے جگانا — افسانۂ درد و غم سنانا
نالوں ہی سے اپنے کام لینا — سونا نہ کسی کو سونے دینا
پڑھنا کوئی شعر یا کہ عالی — تا دل ہو کسی طرح سے خالی
تس پر یہ ستم بہار آئی — بلبل کی غضب پکار آئی
صحرا بھی چمن سے کم نہیں ہے — پر حیف کہ تو بہم نہیں ہے
گل نظروں میں خار سا لگے ہے — بلبل کی صدا یہ دل جلے ہے
کوئل کی صدا بھی بے نمک ہے — کانوں میں تو اپنے وہ جھنک ہے
نہروں کی روانی دیکھ جانی — ہو جائے ہے دل تو پانی پانی
گلزار ہو یا بہار ہووے — اور سیر ہو شکار ہووے
مائل ہی نہیں کسو طرف دل — اپنے ہی سے کچھ ہوا ہے غافل
اللہ وہ دن کرے شتابی — ہو وصل سے تیرے کامیابی
دوری کے یہ دن شتاب جاویں — وہ راتیں وصال کی پھر آویں
پھر سات ترے مزے اُٹھاویں — بدخواہ رقیب کو جلاویں
یہاں قصۂ سخن تمام ہوئے گا — پیغام بھی اختتام ہوئے گا

کان اُس کے ذرا تو کھول دینا
یاروں کا سلام بول دینا

۵:۔ مثنوی زمستاں (۹۳ شعر)

پلا اے ساقی خورشید منظر — مئے دو آتشہ و چار ساغر
کہ تا اُس جوش دل گرمی بہم ہو — گزند شدت سرما تو کم ہو

کہ از بس گرم ہے بازار سرما — برودت ہے متاع بار سرما
ہوا سے جل گیا رنگ زن و مرد — برستی ہے فلک سے آتش سرد
زمستاں نے اثر ایسا کیا ہے — کہ موج آب، آب بوریا ہے
ہمیں تو زندگی دشوار سی ہے — اگر خوش ہے تو قوم پارسی ہے
اگر پیتے ہوئے ٹک ہاتھ تھم جائے — پیے وہ آتشہ کا جام جم جائے
ہوا گلشن کا ہر حوض مدور — ہوا سے جم کے رشک ماہ انور
غبار شبنم، صبح زمستاں — سراپا نور ہے اور نور افشاں
برستی ہے نم شب ریزہ ریزہ — ذخیرہ برف کا ہے نیزہ نیزہ
موذن کو کہاں یارائے تقریر — کہ ثابت منہ سے نکلے لفظ تکبیر
مصلی دست و پا کب دھو سکے ہے — تیمم ہو سکے تو ہو سکے ہے
کبابی جا بجا ہے غم سے رووے — بجائے تکا اپنے تئیں پرووے
حقیقت طرفہ بھڑ بوبخے کی سنیے — نخود کی جائے خود چاہے ہے بھنیے
عجب کیا ہے کہ ہے قدرت خدا کی — بندھے سوٹ اس ہوا میں... ہوا کی
مغنی گرچہ خود آتش نفس ہے — غرض اس پر بھی دیپک کی ہوس ہے
قیامت ہے برودت فصل دی میں — دم نائی گرہ ہوتا ہے نے میں
عجب احوال ہے سرما سے تن کا — لہو بھی خشک ہے نہر البدن کا
طبیب اس فصل میں جز قرص خورشید — علاج تپ نہیں کرتے بہ تبرید
بیاں کرتے ہیں از بس نفع گرمی — کہ ہے گرمی سے اولیٰ دفع گرمی
وبال جان عاشق چشم نم ہے — کہ ٹھنڈی سانس لینا بھی ستم ہے
پلا ساقی مئے گل گوں دو سالہ — کہ ہے اس فصل میں بہ از دو شالہ
مزا کچھ ہے تو نوشا نوش میں ہے — کہ اک خورشید رو آغوش میں ہے
شکایت تا کجا کریے ہوا کی — گذر ہی جائے ہے ہر بلا کی
بحمد اللہ کہ عشق آتش نسب ہے — شرار آہ گرمی کا سبب ہے
وگرنہ زندگی دشوار ہوتی — ہوا دہ ہے جگر سے پار ہوتی
سخن خاموش ہو جا ورنہ کچھ کہہ — صنم سے اپنی آنکھیں سینکتا رہ

کہ یہ افسانہ از بس سرد تر ہے
نسیم گفتگو سے درد سر ہے

فارسی

(۱) مثنوی عاشقانہ۔ (۲) قطعہ جنگ و قطعہ دیگر تاریخی (۳) قصیدہ بتقریب قصر وزیر دکن

بنیادش از فلک بجہاں استوار باد　　　قصر وزیر شاہ زمن پائدار باد
ہر مصرعم دلیل بود بہر طرز سال　　　روشن بہ ماہ راج مسیحا و فار باد

قطعات و رباعیات

تا رفت ز چشم خویش ظل الٰہی چون نور نگاہ　　　شد تیرہ جہاں بدیدہ چو ماہی در حال پناہ
کردم چو سوال سال وصلش ہاتف غیر مومن　　　یارب بجہاں بود فرید و جاہ ہم با عزت و جاہ

۱۲۲۵

(۲)

استاد شفیق[۱] من افسوس　　　از بینجی سرائے فانی رفت
روئے دل از کسے نمی بینم　　　مایۂ لطف و مہربانی رفت
از حلاوت گذشت نظم و نثر　　　نمک از شعر و شعر خوانی رفت
از جہاں بر فنا د قدر کمال　　　عالم علم نکتہ دانی رفت

سال رحلت رقم نمود شفیق
وائے مشاطۂ معانی رفت

۱۲۲۴

(۳)

شد رو پوش چو نامدار صاحب[۲]　　　پروردۂ دولت کنار صاحب
اندوہ بموئے درد گفتم سالش
صد حیف کہ رفت یادگار صاحب

(۴)

---

[۱] لچھمی نرائن شفیق صاحب تخلص اورنگ آبادی جن کے لئے مجلۂ مکتبہ جلد (۲) نمبر (۱ تا ۶) دیکھیے۔ ان کا ایک تذکرہ چمنستان شعرا انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کی جانب سے طبع ہو چکا ہے جس میں وفات کا ذکر نہیں ہے [۲] نقل؟

شاعر خوش خیال منشا لال | از پئے سنجِ سرا چو گشت رواں
سال فوتش رقم نمود سخن | آہ اُستاد زادہ رفت جواں

۱۲۰۹ھ

(۵)

بست تارخت سفر زیں مرحلہ | والداں صاحب ذہن سلیم
زو رقم سال وصال او سخن | آہ بے دریا شدہ دُرِّ یتیم

۱۲۰۹ھ

(۶)

ہائے مانک چند رحسب الحکم رفت | وائے مانک چند رحسب الحکم رفت
چوں ببارد دیدہ ام خوں از جہاں | رائے مانک چند ۔ حسب الحکم رفت

(۷)

شد ز دنیائے دوں وحید الدین | آں سوئے آسمانِ ہفت طبق
گفت سال وصال او سالک | گشت مرد وحید مینِ حق

۱۲۳۰ھ

صد شکر کہ با ہزار لطف دل جو | سرگرم نشاط ہے وزیر خوش خو
اے مست مئے طرب ! ادھر ہو لا نذر | رکھتا ہے بسنت کی خبر بھی کچھ تو

(۲)

اے بانی دولت کمال اکبر | رونق افزائے ملک و مال اکبر
حقا کہ جمال عالم آرا تیرا | ہے مظہر جلوۂ جلال اکبر

(۳)

جب تک کہ رہے فلک کی قایم بنیاد | اور اہل زمیں رہیں زمیں پر آباد
بایں ہمہ ملک و مال و جاہ و اجلال | مشغول رہے بعیش بالا یہ شاد

(۴)

اللہ ! یہ کس قدر ہی جاہل گم راہ | عارف پہ کرے ہے تہمت کفر پناہ
یہ عقل یہ ۔ امتیاز کفر و اسلام | لاحول ولا قوۃ الا باللہ

(۵)

ممکن ہے کہ یہ تاریخ وفات صاحب کے والد رائے منسا رام کی ہو ۱۲۰۹ھ غالباً بابلاً دیکھو گلزار آصفیہ صفحہ ۱۲۶

بڑھ بڑھ کے سخن سے اس قدر بھی بولو — خاموش رہو نہ عیب اپنے کھولو
پھر کیجیے کسو کی آدمیت پر حرف — پہلے تم آپ آدمی تو ہو لو

(۶)

محسن کی کبھو نہ مدح و توصیف کریں — مفسد کی ہمیشہ دل کی تالیف کریں
ایسے تو دنی ہیں گردنی کے گھر سے — گر بھر بھی گزری ملے تو تعریف کریں

(۷)

بس کہ آفاق میں ہے شور سخن کا میرے — آج پھرلون ہے ہم زور سخن کا میرے
دست بستہ نہ ملے مجھ سے عدو پھر کیونکر؟ — اوّل روز تہ ہے چور سخن کا میرے

(۸)

کمال بے حیائی کو کفیل کار سمجھا ہے — یہ ناقصوں نے استغنا کو استکبار سمجھا ہے
نصیحت گر عبث تشنیع کرنا ہے کہ عاشق کی — ملامت کو تو عین گرمی بازار سمجھا ہے

(۹)

دود جگر کو شعلۂ شفاف سے شرط ہے — زلف سیہ کو تابش موباف سے شرط ہے
کرتے ہو اس قدر جو طرف داری رقیب — یارو! خدا کے واسطے انصاف شرط ہے

(۱۰)

جس دم کہ ہوا نہال قامت برپا — عاشق پہ ہوئی ہزار آفت برپا
واللہ کہ انتظار محشر نہ رہا — قامت نے ترے کی ہے قیامت برپا

(۱۱)

وہ تم نہیں رہے وہ محبت نہیں رہی — القصہ تم سے چشم مروت نہیں رہی
پوچھو تو اب گھمنڈ ہے کس بات پر نہیں؟ — صورت بھی ایک شے تھی سو وہ صورت نہیں رہی

(۱۲)

واہ رے عہد جوانی کچھ عجب ایام تھے — وہ جو اک عالم سے رم کرتے تھے ہم سے رام تھے
صید محبوباں نہ تھا بادصف منظور نظر — پر اک استغنا قیامت تھا کہ لاکھوں دام تھے

(۱۳)

ناصح کا اثر کیا؟ کہتا مجھ کو — مرغوب رہا ستم کا سہنا مجھ کو

اُمید وفا سے سب سے ہل ہل دیکھا　　آخر نہ ہوا کسو سے لہنا مجھ کو

قصائد وغیرہ کی تفصیل میں وہ قصائد وغیرہ داخل نہیں ہیں جو اُس کے قبل نمونہ کے طور پر انتخاب میں آگئے ہیں۔

قصاید کے ذخیرے سے ممکن ہے کہ یہ رائے قائم کی جائے کہ سخن ایک مدح گو شاعر تھے لیکن وہ خود آداب مدح کے متعلق کہتے ہیں۔

نسبت اہم ہے خادم و مخدوم میں سخن　　ممدوح ہو غیور تو مداح کیوں نہ ہو!

رنگ تغزل اور اُس کے ادائے اسلوب کی نسبت اُن کے یہ خیالات پیش نظر رکھیے۔

سودا بھلا بتا کہ کسی کو بھی یاد ہیں　　آتے ہیں جو کہ بندش مضموں تجھے مجھے

مگر تقلید سودا ہم سے پوری ہو نہیں سکتی　　جبھی تو آپ فرماتے ہیں ایسا یوں نہیں یوں ہے

بھلا ہم تم غزل کہہ کر سخن فہموں کو دکھلائیں　　کہیں استاد گر ترکیب مرزا یوں نہیں یوں ہے

مضموں جو ہو سب سے بیگانہ وہ اپنا ہے　　طالب نہیں ہم اُس کے مطلب جو سب کا ہو

سرشق گرنہ ہوتا وہ برق خرمن صبر　　شعر سخن میں ہرگز برجستگی نہ ہوتی

گوئے مضمون و معانی لے گئے میدان سخن　　وہ جو تھے چالاک تر فن سخن میں ہم سے

مطبوع ہے سخن کا سخن ہر زمین میں　　گر صاف ہو تو صاف ہی ورنہ خیال ہے

سخن کمال تو یہ ہے کہ غیر مدح کریں　　وگرنہ عیب ہنر در کو خود ستائی ہے

کہوں گر بلبل باغ دکن ہوں　　بجا ہے۔ خود ستائی کون سی ہے؟

پوچھیے اُس سے اگر صافی تقریر سخن　　حضرت درد کا دیوان اُٹھا لیتا ہے۔

اے سخن الحمد از لطف ست جان زاد طبع کو　　گر وہ ہر لخت جگر نور بصر یہ بھی تو ہے

سخن عروض کی تکرار سے گزر خاموش　　سبب کہاں کا۔ کدھر کا وتد نکالا ہے

"نے" کا استعمال اکثر قدیم طرز پر کیا گیا ہے۔ بعض مثالیں دیکھیے۔

عشق میں ان مہوشوں کے ہاتھ ہم نے دھو چکا　　نام سے ناموس سے کم بخرد سے ننگ سے

پھر تو الہ بادھی قبضہ میں آ چکا　　وقتے کہ ہم نے قلعہ احمد نگر لیے

ہے ہے پہچاننے سے اب تو صورت آشنا اپنے　　محبت نے نہیں کچھ ناتواں ذرا ایسی کی

ولے کچھ اور طرح یہ بھی نکالے ہم نے　　یوں ہی بدنام کیے دیکھے نہ بھائے تم نے

سخن کی عام شاعری اور اُن کے انتخاب سخن کے متعلق پہلے نمبر میں نوٹ آگیا ہے۔ مجھے دکھنی شاعروں کے مطالعہ میں اب تک، شیر محمد خاں ایمان کے بعد یہی شاعر، شاعری کی حیثیت سے نظر آتا ہے۔ اگرچہ کہ سخن شفیق اورنگ آبادی کے شاگرد ہیں لیکن صرف شاعری کی حد تک سخن کو "باز اُستاد" کہا جائے تو خلاف واقعہ نہیں، میں نے شفیق کی شاعری کا بھی مطالعہ کیا ہے اور قارئین "مجلۂ مکتبہ" کی نظر سے بھی شفیق کا کلام گزرا ہے۔ رنگ تغزل میں مجھے ان کا صرف ایک شعر یاد رہ سکا ہے ؎

جان! وعدہ پہ تم تو آؤ گے　　　پر مجھے تاب انتظار کہاں

ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو شفیق کے اور اچھے شعر بھی یاد ہوں، میں اپنے مذاق پر قارئین کو مجبور کرنا نہیں چاہتا۔ وہ صرف سخن کے انتخاب سخن کو سخن گسترانہ پڑھنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ انتخاب سخن کی نسبت میرے خیال میں جو خیالات مکرر ہے تھے وہ خود مصنف کی زبان سے سن لیجئے ؎

منتخب میں ترے اشعار سخن کیا چھنیے　　　جی میں آتا ہے کہ لکھ سارے کے سارے کھیئے

انتخاب کلام

(عمریافعی)

۱ گہے دین، گاہ دنیا چاہتا ہے		دل خود کام کیا کیا چاہتا ہے
۵ جسے دل چاہتا ہے دل نشیں ہے		دل دیوانہ پھر کیا چاہتا ہے
۲ گہے ناں، گاہ حلوہ چاہتا ہے	ق	یہ کافر نفس کیا کیا چاہتا ہے
۳ غذا بہتر سے بہتر ڈھونڈھتا ہے		لباس اچھے سے اچھا چاہتا ہے
۴ بہت کچھ چاہتا ہے یہ تو لیکن		خدا جانے خدا کیا چاہتا ہے
نفس سینہ میں مارا پھر رہا ہے		کسی میں جی ہمارا پھر رہا ہے
کسو کی خاک پھانکا چاہتا ہے		فلک جو منہ پسارا پھر رہا ہے
بایں پشت خمیدہ دیکھیے تا		فلک کیا بے سہارا پھر رہا ہے

تکلف برطرف اس عصر کے حاتم ہمی کہلاتے — موافق اپنی ہمت کے خدا دیتا تو دکھلاتے
فقط اک دل میں تیرے ہی اثر کرتی نہیں ظالم — وگرنہ وجد عالم کو مرے نالوں پہ ہوتا ہے
رخِ زرد اپنا دیکھے۔ دیکھے نقشِ ناخنِ غم کو — کہ زر ہی دیکھتے ہیں دیکھ کر ماہِ محرم کو

نظر بر مصلحت چندے توقعِ بدگمانی کر — مجھے اپنا نہ جان اے جان! بیگانہ سمجھ مجھ کو

ہم ہیں برے سراپا، ہاں تم بڑے بڑے ہو — بولو نا سب طرح سے تم بھی تو پھر برے ہو

خالی کرو نا دل کو غم سے بھرے ہوئے ہو — ہم بھی مرے ہوئے ہیں تم بھی مرے ہوئے ہو

انسان محوِ صنعِ بے چون ہو تو کیا ہو — حیرانِ کارگاہِ گردوں نہ ہو تو کیا ہو
دیکھا نا تم نے ان کے ناز و ادا۔ بھلا پھر — دل ان پری وشوں کا مفتوں نہ ہو تو کیا ہو

ظاہر میں سخن (سے) وہ دل کھول کے ملتا ہے؟ — آغوشِ تصور میں آ وے ہے جو رنجیدہ

ہوا قاصد کا کیا اس میں بھلا کچھ — سنا کچھ ہم سے اور اس سے کہا کچھ
کہا اک دن کسی ہمدم سے اس نے — ق "سخن کا حال بھی تم نے سنا کچھ؟"
کہا "کیوں خیر ہے؟" سنتے ہی اس نے — ۲ "سنوں میں بھی تو اس کا ماجرا کچھ"
کہا یہ "اک پری پیکر پہ غش تھا — ۳ بقدر حال تھا وہ بھی فدا کچھ۔
کئی دن ہو گئے ہیں گم ہے کہ باہم — شکر رنجی ہوئی ہے ظاہرا کچھ!"

آ! چھوڑ دے اسے تو دیں! بکاشانہ و آئینہ — دل وہ ہے جسے کہیے ہم خانہ و آئینہ

فزوں اندازہ سے گر ہو۔ زیاں ہے خندہ و گریہ — کہ رنج و آفتِ شبنم و دہاں ہے خندہ و گریہ

آفریں اے دانش و رائے صوابِ فاختہ — مصرعِ سروِ سہی ہے انتخابِ فاختہ
رشکِ الفت سخت جاں فرسا ہے۔ دیکھا آپ نے — پیچ و تابِ قمری و ہم اضطرابِ فاختہ
فاختہ بھی سوختہ قمری کے ہاتھوں کچھ نہیں — قمریِ دل باختہ بھی ہے کبابِ فاختہ
ظرف اور مظروف کی نسبت ضروری ہے سخن — کاش کے ہو سرو مینائے شرابِ فاختہ

اس پریشاں نظری سے کیوں تری ڈرتا ہوں — دل مبادا ہدفِ تیرِ ہوائی ہو جائے
بارے کیا لطف ہے پھر کہنے کا ایسے پیارا! — منہ سے نکلی ادھر اور بات پرائی ہو جائے

یوں آپ ہی تو مجھ کو نہ چاہے تو نہ چاہے — حاضر ہے غرض بندۂ سرکار تو پھر بھی

جہاں ہے یا کوئی صورت کدہ ہے — جسے دیکھو تو اک حیرت زدہ ہے
تجھے منظور ہو یوں ہی اگر دیکھنا حاضر ہے — ارے او دل دیکھتا کیا ہے بہارِ گلشن ہے

رقیب روسیہ کو دیکھ لے جس نے نہ دیکھا ہو — ہمارے وقت میں فرعون بے سامان حاضر ہے
نہیں تو نے ستایا ہم کو گر اے شوخ ایسا ہے — تو پھر رکھ دے نہ سر پہ ہاتھ یہ قرآن حاضر ہے
غضب ہے صافی رخ کو سخن پر خفگی آتی ہے — اگرچہ فتنہ غائب ہے مگر بہتان حاضر ہے

ہم دبستان وہم تاشش اپنے — اٹھ گئے آہ خواجہ تاشش اپنے
کیا ہوئے اے ہم خدا جانے — نالہ ہائے جگر خراشش اپنے
لگیں سرگوشیاں ہم ہونے — راز دل ہو گئے جو فاش اپنے

اک ذرا بات سمجھ کر کریے — جرم اثبات سمجھ کر کریے
گرچہ تصفیہ ہوا ہے باہم — پر ملاقات سمجھ کر کریے
صرف بے صرفہ نہ ہو لازم ہے — صرف اوقات سمجھ کر کریے
باعث فتنہ مبادا ہووے — رد سوغات سمجھ کر کریے
قافیہ تنگ نظر آتا ہے — فکر ابیات سمجھ کر کریے
شیخ کہتا ہے تصور اپنا — صورت ذات سمجھ کر کریے

ذوق سخن سے واقف ارباب ذوق کچھ ہیں — جو بات میں مزا ہے وہ کب نبات میں ہے

یہ اس کا اختیار ہے شب آئے یا نہ آئے — گزرے ہم انتظار سے اب آئے یا نہ آئے

کسی سے داغ دل پوشیدہ مثل لالہ کیا کیجے — عیاں ہے رنگ رو سے اپنے ضبط نالہ کیا کیجے

ہمارے غائبانہ کچھ ہے اور وہ روبرو کچھ ہے — مزاج یار کیا کہیے کبھو کچھ ہے کبھو کچھ ہے

لیتا ہے کب وہ جان جسے دل پسند ہے — مشکل تو ہے یہی کہ وہ مشکل پسند ہے

مکدر کب کسی سے وہ بت حراف ملتا ہے — برنگ آئینہ ملتا ہے جس سے صاف ملتا ہے

غنچہ لب! دن بھی گیا اور رات بھی جاتی ہے — اب تو کھل کر بول کچھ کیا بات بھی جاتی ہے

حلیم طبع کسی پر غضب نہیں ہوتے — اگرچہ ہوتے ہیں پر بے سبب نہیں ہوتے
ادب ضرور ہے ہر چند خورد کو ہر جا — مگر بزرگ بھی کچھ بے ادب نہیں ہوتے

غنچے سے دہن اس کا دیکھو نا ملا کر تم — سرخی میں یہ کچھ کم ہے، دو رخ زیادہ ہے

جس وقت مرے دل کی وہ گھات پہ آتا ہے — گر غیر سے ہے پر اپنی ہی جس بات پر آتا ہے
دل ہی مرا جانے ہے جس طرح سے گزرے ہے — افسوس مجھے اپنے ان رات پر آتا ہے

بے وجہ ہمارے سے پھر رنگ نکالا ہے — اس شوخ نے دیکھو تو کیا ڈھنگ نکالا ہے

ہو جائے ہے دیوانہ اک بار جو دیکھے ہے — اللہ! پری رونے کیا رنگ نکالا ہے

آستیں گر وہ خود پسند چُنے — سوج پھر تنکے ایک چند چُنے
پیچ کھا کھا کے مار مر جاوے — اپنے جامہ کے گر وہ بند چُنے

ملادے کس طرح یہ ہم کو جا پھر آنکھ قاتل ہے — نہ اسکی جان ہی نکلی نہ اسکی آرزو دل ہے

ہم نے کیا خوب رو نہیں دیکھے۔ — ایسے پر حیلہ جو نہیں دیکھے
اُس کا کیوں کر بھلا خیال کریں — خواب میں بھی کبھو نہیں دیکھے
چشم گریاں پہ ٹک نظر کیجے۔ — تم نے گرآب جو نہیں دیکھے

دیکھئے دیکھتے ہی دل کو چرا لیتا ہے — لا میں کہتا ہوں تو باتوں میں لگا لیتا ہے
اُس نے جھوٹے بھی کبھو پوچھا نہ دیکھا تجھکو — پھر تو ایسے کا سخن نام بھلا لیتا ہے

جوں ہی اُس بت کو سخن جلوہ نمائی سوجھی — دیکھتے ہی بخدا اُس کو خدائی سوجھی

دیدۂ تر سے مرا اشک چلا جاتا ہے — اور وہ شرم سے جوں شمع گلا جاتا ہے

آہ! یوں رات چلے جاتی ہے — ہاتھ سے بات چلے جاتی ہے۔
بارے صد شکر تصور میں ترے — یوں بھی اوقات چلے جاتی ہے۔
ساقیا! اب تو کوئی جام پلا۔ — مفت برسات چلے جاتی ہے۔
حسب فرمائش جانانہ ہنوز — روز سوغات چلے جاتی ہے۔

حرف جو لانے نہ تھے منہ پر وہی ہم لا گئے — بندہ پرور! تم تو اپنی ہی سے فرما کر گئے
حائل وصل صنم اغیار جیسے ہیں سو ہیں — عاقبت یہ سنگ دل ہم سے نہ اٹھوائے گئے
اتنی مدت میں سخن اس کو نہ دیکھا آج تک — گرچہ ہم کوچے میں اُس کے بارہا آئے گئے

وہ دل آزار پھر آتا ہے خدا خیر کرے — دیکھیے کس کو ستاتا ہے خدا خیر کرے
شام کل کی تو مجھے روتے ہی روتے گزری — آج پھر شام بتاتا ہے خدا خیر کرے
تم نے دیکھی نہ ضد اس کی نہیں تا کر کی — اس شب تار میں جاتا ہے خدا خیر کرے
کیا سبب ہے کہ وہ عیار خلاف معمول — گھر مجھے اپنے بلاتا ہے خدا خیر کرے
ظاہر اخبط نے گھیرا ہے اسے آج سخن — گالیاں صاف سناتا ہے خدا خیر کرے

سنتے ہی خبر ترے سفر کی — وحشت نے مزاج پر اثر کی
جو بات کہو اُسے کہے ہے۔ — "جانے بھی دو لائے ہو کدھر کی"

کچھ دوس نہیں ہے شمع رو پر　　ایسی تمیس کریں سحر کی۔
اتنا بھی میاں! چھپا کے ست چل　　چوٹی ہی تو ناگ ہے کمر کی۔
کیا بیٹھے ہو لال۔ لال میرے!　　کچھ تو کہیے اِدھر اُدھر کی؟

اُف ری تری مے نوشی اللہ ری یہ بے ہوشی　　جب میں تجھے دیکھوں ہوں سرشار ہی رہتا ہے

بغل میں ان دنوں رکھتی ہے اپنی خوبرو ایسا　　پری رو! تو اگر دیکھے اُسے دیوانہ ہو جاوے
سخن اس غم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ　　ترا احوال بھی مجنوں صفت دیوانہ ہو جاوے

تو تو پھرے ہے اپنی فقط چشم تر لیے　　پھرتے ہیں آرزو میں بہت اس کی زر لیے
جی تو یہ چاہتا ہے کہ اُٹھیے نہ جا سے　　اور حرص لے کے پھرتی ہیں در بدر لیے

پھنسایا محبت نے دام بلا میں　　مجھے ورنہ کب آرزو تھی کسو کی
تمہاری ہی چشم سخن گو نے سمجھا　　کہ کچھ زیر لب گفت و گو تھی کسو کی
عجب عیش تھا وہ کہ مستی میں اکثر　　گلے سے لپٹنے کی خو تھی کسو کی
خدا جانے پیارے صنم! کیا ہوا وہ؟　　گلی میں تری ہائے ہو تھی کسو کی
نہیں خالی حکمت سے آنکھوں کا بہنا　　مگر ان کو فکر وضو تھی کسو کی
سخن! آنکھ کھلنے نے بس کچھ دیا ہے　　کہ صورت ابھی روبرو تھی کسو کی

ملامت گر چھڑک زخم جگر پر تو نمک نکلے　　خیال یار پر مشکل ہے دل سے یک بیک نکلے
نکالا کام دل تو نے بہت سے کامگاروں کے　　کسی ناکام کا بھی کام گاہے اے فلک نکلے
فراموش گر کرے حق نمک کو بحر کے یارب　　بدن سے پھوٹ کر ماہی کے دریا کا نمک نکلے
سخن اپنی غلط فہمی تھی جن کو گرم سمجھا تھا　　کمال افسردہ دل نکلے نہایت ہی خنک نکلے

آج بھی ہم سے بناتے ہو ابھی یہ باتیں　　کل ہی کی بات تو ہے ہوش سنبھالے تم نے
واہ وا ہم بھی سلیقے کے معترف ہیں اب تو　　ناز ایجاد کیے سب سے نرالے تم نے

عرض سوال یاں ہے شایان فقر کب ہے　　لبریز ہے نوا سے قانون بے نوائی
کرتا ہے تن وہی کب عدم دل دریغ　　چاہے ہے آئینے سے جو نقد رونمائی

کسی دن ہم تجھے تنہا اگر اے شوخ پاویں گے　　ہمارے جی پہ جو جو کچھ گزرتی ہے سناویں گے
برنگ سرمہ منظور نظر ہم بھی کبھو ہوں گے　　جلاویں آپ دیکھیں تو ہمیں کب تک جلاویں گے

کبھو اطلس کی انگیا ہے کبھو تشنہ کی چولی ہے　　تکلف برطرف سارا ہی بند بدلتا ہے

اب تو ملتے ہو نہ چلتے ہو خدا خیر کرے — کم بہت گھر سے نکلتے ہو خدا خیر کرے
اب تو بیجوں ہی پہ چلتے ہو خدا خیر کرے — دن بدن رنگ بدلتے ہو خدا خیر کرے
نشہ اتنی تو نہیں ہے تمہیں کہیے کیا ہے؟ — کہیں گرتے ہو سنبھلتے ہو خدا خیر کرے
آپ کی سنگدلی اب وہ کدھر ہے کہیے! — موم کی طرح پگھلتے ہو خدا خیر کرے
یہ جو تم وصف خط سبز بیاں کرتے ہو — آج کچھ زہر اُگلتے ہو خدا خیر کرے
ہے سخن سے تمہیں اللہ قساوت کتنی؟ — قتل کرتے ہو کچلتے ہو خدا خیر کرے

یہاں پری تا بہ حور یکساں ہے — جلوۂ نار و نور یکساں ہے
دل سے دل کو اگر تعلق ہو — یار نزدیک و دور یکساں ہے
چاہیئے دیدۂ حقیقت بیں — شعلہ و شمع طور یکساں ہے
یہ وہ سرکار ہے سخن کہ یہاں — کودن و ذی شعور یکساں ہے

صنم کو بہر تحصیل سبق آئینہ بہتر ہے — کہ صد دفتر سے علم اخلاق آئینہ بہتر ہے

قسم کھاتے ہو کیا اے جان اجانے — تمہارا دین اور ایمان جانے
بھلا کچھ اور بھی تم جانتے ہو؟ — اجی کیا بس بُرا ہی مان جانے
نگہ پر تو نگہ رکھتے نہیں ہو؟ — تغافل ہی فقط پہچان جانے
ہے الطاف یہ ہی چاہیئے نت — تمہارا جب سخن احسان جانے

یوسف مصر ہو تو کام نہیں — غیر سے اپنے پاس کے ہوتے
خاک ہو تیرے ہاتھ سے اے عشق! ق — یہی تا ہر دیار کے ہوتے
سرمہ ہوتے بہت تو یہ ہوتا ۲ — زیب چشم نگار کے ہوتے
پھر تو اکسیر ہی تھے گرد راہ — گر کسی خاکسار کے ہوتے

ربط وہ اگلے کم ہوے سو ہوے — تجھ سے بیگانے ہم ہوے سو ہوے

تان جب اُس کے کان پڑتی ہے — جان کے تن میں جان پڑتی ہے

نظر سے اپنی بدیا خوب تر صورت گزرتی ہے — تکلف بر طرف اپنی بہر صورت گزرتی ہے
ہزاروں صورتیں دل سے اتر جاتی ہیں اک پل میں — نظر سے اپنی صورت گر کی گر صورت گزرتی ہے
یہ حسن و عشق ہے آئینہ ہم امتحاں میں — گزرتی ہے اُدھر بھی جو ادھر صورت گزرتی ہے
بنے ایسے خود آرا سے سخن کس شکل پھر کہیے؟ — بناتے ہی جسے آنکھوں پہ ہر صورت گزرتی ہے

۱۔ اب مذکور ہو لئے [illegible] ۱۴۱

کیا فرق کفر و دیں کے آیا ادر میاں ہے　　تسبیح تک تو دیکھا زنار در میاں ہے

نظر آتے ہیں مجھکو برق کے سے ڈھنگ نالے میں　　کہ گم ہو جائے گاہے اور گاہے دم بدم چمکے

یہی صورت رہی اپنی اگر اک چند دو دن ہیں　　تو پھر تم دیکھنا صورت بھی پہچانی نہ جاوے گی

ہمیں غم ہے کہ ہم آخر نظر میں دشمن جاں کی　　سبک ہو جائیں گے پر یہ گراں جانی نہ جاوے گی

سفر ہو یا حضر ہو بندہ پرور! یہ محبت ہے　　بدشواری ہی جاوے گی بآسانی نہ جاوے گی!

زر نہ درویش لے ریا چاہے　　من کو مارے جو کیمیا چاہے۔

سخت عقل و جنوں کی بگڑی ہے　　ق　ایک کی ایک ضد کیا چاہے۔

وہ یہ چاہے کہ تار تار کروں　　۲　یہ گریبان کو سیا چاہے۔

خلط بحث میں اے سخن! ایسے　　۳　دل تو انصاف ہی کیا چاہے۔

حق تو یہ ہے کہ وہ سہاگن ہے　　۴　بندہ پرور! جسے پیا چاہے۔

حالت یہ اپنی ضعف سے عبرت فزا ہی　　قامت دوتا ہوا کہ وہیں شکل لا بنی

اے منعم اس سے فائدہ بھی کچھ ہوا تجھے؟　　لوٹے ہزار گھر تو یہ عشرت سرا بنی

آسودہ جب ہوا دل بے تاب عیش ہے　　سیماب ہے جو ٹھہر گیا کیمیا بنی

ہمارا درد دل مجنوں سے پوچھو ہم سے مت پوچھو　　کہ حال عاشق دل باختہ دل دادہ جانے ہے

سب ہی ہے گرچہ حباب آسا بنائے زندگی　　بھر رہی ہے سر میں تس پر بھی ہوائے زندگی

یاد وہ عہد شباب اے دل! کہ تھے چند روز　　عیش سے آباد تھی عشرت سرائے زندگی

عالم طفلی و پیری سے مجھے ظاہر ہوا　　ابتدائے زندگی و انتہائے زندگی

امر ناچاری ہے کیا کیجے کہ ٹالے ہی بنی　　آپڑی ہے اب تو سر ہی پر بلائے زندگی

از کفن تا پیرہن دیکھا تو اتنا فرق ہے　　یہ ردائے مرگ ہے اور وہ عبائے زندگی

سانس لیتا ہے جو یہ بیمار دشواری کے ساتھ　　ظاہرا تنگی کرے ہے تنگنائے زندگی

ایسی ہی آہستہ آہستہ چلے جاتی ہے کچھ　　گوش زد ہوتی نہیں آواز پائے زندگی

مرگ ہی کی یاد رہ رہ کر مجھے آتی رہی　　ہو گیا جب سے گرفتار بلائے زندگی

ہے ہی تنگی نفس کی اور دل کی غنچے کی　　تا نہ شکل گل قبا ہو یہ قبائے زندگی

خضر آسا ہو اگر عمر ابد پھر بھی سخن　　یاد رکھیو پھر لیوے موت بہ رضائے زندگی

چمن میں صبح وہ ایسی امنگ سے آئے　　کہ گل تمام نظر تو ہم رنگ سے آئے

وہی بسر وہ بت شوخ و شنگ سے آئے — کہ بار عشق میں جو نام و ننگ سے آئے
ہوئی نصیب انہیں کو بہار بے رنگی — برنگ بو جو نکل صاف رنگ سے آئے
کیا ارادہ اشنان جب وہ کافر نے — سبو بھرے ہوئے دریا گنگ سے آئے

وہ دل فگار کا پھر کیوں نہ کام ہو جاوے — ہلال زخم جو ماہ تمام ہو جاوے
دل گرفتہ کھلے جب تو سرخوشی ہووے — شگفتہ ہو جو یہ غنچہ تو جام ہو جاوے

آفریں کہیے انہیں پیارے کہ پیدا ہی کیا — دولت عمر ابد کشتوں نے مر مر کے ترے
ایک دن بھی رو دل پایا نہ تجھ سے آج تک — گرچہ ہم بندہ ہیں بے دام و درم گھر کے ترے
اس توقع پر کہ پھر بھی تو نظر آوے کہیں — ہو گئے دریوزہ گر مشتاق در کے ترے
ہم سے اے سرکش نہ کر نخوت فروشی اس قدر — تو اگر سر ہے تو ہم بھی تاج ہیں سر کے ترے
بال و پر بلبل کے اے صیاد آوارہ نہ کر — کام ہی آ جائیں شاید بالش پر کے ترے
اے زلیخا ہاتھ کیا آیا ترے اس مکر سے — قفل آخر جبر ٹوٹے کاخ مصور کے ترے

عشوہ و ناز و کرشمہ ایک سو دل ایک سو — یہ تن تنہا ہے اور جم غفیر حسن ہے
کچھ عجب نسبت ہے ان دونوں کی آپس میں سخن — مہر سے طرح وفا مہ سے ضمیر حسن ہے

کون کہتا ہے کہ آئینہ کنارے رکھیے — پر نظر حال پہ بھی ٹک تو ہمارے رکھیے
دل پر داغ جو ایسا ہی پسند آیا ہے — لیجیے نذر ہے یہ پاس تمہارے رکھیے
خیر معلوم ہوا ہم کو ستاتے کیا ہو؟ — گر پری آپ نے شیشہ میں اتارے رکھیے
قدر دانی نہ کریں پھر بھی یہ مہر و ان کی — رو برو چرخ سے لا کر جو ستارے رکھیے

غم میں کہاں کہاں نہ ترے اے صنم پھرے — کوچہ بکوچہ، دربدر و خم بخم پھرے
ہم کہا یہ دوس کھتے ہو انصاف تو کرو — تم ہم سے پھر گئے کہ بھلا تم سے ہم پھرے؟
اپنی سی گر منش نہ نوازی کمی نہ کی — پر ہم پھرے بتوں سے نہ ہم سے صنم پھرے
قاصد پھر اس غریب پھر آ مہر و مہ پھرے — پر اس طرف نہ رہرو ملک عدم پھرے
کیا کام اس کو باغ سے طاؤس کی طرح — ہمراہ ہی لیے جو بہار ارم پھرے
کافر ہو گو اعتبار ہو اب جس کو آپ کا — سو مرتبہ تو آپ نے کھا کر قسم پھرے
اب جو چلے ہو شام ہی کو منہ دکھاؤ گے — شب کے جو تم ہو گئے سو تم صبح دم پھرے

خلاف وضع جہاں ناز نانہ ساز ایسے — نہیں کرخت ہی ایسے کہ ہم گداز ایسے

نہوں جو درپئے ایذائے عاشق مسکیں
کہاں جہاں میں معشوق دل نواز ایسے
طریق باختہ ہو شان عشق مت پوچھو
کہ خال خال ہیں جاں باز و پاک باز ایسے

انداز کو سخن کے ہمدم نہیں سمجھتے
باوصف محرمیت محرم نہیں سمجھتے
وادی پہ اپنی جس دم آتے ہیں چشم گریاں
صد سیل کو بقدر شبنم نہیں سمجھتے
پہنچی ہے بے نیازی اس مرتبہ پر اپنی
حاتم کو اے سخن ہم حاتم نہیں سمجھتے

بدست جوانی آخر آخر پیری میں ہشیار ہے تو
تھے رات تو خواب غفلت میں دل نکلا جب بیدار ہو

کیوں نہ مغرور ہو تائید فلک پر حاسد
سفلۂ محض ہے سفلہ کی کمک رکھتا ہے
رتبۂ حضرت انسان سے آگاہ بھی ہو؟
ہے تو آدم پہ تفوق پہ ملک رکھتا ہے
سرکشی سے مرے نالے کی نہیں تم واقف
سر اٹھاتا ہے تو پیتا بہ فلک رکھتا ہے
گرمی عشق کو گل کھانے نے افسردہ کیا
گرم ہے داغ پہ تاثیر خنک رکھتا ہے
اے سخن! خندۂ شیریں ہو اگرچہ شیریں
گریہ فرہاد کا بھی آب و نمک رکھتا ہے

تا چند رخ سے ماہ ترے منفعل رہے
زہرہ تری جبیں سے کہاں تک خجل رہے
حسن و وفا کا قحط ہے اتنا جہان میں
عاشق رہے نہ وہ بت پیماں گسل رہے
ہے شرط اتحاد تو یہ چاہیے کہ یار
آشفتہ زلف ہو تو پریشان دل رہے
معمور ہے صفا سے وہ رخ اس قدر کہ بس
اتنی جگہ نہیں کہ سخن ایک تل رہے

نہ پوچھو خوش ادائی کون سی ہے
بھلا اس میں برائی کون سی ہے
اگرچہ بے سر و ساماں ہے بندہ
بتوں کے گھر خدائی کون سی ہے
مکدر ہی رہا کرتا ہے اکثر
اسے ہم سے صفائی کون سی ہے
رسائی کی جہاں ہو نارسائی
ہمیں پھر واں رسائی کون سی ہے
جسے تو نے جفا سمجھا ہے یہ بھی
وفا ہے بے وفائی کون سی ہے
دکھا جاتے ہیں گاہے خستہ حالی
پھر اس میں خود نمائی کون سی ہے
سخن جو غش ہے اس ہرجائی پر
بھلا یہاں میرزائی کون سی ہے

ہمارا جرم اس نے کچھ نہ کچھ ثابت کیا ہوگا
کہ ترک آشنائی شوخ نے اک بار ایسی کی
ہمیں اب ایک دم بھی عمر مشکل ہے بسر کرنا
تمہارے ہجر نے تو زندگی دشوار ایسی کی
توقع وصل کی پھر بندہ پرور اکیا ہی کم ہے
طلب پر تم نے اک بوسے کے جب تکرار ایسی کی

وفا مجنوں سے کی لیلیٰ نے جس پیش از یں چندے | سخن ہے اپنے تو نے بھی تو اے دلربا ایسی کی

دیدۂ نرگس شہلا یہ چھبن کیا جانے | شوخی چشم سیہ مست ہرن کیا جانے
گل ہے محرم جو نہ ہو رخ سے بھلا کیا واقف | غنچہ دیکھا نہ ہو جس نے وہ دہن کیا جانے
درد ہمدرد ہی کچھ جانے تو جانے اپنا | درد دل ورنہ بت عہد شکن کیا جانے

دور و نزدیک گفت و گو ہی ہے | تو جسے ڈھونڈھتا ہے تو ہی ہے
ہم نہ دیکھیں تو نقص بینش ہے | ورنہ وہ اپنے روبرو ہی ہے
مست ہیں اور کچھ نہیں رکھتے | اپنا سرمایہ اک سبو ہی ہے
مرغ قبلہ نما کی طرح سخن | روئے مشتاق ایک سو ہی ہے

اشک سے چشم تر کو آگ لگی | گرم پانی سے گھر کو آگ لگی
ہجر کی رات جو نہیں کٹتی | کیا بلا اس سحر کو آگ لگی
عیب ہی ہے جہاں تہاں عیب | جب تو علم و ہنر کو آگ لگی
دیکھتے ہی وہ شعلہ رو کو سخن | تار نظر کو آگ لگی

جو فقط دل سے آشنا ہوئے | وہ سجود گم نہ ہو تو کیا ہوئے
کس بلا میں پھنسا دیا اے دل! | کیا کیا ہے ترا برا ہوئے
زخم دل پر اگر سخن تیرے | چھڑکیے تو نمک مزا ہوئے

طالب نہیں کہ دولت جم اپنے ہاتھ آئے | پر یہ خدا کرے کہ صنم اپنے ہاتھ آئے
ایسے ترے سراغ میں شب گم ہوئے کہ بس | آیا نہ تو ہی ہاتھ نہ ہم اپنے ہاتھ آئے
آئے جو ہاتھ ہاتھ تو بیعت ہی کیجیے | سر ہی پہ رکھیے گر وہ قدم اپنے ہاتھ آئے
بس ہے یہی کہ رخ بہ رخ ہو وہ گل رخ تو پھیر ادھر | رخ بھی نہ کیجیے جو ارم اپنے ہاتھ آئے

نالہ کو ارتباط ہے دل سے | گریہ کو اتحاد چشم سے ہے
مست و مخمور و ساحر و فتنہ | فی الحقیقت مراد چشم سے ہے
گرچہ اے شیخ یہ مسلم ہے ق | قدر ابرو زیاد چشم سے ہے
ابروئے یار سجدہ گاہ بجا (۲) | پر مجھے اعتقاد چشم سے ہے

کدھر وہ چشم تغافل پناہ پھرتی ہے | مژہ کے سایہ میں جس کی نگاہ پھرتی ہے
حباب بادہ جو شاں نہیں مگر اے دل | پری رکھے ہوئے سر پر کلاہ پھرتی ہے

سخن ہی ظلم رسیدہ نہیں تن تنہا — کہ اک جہان یہاں داد خواہ پھرتی ہے

ترک کی یار نے ہے جو دستداری دوستی — دشمنی جانا اگر تم نے ہماری دوستی

خاک ایسی زد و بجی پر کہ آدھی بات پر — ہو گئی برباد اک مدت کی ساری دوستی

کیوں کیا آزردہ تم نے خاطر عشاق کو — تھی اگر پیارے تمہیں ایسی ہی پیاری دوستی

ایک دن شیریں نے خسرو سے کہا با صد نیاز — ق — کیا یوں ہی ہوتی ہے باہم آپس واری دوستی

ہم تمہیں چاہیں بدل اور تم رہو مشغول غیر — ۲ — یہ ہماری دوستی ہے وہ تمہاری دوستی

فضولی ہے اگر کہیے کہ ان آنکھوں سے دیکھا ہے — وہ آنکھیں اور ہی ہیں اس کو جن آنکھوں نے دیکھا ہے

- - - - - - - - -

خدا جانے کہ بد نظروں نے کن آنکھوں سے دیکھا ہے

خدا عالم ہے حال غیب کا ہم نے سخن اب تک — پری دیکھا ہے آنکھوں سے نہ جن آنکھوں سے دیکھا ہے

فرصت شب وصال کی برق و شرر ہوئی — تھی شام ہی ہنوز کہ پیدا سحر ہوئی

تلخی نزع رشک نے اس کو چکھا دیا — شیریں کے حق میں زہر سے بدتر شکر ہوئی

مست مئے نشاط ہے تو سیر و طیر میں — جانے تری بلا جو مری جان پہ ہوئی

اپنی خبر ہو پھر اسے کیوں کر کہ راہ میں — جاتی ہوئی خبر بھی ز خود بے خبر ہوئی

نسبت ہی حسن و عشق میں کچھ اور ہے سخن — ابرو ہوئی جو تیغ تو چھاتی سپر ہوئی

نہ تنہا چشم ہی رطل گراں کا کام کرتی ہے — نگاہ مست ساقی اک جہاں کا کام کرتی ہے

مژہ تنہا نہ تیغ خوں فشاں کا کام کرتی ہے — نگاہ تیر کیا کم ہے سناں کا کام کرتی ہے

زبان بے زبانی صد زباں کا کام کرتی ہے — نگاہ عجز عاشق ترجماں کا کام کرتی ہے

ایک تنہا نہ وفا لوٹ گئی — حسن پر اس کے ادا لوٹ گئی

دیکھ اس مست حیا کو محجوب — اور تو اور حیا لوٹ گئی

خون عاشق پہ ہوا جب مائل — پانو پر اس کے حنا لوٹ گئی

آج بن ٹھن کے وہ بت یوں نکلا — کہ خدائی بخدا لوٹ گئی

مرضی بت جو سوئے جلوہ نمائی آئی — دیکھنے کو بخدا اس کے خدائی آئی

طور سے اپنے وہ خود در سے گزرتا کب ہے — یہ طبیعت ہی تو ہے پھر جدھر آئی آئی

کیا کیا ہم نے کہ آزردہ کیا گل رو کو — کیا بھلی چنگی بھلائی میں برائی آئی

نہ ہوا صاف کبھو ہم سے مکدر ہی رہا — ایسی ہی جی میں وہ بدظن کے برائی تھی

اور بھی کچھ مزا آتا ہے صبا کو پوچھو یا یہ غنچہ ہی کی بس عقدہ کشائی آئی
اپنی نیکی سے نہ ہم گزرے بد و نیک جب تو اس بُرے وقت میں کام اپنے بھلائی آئی

خدا ہی خیر کرے کچھ قلق ابھی سے ہے شروع عشق ہے اور سینہ شوق ابھی سے ہے
ہنوز اس لب مے گوں تلک نہیں پہنچا کہ جام شرم سے پُر از عرق ابھی سے ہے
اگرچہ اول جوش جنوں ہے پر سر میں ہوائے بادیۂ لق و دق ابھی سے ہے
نہ ہے زمانہ کہ لڑکوں کو اس زمانے کے دوا دوی پئے سدِ رمق ابھی سے ہے
شب وصال کہاں ہے سخن، یہ تماشا ہے! ہنوز شام ہے پیدا قلق ابھی سے ہے

کہ اُس خو درانے کو ہر بام و ہر منظر خوش آتا ہے اُسی کو خوش کرے ہے تو اُس کو جو منظر خوش آتا ہے
کسو کا ناز خوش آتا نہیں نازک دماغوں کو خوش آتا ہے تو ناز صاحبِ جوہر خوش آتا ہے

کہے سنے پہ کسو کے عمل کیا تم نے ہمارے کام میں آخر خلل کیا تم نے
یہ خوب کام کیا حضرت سخن اے واہ کہ ترک صحبت اہل دول کیا تم نے

کبھو جو مجھ سے خوش ہوتا ہے تو بے وجہ ہنساتا ہے کبھو ناخوش جو ہو جاتا ہے تو بے وجہ رلاتا ہے
عجب صورت ہے عاشق کی نیا حال اُن بیری میں سحر تک شام سے بیٹھا ہوا قیموں کھلاتا ہے
پئے تسکین سخن یوں دل پہ اپنے ہاتھ رکھتا ہے تھپک کر طفل بد خو کو کوئی جیسے سلاتا ہے

بایں عاشق نوازی جان! پھر یہ دل لگی کیسی جو تیری دوستی یہ ہے تو ہوگی دشمنی کیسی؟
کسی کا ذکر تقریباً آ جاتا ہے رُکنا ہے زیادہ اس سے ہوگی اور اُس کی بدظنی کیسی
یہ ہم ہی ہیں کہ اب تک روک رکھا ہے اُسے ورنہ کرے ہے نفس کافر خرچ ہمت توسنی کیسی
نہ کیجے شیخ کو فرعون بے ساماں تو کیا کیجے؟ بھری ہے سر میں اس کے نشۂ کبر و منی کیسی
بھلا پروانۂ دل سوختہ جاں ہو کس صورت بلائے جان ہے اس کی یہ شمع کشتنی کیسی
نہ سمجھے یوں تو ہٹ دھرمی ہے شیریں کی سخن ورنہ کیا ہے کوہ کن نے بے ستوں پر جاں کنی کیسی؟

بخود بالیدہ ہوتا ہے جو اتنا آج کھل کھل کے خدا جانے کہ کیا پھونکا صبا نے کان میں گل کے
ہوئے آزاد جو خط کے نمو ہوتے وہ کیا جانے اسیری کا مزا پوچھو گرفتاروں سے کاکل کے
سخن دیکھا نہ سمجھے لے گیا اُس زلف مشکیں نے پہلوانی کی پیچ آخر نہ آئی کام سنبل کے

آپ جو ہم سے لگے مہر و وفا کم کرنے غیر خوش وقت ہوئے یار لگے غم کرنے
کچھ عجب تم نے کیا ہم سے تفنن اے واہ جب کہ ہم رام ہوئے آپ لگے رم کرنے

دیکھ اُس چہرۂ پر نور کو ارباب نظر — سورۂ نور باخلاص لگے دم کرنے
خبر ہے جان! کہ اک گونہ شکر آلی پر — دوستی ہی کو لگے آپ تو برہم کرنے
تا دہندی پہ کمر آپ نے ایسی باندھا — طرح سرکار جو کرتے تھے لگے ذم کرنے

کہہ دو جراح سے اتنا کہ خبرداری سے — زخم دل کچھ نظر آتے ہیں مجھے کاری سے
بارہا منع کیا اُس کو جفاکاری سے — لیک گزرا نہ دل آزار دل آزاری سے
کاہے کو ذکر اسیرانِ وفا کرتے ہو — تم تو واقف ہی نہیں ذوق گرفتاری سے
سلسلہ اشک مسلسل کا نہ پوچھو اپنے — بہرہ ور بحر ہے اس سلسلۂ جاری سے
وقت یاری کے نہ کی ایک نے تجھ سے یاری — یہی امید تھی یاروں کی مجھے یاری سے
بخت کچھ ایسے ہی برگشتہ ہوئے ہیں اپنے — کام دل زور سے نکلا نہ سخن زاری سے

تجھے بگاڑ دیا ہم نے راست پوچھو تو — وگرنہ وضع تری یہ تو کج کلاہ نہ تھی
کیا سلوک جو اے ماہ مہرباں تو نے — ہیں یہ تجھ سے توقع خدا گواہ نہ تھی
غم فراق نے دیکھا نہ کر دیا آخر — اگرچہ حالت دل اس قدر تباہ نہ تھی
کیا جو خوص تو یوسف کی بے گناہی تھی — نظر بشرع محبت کم از گناہ نہ تھی
سوائے تیری گلی کے ستم رسیدوں کو — مزا تو یہ ہے کہ ظالم کہیں پناہ نہ تھی
ہوا جو شکوہ سرا تو سخن تغافل کا — ارے وہ عین نگہ تھی تجھے نگاہ نہ تھی

رکھتے حسد سے اس لیے یوں تجھے مجھے — جلتے ہیں دیکھ لیلیٰ و مجنوں تجھے مجھے
مجبور ہوں اس امر میں اے جاں! کیا کروں — ملنے نہ دے جو گردش گردوں تجھے مجھے
عشاق تجھ سے رام ہیں معشوق مجھ سے رام — ہے یاد کچھ عجیب ہی افسوں تجھے مجھے
اک دن کہا بعجب صنوبر نے سرو سے — ق "حق نے دیا ہے کیا قد موزوں تجھے مجھے"
اُس نے کہا کہ "چپ! کہیں گلشن سے باغباں — ۲ ایسا نہ ہو نکال دے بیروں تجھے مجھے"

ہے جی میں کہ اب ترکِ وفا کیجیے اُس سے — غیروں سے ملے جو نہ ملا کیجیے اُس سے
اے ہم نفسو! حالِ دل زار ہمارا — اظہار بھلا کچھ تو کیا کیجیے اُس سے
آ جائے جو اس وقت سخن عین خوشی ہے — بیٹھے ہوئے پھر شعر سنا کیجیے اُس سے

نرگس مخمور دل کی غم گساری کیا کرے — آپ ہی بیمار ہے بیمارداری کیا کرے
دیکھیے آئندہ اپنی آہ و زاری کیا کرے — عاقبت دل کی ہماری بے قراری کیا کرے

سخن ہم بندۂ عزت نہیں اے بے اعتناؤں کے — جو بااین خشک مغزی تر دماغوں سے کہیں ملیے
خجل ہوتے اگر روئے وفا سے یار کیا کہتے — اگر یاری نہ کرتے یار سے ہم۔ یار کیا کہتے؟
نہ ہوتے ہم شریک دور تو میخوار کیا کہتے — وگر بدمست ہو جاتے تو ہشیار کیا کہتے؟
تغافل کیش نے اچھا ہوا پوچھا نہیں ہم سے — اگر کہتے تو ہم حال دل بیمار کیا کہتے۔

سینکڑوں ہی آفتیں ہیں عشق میں گرچہ ولے — راز دل افشا مبادا ہو خطر یہ بھی تو ہے۔
اتحاد حسن و عشق اتنا تو ہے بایک دگر — گر وہ تڑپے ہے ادھر مضطر ادھر بھی تو ہے
گھر ہی جانا فرض ہے کچھ اس اندھیری رات میں — شب کی شب رہ جائے نا جان! گھر یہ بھی تو ہے
اُس طرف سے تو گزرتے ہو تم اکثر پر کبھو — اس طرف سے بھی گزر ہیئے رہ گزر یہ بھی تو ہے
تم نے تنہا دلبری ہی کو ہنر جانا مگر — بندہ پرور! دل رہی کرنا ہنر یہ بھی تو ہے

جو تو کہتا ہے زاہد ہم رستا یوں نہیں یوں ہے — غلط فہمی ہے تیری آن، ادھر آ۔ یوں نہیں یوں ہے
وہی عاشق ہے جو معشوق معشوقان عالم ہو — کہ لطف عشق بازی جا بجا یوں نہیں یوں ہے
ہوا ہو، ابر ہو، دلدار ہو، مطرب ہو، گلشن ہو — کہ خط مے کشی اے بادپیما۔ یوں نہیں یوں ہے
پئے رفع گماں تم اتنی باتیں کیوں بناتے ہو — خفا ہو جائیے بس ہم نے مانا۔ یوں نہیں یوں ہے

گر دل سے دل کو خفیہ پیوستگی نہ ہوتی — حسن و وفا کی باہم وابستگی نہ ہوتی
لے ہی چلی تھی حرص خانہ خراب دل کو — مانع اگر ہماری وارستگی نہ ہوتی
بے مہری بتاں ہی نافع ہوئی وگرنہ — دارو پذیر اپنی دل خستگی نہ ہوتی

اگر مفسد نہ کہیے حاسد بدظن کو کیا کہیے — وگرنہ فتنہ نہ کہیے ایسے برہم زن کو کیا کہیے
اگر ہالہ نہ کہیے حلقۂ زر کو تو کیا کہیے — ثریا گر نہ کہیے۔ کہیے پھر لٹکن کو کیا کہیے
سراپا پھونک دی اس آتش گل نے تو تن من کو — اگر دوزخ نہ کہیے۔ کہیے پھر گلشن کو کیا کہیے
بلائے جاں گرا ہی اس سے حق محفوظ ہی رکھے — اگر افعی نہ کہیے تو سبک گردن کو کیا کہیے
کسی سے کیا گلہ یہ بھی سخن قسمت کی خوبی ہے — ہوئے جب دوست ہی دشمن تو پھر دشمن کو کیا کہیے

مہجور جاں بلب کی خورسندگی نہ ہوتی — وہ جان جاں نہ ہوتا تو زندگی نہ ہوتی
تقصیر یک سر مو ہوتی نہ گر وفا میں — حاشا کہ آج کے دن شرمندگی نہ ہوتی
گر زندۂ ابد ہم ہوتے تو اپنے ذمہ — شہر عدم کی ثابت باشندگی نہ ہوتی
ایسے بھی ہم نہ تھے جو افشائے راز کرتے — بندہ نواز تم سے گر بندگی نہ ہوتی

اُس رخ سے اقتباس انوار اگر نہ کرتے — تو مہر و ماہ کی یہ تابندگی نہ ہوتی

صبا جس دم کہ ذکر خوبی کاکل نکالے گی — چمن سے ہو کے شاں خجلت سے سنبل نکالے گی
پیا گر آب گل بن نے مرے چشموں کے چشموں سے — دل صد چاک جائے غنچۂ شاخ گل نکالے گی
نہیں قایل ہم اُن نالوں کے ہم جب ہیں متوجہ — طرح تازہ کوئی فریاد کی بلبل نکالے گی
فقط اک آبلوں پر منحصر کیا ہے کہ دیکھو گے — ابھی تو یہ تہی پائی بہت سے گل نکالے گی
وہ چشم شعبدہ باز لے سخن اتفاقاً آفت ہے — سوئے آپ سے اہل ورع کے گل نکالے گی

عاشق میں ہم تو اپنے بہ بہ اِن کے — شیریں لبوں کے اور وہ شیریں زبان کے
مرد خدا نے قہر کیا اپنی جان پر — بیٹھے بٹھائے ناک ہی بدھیں کان کے
مرغوب کیوں ش آپ کو ذکر لعل نوش — ہیں آپ بھی تو ایک چٹوری زبان کے
کافر ہو مطمئن جو سو قول و فعل پر — ہے سچ تو یہ کہ جھوٹے ہو سارے جہان کے
کیا پوچھنا پھر آپ کے انصاف و عدل کا — تم بھی تو ہوتے سوتے ہو نوشیروان کے

نہ یہ سونے کی پتلی ہے نہ چاندی کی پتلی ہے — مرے مہر سراپا مگر گینے کی پتلی ہے
نظر کرتے ہیں کب اہل نظر اس زال دنیا پر — نظر میں اُن کی یہ بھی ایک چوبینے کی پتلی ہے
نظر آتی ہے صورت صاف ہر ہر عضو سے اُس کے — مگر اُس کا سراپا صرف آئینے کی پتلی ہے

پھوٹے سینہ تاس اُس کے ہے یہ من میں ہاتھ کے — تا کہ اک جان گر آجائے تن میں ہاتھ کے
حرز بازو منظور ہے گر تجھکو اے جان جہاں — تو تو دو نہ نام بس ہیں نور تن میں ہاتھ کے
پوچھنا کیا اُن بتوں کے دست رنگیں کی بہار — گلشن جنت دکھاتے ہیں چمن میں ہاتھ کے
یاد ہیں وہ دن کہ جب مہندی لگاتے تھے جو — یک دگر لیتے تھے بوسہ لڑکپن میں ہاتھ کے
ایک انگلی کی بھی قیمت ہو نہیں سکتی سخن! — دیں اگر صد پنجۂ مرجان ثمن میں ہاتھ کے

یہ طالع کی خوبی ہے کہ غم خواری کروں جس کی — طرف ہوتا مجھ سے ہی طرفداری کروں جس کی
نرالے ہیں جہاں سے رسم کچھ ان سینہ صافوں کے — نہیں خاطر رکھتے نہ خاطر آزاری کروں جس کی
دلوں کا بھید ہے یہ بھی قسم ہے آپ کے سر کی — وہی دیتا ہے مجھکو پیچ دستاری کروں جس کی
اثر خدمت گزاری کا تو دیکھا یہاں ہم نے — پھر الیتا ہے منہ وہ غلط تاری کروں جس کی
غلط ہے یہ کہ نیکی کا بدل نیکی ہے۔ وہ بیری — خرابی پر کمر باندھے ہے سعاری کروں جس کی
سخن وہ دور کھینچے ہے نہایت آپ کو مجھ سے — نظر پر خاک ساری ناز برداری کروں جس کی

کمال عجز و غرور اپنا قسم بوحنیفہ کہ دیدنی ہے　　کہ سرکشوں سے تو سرکشی ہے فروتنوں سے فروتنی ہے

صنم کی بے نشانی ہی نشاں ہے　　نہاں ہے ہم سے وہ جتنا عیاں ہے

نہ فکر دین و ایماں ہے نہ غم جور و ستم کا ہے　　خدا حافظ کہ دل کچھ بے طرح مائل صنم کا ہے

ہر اس سے متعادل ہو یا ماہ کی قدرت ہے　　باللہ صنم کیا ہے اللہ کی قدرت ہے

اٹھاوے کس طرح سر کو وہ ماہ ناز بالیں سے　　ہوئے ہیں ایک گر چسپیدہ مژگاں خواب شیریں سے

خدا ہی کشتی دل کا ہمارے اب نگہباں ہے　　دبالے کو فغاں آندھی ہے جوش گریہ طوفاں ہے

جن سے امید تھی وہ لوگ وہ اپنے نہ ہوے　　واسطے جن کے کیا جوگ وہ اپنے نہ ہوے

شکل ظالم جو کرے طرح - ایں طرح کرے　　پہلے جیں طرح کرے بعد جبیں طرح کرے

سرکشی فکر میں ہے چرخ بریں طرح کرے　　خاکساری ہے بخود گم کہ زمیں طرح کرے

مرد کامل ہی کو لائق ہے کرے جو چاہے　　کفر بنیاد کرے یا کوئی دیں طرح کرے

فکر عالی سے تیقن ہے سخن کی مجھ کو　　آسماں طرح کرے یا وہ زمیں طرح کرے

غش ہیں جو حسن گلو سوز پہ وہ کیا جانے　　شمع کیا چیز ہے پروانہ کسے کہتے ہیں

بستۂ زلف گرہ گیر کرو جب جانے　　ایسے دیوانے کو زنجیر کرو جب جانے

آپ کی بندہ نوازی تو مسلم ہے ولے　　عفو بے جرم کی تقصیر کرو جب جانے

پاس دلداری اغیار تو کرتے ہو بہت　　خاطر عاشق دل گیر کرو جب جانے

دل ہوا گل گل طلوع نشۂ فرہنگ ہے　　رنگ شیشہ نے کیا پیدا کئے بے رنگ سے

ظاہر رنجش ہوئی ہے کچھ وہ شوخ شنگ سے　　ان دنوں جو حضرت دل ہیں نہایت تنگ سے

خیر اندیش سمجھتے ہیں تجھے　　مرہم ریش سمجھتے ہیں تجھے

ہم تو اے کاوش مژگان سیاہ　　بیش از بیش سمجھتے ہیں تجھے

کم سے کم آپ کو تو جاں پہ بہم　　بیش از بیش سمجھتے ہیں تجھے

اے سخن! اہل نظر جتنے ہیں　　مرد درویش سمجھتے ہیں تجھے

دید سے اک نیم رخ کی کب ہوئی سیری مجھے　　تا نہ سر سے پاؤں تک اے جان دیکھیں تجھے

منفعل تو کیا کروں الطاف تیرے دیکھ کر　　رو نہ دوں تو کیا کروں حسن دغم غصب دیکھیں تجھے

اس لئے پاس ادب تیرا مجھے ملحوظ ہے　　مجھ سے ہو سکتا ہی جو میں بے ادب دیکھوں تجھے

بجھ ہی جانے دل [illegible]　　ساغر مے سے اگر میں لب بلب [illegible]

تنقید و تبصرہ

چمنستان شعرا | مرتبہ مولوی عبدالحق بی۔اے معتمد انجمن ترقی اردو اورنگ آباد قیمت ۵ر مجلد ۵۶۵

انجمن ترقی اُردو نے قدیم کتابوں اور بالخصوص شعرائے اردو کے تذکروں کا جو سلسلہ اشاعت جاری کر رکھا ہے اس میں منشی لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی کا یہ نایاب تذکرہ ایک مفید اضافہ ہے۔ قدیم اردو شاعری کی نسبت یہی تذکرے موجودہ زمانے کے لئے ہر قسم کی معلومات بہم پہنچانے کا ذریعہ ہیں اور ان میں اگرچہ تاریخ و تذکرہ کے اعتبار سے شعرا کے تفصیلی حالات، ان کی زندگی کے اہم سنین، ان کی شاعری کی ابتدا اور ترقی وغیرہ پر جیسی چاہیے روشنی نہیں پڑتی لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ انہی تذکروں کے مطالعہ اور باہمی مقابلے سے جدید اصولوں پر اردو شاعری کی تاریخ مرتب کی جائے اور مختلف تذکروں کے نامربوط بیانات سے بے جا تعریفوں اور مبالغوں کو نظر انداز کر کے قدیم شعرائے اُردو اور ان کی شاعری کی نسبت مربوط و مسلسل معلومات اخذ کی جائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انجمن ترقی اُردو نے شعرائے اُردو کے تذکروں کا اچھا سلسلہ شائع کر دیا ہے۔

چمنستان شعرا ۱۱۷۵ھ میں تالیف ہوا موجودہ تذکروں میں قدیم ترین تذکرے میر تقی کا نکات الشعرا اور تذکرہ فتح علی گردیزی ہیں یہ دونوں ۱۱۶۵ھ کی تالیف ہیں۔ شفیق نے جب ان تذکروں کو دیکھا تو خود اس کو بھی ایک وسیع تذکرہ لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور ان دونوں تذکروں کو پیش نظر رکھ کر بڑی تلاش و جستجو سے (۲۱۲) شعرا کے حالات فراہم کر کے اپنا تذکرہ ترتیب دیا۔ اس تذکرے کا صرف ایک ہی قلمی نسخہ جو غالباً مولف کا مسودہ ہے کتب خانۂ آصفیہ میں محفوظ ہے۔ آج تک کسی اور نسخہ کا علم نہیں ہوا۔ مولف تذکرہ خود بھی بڑا پرگو شاعر اور مورخ تھا۔ اس نے اس کے علاوہ ایک اور تذکرہ (جو فارسی گو شعرا کا ہے) اور کئی تاریخیں لکھی ہیں۔ اس کو تحقیق حالات اور تاریخی مواد کی فراہمی کا بڑا ذوق تھا جیسے اور جہاں تک سمجھا جاتا ہے اُس نے چمنستان شعرا کی تالیف میں بڑے تفحص اور دقت نظر

کام لیا ہے۔ میر تقی اور فتح علی گردیزی دونوں کے تذکرے نہایت مجمل ہیں اور اکثر صورتوں میں اُن کی اطلاعات ناقص ہیں۔ دونوں نے اس تحقیق و تجسس سے کام نہیں لیا جو ایک تذکرہ نویس کا فرض ہونا چاہیئے۔ دکھنی شاعروں کے متعلق ان دونوں کی معلومات کا واحد ذریعہ سید عبدالولی عزلت کی بیاض اور چند زبانی بیانات ہیں۔ سید عبدالولی گجرات کے باشندے تھے اور ۱۱۶۵ھ میں بہ سلسلہ سیاحت دہلی میں وارد تھے۔ دکن کے قدیم شعرا اور بالخصوص گولکنڈہ اور بیجاپور کے سخن طرازوں کا خود انہیں بہت کم علم تھا یہی وجہ ہے کہ میر تقی اور فتح علی گردیزی کو پڑھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ان کے تذکرے باوجود قدیم ترین ہونے کے قدیم شعرا کی نسبت نہایت ادھوری اور ناقص معلومات رکھتے ہیں چمنستان شعرا خاصہ ضخیم تذکرہ ہے۔ اس کا مولف خود دکن کا باشندہ ہے اور تلاش مواد میں بڑی جگر کاوی کسے کام لیا ہے اس لئے دکنی شاعروں کے متعلق اس میں بہت مواد ملتا ہے۔ شمالی ہند کے بھی ایسے بہت سے شاعر ہیں جو میر تقی اور فتح علی گردیزی کے ہاں نظر انداز کر دے گئے ہیں اور جن کے حالات اور کلام دونوں اس تذکرے میں موجود ہیں۔ یہ تذکرہ اُردو ادبیات کے متعلمین کے لئے نہایت مفید تاریخی دستاویز ہے اور نامناسب نہیں کہ جامعہ عثمانیہ کے امتحان ایم۔ اے اور پنجاب کے امتحان اعزاز ان اُردو میں بجائے نکات الشعرا گلشن بے خار اور گلشن ہند کی اس کو شریک نصاب کیا جائے اور متعلمین سے خاص خاص شاعروں پر تحقیقات کرائی جائیں۔

مولوی عبدالحق بی۔ اے نے اس پر کوئی (۴۲) صفحات کا ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں مختصراً شفیق کے حالات زندگی کے علاوہ اس کے کلام اور اُس کی دیگر تصانیف پر نوٹ بھی ہیں۔ شفیق کا خاندان اپنی علمی خدمات کے لئے نہایت ممتاز ہے۔ وہ مشہور بلگرامی علامہ غلام علی آزاد کا شاگرد خاص اور تربیت یافتہ تھا بلحاظ شاعری اُس کا مرتبہ خاصا بلند ہے۔ اس کے حالات اور کلام پر خود اُس کی اپنی تصانیف اور دیگر ہم عصروں کے بیانات وغیرہ سے بہت سا مواد فراہم کیا جا سکتا اور ضخیم سوانح عمری مرتب ہو سکتی ہے۔ مرتب تذکرہ نے اہل تحقیق کے فائدے اور تذکرے کی دلچسپی میں اضافہ کرنے کے لئے بعض شاعروں کے حالات ایک اور تذکرہ تحفۃ الشعرا سے لے کر بطور حاشیہ اس کتاب میں شریک کر دئے ہیں جس سے واقعی یہ تذکرہ زیادہ مفید ہو گیا۔

چونکہ اس تذکرے کا صرف ایک ہی مخطوطہ دنیا میں محفوظ ہے وہ بھی بہت گنجلک اور ناصاف خط میں ہے۔ نیز اس کی نقل لینے میں زیادہ دقت نظر سے کام نہیں لیا گیا اس لئے بعض جگہ مضمون بھی خبط ہو گیا ہے کہیں کہیں نقطے بھی دیتے پڑے ہیں۔ چند طباعت کی غلطیاں بھی رہ گئی ہیں سرورق پر مولف تذکرہ کا نام لچھمی نارائن کی بجائے لچھمن نارائن چھپا ہے صفحہ دوم پر اس کا سال ولادت ۱۱۸۵ھ بالکل غلط ہے۔ کتاب کی تیاری میں بڑی نفاست پسندی سے کام لیا گیا ہے اور جلد بہت خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔

خزینۂ تاریخ | دفتر بزم تاریخ کلیہ جامعہ عثمانیہ قیمت ۸؍

کلیہ جامعہ عثمانیہ کے افتتاح کے ساتھ ہی مختلف مضامین پر بحث و تمحیص اور تحریر و تقریر کے مواقع نکالے گئے اور طلبائے کالج کی مختلف بزمیں قائم ہوئیں۔ بزم تاریخ بھی ایک ایسی ہی انجمن ہے جس میں شعبۂ تاریخ کے معلمین و متعلمین سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں اور وقتاً فوقتاً مختلف تاریخی موضوعوں پر محققانہ مقالے پڑھے جاتے اور اچھی تقریریں کی جاتی ہیں۔ اراکین بزم کی دلچسپی و استفادے کے لئے ایسے بیرونی اصحاب سے بھی تقریریں کرائی جاتی ہیں جو تاریخ کے کسی خاص موضوع پر مستند حیثیت رکھتے ہیں۔ اس قسم کی انجمنوں کے قیام سے جامعہ عثمانیہ کی زندگی میں بڑی سرگرمی اور بیداری کی نمایاں نشانیاں نظر آتی ہیں۔ نہایت مسرت کی بات ہے کہ جامعہ کی بزم تاریخ اپنے فرائض وجود کی انجام دہی میں دوسری بزموں پر فوقیت رکھتی ہے اور اس نے حقیقی معنوں میں طلبائے جامعہ میں تاریخی ذوق پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے خزینۂ تاریخ اس کی مساعی کا پہلا ثمرہ ہے جو کتابی صورت میں اہل ذوق کے آگے پیش کیا گیا ہے۔ اس گلدستہ تاریخی میں سب سے پہلے تعارف کے عنوان سے مولوی ہارون خاں شیروانی ایم۔ اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا سینیر پروفیسر تاریخ نے جو اس بزم کے بلحاظ عہدہ صدر اعظم ہیں بزم تاریخ کا تعارف کرایا اور اس کے مفید مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد مختلف مضامین شروع ہوتے ہیں۔ بعض مضمون کالج کے پروفیسروں کے ہیں اور بعض طلبا کے۔ تقریباً ہر ایک مضمون سلیقے سے لکھا گیا ہے اور تحقیق و تلاش تاریخی کے ثمرات سے مالا مال ہے۔ مضامین اسلامی، ہندوستانی، دکنی تاریخوں اور بعض

عام تاریخ و سیاسیات کے متعلق ہیں اس لئے فن تاریخ کی ہر ایک شاخ سے دلچسپی رکھنے والے کے لئے اس کا مطالعہ افادہ بخش ہوگا۔ ہمیں اُمید ہے کہ اس بزم کے موجودہ کارکن بھی اپنے پیش روؤں کی طرح سرگرمی کے ساتھ بزم کی ترقی میں حصہ لیکر خزینۂ تاریخ کے شماروں میں بے شمار اضافہ کریں گے اور اس عنوان سے جو مفید علمی خدمت جامعہ عثمانیہ نے شروع کی ہے اس کو طویل اور عظیم الشان بنائینگے۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کی اصلی غایت یہی تھی کہ ملک کے ہونہاروں میں ایسا ہی علمی مذاق پیدا ہو اور موجودہ سرمایہ علمی میں ان کی بدولت وہ اضافہ کثیر ہو جو پچھلے ستر بہتر برس کی کورانہ اور خلاف اصول طرز تعلیم کی نہ صرف تلافی کر دے بلکہ مستقبل کو بھی خوش آئندہ بنائے۔

حالاتِ قدسی از مولوی اقبال حسین خاں بی۔اے۔ ایل۔ ایل۔بی (آلہ آباد) ضخامت (۶۸) صفحے قیمت ۸ر۔ یوسف علی غریب نواز چوک بھوپال سے طلب فرمائیے۔

یہ ایک بزرگ حضرت مخدوم شہزادہ ناصر الدین محمد اسد الرحمن قدسی کی سوانح عمری ہے جو آپ کے مرید و عقیدت کیش شیخ مولوی اقبال حسین خاں نے اپنے حسن عقیدت سے بڑی سلیقہ مندی کے ساتھ مرتب کی ہے۔ حضرت قدسی اس وقت بقید حیات ہیں اور طالبان فیض کے لئے آپ کی ذات مرجع بنی ہوئی ہے۔ عقیدت کیش مرید نے اپنے پیر و مرشد کے حالات زندگی بیان کرنے کے بعد آپ کے اخلاق و عادات پر مفصل بحث کی ہے اور آپ کے کردار کی نمایاں صفات فیض صحبت، ایثار، ہمدردی، صبر و توکل، خودداری، بے نیازی و قناعت، سخاوت و شجاعت پر شرح و بسط سے لکھا ہے۔ آخر میں آپ کے اقوال و نصائح بھی نقل کر دیئے ہیں۔ یہ کتاب جیسی اعلیٰ کردار ہستی کی لائف ہے، اس کے مدنظر ناظرین اس سے نہایت عمدہ نصائح حاصل کر سکتے ہیں۔ اور مغرب کے دلدادہ نوجوان کے لئے تلخ گفتار واعظوں اور کافر گر مولویوں کے مواعظ و مواعید سے زیادہ مفید ثمرات اس کتاب کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ پڑھنے والا خود بخود فرنگیت سے متنفر ہو کر اسلامی سعید زندگی کا گرویدہ ہو سکتا ہے۔ کتاب کے پہلے چند اوراق مقدمہ کے لئے وقف ہیں جو مولوی حامد سعید (بھوپالی) کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ مقدمہ میں انحطاط مذہب اور عمل سے بے اعتنائی اور قول کے اسلام پر بڑا پُر جوش ہے اور خوب لکھا ہے۔

زندہ طلسمات

جس کو باشندگان حیدرآباد کے علاوہ معزز حکمار اور ڈاکٹروں نے صدہا مریضوں پر امتحان کرکے سینکڑوں سرٹیفکیٹ عطا کئے۔ زندہ طلسمات ملکی ہونے کے علاوہ رجسٹرڈ اور پیٹنٹ شدہ ہے جسب ذیل امراض پر آناً فاناً میں طلسمی اثر دکھانا اُس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ مثلاً ہیضہ۔ پلیگ۔ بخار۔ ہچکی۔ متلی۔ کھانسی۔ دمہ۔ بواسیر۔ خارش۔ سانپ۔ بچھو۔ کے زہر اور ہر اقسام کے درد کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے آزمائیے ایک بار ضرور آزمائیے پبلک کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے۔ شیشی نمبر (۱) عہ نمبر (۲) ۸ر نمبر (۳) ۴ر ایک درجن کے خریدار کو خرچہ وی۔ پی۔ معاف ہوگا۔

پتہ خط اور تار کا "زندہ طلسمات حیدرآباد دکن"

ویجیٹال بام

بیرونی استعمال کی پر تاثیر اور لاجواب دوا

یہ دوا بیرونی استعمال کے لئے آپ اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزاء سے مرکب اور بالکل بے ضرر ثابت ہو چکی ہے جو اقسام کے اعصابی اور اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس کو سالہا سال کے تجربہ اور عرق ریزی کے بعد اعلیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے اور متعدد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اس کو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں اس سے زیادہ پر اثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے کوئی گھر اور خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہیئے استعمال کے ساتھ ہی اپنا برقی اثر دکھلاتی ہے اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہو جاتا ہے۔ علی الخصوص نقرس وجع مفاصل۔ دمہ۔ درد سر درد دل۔ بچھو کے زہر کے لئے زخم کے لئے اور جلے ہوئے جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال تھوڑی دوا لیکر دن میں تین چار وقت مقام ماؤف پر ملیں اور اگر افاقہ نہ ہو تو دوا کے استعمال سے پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر اچھی طرح اعصاب کو بھانپ دیں اور صاف کریں جو صاحب بیرمن امتحان طلب فرمادیں بخوشی تعمیل کیجائیگی۔

نوٹ:۔ ہمارے دواخانہ میں ہر قسم کی تازہ ادویات کا ذخیرہ ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اور نسخہ جات نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کئے جاتے ہیں۔

المشتہر

جینس اینڈ کمپنی ڈسپنسنگ کیمسٹ اسٹیشن روڈ قریب محکمہ مالگزاری حیدرآباد دکن

ہندوستان کی طباعت میں عظیم الشان انقلاب اور یورپ کو مات

مرقع چغتائی (یعنی) دیوان غالب مصور

جس کی پہلی اشاعت کے ۲۱۰ نسخے بحساب فی نسخہ ۱۱ کلدار فروخت ہو چکے

یہ شاندار مرقع اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ اعلیٰحضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ کے نامِ نامی اسم گرامی سے باجازت منسوب ہے

مختصر تفصیل

تعارف نامہ از ڈاکٹر سر محمد اقبال

دیباچہ از نقاد مصوری ڈاکٹر کزنز (مدراس)

(۱) مکمل متن دیوان غالب نہایت عمدہ طریق سے۔ (۲) مقدمہ سخنہائے گفتنی از مصور (چغتائی) (۳) انتخاب کلام

(۲۱) تصاویر جو چار رنگوں میں بذریعہ بلاک یورپ کے ایک ماہر فن کارخانہ سے تیار کرائی گئی ہیں۔

(۲) تصاویر حضرت چغتائی کی بہترین صناعی کا اعلیٰ نمونہ از ڈٹ لامن بلاک کے ذریعہ تیار کرائی گئی ہیں

(۲) تصاویر جناب چغتائی کے پنسلی خاکوں سے بنوائی گئی ہیں۔

(۹) تصاویر عام رنگوں اور بانی ہلکے رنگوں میں تیار ہوئی ہیں۔

کتاب کی جلد نقلی مراکو کے چمڑے سے تیار کرائی گئی ہے جس پر طلائی بیل بوٹے اور کتاب کا نام کندہ ہے چھاپا ولیم کاغذ پر نہایت نفاست سے چھپی ہے

قیمت ان تمام خوبیوں کے باوجود صرف لعہ سکہ عثمانیہ رکھی گئی ہے۔

مکتبہ ابراہیمیہ نے ممالک محروسہ سرکار عالی میں فروخت کا انتظام اپنے ذمہ لیا ہے

المشتہر

مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی (محدود) اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

نوٹ۔ مکتبہ کے شوکیس میں کتاب ہر وقت ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے

اس صدی کی
مہتم بالشان اُردو کتاب
اُردو شہ پارے
زیر ادارت
ڈاکٹر سید غلام محی الدین قادری۔ ایم اے، پی، ایچ، ڈی (لندن)
اُردو شہ پارے
تین جلدوں میں شائع ہو رہی ہے
جلد اول۔ اُردو کی ابتدا سے لیکر ولی کے عہد تک۔ مرتبہ سید غلام محی الدین صاحب قادری، ام اے، پی، ایچ، ڈی، (لندن)
جلد دوم۔ ولی کے عہد سے حالی کے عہد تک۔ مرتبہ مولوی سید محمد صاحب ام، اے
جلد سوم۔ حالی کے عہد سے موجودہ زمانے تک۔ مرتبہ مولوی عبدالقادر صاحب سروری ام۔ اے۔ یل یل۔ بی۔
پہلی جلد وسط نومبر میں شائع ہو رہی ہے
اس میں
(۱) اُردو کی ابتدا سے ولی کے عہد تک کی ادبی تاریخ (۲) اردو ادب کے سنین کا خاکہ (۳) ہر دور کے مصنفین اُن کے کارناموں اور ان کے مخطوطوں کے متعلق تفصیلی معلومات (۴) اس عہد کے اُردو مصنفین کے بہترین شہ کار (۵) قدیم متروک اور نامانوس الفاظ کی فرہنگ (۶) سید شاہ راجو، علی عادل شاہ ثانی، سلطان عبداللہ قطب شاہ، ابوالحسن تاناشاہ، سلطان محمد قلی قطب شاہ، ابن نشاطی اور دوسری قدیم معاشرت کی تصویریں شامل ہیں۔
قدیم اردو ادب
اس سے وسیع اور بہتر معلومات کا ملنا دشوار ہے اس کے لیے مصنف نے یوروپ کے تمام کتب خانوں کی چھان بین کی۔
کاغذ
تقطیع (کراؤن) ۔ صفحات (۴۰۰)
نفیس جلد کے ساتھ
کوئی اُردو کتاب اس شان سے آج تک شائع نہیں ہوئی
قیمت چھ روپے بارہ آنے علاوہ محصول ڈاک
ناشر
مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی (محدود) اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

*

قاموس الاغلاط

اعلیٰ انتقاد ادبی کی یہ پہلی کتاب ہے۔ جو السنہ عربی و فارسی و اردو میں تصنیف ہوئی ہے جس میں ہزارہا ادبی اغلاط کی تصحیح و تنقیح اور الفاظ کی تحقیق و تدقیق کی گئی ہے۔

اس کتاب میں ہر لفظ کی لسانی تشریح تجزیٔ کلام اعراب و تشکیل، سکون و حرکت کے بعد اس کی اصل و حقیقت۔ مادہ۔ مآخذ و اشتقاق تحلیل و ترکیب اسما کی صورت میں تذکیر و تانیث اور واحد و جمع شرح و بسط کے ساتھ بتائی گئی ہے۔

اس لغت میں الفاظ کی اصلیت کے اظہار میں زندہ و مردہ السنہ عالم۔ خصوصاً سامی و آریٰ زبانوں کے الفاظ کا تقابل و تماثل کیا گیا ہے۔ عربی، فارسی و اردو علم ادب کے وسیع و غائر مطالعہ کے بعد جدید فلالوجی (فلسفۂ لغویہ) کے اصول کے موافق علامۃ الدہر مولانا سید مختار احمد و ادیب العصر مولانا ذہین نے مدون کیا ہے۔ یہ لغت اہل دفاتر و اہل مدارس اہل علم، ادبا و شعرا، انشا پرداز، مصنفین، صحافیین، (جرنلسٹس) و مضمون نگار و نامہ نگار اصحاب کے لئے نہایت مفید و کارآمد ہے۔ مدارس عالیہ و ثانویہ کے پروفیسر (اساتذہ)، متعلمین اور کل تلامذہ کو یہ کتاب حرز جان بنانی چاہیئے۔ غالب، آزاد، ناسخ، امیر، جلال محض چند اصول و کلیات سے واقف تھے۔ لیکن یہ لغت نوادبیات، لسانیات، اصول زبان، مقالات انتقادیہ وغیرہ کا مخزن ہے۔

جمیع عدالت ہائے مرافعہ، دیوانی و فوجداری کے حکام، و اراکین، قضاۃ و عملہ عدالت۔ اور بیرسٹروں، پلیڈروں، وکیلوں مختاروں وغیرہ سب قانون پیشہ اصحاب کو اس کتاب کا پیش نظر رکھنا لازم ہے۔ مفہوم کا جاننا لازمی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دیگر محاکم مال۔ فینانس، سیاسیات۔ امور مذہبی، تعمیرات۔ فوج وغیرہ کے دفاتر میں رکھنا لازم ہے۔ کیونکہ ملکی و رسمی (آفیشل) زبان اردو سے بخوبی واقف ہونا ضروری ہے۔

غرض یہ لغت تحریری و تقریری ہزارہا اغلاط سے آگاہ کر کے دو مقولوں۔ مقرروں۔ خطیبوں۔ وکیلوں۔ بیرسٹروں کو بھی علمی فائدہ پہنچائے گا۔ کیونکہ اس میں ایسے الفاظ کی تصحیح بھی کر دی گئی ہے۔ جو فاضل ادبا بھی اپنی تصانیف میں بے دھڑک غلط لکھ گئے ہیں۔ یوں تو عربی، فارسی اور اردو کے بیسیوں لغات ملیں گے۔ لیکن ایک جگہ اصول و قواعد و شواہد سے تصحیح کیا ہوا اغلاط کا کافی و وافر علمی ذخیرہ اسی لغت کو پائیں گے۔

باوجود ان تمام خوبیوں کے قاموس الاغلاط کے جواہر ریزوں اور الماس جیسے لعلوں کی قیمت دس روپیہ کچھ بھی نہیں

المشتہر

مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

المشتہر شعبہ تجارتی

مطبوعاتِ مکتبہ

دکن میں اردو مصنفہ مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب منشی فاضل۔ جنوبی ہند میں اردو کی ابتدائی تاریخ قطب شاہی عادل شاہی اور آصف جاہی دوران میں اردو نظم و نثر کی حالت اور شعرائے اردو کا تذکرہ معہ نمونۂ کلام ضخامت ۳۰۸ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن $\frac{20\times30}{16}$ کاغذ چکنا بار دوم قیمت عہ

خیابانِ اردو مرتبہ جناب محمد عارف صاحب حیدرآبادی ہندوستان کے ممتاز اردو انشا پردازوں اور نامی گرامی شعرا کے نظم و نثر کا بہترین انتخاب جو مدارس کے تعلیمی نصاب کیلئے نہایت موزوں ہے ضخامت تقریباً ۴۵۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن $\frac{20\times30}{16}$ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد سادہ عہ

روحِ تنقید مصنفہ مولوی ابو الحسنات سید غلام محی الدین قادری زور ایم اے۔ فن تنقید کے متعلق اردو زبان میں پہلی کتاب ہے جس میں ماضی و حال کے علمائے یورپ کی تنقیدی اصول بیان کیے گئے ہیں اور ان اصولوں کی روشنی میں مثنوی سحر البیان پر ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے ضخامت ۲۵۶ سائز پاکٹ ایڈیشن $\frac{20\times30}{16}$ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ بار دوم قیمت عہ

تنقیدی مقالات مصنفہ زور صاحب۔ یہ روح تنقید کا دوسرا حصہ ہے جس میں مصنف نے روح تنقید کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں انگریزی، فارسی اور اردو زبانوں کے مشہور اہل قلم کی قلمکاریوں پر تنقید کر کے ان اصولوں کا استعمال دکھلایا ہے اور نیز بعض مشہور اردو انشا پردازوں کے طرز تحریر پر تبصرہ کرنے کے خاص خاص اصول بیان کیے گئے ہیں ضخامت ۲۵۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن $\frac{20\times30}{16}$ کاغذ چکنا لکھائی وغیرہ عمدہ مجلد سادہ ہے

اردو کے اسالیبِ بیان مصنفہ زور صاحب۔ نثر نگاری کی ابتدائی کیفیت ابتدا سے لیکر آج تک کے نثر نگاروں کے طرز تحریر و انداز بیان کا تذکرہ۔ خاص طرز تحریر کے اردو انشا پردازوں کے اسالیب بیان پر تبصرہ ضخامت ۴۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد سادہ عہ

سلطان محمود غزنوی کی بزمِ ادب مصنفہ زور صاحب۔ سلطان محمود غزنوی سے پہلے اور بعد کے علم و ادب کے حالات سلطان محمود غزنوی کے علمی، ادبی کارنامے ترتیب کتاب میں پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران سے استفادہ کیا گیا ہے ضخامت ۱۲۰ صفحے۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۱۲ر

دنیائے افسانہ مصنفہ مولوی محمد عبد القادر سروری ایم اے ایل ایل بی، افسانہ نگاری کی ابتدائی تاریخ اور افسانہ نویسی کے اصول و مبادیات اردو زبان میں اپنے مضمون کی پہلی کتاب ہے ضخامت ۲۱۸ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی بہترین قیمت عہ

مبادیِ فلسفہ مولفہ مولوی میر حسن الدین صاحب بی اے ایل ایل بی، ڈاکٹر اے ایس راپورٹ پی۔ ایچ۔ ڈی کی پرائمر آف فلاسفی کا مفصل، بامحاورہ اور عام فہم اردو ترجمہ ضخامت ۱۳۶ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۱۲ر

اربابِ نثرِ اردو مصنفہ مولوی سید محمد صاحب قادری ایم اے۔ فورٹ ولیم کالج کے اردو اہل قلم کے تحقیقی حالات اور ان کے مصنفات پر تنقید و تبصرہ۔ انیسویں صدی عیسوی کی اردو نثر نگاری کی تاریخ ضخامت ۲۴۳ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت عہ

آثار الکرام جلد اول مصنفہ شمس المورخین جناب حکیم سید شمس اللہ قادری ام آر اے ایس۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے علمی و ادبی کارناموں کی محققانہ تاریخ ضخامت ۲۴۴ صفحے۔ سائز $\frac{26\times24}{16}$ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی خاصی قیمت ۱۲ر

جواہرِ کلیاتِ نظیر منتخبہ جناب مولانا ذہین و سید مختار احمد نظیر اکبرآبادی کے کلیات سے اخلاقی۔ ادبی۔ نصیحت آموز، ظرافت آمیز اور دلنواز نظموں کا مجموعہ ضخامت ۲۸۰ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی خاصی قیمت عمر

عقائدِ امام مترجمہ مولوی محمد عبد الغفور عابدی صاحب فقہ اکبر کا عام فہم اور بامحاورہ اردو ترجمہ۔ قیمت ۴ر

اسوۂ حسنہ مصنفہ مولوی احمد عبداللہ مسدوسی بی اے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کے سامنے کیسی زندگی پیش کی تھی ضخامت (۸۰) صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۸ر

دکنی لغت مولفہ مولوی سید شعار احمد شعار ہاشمی۔ اردوئے قدیم یعنی دکنیات کا لغت جس میں دکنی زبان کے الفاظ و محاورات کی تشریح کی گئی ہے ضخامت ۱۲۱ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ۸ر

شاہ رفیع الدین قندھاری مرتبہ مولوی محمد عبد الغفور صاحب عابدی۔ دکن کے ایک مشہور صاحب دل صوفی عالم کے دلچسپ حالات ضخامت ۴۸ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی قیمت ۵ر

خزینۂ اخلاق مصنفہ مولوی سید عبد العزیز صاحب عزیز اخلاقی و ادبی نظم و نثر کا مجموعہ۔ ضخامت ۶۴ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۶ر

سیرت خیر البشر وسیرت مبارک مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالے جس میں آنحضرت صلعم کے مکارم اخلاق بیان کیے گئے ہیں۔ قیمت ۱ر

نیک بی بی مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالہ جس میں بتلایا گیا ہے۔ نیک خو بی بی کس طرح اپنے بد خو شوہر کو ٹھیک کر سکتی ہے۔ قیمت ۲ر

چھوٹا شیطان مصنفہ مولانا ذہین۔ منظوم اخلاقی رسالہ قیمت ۱ر

ملنے کا پتہ۔ انجمن امداد باہمی مکتبۂ ابراہیمیہ روبروئے محکمۂ مالگذاری اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن